زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

جلد ۔۶۔۷ شمارہ ۔ ۲۱۔۲۲

جنوری تا جون ۲۰۲۲ء

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

نائب مدیرہ نشاط پروین

تزئین کار: اعجاز رحمانی

سرورق: نعیم یاد (پاکستان)

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

● 'ثالث' کے اس شمارے کی قیمت ۵۰۰ روپے ہے۔

فہرست

	اداریہ	اقبال حسن آزاد	۵
	حمد	آفتاب عالم اطہر گیاوی	۸
	نعت	غلام مجتبیٰ مہر	۹
کوائف	کوائف شوکت حیات	ادارہ	۱۰
مضامین	شوکت حیات کی افسانہ نگاری	پروفیسر وہاب اشرفی	۱۲
	شوکت حیات کی افسانہ نگاری	وارث علوی	۲۱
	شوکت حیات کا فن	فاروق ارگلی	۲۶
	شوکت حیات کے افسانے	ڈاکٹر ابرار رحمانی	۳۶
	شوکت حیات کا ناول/ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' ایک تنقیدی جائزہ	پروفیسر صفدر امام قادری	۴۴
	شوکت حیات اور ان کے افسانے	ڈاکٹر سید احمد قادری	۶۲
	شوکت حیات کے افسانوی اختصاص	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۷۱
	''گنبد کے کبوتر'' تہذیب کی مسماری کا استعارہ	ڈاکٹر صغیر افراہیم	۸۳
	شوکت حیات اور ''گنبد کے کبوتر''	ڈاکٹر سید اشہد کریم	۹۲
	شوکت حیات کا فن	ڈاکٹر حامد علی خان	۱۰۱
	شوکت حیات اردو افسانے کی منفرد آواز	ڈاکٹر منصور خوشتر	۱۱۰
	حیات اردو افسانہ: شوکت حیات کا فکری و فنی مطالعہ	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۱۱۷
	شوکت حیات: صداقتوں کا کہانی کار	عرفان رشید	۱۲۵
	شوکت حیات کے افسانوں کا اختصاصی پہلو	ڈاکٹر قسیم اختر	۱۳۲
	سن ستری افسانے کا قضیہ اور شوکت حیات کے نظریات	ایم۔ خالد فیاض	۱۳۸
	شوکت حیات کے امتیازات	ڈاکٹر زرنگار یاسمین	۱۴۳
	شوکت حیات اردو افسانے کا سنگ میل	ڈاکٹر وصیہ عرفانہ	۱۵۲

ثـــــالـــــث

	شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیاں	ڈاکٹر گلاب سنگھ	۱۷۴
	شوکت حیات کے افسانے	ڈاکٹر نزہت پروین	۱۸۰
خاکے	افسانے کا سکندر: شوکت حیات	مشتاق احمد نوری	۱۸۵
	وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی	عبدالصمد	۲۰۴
	شوکت حیات	ڈاکٹر ابرار رحمانی	۲۱۴
	ساز بوالعجبی کا تار حیات	غضنفر	۲۱۶
	شوکت حیات.....کچھ یادیں.....کچھ باتیں	ڈاکٹر منظر اعجاز	۲۲۲
	بھول بھلیاں اور شوکت حیات	اقبال حسن آزاد	۲۳۰
	شوکت حیات سے دو ملاقاتیں	نشاط پروین	۲۳۸
تجزئے	''ذائقہ'' میں نئے ذائقے کی دریافت	مشتاق احمد نوری	۲۴۰
	شوکت حیات کا افسانہ ''بانگ''	غضنفر	۲۴۷
	شوکت حیات کے افسانے ''میت'' کا تجزیہ	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۲۴۹
	افسانہ ''کوبڑ'' اخلاقی و تہذیبی اقدار کی زوال پذیری کا اشاریہ	ڈاکٹر توصیف احمد ڈار	۲۵۶
مکالمے	شوکت حیات سے گفتگو	نثار احمد صدیقی	۲۶۱
	شوکت حیات سے مکالمہ	ڈاکٹر محمد غالب نشتر	۲۶۹

شوکت حیات کے خطوط

بنام: قرۃ العین حیدر ڈاکٹر، ابرار رحمانی، عین تابش،	ادارہ	۲۷۳ تا
سید احمد قادری، رفیع حیدر انجم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر ارشد رضا		۲۸۲

شوکت حیات کے مضامین

معاصر اردو افسانہ: تغیر و تبدل اور امکانی حقیت نگاری	شوکت حیات	۲۸۳
مابعد جدید افسانہ	شوکت حیات	۲۹۱
میری تھیوری سازی اور میرے افسانے	شوکت حیات	۲۹۹

ثـــــالـــــث

شوکت حیات کے افسانے

	گنبد کے کبوتر	شوکت حیات	۳۰۲
	رانی باغ	شوکت حیات	۳۱۲
	مرشد	شوکت حیات	۳۲۷
	ذائقہ	شوکت حیات	۳۳۲
	بانگ	شوکت حیات	۳۳۹
	میت	شوکت حیات	۳۵۰
	کوبڑ	شوکت حیات	۳۵۹
ناولٹ	سرپٹ گھوڑا	شوکت حیات	۳۶۹
تبصرہ	دیکھ لی دنیا ہم نے مبصر اقبال حسن آزاد		۴۴۶۔ ۴۵۱

ثالث پر تبصرے

	عشرت ظہیر، سلیم انصاری، عظیم اللہ ہاشمی، اصغر شمیم، ڈاکٹر منصور خوشتر، ریحان کوثر، روندر جوگلیکر	۴۵۲۔ ۴۸۸
مکتوبات	فاروق ارگلی، مرغوب اثر فاطمی، عین تابش، غزال ضیغم، فخر الدین عارفی، غلام نبی کمار، ڈاکٹر اختر آزاد، وسیم فرحت، وسیم احمد فدا، جرنلسٹ اقبال، مختار بلال، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، احسان تابش، ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی۔	۴۸۹۔ ۴۹۶

◀◀ ● ▶▶

ملنے کا پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ۔۴

● اقبال حسن آزاد

اداریہ

آجکل پوری دنیا میں ایک عجیب سا ہنگامہ برپا ہے۔لیکن یہ ہنگامہ خیزی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔اگر دنیا کی تواریخ پر نظر ڈالی جائے تو آپ پائیں گے کہ یہ جہانِ آب وگل روزِ اول سے ہی ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔آدمِ خاکی کو دنیا میں کبھی بھی آرام اور چین حاصل نہیں ہوا۔آپ جسے زمانۂ امن سمجھتے ہیں وہ دراصل ماندگی کا وقفہ ہے۔اور اس وقفے کے بعد پھر وہی شور وشر، وہی زیر وزبر، وہی ہنگامہ خیزی۔اور شاید اسی لیے علامہ اقبال کو یہ کہنا پڑا تھا کہ:

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک　　کرم ہے یا کہ ستم تیری لذّت ایجاد
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل　　یہی ہے فصلِ بہاری، یہی ہے بادِ مراد؟

دنیا ہے تو ہر طرح کے ہنگامے بھی ہیں۔ان ہنگاموں سے ڈرنا چاہیے نہ گھبرانا۔بلکہ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔لیکن یہ مقابلہ آرائی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں: ع

انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

ہنگامے تو ہوتے ہی رہیں گے لیکن ہمیں اپنا کام مسلسل کرتے رہنا چاہیے۔اگر ہم ان میں اُلجھ گئے تو ناکامی اور نامرادی ہمارا مقدر بن جائے گی۔

☆☆☆

شوکت حیات ہمارے عہد کے منفرد اور البیلے افسانہ نگار تھے۔وہ صرف افسانہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ نظریہ ساز بھی تھے۔انہوں نے اردو ادب کو ''انامیت'' کی تھیوری دی۔ان کی بے وقت موت نے اردو افسانے کو بہت نقصان پہنچایا۔گرچہ ان کی موت کرونا سے نہیں ہوئی تھی لیکن کرونا کال میں آئی قضاء کی وجہ سے بہت سارے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ بھی اسی وبا کے شکار ہوئے تھے۔ان کے انتقال کے وقت میں اپنی بیٹی ڈاکٹر فریحہ سبین کے ساتھ رانچی میں تھا وہ ان دنوں RIMS میں M.S کر رہی تھی۔لاک ڈاؤن کی وجہ سے اس کے فلیٹ تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔اس خبر کو سن کر مجھے دلی صدمہ پہنچا۔شوکت حیات کی بڑی خواہش تھی کہ ''ثالث'' میں ان پر گوشہ نکلے۔افسوس کہ ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہو سکا۔لہٰذا میں نے ''ثالث''

کے ایک شمارے میں ان پر گوشہ نکالنے کا ارادہ کیا۔اس وقت تک میرے ذہن میں یہ صاف نہیں تھا کہ اس گوشے میں شوکت حیات کے فن اور زندگی کے کن گوشوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔بس ایک ادھوری خواہش تھی جسے پورا کرنا تھا۔آتش نے کہا ہے کہ:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

میں نے جیسے ہی اس گوشے کا اعلان کیا میرے عزیز دوست پروفیسر صفدر امام قادری (صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ) نے بہت سارا مواد مجھے ارسال کر دیا۔علاوہ ازیں شوکت حیات کے ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' پر ایک پُر مغز مقالہ بھی لکھا اور قدم قدم پر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔میں ان کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں۔پروفیسر صفدر امام قادری کے علاوہ ڈاکٹر قسیم اختر (صدر شعبۂ اردو، کشن گنج کالج، کشن گنج) اور ڈاکٹر ارشد رضا (مدیر اندشہ، بھاگلپور) نے بھی اس سلسلے میں میری مدد کی۔ان دونوں حضرات کا بھی شکریہ۔اس شمارے کی ترتیب کے دوران اتنی کثیر تعداد میں مضامین موصول ہوئے کہ گوشے کی جگہ پورا نمبر تیار ہو گیا۔اس میں زیادہ تر مضامین بالکل نئے ہیں اور خاص اسی نمبر کے لیے ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔مثلاً پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر قسیم اختر، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر گلاب سنگھ اور ڈاکٹر نزہت پروین کے مضامین بالکل نئے ہیں۔اس وقت تو مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی جب پاکستان سے ایم۔خالد فیاض (ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجوئیٹ کالج، گجرات، پاکستان) کا مضمون موصول ہوا۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ شوکت حیات کی شہرت سرحد پار تک پہنچ گئی تھی۔مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر منظر اعجاز، راقم الحروف اور محترمہ نشاط پروین نے اپنی یادوں کو سمیٹا اور شوکت حیات کا خاکہ لکھا۔اس نمبر میں نوجوان ریسرچ اسکالرز کی بھی اچھی خاصی حصہ داری ہے۔کیونکہ باصلاحیت قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ثالث کی پالیسی میں شامل ہے۔شوکت حیات دوستوں کو خط لکھنے میں کے معاملے میں کافی فعال تھے اور اپنے مداحوں کا شکریہ ادا کرنے میں آگے آگے رہتے تھے۔لیکن جب کوئی ان سے اغماض برتتا تھا تو اس کی شکایت بھی کرتے تھے۔شوکت حیات کے چند اہم خطوط بھی اس نمبر میں شامل ہیں۔ان سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو روشن ہوتے ہیں۔اس نمبر میں شوکت حیات کے چند اہم افسانے شامل اشاعت ہیں اور ان افسانوں پر مشتاق احمد نوری، غضنفر، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر توصیف احمد ڈار کے تجزیے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

''ثالث'' آن لائن بھی دستیاب ہے جسے درج ذیل ویب سائٹ پر جا کر نہ صرف پڑھا جا سکتا ہے بلکہ

اسے ڈاؤن لوڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔رسالے کی ویب سائٹ کو تادم تحریر ۶۲ ہزار سے زائد بار وزٹ کیا جاچکا ہے۔

www.salismagazine.in

۴۹۶ صفحات پر محیط اس نمبر کی قیمت مبلغ ۵۰۰ روپے ہے جسے درج ذیل اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیا جاسکتا ہے یا درج ذیل QR کو اسکین کر کے ذریعہ بھیجا جاسکتا ہے۔

Eqbal Hasan Azad

PUNJAB NATIONAL BANK, MUNGER

A/c No. 0508010126991

IFSC Code-PUNB0050820

EA

Eqbal Hasan Azad

UPI ID: 9430667003@paytm

Paytm: 9430667003

● ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاویؔ

حمد باری تعالیٰ

توخالق و مالک ہے رازق بھی خدایا ہے
تو نے ہی خدا وندا ہر شئے کو بنایا ہے
واحد ہے خدایا تو کوئی نہیں تجھ جیسا
جو کچھ ہمیں حاصل ہے سب تیری عطایا ہے
تو حافظ و ناصر ہے ہم سب کا نگہباں ہے
قدرت سے فقط اپنی،دُنیا کو سجایا ہے
دی عقل و تدبر بھی انسان کو رب تونے
ہر راہ سُجھائی ہے ہر علم سکھایا ہے
تیری ہی تو قدرت سے قائم ہیں فلک ،تارے
تونے ہی زمیں کو بھی گردش میں لگایا ہے
سر سبز کیا تو نے سوکھے ہوئے کھیتوں کو
ہم کھاتے ہیں جو کچھ بھی تونے ہی اُگایا ہے
قادر ہے تو ہر شئے پہ ، مولا یہ سمجھ کرکے
اطہرؔ نے ترے آگے سر اپنا جھکایا ہے

Masjid Gali, Shahmir Takiya
P.O. Chand Chaura, Gaya
823001 (Bihar)
Mob:+91 7250631194

● غلام مجبیٰ مہرؔ

نعت پاک

رہ گزر روشن ہوئی قلب و جگر روشن ہوئے
آپؐ کے پرتو سے سب اہل نظر روشن ہوئے

آپؐ سے پہلے یہاں تاریکیوں کا راج تھا
آپؐ آئے تو جہاں کے بحر و بر روشن ہوئے

آج بھی اک اک در و دیوارِ یثرب ہیں گواہ
آپ کے قدموں کے صدقے بام و در روشن ہوئے

ظلمتیں رخصت ہوئیں باطل کا سر نیچا ہوا
واقعی نور نبیؐ سے گھر کے گھر روشن ہوئے

مہرؔ ہم تو برملا یہ بات کہتے آئے ہیں
راہ حق میں جو کٹے بے شک وہ سر روشن ہوئے

◀◀ ● ▶▶

Rizvi Colony,Shah Zubair Road
Munger Bihar 811201
Mob: +91 90650 92349

● ادارہ

شوکت حیات

شوکت حیات

اصلی نام : سید شوکت حیات محفوظ الحق
قلمی نام : شوکت حیات
والد کا نام : سید محفوظ الحق مرحوم
تاریخ پیدائش : یکم دسمبر ۱۹۵۰ (پٹنہ، بہار)
تعلیم : ایم اے گولڈ میڈلسٹ، یو جی سی ''نیٹ''
پیشہ : فری لانس ادبی وصحافتی رائٹنگ اور ترجمہ نگاری
پہلی کہانی : بکسوں سے دبا آدمی
کب اور کہاں شائع ہوئی: کتاب لکھنؤ، ۱۹۷۰
کس افسانے سے شہرت پائی: بانگ
تصانیف : ''گنبد کے کبوتر'' (افسانوی مجموعہ ۲۰۱۱ء)
''بانگ'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۲۰۱۲ء)
شوکت حیات کے وہ خواب جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔
بھوبل (افسانوی مجموعہ)
پھسینڈا (افسانوی مجموعہ)
رانی باغ (افسانوی مجموعہ)
سرپٹ گھوڑا (ناولٹ)
۱۹۷۰ کے بعد اردو افسانہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
انعامات : گنبد کے کبوتر کے لئے قومی کتھا ایوارڈ ۱۹۹۶
بہار اردو اکادمی کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ۲۰۰۸

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی سے شیلڈ آف آنر ۲۰۰۹
گنبد کے کبوتر کے لئے یوپی اردو اکادمی کا پہلا انعام ۲۰۱۱

خصوصیت : ۱۹۷۰ کے بعد اپنے مخصوص رجحانات اور تھیوریز انامیت ''انام نسل'' اور ''انام افسانے'' کے بنیاد گزار ہونے کی حیثیت سے نمایاں شہرت حاصل کی۔ ''نامیاتی افسانوں''، ''نامیاتیت''، ''امکانیت پسندی'' اور ''مابعد جدید افسانوں'' کی وجہ سے چرچے میں رہے۔

قابل ذکر باتیں: ۱-۱۹۷۵ء کے بعد افسانے کے ہر قومی سمینار میں شرکت
۲-ساہتیہ اکادمی کے گرانٹ کے ذریعہ ہندوستان کے مختلف ثقافتی علاقوں کی سیاحت
۳-''ڈھلان پر رکے ہوئے قدم''، ''بانگ''، ''گنبد کے کبوتر'' اور ''رحمت صاحب'' کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل۔
۴-۱۹۷۰ء کے بعد شائع ہونے والی ہر اہم افسانوی انتھولوجی میں کہانی شامل
۵-سارم ممالک قومی رائٹرس کانفرنس ۲۰۰۵ء علی گڑھ میں تھیوری ساز مقالہ خوانی-امکانیت پسندی

انتقال: ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء (پٹنہ، بہار)

◀◀ ● ▶▶

● پروفیسر وہاب اشرفی

شوکت حیات کی افسانہ نگاری

سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں؟ شوکت حیات کے متعدد افسانے ذہن کے نہاں خانے پر قابض ہیں۔ اگر انہیں کھرچنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ از سر نو تر و تازہ ہو کر تسلط جمائے نظر آتے ہیں۔ دراصل فن کی اثر پزیری نت نئے روپ اختیار کرتی رہتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب اس کی نمود میں غور و فکر کے ساتھ وہ رویہ بھی کام کر رہا ہو جسے عام لفظوں میں ایمانداری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یعنی فنکار اپنے فن کے تئیں سچا ہے۔ لہٰذا اسے اپنے موضوع کو ایک معیار بخشنے میں خاصی کاوش کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا دردمند دل نشیب و فراز سے گزرتا ہوا ایک ایسی منزل پالیتا ہے جو عمومی طور پر بہتوں کے لئے دشوار ہو سکتی ہے بلکہ ہوتی ہے۔

دراصل شوکت حیات ایک Protest کے فنکار ہیں۔ جن کے یہاں ناہمواریوں کے خلاف مسلسل جدوجہد ملتی ہے، صرف گلہ نہیں ملتا بلکہ ان سے ٹکرانے کا عزم بھی ملتا ہے۔ تو کیا شوکت حیات ایسی صورت حال سے نپٹنے میں براہ راست برہنہ رویہ اختیار کرتے ہیں؟ جواب نفی میں ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ ''برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائیست''۔ وہ پختہ ذہن کے فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح سے متوازن بھی ہوتا ہے، کہیں کوئی لاتعلق داغ دھبہ نہیں۔ اب جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقعہ کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتاسر بڑھا دیتی ہے۔ نتیجے میں افسانہ نگار کی غایت افسانہ بن کر ایک پیکرِ تخلیق میں ڈھل جاتی ہے۔

ان امور کی وضاحت کے لئے شوکت حیات کے کسی بھی افسانے کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک افسانہ ہے ''سرپٹ گھوڑا''۔ اسے ناولٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعضوں نے اسے اس نہج پر بھی دیکھا ہے لیکن اس کی بنت میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا ہے کہ اس کا تناظر ہندستان کے وہ عوام ہیں جن کے مقدر میں سکون نہیں۔ ہیجان و اضطراب کا شکار ہو کر وہ ایک ایسی زندگی گزارتے ہیں جسے کسی حال میں بھی انسان کی معتدل زندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے کئی Shades ایک طرف جبر و اختیار کی کہانی سامنے لاتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ہجر و وصال کی کیفیتوں کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ صورتیں اکہری نہیں ہیں۔ یہ تمام

نکات ایک تخلیقی سطح پر دیکھے گئے ہیں۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں عام شہری کن مراحل سے گزر رہا ہے اس کا آئینہ خانہ ''سرپٹ گھوڑا'' ہے۔ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ عنوان ہی سے زندگی کی تیز رفتاری کا حال روشن ہو جاتا ہے لیکن یہ تیز رفتاری زندگی کی آراستگی میں معاون نہیں ہوتی، سچائی اپنی جگہ پر لیکن ایسی سچائی کو فن کا لبادہ پہنانا ایک دوسری چیز ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ شوکت اپنے اس طویل افسانے میں بھی اپنے فن کو قربان نہیں کرتے۔ یہ ان کا ایسا وصف ہے جو بہت کم ان کے معاصرین کے حصے میں آیا ہے اور جو ایسا محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، نام گنوانے کی ضرورت نہیں۔ ''سرپٹ گھوڑا'' کی آخری سطور ملاحظہ ہوں :

''کچھ دن کے بعد حالات نارمل ہوئے تو اسے اس انجان فرشتہ صفت محسن کا خیال آیا۔ ادھر ادھر سے پانچ سو اکٹھا کر کے اس نے قرض کی ایک قسط فوراً ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

پرانی پتلون کی جیب میں پڑے ہوئے کاغذوں کے انبار میں وہ اس کے پرزے کو بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ پایا لیکن لکھے ہوئے پتے اور ٹھکانے پر پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ وہ گھر خالی ہے۔ محلے میں بہت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اپنے بیٹے کی موت پر خودکشی کئے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا۔ اب تو ان کی راکھ بھی فضا میں تحلیل ہو چکی ہوگی۔

سکتے کے عالم میں واپس لوٹتے ہوئے اسے لوگوں کے ازدحام میں سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ معدوم ہوتی ہوئی سنائی دی۔

پست لہجے میں بیوی کو واقعے کی روداد سناتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کی اپنی آواز ایک ناتواں سی ہنہناہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

''کیا ہوا آپ کو؟'' بیوی نے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا لیکن اب اس کے منہ میں کوئی لفظ نہ رہ گیا تھا۔''

استحصال کا ایک افسانہ جو تقریباً پون صدی پہلے پریم چند نے لکھا تھا، اتنا مشہور ہوا کہ نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال ''کفن'' کے کردار ذہن و دماغ پر آج بھی چھائے ہوئے ہیں۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ موصوف کے کردار مادھو اور گھیسو کامیو کے ناول Outsider کے مرسول کے سوتیلے بھائی ہیں لیکن یہ تو ایک الگ بات ہوئی۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ شوکت حیات کے افسانے کا 'مادھو' پریم چند سے تعلق بھی رکھتا ہے اور اس سے آگے بھی ہے۔ پریم چند شاید اس وقت یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ یہ کردار استحصال کرنے

والوں سے لڑ بھی سکتے ہیں، انہیں پسپا کر کے آگے بھی بڑھ سکتے ہیں اور اپنی ایک نئی دنیا بسا سکتے ہیں۔ شوکت حیات نے ایک طرف استحصال کی کیفیت واضح کی ہے تو دوسری جانب اس کا بھی احساس دلایا ہے کہ آج کا مادھو استحصال کے خلاف مسلسل ٹکراتے ہوئے آگے بڑھ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر جگہ استحصال کرنے والے کتے بھونکتے نظر آتے ہیں لیکن مادھو اس سے ہراساں نہیں ہے۔ دراصل مادھو کی زندگی کے حالات تو وہی ہیں جو پریم چند کے یہاں تھے لیکن آج الٹرا الفٹ ذہن کی انقلابی قوتیں ابھر چکی ہیں جن کے سامنے بھونکتے ہوئے کتوں سے خوف نہیں کھاتا ہے بلکہ ان کے بھونکنے کے عمل کو ایک نہ ایک دن خامشی میں مبدل کر دینا ہے۔ ایسا ہو یا نہ ہو لیکن مادھو سے یہی سبق حاصل ہوتا ہے۔ افسانہ ''مادھو'' کے چند سطور دیکھئے :

''لوگوں نے اسے کندھے پر اٹھا لیا اور 'مادھو زندہ باد' کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔

دفعتاً اسے بہت سارے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں دور سے آتی سنائی دیں۔

اس کے چہرے سے کڑواہٹ مترشح ہونے لگی۔ کندھوں سے ایک جھٹکے سے کود گیا۔

جنگل کے اس پار سے نگاڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دور کسی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز فضا میں گونجی۔ ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثر ابھرے۔

معنی خیز نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے وہ جنگل کی طرف کوچ کر گیا۔

اس کے ہونٹوں پر رینگتی ہوئی پراسرار مسکراہٹ دھیرے دھیرے پھیلتی جا رہی تھی۔''

افسانے میں جو موضوع اپنایا گیا ہے وہ معمولی سی لغزش سے نعرے میں مبدل ہو سکتا تھا لیکن شوکت حیات تو ایک چوکس اور باخبر افسانہ نگار ہیں۔ وہ فنی برتاو کے طریقے سے آگاہ ہیں۔ ایسے میں کہیں بھی ایسا شور سنائی نہیں دیتا جو شور محض ہو۔

یاد رکھنا چاہئے کہ شوکت حیات نے بہت پہلے ایک افسانہ ''بانگ'' تخلیق کیا تھا۔ اس میں بھی امکانی انقلاب کی بشارت تھی۔ یہ افسانہ اس وقت سامنے آیا تھا جب افسانے کے کردار، پلاٹ وغیرہ منفی صورتیں اختیار کر چکے تھے لیکن شوکت حیات نے بہت پہلے اس کا احساس کر لیا تھا کہ Plotless افسانے یا متشدد قسم کے علامتی افسانے مشرقی مزاج سے لگّا نہیں کھاتے۔ لہٰذا ''بانگ'' کو اگر اردو افسانے کا

اہم Turning Point تسلیم کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔اس میں علامت کا ایک ہلکا پردہ ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔دراصل اس افسانے کے مرغ وہ انقلابی ہیں جو آنے والے انقلاب کی خبر دیتے ہیں جیسے اب فتح ان کے بہت قریب ہو :

''بہت دیر بعد لڑکھڑاتے ہوئے سرخ پانی سے وہ باہر نکلے تو زرد ہو چکے تھے۔ دریا کے کنارے سارے مرغ ایک ساتھ بلند آواز میں بانگ دے رہے تھے،یعنی ''نوید فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید۔''

تو کیا شوکت حیات ذہنی سطح پر فاتح بننے کی سبیل پیدا کرتے رہتے ہیں؟ کیا یہ ان کی خوش فہمی ہے؟ اس کا جواب ان کے افسانے ''شکنجہ'' سے مل جاتا ہے۔جس میں ایک غریب مزدور کا بچہ تعلیم حاصل نہیں کر پاتا اور اس کا باپ اس قدر لاچار ہے کہ آخرش اسے مزدور بنا دیتا ہے۔ Child labour کے قوانین اپنی جگہ پر اور حالات کا جبر اپنی جگہ پر۔گویا شوکت حیات یہ نہیں بھولتے کہ انسانی زندگی کی بے بسی کا کوئی مداوا ابھی ممکن نہیں لیکن ایک بڑے تناظر میں وہ ذہن کو اس حد تک لچکدار بنا سکتے ہیں کہ کسی بھی منفی صورت واقعہ کو تبدیل کرنے کی ذمہ داری انسان ہی کو قرار دیتے ہیں۔یعنی شوکت سارے بگڑے ہوئے معاملات کو درست کرنے کے باب میں کوئی الوہی رخ اختیار نہیں کرتے ،انہیں راہ راست پر لانے کی ساری ذمہ داری انسانون کی ہی ہے۔دیکھئے ایک حالیہ افسانہ ''کوبڑ'' کا قوام کیا ہے؟

افسانہ ''کوبڑ'' میں دو سگے بھائیوں کی کہانی قلم بند کی گئی ہے۔ایک کسی طرح مشرق وسطیٰ نکل گیا جہاں اس کی آمدنی خاصی ہوگئی ہے۔اس کے مقابلے میں اس کا غریب بھائی بھی ہے جو گھر ہی پر رہتا ہے۔ سب کے لئے مخلص، گھر کے لئے بھی اور باہر کے لئے بھی۔اس کا اپنا بھائی پڑوڈالر کما کر بہت خوش ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب وہ گھر واپس آتا ہے تو اس کی آن بان نرالی ہے۔ہر شخص اس کے آگے بچھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ غریب بھائی بھی محبت نچھاور کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ کہیں کہیں تو بہت آگے نکل جاتا ہے۔اب بھائی کو واپس جانا ہے۔یہ غریب بھائی مختلف قسم کے گھریلو کام سے نپٹ کر تھکا ماندا جب گھر آتا ہے تو ماں اسے کچھ پیسے دے کر ٹرین سے دہلی روانہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو رخصت کر دے۔جب کہ امیر بھائی ہوائی جہاز سے جاتا ہے۔غریب کا حال یہ ہے کہ وہ راستے ہی میں لٹ پٹ جاتا ہے،ایک پھوٹی کوڑی اس کے پاس نہیں رہتی۔امیر بھائی ملاقات پر اس سے کچھ نہیں پوچھتا حد تو یہ ہے کہ کھانے پینے کے بارے میں بھی کوئی سوال نہیں کرتا۔ہاں رخصت ہوتے وقت بغلگیر ہوتا ہے تو اپنے بھائی کا ''کوبڑ'' اس کے ہاتھوں سے مس کر جاتا ہے اور وہ بجلی کی سی سرعت سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔متعلقہ منظر دیکھئے :

''خاموشی کی زبان میں کہتے کہتے اس کے جذبات بے قابو ہونے لگے۔آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔سمندر اچھل اچھل کر اس کے وجود کے کناروں کو ریزہ ریزہ کرنے کے درپے تھا۔

خوابیدہ آواز دوبارہ گونجی۔

''امریکہ کے یاتری گن اب سیکورٹی چیکنگ کے لئے پرستھان کریں۔ رن وے تک لے جانے والی بس ان کا انتظار کر رہی ہے۔

اس کا بھائی بھی آبدیدہ ہوگیا۔

'بھیا تم اپنا خیال نہیں رکھتے.....کیسی صحت ہوگئی ہے تمہاری..... چند سال بڑے ہو.....لیکن دیکھنے میں باپ لگتے ہو.....!'

سب چلتا ہے بھائی.....اگلی بار جب تم آؤ گے تو میں تمہارا دادا لگوں گا.....اور اس سے اگلی بار شاید میں.....!

وہ خود کلامی کرتا ہے۔

'بھیا! اب رخصت کی گھڑی ہے.....آؤ.....ہم لوگ گلے مل لیں۔اب نہ معلوم کب ملنا نصیب ہو.....!'

اس کے بھائی نے دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

دونوں کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں تھے۔

اچانک چھوٹا بھائی چیخ مار کر الگ ہوگیا۔

'بھیا.....تمہاری پیٹھ پر یہ کیسا ابھار ہے.....مگر وہ خبیث کے سر جیسا.!'

بڑے بھائی کو کاٹو تو لہو نہیں۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بھائی کی اس بات کا کیا جواب دے۔چھوٹا بھائی پھر بولا۔

'بھیا!..... یہ کیسا آسیب سوار ہے تم پر.....تم نے آج تک نہیں بتایا.....'!

امریکہ جانے والے ایک ہمسفر نے سکیورٹی چیکنگ کے لیے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ زور سے پکڑا۔

'جلدی کرو.....دیر ہو رہی ہے.....گیسٹ کو گڈ بائی کہو.....!'

'خدا حافظ بھائی.....فی امان اللہ..... بھائی.....!'

اس کا بھائی خوف و دہشت کا تاثر لیے جا رہا تھا۔ لگا تار وہ اس کی پیٹھ کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔

'بھیا! اس خبیث سے چھٹکارا حاصل کرو ..... جیسے بھی ہو.....!''

جاتے جاتے اس نے پکار پکار کر کہا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔''

یہ دوری دراصل معاشی دوری ہے، جو اپنے ہی بھائی سے اسے بیگانہ بنائے ہوئے ہے۔ غریب بھائی بھری جوانی میں جو 'کوبڑ' کا شکار ہے دراصل یہ 'کوبڑ' معاشی اور اقتصادی ہے۔ میں نے افسانے کے محتویات کو بہت بھونڈے طریقے سے بیان کر دیا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ شوکت حیات نے جس فنی گرفت کے ساتھ اس موضوع کو برتا ہے وہ ان کے فن اور فکر کے ارتفاعی کیف کا پتہ دیتا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اس افسانے نے مجھے کئی دن بے چین رکھا۔ اس نے میرے ذہن پر ایک ایسا نقش قائم کیا جو جوانی کے دنوں میں فلم ''دیوداس'' سے مرتب ہوا تھا۔

شوکت حیات نے معاشی تنگ دستی کے کئی افسانے تخلیق کئے ہیں۔ ''مسٹر گلیڈ'' کچھ ایسی ہی کیفیت کا افسانہ ہے۔ پیسے کی ریل پیل سے تو سبھی خوش رہتے ہیں، بھائی، بہن، بیوی، بچے وغیرہ لیکن اگر حالات مختلف ہوں تو پھر کیسی تصویر سامنے آتی ہے، سوچنے کی بات ہے۔ مسٹر گلیڈ ایسی ہی تصویر ہیں۔ ایک تنگ دست دوسروں کی نظروں میں ہی اوچھا نہیں وہ اپنے بیوی اور بچوں کی نظروں سے بھی گر جاتا ہے لیکن وہ کر بھی کیا سکتا ہے؟

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

تو یہی صورت یہاں پیدا ہوتی ہے۔ متعلقہ شخص یعنی مسٹر گلیڈ خواب اور زندگی کی سزا کو ہنستے ہوئے جھیل جاتا ہے۔ یہ اپنے محتویات کے اعتبار سے ایک مابعد جدید رویہ کا افسانہ ہے۔ اس سے ناخوشگوار حالات میں زندگی جینے کا ایک سبق ملتا ہے۔

شوکت حیات نے مختلف طریقے پر مسلمانوں کی زبوں حالی، ان کا انتشار، فرقہ پرستی کے نتیجے میں ان کا المیہ، اپنے وطن سے ہجرت کے بعد وطن واپس لوٹنے پر ان کی بے سروسامانی اور لیڈر شپ وغیرہ جیسے موضوعات کو فنی طریقے سے تخلیقی جہات دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں ''پھسنڈا''، ''تفتیش''، ''بلی کا بچہ''، ''گھڑیال''، ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ''، ''بیگانگی''، ''گنبد کے کبوتر'' وغیرہ قابل مطالعہ ہیں اور شوکت حیات کی تخلیقی صلاحیت کے آئینہ دار بھی۔

''پھسنڈا'' میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ہندو مسلم مشترکہ کلچر کا شعوری زوال کس طرح ہوا؟ معصوم انسان تو لاگ لپٹ نہیں رکھتے۔ ان کا دل دردمند ہوتا ہے پھر ایسے مظلومین کے اندر تبدیلی کیسے آئی۔ سمجھنا چاہئے کہ جب حالات ناخوشگوار ہوتے ہیں تو ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔ شوکت حیات نے اپنے افسانے ''پھسنڈا'' میں صرف اس مسئلے کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ نکسل آندولن کو بھی ذہن میں رکھا ہے جس کے انتشار کی وجہ یہ تلاش کی گئی کہ نکسلی آپس کے بھید بھاو کا شکار ہوئے اور انقلاب کا مقصد ان کے ذہن سے اوجھل ہو گیا۔ ذاتی معاملات نے مرکزیت اختیار کر لی۔ پھر خود غرضانہ عوامل نے بعض انقلابیوں کے لئے غنڈہ گردی کی راہ ہموار کر دی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ایک ایسی تنظیم جس کے مقاصد ارفع و اعلیٰ تھے، کس طرح پراگندگی کا شکار ہو کر استحصال کی راہ اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے امور کو ایک افسانے میں سمیٹنا آسان نہ تھا لیکن شوکت حیات ایسی نیم سیاسی، نیم انقلابی تحریک کو ایک موثر اور حقیقی شکل دینے میں کامیاب ہوئے، یہ بڑی بات ہے۔ اسی طرح ''تفتیش'' فرقہ وارانہ فساد کے اسباب و علل کی تفتیش پر مملو افسانہ ہے اور کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ افسانہ ''بلی کا بچہ'' میں ہندستان کے Lower middle class کے انسانوں کی معاشی، ثقافتی اور انسانی جدوجہد کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' میں ہندو فرقہ پرستی کے مکروہ چہرے کی شناخت کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہماری آئندہ کی نسل کو اپنی حفاظت خود کرنی ہے محض سپر ڈالنے سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے متشدد صورت حال کا مقابلہ ایسی ہی جوابی صورت سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں شوکت حیات نے عام جدوجہد کرنے والوں کو جس طرح terrorist کہہ دیا جاتا ہے، اسے بھی رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقریباً یہی کیفیت افسانہ ''پاؤں'' میں بھی ملتی ہے۔ نقطۂ نظر یہ ہے کہ نئی نسل پر ہندستان کی تقسیم کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ لہٰذا اس باب میں اس نسل کے ساتھ ناانصافی ہوگی تو وہ اس کے ساتھ لوہا بھی لے گی اور اب یہ کیفیت پیدا بھی ہو چکی ہے۔ افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' کی آخری سطور دیکھئے :

''کال بیل بجانے پر بیوی نے دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی لگیں۔ جیسے بہت دیر سے روتی رہی ہو۔

'کیا حال ہے میرے پھولوں کا.....؟'

'خود دیکھ لو جا کر...!'

بچے اپنے بستروں میں گہری نیند میں مبتلا تھے۔ سب کے چہرے پر ایسی اذیتیں جیسے کوئی بہت ڈراونا اور تکلیف دہ خواب دیکھ رہے ہوں.....آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا... اس کے جسم میں کاٹو تو لہو نہیں۔ بالکنی کے کھلتے ہی وہاں کے

ٹوٹے پھوٹے منتشر حال زار نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ نُچے ہوئے پھول، موزائک کے فرش پر مسلی کچلی بکھری ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں.....ٹوٹے پھوٹے گملوں کی مٹیوں کے جابجا ڈھیر..... گوریوں کے گھونسلوں کے منتشر تنکے..... گوریوں کا کوئی پتہ نہیں تھا.....گلہری، تتلیاں اور بھنورے تو اب ایک مدت تک دکھائی نہیں دیں گے.....اس کی بالکنی کا سارا حسن ملیا میٹ ہو چکا تھا۔

آخر بچوں نے اپنے کھیل میں میرا سب کچھ.....اس کا اندیشہ صحیح نکلا۔ اس دن اپارٹمنٹ میں گھسے سانپ کو چند بچوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اس سے کھیلنے کے خطرناک عمل کے عادی ہو گئے تھے۔ اسی لئے تو بچّے اتنے زہریلے اور وحشی ہو گئے تھے۔

آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے اماں کی تلاش اور کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکر کاٹ رہا تھا۔

بیوی سے اس کی نگاہیں ملیں تو اسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میت پڑی ہے اور باہر کرفیو میں اس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔''

''گنبد کے کبوتر'' ایسے تمام افسانوں کے پس منظر میں مطالعہ کیا جائے تو بابری مسجد کے انہدام کے بعد کی فضا اور اس کا Pathos از خود واضح ہو جائے گا۔ لیکن بنیادی Theme اس کی شہادت کے بعد اس پر بسیرا کرنے والے کبوتروں کا ہے جو شام کے وقت لوٹتے ہیں تو ان کا آشیانہ موجود نہیں ہوتا۔ ان کبوتروں پر کیا گزری؟ سوچنے کی بات ہے۔ کبوتروں اور مسلمانوں کو یکجا کیجئے تو افسانے کی قماش، نہج اور اثر پزیری از خود نمایاں ہو جائے گی۔ مفہوم یہ ہے کہ شوکت حیات کسی ایک موضوع میں بند نہیں۔ ان کا خلاقانہ ذہن اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مسائل کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ انہیں فکر و فن کی راہ دے کر تخلیقی Vision میں مبدل کرنا بھی جانتا ہے۔ ایسے میں ان کے موضوعات کا تنوع جس طرح سامنے آتا ہے اور فکر کا Prospective جتنا وسیع ہو جاتا ہے وہ دیدنی ہے۔

شوکت حیات کی افسانہ نگاری کے بعض پہلوؤں سے گفتگو کرتے وقت Situation series کے افسانوں پر بھی ایک نگاہ ڈالنی چاہئے۔ وہ ان افسانوں کے بارے میں خود لکھتے ہیں :

''میں نے سچوئیشن سیریز کی کئی کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ جن میں سے کچھ شائع ہوئی ہیں۔ سچوئیشن ۱/ (''شب خون''، الہ آباد، شمارہ نمبر ۹۶) سچوئیشن ۲/ (''تحریک''، دہلی مئی ۷۵ء)، سچوئیشن ۳/ (''نشانات'' مالیگاؤں، شمارہ نمبر ۸)

سچوئیشن ۴/ (''الفاظ''، علیگڑھ، شمارہ نمبر ۶)، سچوئیشن ۵/ (''اظہار''، بمبئی، تیسری کتاب) اور اب سچوئیشن ۶/ ''جواز'' میں۔

ایک طرح سے قارئین میری تمام کہانیوں کو اور شاید یہ تمام افسانہ نگاروں کی تمام کہانیوں کو سچوئیشن سیریز کی کہانیاں کہہ سکتے ہیں لیکن نکتہ یہ ہے کہ میں اپنی بعض کہانیوں کو ہی اس سیریز کے تحت کیوں پیش کر رہا ہوں؟ کون سے عناصر ہیں جو کہانی کو سیریز میں قاریوں پر سوالات کی بوچھار کرنے کے لئے لا کھڑا کرتے ہیں۔

آج کے پیچیدہ ادبی تقاضوں کے درمیان میں سوالات گمبھیر ہیں۔ جن کے گمبھیر جوابات شاید رواداری میں ممکن نہیں۔ ان پر مجھے، میرے ہمعصر اور پیش رو افسانہ نگاروں اور آج کے صحیح افسانوں کے تمام سنجیدہ قارئین کو تخلیقی سطح پر سوچنا ہے..... مستقل سوچتے رہنا ہے۔''

گویا سچوئیشن کے افسانے ایسے تخلیقی سوالنامے ہیں جو صرف پڑھنے والوں کو ہی نہیں لکھنے والوں کے سامنے بھی کتنے ہی سوالیہ نشانات کھڑے کرتے ہیں۔ اس باب میں میری رائے قدرے مختلف ہے۔ میں نے بلراج مین را کے افسانوں کے سرسری ذکر میں ان کی سچوئیشن کی کہانیوں کی طرف توجہ کی تھی۔ مجھے تب احساس ہوا تھا کہ یہ وہ افسانے ہیں جو کسی ایک سچوئیشن کو شعری احساسات سے ہمکنار کر دیتے ہیں اور یہ احساسات بڑے Sublime ہوتے ہیں۔ مجھے شوکت حیات کے افسانوں میں ذو جہتی کیفیتوں کا احساس ہوا۔ ایک طرف تو شوکت حیات اس امر میں کامیاب ہیں کہ سوالات کھڑے کریں تو دوسری جانب وہ ہر افسانے کو ایک مکمل اکائی دینے میں بھی کامیاب ہیں۔ یہ اکائی زندگی کے کسی مسئلے سے متعلق ہو کر تخلیق کی ایک قاش بن جاتی ہے۔ مجھے سوالات سے زیادہ سروکار نہیں ہے لیکن ان میں جو تکمیلیت کا پہلو ہے وہ میرے لئے نہایت قیمتی ہے۔ اس پس منظر میں شوکت حیات کے متعلقہ افسانے طویل تجزیے کے متقاضی ہیں جس کا یہاں موقع نہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شوکت حیات کے افسانے فکری اور فنی افسانے کے ارتقاعی کیف کی مثالیں ہیں جن میں زندگی کی دھڑکنیں ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ایک انقلابی ذہن میں کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہو سکتی ہے اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں---اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔

● وارث علوی

شوکت حیات کی افسانہ نگاری

مئے خانۂ ادب میں ترقی پسند تحریک ساغر کا وہ دور تھا کہ نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی۔ اس تحریک کے ساتھ تاریخ ادب میں ادوار ابواب ختم ہوئے اور شاعر و ادیب دہائی کی رضائیوں سے برآمد ہونے لگے۔ شوکت حیات کا نام ۷۰ء کی دہائی میں نمایاں ہوا جو جدیدیت کی لائی ہوئی علامت پسندی، تجریدیت اور اسطور پسندی کے ادھ کچرے تصورات سے کھد بدا رہی تھی۔ نئے لکھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان تصورات کے تحت کس نوع کے افسانے لکھیں۔ ان باریکیوں کا علم ان نقادوں کو بھی نہیں تھا جو ڈھول توانِ تصورات کا پیٹ رہے تھے لیکن کام کلاسیکی ادب پر، میر کے اشعار پر، داستانوں پر، اور لسانیات پر کر رہے تھے۔ بہرحال نظریاتی کنفیوزن کے باوجود اس دہائی سے چند افسانہ نگار ایسے نکلے جنہوں نے علامتی، تجریدی اور اسطوری افسانوں کی اچھی مثالیں قائم کیں۔ بہت سے تھے جو ٹیگوریت، خلیل جبرانیت اور ادب لطیف کے دلدل میں ایسے پھنسے کہ کسی نے اُن کا سراغ پانے کی بھی سعی نہ کی۔ انہیں گم راہ کیا اس تصور نے کہ افسانہ تو تھرڈ کلاس صنفِ سخن ہے اور صرف شاعری اُم الفنون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے افسانہ نگاروں سے اغماض برتا اور اُن شعراء پر لکھتے رہے جو اُن کی تنقیدوں میں زندہ ہیں۔

شوکت حیات اُن جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پروا کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہِ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔

شوکت حیات سے میں زندگی میں صرف ایک دو بار ملا ہوں۔ سمیناروں میں بس یا کار میں اُن کے قریب سیٹ ملی گئی تو ہم سفر ہو گئے یا کھانے کی میز پر ساتھ ہوا تو ہم نوالہ کہلائے۔ اُن سے خط و کتابت بھی نہیں رہی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر یا انجنیئر بن سکتے تھے کیونکہ بورڈ میں بہت اچھے مارکس سے پاس ہوئے تھے۔ لیکن افسانہ نگاری کا شوق انہیں اس طرف کھینچ لایا۔ میرا جی چاہا کہ انہیں چیخوف اور سامرسٹ مائم کی مثالیں دیتا جو ڈاکٹر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی ہمارے زمانہ کی درخشاں مثال سید شیر شاہ ہیں جو ڈاکٹر بھی ہیں۔ سوشیل ورکر بھی اور بے مثال افسانہ نگار بھی۔ شوکت حیات نے مجھے بتایا کہ انہوں نے لگ بھگ

سو افسانے لکھے ہیں۔ میں ہمیشہ ان سے جب بھی موقعہ ملتا کہتا کہ افسانوں کا مجموعہ شائع کرائے۔ میرے اس سیدھے سادے سوال کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ خاقانی کے کسی شعر کی شرح معلوم ہوتا تھا۔

شوکت حیات آدمی ذرا ترنگی بھی ہیں اور ضدّی بھی اب وہ افسانے شائع کرانے پر راضی ہو گئے تو بضد ہیں کہ پہلے مجموعے کا دیباچہ خاکسار ہی لکھے۔ وہ بھی اس وقت جب کہ میں ریڑھ کی ہڈی کی ایسی بیماری میں مبتلا ہوں کہ بیٹھ کر دو حرف لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب میری بھی ایک بدعادت یہ ہے کہ دیباچہ وغیرہ میں مجھ سے بات نہیں بنتی اگر میرے سامنے افسانہ نگار کے تمام افسانے ہوں، تو اُن پر ایک مضمون لکھ سکتا ہوں۔ میری یہ مجبوری میں شوکت حیات کو بتانا چاہتا تھا لیکن ریڑھ کی ہڈی کے ایک لشکارے نے یہ بات مجھے سمجھائی کہ اس وقت کہ ''من وگرز وافراسیاب'' کہنے کی سکت بھی مجھ میں نہیں رہی۔ افسانہ کے اس دماوند کو میں کیسے عبور کروں گا۔ چنانچہ دیباچہ کو ہی لبیک کہنے میں عافیت نظر آئی۔

شوکت حیات کو زبان اور بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ ان کے معمولی افسانوں میں بھی یہ حسن برقرار رہتا ہے۔ ان کی نثر بڑی ہموار ہے۔ ایک کے بعد دوسرا جملہ سمندر کی لہروں کی مانند سبک ساری سے آتا ہے۔ بہت سے لکھنے والوں کی زبان میں جو ہکلا پن ملتا ہے اس سے وہ صاف بچ گئے ہیں۔ ان کے یہاں پیچیدگی ہے لیکن الجھاؤ نہیں، اشارے، کنائے اور اجمال ہے جو اہمال سے بارہ پتھر دور رہتا ہے۔ چونکہ اُن کے زیادہ تر افسانے نفسیاتی اور سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا طریقۂ کار حقیقت نگاری ہے لیکن اُن کا تعلق چونکہ اس نسل سے بھی رہا جو علامات اور اسطوریات کی گرویدہ تھی، شوکت حیات نے اس نئے افسانہ کے اثرات قبول کئے ہیں۔ لیکن انہوں نے کسی ایک طریقہ کار سے اپنی وابستگی پیدا نہیں کی کہ وہ پاؤں کی زنجیر بن جاتا۔ لیکن انہوں نے جو بھی طریقۂ کار اپنایا اس سے مکمل انصاف کیا۔ ان کا افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' اردو کے چند بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ بلکہ شاہ کار کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

ظاہر ہے یہ افسانہ بابری مسجد کے انہدام پر ہے اور اس موضوع پر دوسرا اثر انگیز افسانہ جو میری نظروں سے گزرا ہے وہ سید محمد اشرف کا ''دوسرا بن باس'' ہے۔ گنبد جب تک تھا علامت تھا۔ ہماری تاریخ تہذیب اور مذہب کی۔ اب نہیں رہا تو ایسا روحانی خلا پیدا ہو چکا ہے جس کی ماہیت کا بھی ہمیں شعور نہیں۔ اس خلا میں اُن کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز گونجتی ہے جو گنبد کے نہ ہونے سے بے سہارا ہو گئے ہیں۔ کبوتروں سے قطع نظر آدمی کا بے سہارا پن ایسے دور و دراز اندیشوں کو جنم دیتا ہے کہ وقت کے بہاؤ میں اس کی شکستہ کشتی کو کوئی کنارا مل سکے گا یا نہیں۔ یا پھر یہ ہولناک انجام کا آغاز ہے۔

واحد متکلم کے فلیٹ کے پہلو والے فلیٹ میں رہنے والے سین دادا، جو اسے لیکر مسٹر تھامسن کے یہاں جاتے ہیں جہاں شراب کا دور چلتا ہے اور مسٹر تھامسن کی نرادھار نوجوان ملازمہ مرد کے جنسی تشدد کا شکار ہے، یہاں زندگی کا ایک خاکہ بنا ہوا ہے جو جبلتوں کا تراشیدہ ہے۔ واحد متکلم نہ شراب پیتا ہے نہ اسے ان کی سطحی، چھچھوری زندگی میں کوئی دلچسپی ہے۔ سین دادا اور مسٹر تھامسن کے لئے وقت میں بہاؤ نہیں، ٹھہراؤ ہے۔ جمود ہے۔ اُن کے کائی لگے ٹھہرے پانی میں اور مظلوم ملازمہ کے ساتھ ان کے سلوک میں خارج کا کوئی بھی واقعہ ہلچل پیدا نہیں کرسکتا۔ ایک کبوتر باورچی خانہ میں گھس آتا ہے۔ وہ لہولہان ہے۔ پڑوس کے ایک شخص نے فالج زدہ بڑھیا کے ہاتھ پر کبوتر کا خون ملنے کے لئے اس پر چھری چلائی تھی لیکن کبوتر ہاتھوں کی گرفت سے نکل آیا۔ قدیم بوسیدہ مفلوج عقائد توہمات اور رسم ورواج کو اسی طرح تازہ جوانیوں کا لہو پلا پلا کر زندہ رکھا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں ایک سانپ بھی نکل آتا ہے، جو ان پھنکارتی زہریلی تقریروں کی یاد دلاتا ہے جو اڈوانی جی کی جاترا میں ایک ایک گاؤں کے مجمع کے سامنے کی گئیں۔

اس سانپ کا تعلق ان بچوں سے تھا جو اس کے ساتھ کھیل کر شاید اب واحد متکلم کے فلیٹ میں سو رہے تھے۔ کیچ دیم ینگ یا ان بچوں کو کم سنی ہی میں اپنے زیر اثر لے آؤ۔ یہ نعرہ آر ایس ایس کا بھی ہے او رطالبان کا بھی۔

واحد متکلم اندر سے ایک ہرا بھرا آدمی ہے۔ جمالیاتی شخصیت کا مالک۔ انسان دوست۔ درختوں، پودوں، پھولوں اور قسم قسم کی چڑیاؤں اور پرندوں سے محبت کرنے والا۔ اس نے اپنے فلیٹ کی بالکنی پر گملوں میں پھولوں کے پودے لگا رکھے ہیں اور پنجروں اور ڈربوں میں پرندے پال رکھے ہیں۔

جب واحد متکلم اپنے فلیٹ پر پہنچتا ہے تو دوسرے فلیٹوں کے بچّے اس کے فلیٹ میں گہری زہریلی نیند سو رہے ہوتے ہیں اور بالکنی میں تمام گملے اور ان کے پودے اور پھول ٹوٹے پڑے ہوئے ہیں اور خوبصورت پرندے یا تو زخمی ہیں یا اڑ گئے ہوتے ہیں۔

ہر فساد کے بعد یہی تو ہوتا ہے۔ لوگ اس طرح رہتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پورا افسانہ حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ لیکن گلے تک علامت کے پانیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔

شوکت حیات کے یہاں ایسے کتنے ہی افسانے ہیں جن کا حسن اور معنویت کو اجاگر کرنے کے لئے جزرس مطالعہ اور تجزیہ کی ضرورت ہے۔ قاری اساس تنقید کو شوکت حیات کے افسانے نکتہ رس مطالعہ کے لئے صلائے عام ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ شوکت حیات کے یہاں نئے تجربات اور اجتہادات میں

دلچسپی ہے لیکن پابستگی نہیں۔ اسی لئے اُن کے یہاں ایک ہی رنگ کے افسانے نہیں ملتے۔ اُن کے افسانوں میں موضوع اور طرزِ بیان کا کافی تنوع ہے۔

مثلاً اسی موضوع یعنی فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات پر ایک افسانہ ہے جس کا عنوان ہے ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' پورا افسانہ حقیقت پسند بیانیہ میں لکھا گیا ہے۔ علامت اور اسطور کا دور دور تک پتہ نہیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار ہے عبدالمنان۔ جو ایک بہت ہی عسرت زدہ مزدور ہے جسے کارخانوں میں کام ملتا ہے اور نہیں بھی ملتا۔ یہ مزدور اس زمانہ کا ہے جب کہ دیس میں مزدور تحریک طاقتور تھی، اور عام مزدور بھی طبقاتی کشمکش، انقلاب، روس اور چین کی باتیں کرتے تھے۔ افسانہ میں رجنی پام دت کا ذکر بھی ہے جو عبدالمنان پڑھتا ہے۔ اس زمانہ میں مزدور مختلف علاقائی زبانوں میں ترجمہ شدہ رجنی پام دت کی کتاب پڑھا کرتے تھے۔ عبدالمنان کی بیوی بچے دوسرے شہر میں ہیں اور ان سے ملنے کے لئے عبدالمنان بے چین رہتا ہے۔ اس کا دوست اس کے لئے قرض پر پیسوں کا بندوبست کرتا رہتا ہے۔ عبدالمنان اپنے بچوں کے لئے کھلونے خریدتا ہے۔ بہنوں کے لئے شادی کی تیاری کرتا ہے۔ دوسرے روز وہ اپنے دوست کے ساتھ بوٹینیکل گارڈن میں گھومنے جاتا ہے۔ دونوں دوست خوب گھومتے ہیں اور اچھے اچھے کھانے کھاتے ہیں۔ باغ میں وہ اُن دنوں کو یاد کرنے لگا جب وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گھومنے آتا تھا۔ وہ یاد کرتا ہے کہ اس کا بچہ کیسے ہاتھی پر بیٹھا کرتا تھا۔ وہ ماضی کی یادوں کو حال کے آئینہ میں دیکھتا ہے اور اب یہ حال ایک ہی دن کے بعد مستقبل کی زندہ حقیقت بن جائے گا۔

شہر کی فضا میں کشیدگی ہے کیونکہ گنبد گر چکا ہے۔ باغ میں لوگ آہستہ آہستہ کم ہو رہے ہیں۔ دوست چاہتا ہے کہ عبدالمنان سفر کا ارادہ ترک کردے۔ لیکن عبدالمنان تو شوکت حیات کے ایک اور افسانہ ''تفتیش'' کے آفتاب خان کی مانند نہ صرف سیکولر مزاج کا ہے بلکہ ریڈیکل ہونے کے سبب بابری مسجد کے منہدم ہونے پر افسوس کرنے کی بجائے الٹا کہتا ہے کہ ماضی میں مسلمان حکمرانوں نے جو کچھ زیادتیاں کی تھیں۔ انہیں بھی یاد رکھنا چاہئے۔ باغ میں آنے والے لوگ ہراساں گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ اس کا دوست چاہتا ہے کہ وہ سفر کا ارادہ ملتوی کردے۔ عبدالمنان کے چہرے پر بھی خوف ہے۔ لیکن جیب میں ریل کا ٹکٹ اور خریدے ہوئے تحائف بھی ہیں۔ اس کا دوست اسے سٹیشن چھوڑنے جاتا ہے۔ اور ٹرین روانہ ہوجاتی ہے۔

شوکت حیات نے افسانہ کے آخری جملہ میں سعادت حسن منٹو ہی کی طرح غیر متوقع انجام کی کاری ضرب لگائی ہے۔ اور یہ جملہ بھی ایک ہولناک حقیقت کا استعارہ ہے۔ جملہ یہ ہے:

> ''اور ٹرین اس علاقہ کی طرف روانہ ہوجاتی ہے۔ جہاں انسانی اجسام پھول گوبھیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں''

افسانہ کے غیر متوقع انجام کے متعلق جان اپڈائک (John Updike) نے لکھا ہے کہ وہ پیر کے تلئے کا بہت بڑا Enlarge کیا ہوا فوٹو کی مانند ہونا چاہئے۔

دیباچہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ شوکت حیات کے تمام اچھے افسانوں کی فنکارانہ پیچیدگیوں کو اجاگر کیا جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شوکت حیات کے اچھے افسانے کرداروں کی انفرادیت، فضا بندی اور پلاٹ کی نہایت نازک پیچیدگیوں کے حامل ہیں۔

خاطر نشان رہے کہ شوکت حیات کے یہاں صاف ستھرے سیدھے سادے افسانے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ''بلی کا بچہ'' پورا افسانہ سہل ممتنع ہے (پتہ نہیں شاعری کے صیغہ کی یہ اصطلاح افسانوں کے تذکرے میں کتنی موزوں اور مناسب ہے)۔ لیکن یہ افسانہ دل کو چھوتا ہے خصوصاً اس کا انجام۔ شوکت حیات کے یہاں سادگی ہے لیکن پیش پا افتادگی نہیں۔ فنکارانہ دروبست ان کے ایسے افسانوں میں بھی ملتا ہے جو مجھ جیسے پڑھنے والوں کے لئے بظاہر تو دلچسپ لیکن بہ باطن کمزور ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کا افسانہ ''مادھو'' جو پریم چند کے افسانے کفن کی پیروڈی ہے۔ ایک اچھی پیروڈی کفن پر شفق نے لکھی ہے۔ پیروڈی اور بین المتونیت ما بعد جدیدیت کی لائی ہوئی اصطلاحیں ہیں۔ مادھو مجھے اس لئے پسند نہیں کہ شروع میں جنسی تلذذ سے کام لیا ہے اور آخر میں فلمی انداز کا تھرل ہے جب مادھو جاگیردار کے خوں خوار کتے کے ساتھ رضائی لے کر لڑتا ہے اور دس ہزار کا انعام جیت جاتا ہے۔ بہت سے نقاد فیشن پرستی کا شکار ہو کر ایسے افسانوں کی تعریف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں پیروڈی یا بین المتونیت کے جلالی الفاظ برقانی بچہ کو بھی گل گودنا بنا دیں گے۔

◄◄ ● ►►

نئی کتابیں

نام کتاب : گدی برادری کے چار اہم قلمکار مصنف و ناشر: ڈاکٹر رونق شہری سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت : ۳۰۰ روپے	نام کتاب: نذیر احمد یوسفی شخصیت اور فن مرتبہ: ڈاکٹر صابرہ خاتون 'حنا' سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت : ۲۲۰ روپے
نام کتاب: میرے والدین مصنف: صفدر امام قادری سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت: ۲۵۰ روپے	نام کتاب: نامے (عارف نقوی کے نام مشاہیری کے خطوط) ترتیب و انتخاب: پروفیسر اسلم جمشید پوری سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت: ۴۰۰ روپے

● فاروق ارگلی

شوکت حیات کا فن

ہمارے عہد کے بلند مرتبہ افسانہ نگار شوکت حیات کی فنی اور تخلیقی حیثیت و اہمیت پر بات شروع کرنا ہو تو وارث علوی مرحوم سے بہتر تمہید ممکن نہیں کہ ''مئے خانۂ ادب میں ترقی پسند تحریک ساغر کا وہ دور تھا کہ نکلے جو میکدے سے تو دُنیا بدل گئی۔ اس تحریک کے ساتھ تاریخ ادب میں ادوار، ابواب ختم ہوئے۔ شاعر و ادیب دہائی کی رضائیوں سے برآمد ہونے لگے۔ شوکت حیات کا نام ستر کی دہائی میں نمایاں ہوا جو جدیدیت کی لائی ہوئی علامت پسندی، تجریدیت اور اسطور پسندی کے اَدھ کچرے تصورات سے کھد بد ارہی تھی، نئے لکھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان تصورات کے تحت کس طرح کے افسانے لکھیں، ان باریکیوں کا علم ان نقادوں کو بھی نہیں تھا جو ڈھول تو ان تصورات کا پیٹ رہے تھے لیکن کام کلاسیکی ادب پر، میرؔ کے اشعار پر، داستانوں پر اور لسانیات پر کر رہے تھے۔ بہر حال نظریاتی کنفیوزن کے باوجود اس دہائی سے چند افسانہ نگار ایسے نکلے جنھوں نے علامتی، تجریدی اور اسطوری افسانوں کی اچھی مثالیں قائم کیں، بہت سے تھے جو ٹیگوریت، خلیل جبرانیت اور ادبِ لطیف کے دلدل میں ایسے پھنسے کہ کسی نے ان کا سراغ پانے کی بھی سعی نہ کی۔ انھیں گمراہ کیا، اس تصور نے کہ افسانہ تو تھرڈ کلاس صنفِ سخن ہے اور شاعری اُمّ الفنون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے افسانہ نگاروں سے اغماض برتا اور ان شعراء پر لکھتے رہے جو ان کی تنقیدوں میں زندہ ہیں۔ شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہِ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ خود اپنا راستہ بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے بھی خود ہی ایجاد کرتے ہیں۔''

وارث علوی صاحب نے یہ باتیں شوکت حیات کے افسانوی مجموعے 'گنبد کے کبوتر' کے پیش لفظ میں کہی تھیں، لیکن اس کتاب کے سرورق کی پشت پر ناشر کی طرف سے جو نوٹ درج ہے وہ بھی اس قدر حقیقت پسندانہ اور دانشورانہ ہے کہ چاہے یہ کسی نے بھی لکھا ہو لیکن شوکت حیات کو پڑھنے والے ہر باشعور قاری کو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خود اس کے دل کی آواز ہو:

''۱۹۷۰ء کے بعد کے اس اہم ترین اور ذہین افسانہ نگار شوکت حیات جنھوں نے روایت پسندی سے گریز کیا، ترقی پسندی کی خارجیت پسندی اور جدیدیت کی داخلیت پسندی کے اکہرے پن اور انتہاؤں سے

برأت کرتے ہوئے فرد کو اس کے سماجی و ثقافتی پس منظر اور سچویشن کے حصار کی بندشیں جھیلتے ہوئے مکمّلیت میں دریافت کرنے کی سعی کی ہے۔ شوکت حیات کے افسانے عصر حاضر کے ایسے افسانوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں جو بیک وقت عصری اور آفاقی افسانوں کے آمیزے اور اختصاص و انفراد سے مملو ہیں۔ وقت، سماج، روایت، سیاست، نفسیات، ثقافت اور فکر کی جکڑ بندیوں کو جھیلتے ہوئے افسانوں کی تصویر کشی جس دردمندی کے ساتھ شوکت حیات کے یہاں ملتی ہے، وہ دوسروں کے یہاں نہیں، عصری و آفاقی انسان کی بیچارگی، زندگی کی بے ثباتی اور ناکارگیِ ہستی موضوعات ان کے افسانوں میں نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں جنھیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اس اہم افسانہ نگار شوکت حیات نے ۱۹۸۰ء ۱۹۹۰ء اور نئی صدی میں بھی تازہ کاری اور روانی کے ساتھ اس طرح نئے رنگ و روغن اور نئے خط و خیال میں اپنے افسانے پیش کیے جنھیں پڑھ کر، ان کی دہائیوں کے حصار سے اُٹھ کر اپنی حیثیت و اہمیت دو چند کرانے کا احساس ملتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے افسانوں کو انام، نامیاتی اور جدلیاتی، حرکی، امکانی و فکری افسانے کہتے ہیں۔''

اس میں شک نہیں کہ پریم چند سے شروع ہونے والی مختلف فنی روش و روایات اور محرکات و تحریکات سے خاصے الگ، واحد، منفرد اور اوریجنل افسانہ نگار ہیں جن کا فنی اسلوب فرقہ واریت، طبقہ واریت، بالادستی اور جبر و استحصال کے بدترین سماجی نظام کے استیصال اور دردمند فنکار اور انقلابی مفکر اور مدبر کی صورت میں وہ ایسے ترقی پسند ہیں جو بائیں بازو کے نظریات میں یقین رکھتا ہو، لیکن ان کے یہاں اشتراکیت کی نعرہ بازی اور مبارزت کا شعور و شغب نہیں جس سے ترقی پسندی عبارت ہے۔ فراریت، زخم خوردگی اور شکستگی کا نوحہ و ماتم بھی نہیں، روح و ضمیر کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا احتجاج، جہد و عمل کا خاموش پیغام اور صورتِ حال کے گھنے اندھیروں میں نئے اُجالوں کی بشارت ہے۔ شوکت حیات کے افسانوں میں اشاریت، رمزیت، ایمائیت اور علامت آرائی ضرور ہے۔ تشبیہات و استعارات کی نادرہ کاری بھی ہے لیکن شبخونی تجریدیت کی وہ طلسم سازی نہیں جہاں کہانی غائب ہو جاتی ہے اور ناقابلِ فہم انشا پردازی افسانہ کہلاتی ہے۔ شوکت حیات اُردو افسانے کے عصری منظرنامے پر کسی اتباع و تقلید کے بغیر اپنے نجی رنگ و آہنگ کے ساتھ نظر آئے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ: ''شوکت حیات ہمارے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں، وہ اپنے افسانوں میں ادبیت اور سماجی احساس و شعور دونوں پر اصرار کرتے ہیں، وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے طے شدہ نتائج اور سیاہ و سفید میں بنے ہوئے افسانہ کی روایت سے گریز کرتے ہوئے سچائی کی تلاش اپنے طور پر جاری رکھی اور نئی کہانی کا رشتہ سماجی حقیقتوں سے جوڑا۔''

شوکت حیات سائنس کے طالب علم ہیں، انسانی نفسیات ان کا پسندیدہ موضوع ہے، انھوں نے

انسانی زندگی اور سماج کا سائنٹفک تجربہ کیا ہے اور اپنے گرد و پیش وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کے ساتھ گوناگوں موضوعات پر زندہ اور متحرک افسانے تخلیق کیے۔ موضوعات وہی ہیں جو ہندستانی سماجی نظام میں نت نئی صورتوں میں سامنے آتے رہتے ہیں، ان پر مسلسل لکھا بھی جاتا رہا ہے لیکن یہ اس ذہین فنکار کا کمال ہے کہ اندازِ بیان، ٹریٹمنٹ اور مخصوص زاویۂ نظر ہی اس موضوع میں نئی زندگی اور تازگی کا احساس کراتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرقہ واریت اور عصبیت خاص طور پر تقسیم ملک کے بعد ایک مخصوص بالادست اور فسطائی ذہنیت کے عروج اور کمزور اقلیتی طبقے کی زبوں حالی اس عہد کا بڑا، بلکہ سب سے بڑا موضوع ہے۔ آزادی کے بعد اس موضوع پر بلا مبالغہ لاتعداد افسانے اور ناول لکھے جا چکے ہیں۔ شوکت حیات نے بھی ایک کمزور اور مظلوم طبقہ کا فرد ہونے کے ناطے حالات کی سنگین اور اپنی نظروں کے سامنے پامال ہوتی انسانی قدروں کو دیکھا اور اس بے پناہ کرب و اذیت کو محسوس کیا ہے جو ایک پوری قوم کی تقدیر بن چکا ہے۔ لیکن فرقہ واریت یا فسادات پر ایک صاحبِ ضمیر کشادہ ذہن کتھا کار کے روپ میں شوکت حیات کے افسانے قتل و غارت گری کے ہولناک واقعات کی رپورٹنگ یا رننگ کمنٹری نہیں ہیں بلکہ ایسی مؤثر تخلیق کی صورت میں سامنے آتی ہے جس میں احتجاج و طنز بھی ہے اور غم و بیزاری کا اظہار بھی۔ وہ کسی کا نام نہیں لیتے، کسی کے خلاف زہر افشانی نہیں کرتے، بادی النظر میں کوئی اور کہانی بیان کر رہے ہوتے ہیں اور قاری افسانے کے بین السطور اور مافی الضمیر کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور جیوں جیوں سوچتا ہے تخلیق کا تاثر ذہن و شعور پر گہرا تا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے کئی افسانے ہیں جنھیں اُردو ادب ہی نہیں ہندوستانی بلکہ مشرقی ادب میں اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی ناقابلِ فراموش افسانوں میں ایک ہے 'بھائی'۔ یہ ہندوستان میں پیدا ہونے اور زندگی کرنے والے ان دو طبقوں کی کہانی ہے جنھیں گندی عصبیت اور زہریلی سیاستوں نے ایک دوسرے کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہوئے خوفزدہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ چھوٹی سی کہانی ہے جس میں ایک مسلمان فسادات کے دنوں میں بری طرح خوفزدہ ہو کر ایک ٹیمپو میں سفر کر رہا ہے۔ اسے دوسرے مسافر سے جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے، وہ جیب سے سگریٹ بھی نکالتا ہے تو مسلمان ڈر جاتا ہے کہ اب وہ بظاہر دوسری قوم کا دِکھائی دینے والا شخص ریوالور نکال کر اسے گولی مار دے گا۔ ہم سفر اسے سگریٹ پیش کرتا ہے تو وہ اس ڈر سے انکار کر دیتا ہے کہ کہیں اس میں زہر نہ ہو اور وہ مر جائے۔ پھر وہ لمحہ بھی آ جاتا ہے جب ایک موڑ پر فسادی گروہ ٹیمپو روک کر مسافروں سے کپڑے اُتار کر اپنے مذہب کا ثبوت دینے پر مجبور کرتا ہے، تبھی وہ غیر مسلم شخص ریوالور نکال کر فسادیوں کو بھگا دیتا ہے۔ جب وہ مسلمان اس کا شکریہ ادا کرتا ہے تو ریوالور والے شخص کا یہ کہنا کہ ''میں نے تو بھائی کا فرض ادا کیا ہے''، لیکن پھر اس کا یہ کہنا ''اب تو پئیں گے سگریٹ آپ؟'' یہ چھوٹی سی کہانی صدیوں پرانے ملے جلے تکثیری معاشرے

کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔

ہمارے فساداتی ادب کا ایک اور افسانوی شاہکار 'تفتیش' شوکت حیات کا بے نظیر کارنامہ ہے، یہ نفرتوں میں گھری سیاست کے طوفانوں میں اس ملک کے سوا سو کروڑ باسیوں کی کہانی ہے۔ آفتاب صاحب ایک روشن خیال اور اپنے وطن کی سیکولر اقدار پر راسخ العقیدہ، لیکن انھیں نفرتوں کے موسم میں اپنا گھر اور محلّہ چھوڑنا پڑتا ہے جہاں دوسروں کی اکثریت تھی، لیکن وہ بددل اور مایوس نہیں ہوتے، ان سے سوال ہوتا ہے: ''آفتاب بھائی، پچھلی بات جو طوفان آیا تھا اس نے اچھے اچھوں کے پیر اُکھاڑ دیئے، بستیاں اُجاڑ دیں، یہاں تک کہ آپ جیسے جانباز اور ثابت قدم انسان کو ہی وہ دیار چھوڑنا پڑا، کیا آپ اب بھی اپنے پرانے اسٹینڈ پر قائم ہیں کہ ہمیں یہیں رہنا ہے اور مل جل کر رہنا ہے؟''

''ہاں صاحب! میں آج بھی اپنے پرانے اسٹینڈ پر قائم ہوں، ہمیں یہیں مل جل کر رہنا ہے۔ ساجھے کی سنسکرتی کی ڈور تھامے رہنا ہے اور ہم جائیں گے بھی کہاں، بنگلہ دیش بننے کے بعد جینا مرنا سب یہیں ہے۔ پیٹروڈالر ہمارے مسئلے کا مستقل حل نہیں، مل جل کر رہنے اور شیر وشکر بن کر رہنے میں ہی سب کی عافیت ہے، خود ان کی نجات بھی ہمارے وجود کو مان کر چلنے میں ہی ہے۔''

آفتاب صاحب کہتے ہیں: ''برے لوگوں کے ساتھ اچھے لوگ بھی ہیں جو مدد کرتے ہیں، مرنے والوں کے ساتھ سارے لوگ نہیں مر جاتے ہیں اور زندگی ہر حال میں اپنے آپ کو نارمل بنا لینے کی قوت سے مملو ہے۔''

آفتاب صاحب ایک سوال کرتے ہیں جس میں خوفزدہ اور مایوس ہونے کے بجائے استقامت اور عزیمت کا پیغام دیتے ہیں ''لیکن یہ اچھے لوگ برے لوگوں کے سامنے ڈٹتے کیوں نہیں، فرار کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے سامنا کیوں نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ برے لوگ شخص مٹھی بھر ہیں لیکن زیادہ تر اچھے لوگ مل کر مزاحمت کریں تو کہیں کسی طوفان کے ٹکنے کی امید ہی نہیں، برے لوگوں کے پہلے کے مقابلے میں زیادہ منظّم ہونے کے تناظر کا خیال رکھتے ہوئے میں یہ بھی کہوں گا کہ ہمیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی جانبازی بھی بنائے رکھنی چاہیے اور پھول بانٹنے کی ہمارے سنت صوفیوں کی روایت بھی اپنی جگہ پوری تابندگی سے قائم رہے۔''

تقسیم کا عذاب برصغیر کی تمام قوموں نے بھگتا ہے۔ اس تاریخی المیے پر بہترین کہانیاں لکھی گئی ہیں جن میں شوکت حیات کی 'کوّا' بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ایک نوجوان اپنا گھر، ماں باپ چھوڑ کر سرحد پار کے ملک چلا گیا تھا، لیکن اپنے گھر اور اپنے ماں باپ سے جدا رہنا برداشت نہ ہوا تو بہ ہزار دشواری سرحد عبور کر کے اپنے وطن واپس آ جاتا ہے اور جب اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو ایک اجنبی شخص برآمد ہوتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ اس کے باپ یہاں کے حالات سے عاجز آ چکے تھے اور سب کچھ اونے پونے بیچ کر سرحد

پار چلے گئے۔ چھوٹی سی کہانی کی ایسی علامت ہے جو براہِ راست ذہن کو جھنجھوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

'سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ' بھی شوکت حیات کی ایک کی بے نظیر تخلیق ہے۔ عبدالمنان پردیس کے شہر میں ہے، شہر میں کشیدگی ہے، وہ اپنے دفتر سے چھٹی اور قرض لے کر وطن جانے کے لیے بے قرار ہے۔ اسے اپنا بچہ بہت یاد آتا ہے جو سانپوں سے نہیں ڈرتا جبکہ وہ خود بہت ڈرتا ہے۔ وہ اپنے ہندو دوست کو بتاتا ہے کہ ''تعجب ہے کہ میرے بچے سانپوں سے نہیں ڈرتے، شاید ہمارے عہد کی پیڑھی سانپوں سے نہیں ڈرتی، ہم ہی ہیں جو سانپوں سے خوف کھاتے ہیں۔'' عبدالمنان فسادات کے نازک حالات میں اپنے وطن روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا دوست کہانی کا راوی ہے۔ اس کے بعد وہ نہیں لوٹا۔ وہ جس جس علاقے میں گیا وہاں انسانی اجسام پھول گوبھیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ ضرور زندہ بچ گیا ہوگا۔ ایک مخصوص خواب مجھے پریشان کرنے لگا، چاروں طرف اُونچے اُونچے اسکائی اسکریپر آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، چشم زدن میں ان کے درمیان ایک بچہ نمودار ہوتا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ جوان ہوتا ہے اور مجھے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتا ہے ''ہیلو انکل وی مسٹ بی ہیئر اِن انڈیا۔'' اس کے ہاتھوں میں ہتھیار ہے، دور کہیں سے دھماکوں کے درمیان اُونچی اُونچی بلڈنگوں کے زمین دوز ہونے کی آوازیں آ رہی ہیں، میں اس کے چہرے پر غور کرتا ہوں، اس کے چہرے کے نقوش میں عبدالمنان کی نمایاں جھلک ہے۔ وہی سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، میں امن پسند اور روشن خیال شہری ہوں، اس بچے سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔''

ہندوستان کی مسلم اقلیت آزادی کے بعد سے اب تک جانے کتنے المیوں کی شکار ہوئی ہے، تازہ ترین سب سے بڑا گھاؤ بابری مسجد کی شہادت ہے۔ اس سانحۂ عظیم پر 'گنبد کے کبوتر' جیسا علامتی فلسفیانہ افسانہ لکھ کر شوکت حیات نے اُردو افسانہ نگاروں کی اب تک کی سب سے اگلی صف میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو ہمعصروں میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ کہن سال مسجد کے گنبد پر بسیرا کرنے والے کبوتر مسجد کی شہادت کے بعد اپنے آشیانوں کو لوٹتے ہیں تو وہاں سب کچھ مٹ چکا ہوتا ہے۔ آشیانے سے محروم کبوتروں پر کیا گزری؟ بقول وہاب اشرفی: ''سوچنے کی بات ہے، کبوتروں کی جگہ مسلمانوں کو یکجا کیجیے تو افسانے کی نہج اور اثر پذیری از خود نمایاں ہو جاتی ہے۔ ٹریٹمنٹ اور بیانیہ کہانی کو ادبِ عالیہ بنا دینے کے لیے کافی ہے، یہ افسانہ شوکت حیات کی پہچان بن چکا ہے۔

انسانی معاشرے کی ناہمواریوں، ستم ظریفیوں اور تلخ ترین حقیقتوں پر شوکت حیات کے بعض افسانے ناقابلِ فراموش اور اپنی نظیر آپ ہیں۔ مثال کے طور پر 'کوبڑ' جو دو بھائیوں کی کہانی ہے، ایک بھائی کسی طرح غیر ملک چلا جاتا ہے اور دولت مند بن جاتا ہے۔ اسے اپنے وطن کی ہر چیز بیک ورڈ لگتی ہے،

غریب بھائی اپنے گھر پر ہی محنت مشقت کر کے گھر بار چلاتا ہے۔ امیر بھائی کسی کام سے دہلی آتا ہے، اس نے اطلاع دی تھی کہ فرصت نہ ملنے کی وجہ سے گھر (یعنی بہار میں واقع ایک گاؤں) نہیں آسکے گا، فلاں تاریخ کو اس کی فلائٹ ہے۔ ممتا کی ماری ماں بیٹے کو کچھ روپے دے کر دہلی جانے کو کہتی ہے تاکہ وہ اسے دیکھ سکے اور ہوائی اڈّے سے رخصت کر سکے۔ غریب بھائی بڑی مشکل سے دہلی پہنچتا ہے لیکن یہاں اس کی جیب کٹ جاتی ہے، بھائی سے ملاقات ہوتی ہے۔ خودداری کی وجہ سے بھائی سے یہ نہیں کہہ پاتا کہ اس کے پاس واپسی کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ فلائٹ شام کو ہے، بھائی شام تک اپنے غیر ملکی دوستوں وغیرہ کے لیے ہزاروں روپے کے تحائف خریدتا ہے لیکن بھائی کی حالت سے بے خبر ہے۔ رخصت ہوتے وقت گلے ملتا ہے تو اس کا ہاتھ غریب بھائی کی پشت پر اُبھرے ہوئے کوبڑ پر پڑتا ہے، تو وہ حیرانی ظاہر کرتا ہے۔ ہوائی جہاز پرواز کر جاتا ہے اور غریب بھائی سوچتا رہتا ہے کہ اب وہ وطن کیسے جائے گا۔ یہ کوبڑ مفلسی اور تمول کے فرق کی علامت ہے جسے شوکت حیات کی اشترا کی فکر اور فنکارانہ تخلیقیت نے بڑی سنگین علامت بنا دیا ہے۔

شوکت حیات نے اب تک ایک سو سے زیادہ افسانے تخلیق کیے ہیں جو ملک و بیرونِ ملک کے مؤقر جرائد میں شائع ہو کر قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔ راقم الحروف اُردو کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہے، اس حوالے سے اس کی ایک چھوٹی سی رائے بھی ہے کہ شوکت حیات کی چند ایک کو چھوڑ کر ہر تخلیق ان کی فکری وفنی خصوصیات سے آراستہ ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ شوکت نے اب تک جو بھی لکھا پوری ذمہ داری سے اور چھان پھٹک کر اپنے اسلوب، معیار اور تخصص کو برقرار رکھنے کی کوشش کے ساتھ لکھا ہے اور اپنے اس مرتبے پر حرف نہیں آنے دیا جو ادبی سفر کے آغاز سے انھیں حاصل ہو چکا تھا۔ شوکت حیات نے انسانی زندگی کے تمام اہم گوشوں میں جھانکا ہے۔ عشق و محبت اور عورت و مرد کے جسمانی رشتوں کے حوالے سے بھی ان کے یہاں دلوں کو چھو لینے والی کہانیاں موجود ہیں۔ شاعری ہو یا افسانہ، حسن و عشق کی حکایاتِ لذیذ و دلپذیر کے بغیر ادھورے ہیں۔ اس ضمن میں شوکت حیات نے 'رانی باغ' لکھ کر ثابت کیا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے اس پہلو پر بھی ایسی تخلیق پیش کر سکتے ہیں جو اپنی قسم کی انوکھی اور نرالی ہو۔ امر پریم کتھاؤں میں واقعی انوکھی اور منفرد یہ کہانی جوانی میں قدم رکھتے ہوئے ایک مسلمان لڑکے اور غیر قوم کی الہڑ لڑکی کے امر پریم کی ہے۔ کھیل کھیل میں لڑکا رحمت اس آزاد باغ کی جھاڑیوں میں فرطِ جذبات سے عملی اظہارِ محبت کر بیٹھتا ہے۔ رانی گھبرا کر بھاگ جاتی ہے، جاتے وقت رانی کی اوڑھنی جھاڑی میں اُلجھ کر پھٹ جاتی ہے، کپڑے کا ایک ٹکڑا جھاڑی میں اٹکا رہ جاتا ہے، جو رحمت کے لیے اس پہلی محبت کی یادگار بن جاتا ہے جسے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور امریکہ میں ملازمت حاصل کرنے، شادی اور بچے ہو جانے سے لے کر بوڑھا ہو جانے تک سینے سے لگائے رکھتا

ہے، اس نے ازدواجی زندگی گزاری مگر رانی کے خیال سے ایک لمحہ بھی جدا نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ بیوی دُنیا سے رخصت ہو گئی، وہ بوڑھا ہو کر رٹائر ہو گیا، بیٹے باروزگار ہو گئے، پھر اسے بیماری لاحق ہو گئی، ڈاکٹروں نے بتا دیا کہ وہ سال دو سال ہی زندہ رہ سکے گا۔ وہ بیٹوں سے ضد کرتا ہے کہ وہ اپنی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہے اس لیے وہ اب ہندوستان اپنے وطن جانا چاہتا ہے۔ بیٹے امریکی معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں، انھیں یہ پریشانی ہوتی ہے کہ باپ کو ہندوستان پہنچانے جانے میں ان کا کتنا نقصان ہو جائے گا۔ یہ مشکل ایک دور کے رشتہ دار کی وطن روانگی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ رحمت اپنے وطن پہنچ جاتا ہے جہاں اسے رانی مل جاتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ رحمت آج تک اس کے دل میں بسا ہوا ہے۔ اس سے نزدیکی کا وہ لمحہ وہ کبھی نہیں بھول سکی۔ اس کی شادی بھی ہو گئی تھی، مگر وہ شوہر کو مطمئن نہیں کر سکی، رحمت سے اس کے تعلق کی بات راز نہیں رہی، اسے اس نام کے ساتھ ہزاروں اذیتیں اور بدنامیاں سہنی پڑیں، شوہر سے الگ ہو کر اپنے بوڑھے ماں باپ کے گھر رہ رہی تھی، دونوں محبت میں سرشار ہو کر آزاد باغ میں بیٹھ کر خوب باتیں کرتے ہیں، ہنستے ہیں، گھومتے پھرتے ہیں، رانی کے گھر والوں کو اب اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہیں کہ ان کی بیٹی کی گویائی واپس آ گئی ہے۔ رحمت کی حالت دن بہ دن اچھی ہونے لگتی ہے۔ امریکی ڈاکٹروں کی رائے غلط ثابت ہونے لگی۔ محبت کی مسیحائی نے اسے نئی زندگی عطا کر دی تھی۔ بوڑھا رحمت اپنا پیار پا کر دُنیا سے بے نیاز ہو گیا۔ گاؤں میں ایک رشتہ دار کے یہاں امریکہ سے فون آتا ہے۔ رحمت کے بیٹے نے باپ کی خیریت معلوم کی تھی، دونوں بھائی باپ کی صحت کی طرف سے پریشان تھے، رشتہ دار نے بتایا ''تم دونوں خواہ مخواہ پریشان رہتے ہو، تمھارے ابو یہاں بڑے مزے میں ہیں، رانی کے ساتھ روزانہ چہل قدمی کے لیے نکلتے ہیں، وہی رانی، اچھا چھوڑو تم نہیں جانتے ہو گے۔ اس وقت تم لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس باغ میں جہاں اچھے اچھے سورما بھی جانے کی ہمت نہیں کرتے، وہ اور تمھارے ابو بچپن کو دریافت کرنے کے سفر میں گامزن ہیں۔''

''ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انھیں آرام کی ضرورت ہے، دو سال سے زیادہ.....'' بیٹے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر کی بات چھوڑو۔ ابھی اللہ کے فضل سے ہٹے کٹے ہو گئے ہیں۔ ان کی جوانی لوٹ آئی ہے۔ ابھی بہت دن زندہ رہیں گے۔''

شوکت حیات کے یہاں زندگی اپنے تمام رنگوں میں جلوہ گر ہے، ان کی تخلیقات میں گھونسلا، میت، اپنا گوشت، مرشد، پاؤں، ڈھلان پر رُکے ہوئے قدم، مسٹر گلیڈ، سرخ اپارٹمنٹ، شکنجہ، بانگ، بلی کا بچہ، فرشتے، چیخیں، سکوت، گھڑیال وغیرہ اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

پریم چند کی لافانی تخلیق 'کفن' کو بین الاقوامی ادب پارہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ 'کفن' ہندوستانی سماج کے ایک طبقے کی پسماندگی اور ذلت آمیز زندگی کی دل دہلا دینے والی کہانی ہے۔ مادھو اور اس کا باپ گھیسو طبقہ وارانہ نظام کے عبرتناک اور شرمناک نمائندے ہیں۔ مادھو کی بیوی جھونپڑی میں دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے اور دونوں باپ بیٹے عورت کی خبر لینے کے لیے نہیں اُٹھتے کیونکہ وہ کسی کے کھیت سے چرا کر لائے ہوئے آلو الاؤ میں بھون کر کھا رہے تھے۔ ان میں سے کوئی وہاں سے اس لیے نہیں اُٹھتا کہ دوسرا زیادہ آلو نہ کھا جائے۔ عورت بدھیا مر جاتی ہے۔ وہ دونوں باپ بیٹے تو قلاش ہیں، گاؤں والے چندہ کر کے پیسے دیتے ہیں، دونوں کفن لانے کے لیے شہر جاتے ہیں اور کفن خریدنے کے بجائے ان کی ترسی ہوئی روحیں پوری مٹھائی اور شراب میں گم ہو جاتی ہیں۔ دونوں نشے میں بدمست ہو کر ہوش کھو دیتے ہیں۔ پریم چند کا یہ افسانہ یہاں ختم ہو جاتا ہے اور سماج کے اس ہولناک المیے کی کسک چھوڑ جاتا ہے۔ اس سے آگے کیا ہو سکتا ہے، اُردو یا ہندی کے بڑے سے بڑے افسانہ نگار نے سوچا بھی نہیں ہوگا، یہاں شوکت حیات کی تخلیقی بصیرت اپنے کمال کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایک انقلابی، تعمیری سوچ 'کفن' کی توسیع کرتی ہے اور 'مادھو' جیسا شاہکار وجود میں آ جاتا ہے۔

پریم چند کا کردار مادھو ہوش میں آنے کے بعد بے منزل کا مسافر ہے۔ اس کے آگے پیچھے مایوسی، شرم اور ذلت کا اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اس کے ذہن میں زمیندار کا وہ خونخوار الشیشن کتا بھونکنے لگتا ہے، مادھو کو اس کتے سے بیحد نفرت تھی، گاؤں کے زمیندار نے اس دن اعلان کیا کہ اس کے کتے سے مقابلہ کرنے والے کو دس ہزار روپے انعام دے گا۔ مقابلہ کرنے والے کو یہ لکھ کر دینا ہوگا کہ اگر وہ کتے سے لڑتے ہوئے مارا جائے تو اپنی موت کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ کوئی انسان اس خوفناک کتے کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ مادھو زمیندار کا یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے، لکھا پڑھی کے بعد مقابلہ ہوتا ہے، مادھو کتے کو مار ڈالتا ہے۔ لوگ اس کی جیت پر نعرے لگا رہے ہیں، اس کے کانوں میں بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی ہیں، وہ حقارت سے ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے جنگل کی طرف کوچ کر گیا۔ وہاب اشرفی کے لفظوں میں: ''پریم چند شاید اس وقت یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ یہ دبے کچلے کردار استحصال کرنے والوں سے لڑ بھی سکتے ہیں۔ شوکت حیات نے ایک طرف استحصال کی کیفیت واضح کی ہے، تو دوسری طرف اس کا بھی احساس دلایا ہے کہ آج کا مادھو جبر اور نابرابری کے خلاف مسلسل ٹکراتے ہوئے آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر جگہ استحصال کرنے والے کتے بھونکتے نظر آتے ہیں لیکن آج کا مادھو اس سے ہراساں نہیں ہے۔ دراصل مادھو کی زندگی کے حالات تو وہی ہیں جو پریم چند کے یہاں تھے لیکن آج کے الٹرا الفٹ ذہن کی انقلابی قوتیں اُبھر چکی ہیں، جن کے سامنے بھونکتے ہوئے کتوں سے خوف نہیں کھاتا بلکہ ان کے بھونکنے کے عمل کو ایک نہ ایک دن خاموشی میں

بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہو یا نہ ہو لیکن 'مادھو' سے یہی سبق حاصل ہوتا ہے۔'' (تاریخ ادب اُردو)

سیّد شوکت حیات یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو کاشی چک گیا کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا وطن مشہور موضع گیلان تھا، ان کے دادا سیّد حفیظ الحق کاشی چک میں آباد ہو گئے تھے جہاں ان کی زمینداری تھی۔ شوکت حیات کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، والد پولیس میں انسپکٹر تھے، ان کے تبادلے بہار کے مختلف مقامات پر ہوتے رہتے تھے اس لیے انھوں نے کئی اسکولوں میں پڑھا لیکن پھر انھوں نے ۱۹۶۷ء میں میٹرک اور سائنس کالج پٹنہ سے انٹر سائنس کے بعد میڈیکل کالج پٹنہ میں داخلہ لیا۔ شروع سے ہی ان کا ذہن سرمایہ دارانہ جبر و استحصال اور غیر منصفانہ نظام کے خلاف انقلابی اور باغیانہ تھا، اسٹوڈنٹ لائف میں ان کا جھکاؤ مارکسوادی اور نکسل تحریک کی طرف ہو گیا جس کا وہ کھل کر اظہار کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میڈیکل تعلیم پوری نہ کر سکے۔ سائنس اور علم و ادب سے دلچسپی اور مطالعہ اور لکھنے کا ذوق کم عمری میں ہی پیدا ہو گیا تھا، اس میں ان کے والد سیّد محفوظ الحق کا فیض شامل تھا جو خود ایک تعلیم یافتہ اور باذوق انسان تھے، ان کی لائبریری بہترین کتابوں اور جرائد کا خزانہ تھا۔ انھوں نے ہی اپنے ذہین بیٹے کو ڈائری لکھنے کی ہدایت دے کر افسانہ نگار بننے کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ والد کا انتقال جلد ہو جانے کی وجہ سے کئی بھائیوں بہنوں کے کنبے کی ذمہ داریاں سنبھالیں، بہار کے محکمہ کوآپریٹو میں ملازمت ملی۔ ۱۹۸۵ء میں بھٹہ نوادہ کے سیّد ابوالحسن صاحب کی صاحبزادی ارشاد پروین سے شادی ہو گئی۔ ایک محنتی اور عملی انسان کی طرح زندگی کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ ہی ان کی افسانہ نگاری کا سفر بھی جاری رہا۔ ۱۹۷۰ء میں پہلا افسانہ 'بکسوں میں دبا ہوا آدمی' ماہنامہ 'کتاب' لکھنؤ میں شائع ہوا۔ صحت مند اور بالغ نظر ادبی شعور نے آغاز سے ہی اپنی تخلیقی سمت کا تعین کر لیا تھا۔ پروفیسر وہاب اشرفی کے مطابق: ''شوکت نے بہت پہلے افسانہ 'بانگ' تخلیق کیا تھا، اس میں بھی امکانی انقلاب کی بشارت تھی، یہ افسانہ اس وقت سامنے آیا تھا جب افسانے کے پلاٹ، کردار وغیرہ منفی صورتیں اختیار کر چکے تھے، لیکن شوکت نے بہت پہلے اس کا احساس کر لیا تھا۔ پلاٹ لیس افسانے یا متشدد قسم کے علامتی افسانے مشرقی مزاج سے لگا نہیں کھاتے، لہٰذا 'بانگ' کو اُردو افسانے کا ٹرننگ پوائنٹ تسلیم کیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ اس میں علامت کا ایک ہلکا سا پردہ ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔'' خود شوکت حیات کا یہ بیان بھی ان کے تخلیقی مزاج اور فنی رویوں کی تفہیم کے لیے اہم ہے:

''جب شعور نے آنکھیں کھولیں تو اپنی تنہائی پسندی اور کم گوئی نے مجھے اپنے اندر پناہ لینے پر مجبور کیا، کم بولنے اور چپ رہنے اور خود کلامی کا سلسلہ بڑھا، باہر کی طرف دیکھا تو سارا معاشرہ کائنات، تہذیبی انداز کو خلا میں گم ہوتے دیکھا۔ ساری دُنیا الٹی معلوم ہوئی جس کو کبھی کبھی سیدھا کرنے کی خواہش مجھے عجیب و غریب وجدانی اور تخلیقی امکانات کی نئی نئی دُنیاؤں کی سیر کراتی، مجھے لگا کہ اس الٹی اور غلط دنیا کو

میرے لیے قبول کرنا ممکن نہیں۔ اپنے اور دُنیا کے درمیان کشمکش کے اس آغاز نے مجھ پر شعلوں کی یلغار کردی۔ شعور کی آنکھیں کھلتے ہی یوں جھلسنے، بھگتنے اور کھولنے کا سلسلہ شروع ہوا، والد کی موت نے ذہنی بے سروسامانی اور عدم تحفظ کے احساس کو بڑھایا۔ ذہن کی تخلیقی آوارہ گردی روایت سے یکسر انحراف کرتی ہوئی کیسے کیسے صحراؤں میں بھٹکنے پر مجبور ہوگئی، اپنے اندر ہی اندر خارج کے ان تمام نامساعد حالات کے لشکر کے ساتھ کوچ کیا تو اپنی ذات میں چھپے ہوئے اننت آدمیوں کا عرفان ہوا۔'' (انٹرویو)

یہ عرفانِ ذات ان کی تخلیقی اور نجی عملی زندگی کے ساتھ ساتھ آگے کا سفر طے کرتا آیا ہے۔ علم و ادب سے روح کی وابستگی کا ہی نتیجہ ہے کہ ۲۰۰۷ء میں اُردو ادبیات میں ایم اے کی سند امتیاز طلائی تمغہ کے ساتھ حاصل کی اور یو جی سی نیٹ میں کامیابی حاصل کی۔ محکمہ کو آپریٹو کی پچیس سالہ ملازمت لالو پرساد یادو کے مشہور چارہ گھوٹالہ کیس کے ساتھ ختم ہوئی جب وہ محکمہ ہی زوال سے دوچار ہوگیا۔ تب سے تصنیف و تالیف، اخبارات، جرائد، ریڈیو، ٹی وی جیسے مشاغل میں پورا وقت گزرنے لگا۔ ڈرامہ اور ناٹک سے تعلق زمانۂ تعلیم سے رہا ہے، کئی ڈرامے لکھے بھی ہیں، اداکاری کی اور سوتر دھار بھی بنے، ان کے ناٹکوں میں 'کانے کا بخار'، 'اندھے کا سپنا'، 'پنکھے والا'، 'گنبد کے کبوتر' اور 'داماد کا چناؤ' بہت پسند کیے گئے، وہ اپنے طنزیہ اور باغیانہ نکڑ ناٹکوں کے لیے بھی عوام میں پہچانے جاتے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

25-Ganesh Park Rasheed Market
Delhi-110051 Mob: 9212166170

نئی کتابیں

نام کتاب : اپنی طبیعت کا ہے الگ موسم شاعر : ڈاکٹر رونق شہری سال اشاعت: ۲۰۱۸ء قیمت : ۱۵۰روپے	نام کتاب: درسیات (تنقیدی مضامین) مصنفہ: ڈاکٹر خالدہ ناز سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت : ۲۵۰روپے
نام کتاب: ڈاکٹر منصور خوشتر کے نام ۵۰ خطوط مکتوب نگار: ڈاکٹر نذیر فتح پوری سال اشاعت: ۲۰۲۲ء قیمت: ۲۰۰روپے	نام کتاب: ہم عصر اردو ناولوں کا اجمالی جائزہ مصنف : ڈاکٹر محمد شارب سال اشاعت: ۲۰۲۲ء قیمت: ۳۵۰روپے

● ڈاکٹر ابرار رحمانی

شوکت حیات کے افسانے

میں نے پچھلے دنوں اپنی ایک تحریر میں افسانے کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''آج افسانے سیکڑوں کی تعداد میں لکھے جارہے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا کہ پڑھے بھی جارہے ہیں (کہ ادب کا قاری انہیں پڑھنے پر مجبور ہے) لیکن بہت کم ہی افسانے ایسے ہیں جو اپنا نقش تادیر قائم رکھ پاتے ہیں۔ آج بھی جب فکشن کی بات ہوتی ہے تو پریم چند یا پھر ترقی پسند افسانہ نگار منٹو، بیدی عصمت اور کرشن چند کے افسانوں کا ہی بکھان ہوتا ہے یا اس سے بہت آگے گئے تو بلراج مین را، سریندر پرکاش، قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال تک آتے آتے ہماری سانس پھولنے لگتی ہے۔

ایک زمانے تک افسانوں سے کہانی کی گمشدگی کا بڑا چرچا رہا۔ خیر سے وہ دور بھی گزرا اور افسانے میں کہانی کی واپسی ہوئی۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو کہانی کی واپسی ہوئی لیکن کیا واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے؟ اگر واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے تو وہ کہانی کہاں ہے؟ کون سی ہے؟ اور وہ اپنا وجود منوانے میں آخر کامیاب کیوں نہیں ہے؟ آج کوئی کہانی یادگار کیوں نہیں ہو پاتی؟ افسانوں میں کردار کی تخلیق یا کردار سازی بھی آج اس سنہری دور سے بہت پیچھے ہے، جسے ہم ترقی پسند دور کے نام سے جانتے ہیں۔ آج بھی جب ہم کردار نگاری کی بات کرتے ہیں یا یادگار کرداروں کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں کہانیوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آج کوئی یادگار کردار تخلیق نہیں ہو پاتا؟

مطلب یہ کہ نہ پلاٹ، نہ کردار، بس واقعات ہی واقعات آج کے افسانوں کی شناخت ہیں۔ تو کیا افسانہ واقعات کی کھتونی محض ہے؟

ٹھیک ہے آج بھی کچھ افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں افسانہ کی فکر و فن کی پاسداری ہے۔ اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں میں کہانی بھی ہو اور جاندار اور یادگار کردار بھی ہوں۔ لیکن تان پھر وہیں آکر ٹوٹتی ہے کہ کیا یہ سب مذکورہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مدمقابل رکھے جاسکتے ہیں؟

ہمارے بعض افسانہ نویس احباب کہہ سکتے ہیں کہ جناب ان کا زمانہ اور تھا اور ہمارا زمانہ اور ہے اور اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ہم ان سے آگے ہیں۔ لیکن کیا ہم اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہیں؟'' (اداریہ ماہنامہ ''آج کل'' مارچ ۲۰۰۳ء)

میری یہ بات ابھی 'لا الہٰ' کی منزل میں ہی تھی کہ کچھ دانشور ادیب جن میں افسانہ نگار اور افسانہ کے نقاد دونوں ہی شامل تھے، مجھ پر کچھ اس طرح حملہ آور ہوئے کہ 'الا اللہ' کی منزل تک پہنچنے میں، خود کو سنبھالنے میں، خود کو مجتمع کرنے میں مجھے خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ میں نے پہلے بھی اعتراف کیا تھا اور آج بھی مجھے اعتراف ہے کہ ''آج بھی کچھ افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں افسانے کی فکر وفن کی پاسداری ہے۔ اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں میں کہانی بھی ہو اور جاندار اور یادگار کردار بھی ہوں۔''

ایسے افسانہ نگاروں اور ان کے صرف ایک ایک افسانے کی اگر ایک فہرست تیار کی جائے تو وہ کم سے کم اتنی طویل تو ضرور ہوگی:

ذکیہ مشہدی (قصہ جانکی رمن پانڈے)، حسین الحق (جب اسمٰعیل جاگا)، جابر حسین (مالن مائی)، گلزار (راوی پار)، انیس رفیع (غروب سے پہلے)، شفق (مہاجر پرندے)، سید محمد اشرف (آخری موڑ پر)، طارق چھتاری (برف اور پانی)، صغیر رحمانی (ایک شہزادی کی پریم کتھا)، خورشید اکرم (مذبح کی بھیڑیں)، نورالحسنین (سرد کمرے میں آتش داں)، عبید قمر (نامراد گوتم) شموئل احمد (ندی) مشرف عالم ذوقی (بوڑھے بھی جاگ سکتے ہیں)، ساجد رشید (جنت میں محل)، پیغام آفاقی (کوآپریٹو سوسائٹی)، مشتاق احمد نوری (لمبے قد کا بونا)، انجم عثمانی (شہر گریہ کا مکیں)، غضنفر (ختنہ)، قاسم خورشید (من لاگو.....)، علی امام نقوی (خواہش معصوم)، مظہر الزماں خاں (پچھلے دروازے کے آسیب)، حسن جمال (کیا تم میری بیوی سے شادی کر سکتے ہو)، اسرار گاندھی (بلّی)، احمد صغیر (منڈیر پر بیٹھا پرندہ) ترنم ریاض (یہ تنگ زمیں)، نگار عظیم (بڑی فیملی) اور شوکت حیات (گنبد کے کبوتر) وغیرہ۔ اس فہرست میں اور بھی نام جوڑے جا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام افسانے کسی نہ کسی لحاظ سے اچھے ہیں اور ان سب پر بہت 'دلچسپ' گفتگو ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک مختصر سے مضمون میں اپنی گفتگو صرف اور صرف شوکت حیات کے چند افسانوں تک محدود رکھوں گا۔ شوکت حیات کئی وجہوں سے میرے پسندیدہ افسانہ نگار رہے ہیں۔ ایک تو یہی کہ شاید یہ ایک ایسا فنکار ہے جو کسی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر صرف اپنے فن اور فکر سے مطلب رکھتا ہے۔ وہ کہانیاں لکھتا بھی ہے اور اچھے سے اچھے رسالوں میں چھپنے کی خواہش بھی رکھتا ہے لیکن بس اتنا ہی۔ اس سے آگے اس نے نہ کبھی سوچا اور نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سن ستری (یہ خود شوکت حیات کی وضع کردہ اصطلاح ہے) افسانہ نگار اپنی ۳۰۔۳۵ سال کی

فنکاری اور ریاضت کے بعد بھی اپنا ایک مجموعہ شائع نہ کروا سکا۔ یہ ان کی بے نیازی اور انکساری سے زیادہ ان کی لاپرواہی ہے ورنہ ان کے کئی افسانے ایسے ہیں جنہیں قاری دوبارہ پڑھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ کم از کم میں اپنے تعلق سے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ سکہ رائج الوقت تحریکات ور جحانات کے کبھی زیر اثر نہیں رہے۔ نہ نام نہاد ترقی پسندی کی چکا چوندھ میں ان کی آنکھیں خیرہ ہوئیں، نہ جدیدیت کی داخلیت میں گم ہوئے نہ مابعد جدیدیت کی فارمولہ بازی کے چکر میں پڑے۔ البتہ وہ آزادی کے تب بھی دیوانے تھے اور آج بھی ہیں۔ کھلی فضا میں سانس لینا اور کھلے دل و دماغ سے سوچنا ان کی تحریر و تقریر کا خاصہ ہے۔

ان کے افسانوں میں کئی بہت اچھے اور عمدہ افسانے ہیں۔ ان میں سے کچھ اس طرح ہیں: شکنجہ، چیخیں، گنبد کے کبوتر، بھائی، پھسینڈا، اپنا گوشت، مسٹر گلیڈ، مادھو اور فرشتے وغیرہ۔

ان میں سے ہر افسانہ الگ الگ موضوع پر ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ہر افسانے کا الگ الگ ٹریٹمنٹ ہے۔ اور ٹریٹمنٹ کے حساب سے ان کی طوالت بھی الگ الگ ہے۔ کوئی ان میں بہت مختصر ہے اور کوئی خاصا طویل بھی۔

'شکنجہ' ایک غریب قلی کی کہانی ہے۔ بیچارہ قلی کس طرح اپنی قدروں اور پیٹ کی بھوک کے شکنجہ میں پھنس کر رہ گیا ہے وہ اس جملہ سے ظاہر ہے:

> ''چل بیٹے.....دیر مت کر.....اگلی گاڑی یارڈ سے نکل کر پلیٹ فارم پر لگنے والی ہے.....جلدی کر بیٹے.....جلدی.....اس بار ٹھیک سے دیکھ کر بوجھ اٹھاؤں گا۔ کوئی ناطے دار نہ ہو.....'' یہ حقیقت ہے کہ آج ہزاروں لاکھوں لوگ اس طرح پیٹ کی آگ اور قدروں کے شکنجہ کے درمیان پستے رہتے ہیں۔ وہ کراہتے بھی ہیں لیکن ہمارا نظام کچھ ایسا ہے کہ اس سے چھٹکارے کی صورت نظر نہیں آتی۔ شوکت حیات نے قدروں کی پاسداری کی پیش کش میں فن کی پاسداری کا پورا خیال رکھا ہے۔

''مسٹر گلیڈ'' ہر ملک ہر شہر بلکہ ہر گلی محلے میں پایا جانے والا وہ بے ضرر ذی روح ہے جو سماج کو اپنے عمل سے کسی نہ کسی طور پر فائدہ تو پہنچاتا ہے لیکن سماج اسے نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک آفاقی کردار ہے۔

ان کی ایک بہت ہی چھوٹی سی کہانی ہے ''اپنا گوشت''۔ رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے اور بھول جانے کا المیہ۔ تاثر انگیزی میں اپنی انتہا کو چھوتا ہوا۔ کہانی بالکل سامنے کی ہے۔ 'بڑے ابو' نے بچپن میں ہی اپنے والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد طے کیا تھا کہ جب تک وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر لیں گے اپنی شادی نہیں کریں گے۔ لیکن ان ذمہ داریوں کے ادا کرتے کرتے خود ان

کی زندگی کی شام ڈھلنے لگتی ہے اور وہ اپنی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ضرورت بھی نہیں تھی کہ گھر بھائی بہنوں کے بچوں سے بھرا پرا تھا۔ وہ ان بچوں کے لیے کبھی گھوڑا بنتے تو کبھی ہاتھی اور چونکہ وہ مجرد تھے اس لیے جائیداد میں حصہ دینا نہ بھائی بہنوں نے پسند کیا اور نہ ہی انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔

ایک خاص عمر کے بعد جب بڑے ابو کو بیکار محض، نٹھلا سمجھا گیا اور جب یہ کہا گیا کہ ''اس طرح کے بیکار افراد سے گھر کا ماحول بگڑتا ہے.....خاندان کے بچوں پر برا اثر پڑتا ہے'' تو ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ''بس اور نہیں'' کہہ کر جس گھر کو بنایا تھا بسایا تھا، جس کی تربیت کی تھی اسی گھر کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اور ایک دن انتہائی کسمپرسی میں ان کی موت ہو جاتی ہے۔

کہانی کا کلائمکس یہ ہے کہ ان کی موت کی خبر سے ان کے اہل خاندان کو کئی فرق نہیں پڑتا۔ اس حال میں بھی بڑے ابو کے چھوٹے بھائی مرغ کی ٹانگ چباتے ہوئے اپنے بیٹے سے کھانے کے لیے اصرار کرتے ہیں تو اس سے کھانا نہیں کھایا جاتا۔

ڈائننگ ٹیبل پر کھاتے ہوئے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ''میں اپنا گوشت کھا رہا ہوں۔'' افسانہ نگار کا یہ آخری جملہ بلاشبہ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا اور خون دل میں ڈبو کر لکھا گیا جملہ معلوم پڑتا ہے اور ہماری آنکھیں بے اختیار چھلچھلا اٹھتی ہیں۔ یہ افسانہ تادیر اپنا نقش قائم رکھنے میں کامیاب ہے۔

'چیخیں' موجودہ تعلیمی نظام پر لکھا گیا افسانہ ہے کہ کس طرح آج انگلش میڈیم اسکول میں اپنے بچوں کو پڑھانا اسٹیٹس سمبل بن چکا ہے۔ خواہ آپ میں ان اسکولوں میں پڑھانے کی سکت نہ ہو لیکن آپ اپنے بچوں کو انہی اسکولوں میں پڑھوائیں گے۔ افسانہ نگار نے بڑے خوبصورت انداز میں دکھایا ہے کہ کس طرح فیس سلیپ دیکھ کر ایک عام آدمی کی چیخیں نکل پڑتی ہیں۔ کس طرح وہاں کے اسٹینڈرڈ اور رکھ رکھاؤ کو منٹین کرنے میں ان کی چیخیں نکل پڑتی ہیں اور تو اور افسانہ نگار نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک انگریزی میڈیم اسکول میں داخل کرانے کے لیے ایڈمیشن ٹیسٹ ہوتا ہے اور منتخب طلبہ کی لسٹ دیکھتے ہوئے کس طرح بہت سے والدین اور گارجین کی چیخیں نکل پڑتی ہیں۔ موجودہ تعلیمی نظام پر یہ افسانہ ایک بھرپور طمانچہ ہے۔

'بھائی' شوکت حیات کا ایک اہم افسانہ ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھے گئے اس افسانے میں افسانہ نگار نے انسانی نفسیات کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ جب ماحول بگڑتا ہے تو اس طرح ایک دوسرے فرقے پر سے اعتماد اور اعتبار اٹھ جاتا ہے کہ فریق مخالف کا ہر ایکشن اور عمل خوفزدہ کرتا رہتا ہے۔ مبادا اب وہ اس پر حملہ کر دے۔

افسانہ 'گنبد کے کبوتر' تو شوکت حیات کی شناخت بن چکا ہے۔ اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے ''گنبد کے کبوتر'' شوکت حیات کا کامیاب ترین افسانہ ہے۔ بابری مسجد سانحہ کے پس منظر میں بہت سے

افسانے لکھے گئے ہوں گے لیکن 'گنبد کے کبوتر' کی بات ہی اور ہے۔ یہ اس سانحہ کے پس منظر میں لکھا گیا سب سے اہم افسانہ ہے۔ افسانہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

''بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔ متواتر اڑتا جا رہا تھا۔ اوپر سے نیچے آتا۔ بیتابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اڑ جاتا۔''

یہ افسانہ ان سوگوار الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔

''آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے اماں کی تلاش اور کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکر کاٹ رہا تھا۔

بیوی سے اس کی نگاہیں ملیں تو اسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میت پڑی ہے اور باہر کرفیو میں اس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔''

افسانہ یہاں ختم ہو جاتا ہے اور چھوڑ جاتا ہے اپنے پیچھے تاثر کا ایک سمندر۔ بلاشبہ یہ ایک جاندار اور یادگار کہانی ہے۔ اس کہانی کا تانا بانا بننے کے لیے جس طرح کے واقعات اور کردار تخلیق کیے گئے ہیں وہ بے مثال ہیں۔ واقعات تو خیر سامنے کے ہیں جسے شوکت حیات نے اپنے ٹریٹمنٹ سے اور یادگار بنا دیا ہے۔ کرداروں کی تخلیق میں بھی شوکت حیات نے بڑی مہارت اور فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کہانی میں ایک کردار ہے ریٹائرڈ فوجی افسر سین دادا کا، جسے شوکت حیات نے ینگ مین آف سکسٹی ٹو سین دادا کے خطاب سے نوازا ہے۔ اس کردار کی تخلیق ملاحظہ کریں:

''اس کا دل دوسرے گنبدوں میں الجھا ہوا ہولناک 'کیفیات سے گزر رہا تھا۔ سین دادا نرم و گداز جسمانی گنبدوں میں ٹامک ٹوئیے مارتے ہوئے چٹخارے بھر رہے تھے۔

عمر کی کیا بات کرتے ہو..... ہمیشہ خود کو جوان سمجھو.....یہی زندگی ہے.....دیکھنا اور دیکھتے ہوئے ان رنگین تصویروں میں ڈوب جانا اور بار بار ڈوبنا ابھرنا.....!

سین دادا نے پھر کہا۔

''ینگ مین، تم جوانی میں بوڑھا ہو گیا.....ذرا نظر تو اٹھا.....''

سین دادا نے اس کے شانے پر انگلیوں کی گرفت سخت کی۔ آگے تین قیامتیں فاختاؤں کی چال چلتی ہوئی گپ شپ میں مصروف تھیں۔

سین دادا آپ ان فاختاؤں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ذرا اوپر دیکھئے۔ بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول

مستقل آسمان میں چکر کاٹ رہا ہے۔ اپنے مستقر کے بے دردی اور بربریت کے ساتھ مسمار کر کے غائب کر دیے جانے کے بعد کیسی بے گھری داور بے امانی جھیل رہا ہے۔ آپ ان کبوتروں کی آنکھیں دیکھ رہے ہیں ....ان میں اترتا خون، بیچارگی اور کچھ کر گزرنے کی تڑپتی ہوئی آرزوئیں محسوس کر رہے ہیں.....

سین دادا اپنی دھن میں مگن تھے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت کیا تھی۔ ان کے پاس تو پوری زمین تھی اور زمین پر آسمانی جلوے موجود تھے..... وہ ان سن رسیدہ لوگوں میں تھے جن کی آنکھوں سے بیویوں کے مرجانے کے بعد شہوت کے شرارے پھوٹتے رہتے ہیں۔''

سین دادا کا ذاتی کیریکٹر چاہے جتنا کمزور ہو شوکت حیات نے اپنی زبان و بیان اور قلم کے زور سے اسے ایک مضبوط اور یادگار کردار بنا دیا ہے۔ اس افسانے کا قاری مشکلوں سے اسے بھلا پاتا ہے۔

ایک کہانی 'پھسینڈا' ہے۔ کہانی شہر پٹنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اب پٹنہ ہو یا دلّی یا ممبئی، کسی بھی بڑے شہر میں متوسط طبقے کی حالت کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہے۔ صبح دفتر کے لیے نکلیے یا کسی اور کام کے لیے۔ آپ کو بس کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سفر سستا بھی ہوتا ہے اور نسبتاً محفوظ بھی۔ پٹنہ جیسے شہر میں یہ سفر مشترکہ ٹیمپو (تھری وہیلر) میں کرنا پڑتا ہے، جس میں کم و بیش دس سے بارہ سواریاں ٹھنسی ہوتی ہیں۔ اس سفر میں کن کن اذیتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اس کے مسافر ہی جانتے ہیں۔ یہ کھچا کھچ بھری ہو تب بھی آپ اس پر چڑھنے کے لیے مجبور ہیں کہ آفس لیٹ نہ ہو جائے۔ اس بھیڑ والی گاڑی میں کس کس قماش کے لوگ ہوتے ہیں اور شریفوں کو اور خاص طور پر لڑکیوں کو کیسی کیسی پریشانیاں جھیلی پڑتی ہیں، وہ سب پر عیاں ہے۔

دلّی ہو، ممبئی ہو یا پٹنہ یا اور کوئی بڑا شہر۔ یہ روزانہ کا معمول ہے اور اس سے شہر کی ایک بڑی آبادی کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں فرق ہے تو بس یہ کہ دلّی، ممبئی اور کلکتہ میں بس، ٹرین یا ٹرام سے سفر کرنا پڑتا ہے جب کہ پٹنہ جیسے شہر میں ٹیمپو (تھری وہیلر) ہی وہاں کا واحد سادھن ہے۔ لیکن حالات کم و بیش سبھی جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اسی کہانی سے ایک سین ملاحظہ کریں:

> ''کچھ دیر بعد مسٹر دیونرائن سنگھ آئیں گے اور ایک پان کی دکان میں پان کھانے کے بہانے کھڑے ہو جائیں گے۔ انہیں کوئی عجلت نہیں ہوتی۔ چہرے پر ایک خاص طمانیت ہے۔ پان کی دکان کے لمبے چوڑے آئینے میں خود کو کم دیکھتے ہیں اور آس پاس کے نظاروں میں ٹنگے ہوئے خوبصورت اور گداز جسموں سے لطف اندوز زیادہ ہوتے ہیں۔ اسکرٹ سے جھانکتے ہوئے چکنے زانو.....
>
> سڈول پنڈلیاں.....

> برفیلے پہاڑوں کی چوٹیاں.....
>
> کھنکھناتی ہوئی مسکراہٹ.....

سورج دیونرائن سنگھ کی تشبیہات کی لمبی فہرست ہے۔ موقع بہ موقع درجہ بندیوں میں تبدیلی بھی کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی 'خاص چیز' پسند آ جائے تو وہ اپنی نگاہوں سے اسے پوری لذت کے ساتھ نگلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکیلی ہو تو اغل بغل میں ایستادہ ہو جاتے ہیں اور جتنی بھی دیر ہو جائے لیکن ٹیمپو میں اس کے ساتھ ہی سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پندرہ بیس منٹ کے سفر میں اوبڑ کھابڑ سڑک پر ٹیمپو کے ہچکولوں میں لمسیاتی لذت حاصل کر کے نہ معلوم ان کی پیاس بجھتی ہے یا بڑھتی ہے۔ لیکن روزانہ کا ان کا یہ معمول ایسے دکانداروں کی نگاہوں سے چھپا نہیں ہے جن کی دکانیں کم چلتی ہیں اور جو بے کار بیٹھے اس چوراہے کے مشاہدے میں مصروف ہو کر اپنا غم غلط کرتے ہیں۔''

یہ واقعہ ہر بڑے شہر کا روزمرہ کا معمول ہو کر رہ گیا ہے۔ اس واقعہ میں کہانی کار نے پھر بھی ایک حد کا لحاظ کھا ہے ورنہ معاملہ تو اس سے آگے تک جاتا ہوا ہم آئے دن مشاہدہ کرتے ہیں۔

''سورج دیو'' کا کردار آفاقی اور یونیورسل ہے اور مختلف شہروں میں مختلف ناموں کے ساتھ یہ کردار پایا جاتا ہے۔ کردار کا ذکر آ گیا ہے تو بتاتا چلوں کہ یہ افسانہ نہ صرف اپنی کہانی یا ماجرا نگاری کی وجہ سے اچھا ہے بلکہ یہ اپنے طاقتور اور مضبوط کردار کی وجہ سے بھی اہم ہے۔ اس کہانی میں ٹیمپو کا ڈرائیور مرکزی کردار ہے، جو ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ وہ اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنی بے روزگاری کے سبب کرایے کا ٹیمپو چلانے پر مجبور ہے۔ وہ دن بھر ٹیمپو چلانے کے بعد بھی اپنی اور اپنے کنبہ کی اچھی دیکھ ریکھ اس لیے نہیں کر پاتا کہ اس کی کمائی کا ایک حصہ اسے ٹیمپو مالک کو دینا پڑتا ہے۔

یہ کردار چونکہ پڑھا لکھا اور ایک ذہین شخص ہے جنانچہ جب بھی اسے پڑھی لکھی سواری مل جاتی ہے تو وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے تجربات و مشاہدات ضرور شیئر کرتا ہے۔ یہ اس کا معمول بھی ہے اور اس کی مجبوری بھی۔

ایک دن اس ڈرائیور کی خوش قسمتی سے بدرالدین صاحب جیسا پڑھا لکھا اور ایماندار آفیسر مل جاتا ہے (جو اپنی ایمانداری کے سبب ٹمپو کی سواری کرنے پر مجبور ہے) اور وہ شروع ہو جاتا ہے۔ پٹنہ کے کرجی موڑ سے گاندھی میدان تک کے کم و بیش ایک گھنٹہ کے سفر میں وہ ایسی ایسی دانشورانہ اور عالمانہ باتیں کرتا ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ انتہائی فنکارانہ انداز میں اپنے ایک دوست کی کہانی بیان کرتا ہے اور کہانی اپنے تکمیلی مرحلہ میں ہوتی ہے کہ گاندھی میدان آ جاتا ہے۔ اور جب

بدرالدین صاحب پر اشتیاق لہجے میں اس کہانی کا انجام جاننا چاہتے ہیں تو وہ کہتا ہے:

''ہمیشہ یہی ہوتا ہے جناب.....کہانی مکمل ہونے سے پہلے گاندھی میدان آجاتا ہے اور کہانی درمیان میں ہی ختم کرنی پڑتی ہے.....یہی ٹریجڈی ہے اس کہانی کی .....اب تو واپسی کے لیے نمبر لگنا ہے جناب.....پھر کبھی۔''

دیکھتے دیکھتے وہ اپنے ٹیمپو کے ساتھ بھیڑ میں تحلیل ہو چکا تھا۔

اچانک گاندھی میدان کے آگے دھماکہ ہوا اور لوگ سرپٹ بھاگنے لگے۔

اس نے دونوں ہاتھ جیب میں ڈال لیے۔

انگلیاں جیب میں پڑی سختیوں سے مس ہوئیں۔

چاروں طرف طائرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اطمینان کی سانس لی اور ایک جانب روانہ ہو گیا۔ ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔''

'شوکت حیات کی کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے اور ہمارے سوچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ جاتی ہے یا شاید کچھ بھی نہیں چھوڑتی یا شاید ہم خود ہی سوچنا نہیں چاہتے کہ سوچنے سے ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ اب یہی ہمارا وطیرہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ''سب کچھ پھسینڈا ہو گیا۔'' لفظ پھسینڈا آپ کو کسی ڈکشنری میں نہیں ملے گا۔ لیکن اس 'پھسینڈا' میں جو ایک جہان معنی پوشیدہ ہے وہ اس کی قرأت کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے۔ کہانی اپنے واقعات اور اپنے کردار ہر دو لحاظ سے کامیاب ہے۔

مذکورہ بالا تمام افسانوں میں شوکت حیات نے اپنے اردگرد کے واقعات اور سانحات کو جس خوبی اور فنکاری سے پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کے ہاں ماجرا نگاری، پلاٹ، جاندار کردار سبھی کچھ بدرجہ اتم موجو ہیں۔ ان کے افسانے محض واقعات کی کھتونی نہیں ہیں۔ انہوں نے جس باریکی سے واقعات کی پرتوں کو کھولا ہے، جس جزئیات نگاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے وہ ان کا کمال ہے۔ ان افسانوں میں جمع کردہ درد و غم بہت کچھ میر کے درد و غم کے مانند ہیں۔ میر نے درد و غم جمع کر کے ایک 'دیوان' تیار کر لیا تھا لیکن شوکت حیات نے اتنے سارے درد و غم جمع کرنے کے باوجود ابھی تک کوئی مجموعہ ترتیب نہیں دیا ہے۔ کتاب گردی کے اس دور میں بھی شوکت حیات کا اس طرف دھیان نہ دینا ان کے جینون فنکار ہونے پر دال ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Tazeen Aptt.
179/22, Zakir Nagar
New Delhi- 110025

● پروفیسر صفدر امام قادری

شوکت حیات کا ناول/ ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'': ایک تنقیدی جائزہ

شوکت حیات فکری اعتبار سے احتجاج کے فن کار ہیں اور اُن کی اکثر تحریریں اختلاف، مزاحمت سے شروع ہو کر انقلاب کی دھمک تک پہنچتی ہیں۔ وہ خود کو ریڈیکل، کمیونسٹ، ہیومنسٹ اور احتجاجی کارکن کے طور پر ہی پیش کرتے رہے ہیں مگر جس افسانہ نگاری کے قافلے کے ساتھ وہ میدانِ ادب میں اُترے، وہاں برہنہ گفتاری اور شفاف حقیقت نگاری سے ذرا دور کا رشتہ رہا ہے۔ جدیدیت میں استعاراتی بیانیہ آزمانے کا چلن تھا۔ بہت بعد تک شوکت حیات نے خود کو اُسی فریم کا حصّہ بنائے رکھا اور اپنے بیانیہ پر وہ جدیدیت کی ایک پَرت چڑھائے رہے جب کہ نفسِ مضموں کے اعتبار سے وہ ہمیشہ احتجاجی اور انقلابی کیفیت کے حامل رہے۔ شوکت حیات کے اسی مزاج نے اُنھیں مخصوص فنی آداب برتنے کے لیے ہمیشہ بیدار رکھا اور ابتدائی دور کو چھوڑ کر شاید ہی کبھی اس غفلت میں رہے ہوں کہ زندگی اور سماج کے بنیادی سروکاروں، حقیقی موضوعات اور سچّے تجربات کے بغیر بھی افسانہ نگاری کا کاروبار چل سکتا ہے۔ اسی سے اُن کے یہاں فکری توازن کے امکانات روشن ہوئے۔ آج اگر وہ ہمارے لیے قابلِ توجہ اور صفِ اوّل کے مصنف ہیں تو اس کے پیچھے حقیقی سبب یہی ہے کہ فکری اور فنی اعتبار سے اُن کے یہاں واضح توازن اُس وقت پیدا ہو گیا تھا جس زمانے میں اُن کے دوسرے ہم عصر اسلوبیاتی موشگافیوں میں اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے مجبور تھے۔

شوکت حیات ستّر کی دہائی کے افسانہ نگاروں میں اپنی تخلیقی بوقلمونی اور تکنیکی اعتبار سے چاق و چوبند ہونے کے سبب کم از کم چار دہائی سے اردو کے افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں قائم رہے۔ ان کی نسل میں سلام بن رزاق نے خاموشی سے اور شوکت حیات نے بہ بانگِ دہل یہ باور کرایا کہ جدید افسانہ نگاروں سے آگے ایک مستحکم عمارت ان کے دور میں قائم ہو چکی ہے۔ اس طرح گذشتگان کے مقابلے میں ہم عصروں کو زیادہ دنوں تک عدم توجہی کا شکار نہیں بنایا جا سکتا۔ اس عہد میں لکھنے والے تو سیکڑوں کی تعداد میں سامنے آئے اور اس کے بعد بھی اسّی اور نوّے کی دہائی والے بھی بہت حد تک اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ بعض تو افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی اپنی واضح شناخت بنا چکے مگر جدید افسانہ نگاروں کے بعد کے دور میں گذشتہ چار دہائیوں کے فکشن کی ہندستان میں نمائندگی حقیقت میں سلام بن رزاق اور شوکت حیات نے ہی کی ہے۔

آزادی کے آس پاس اردو ادب میں فکشن کے حوالے سے جن دو دہائیوں کی بڑی اہمیت ہے،ان کے دو مسائل عجیب وغریب ہیں۔شاعری اور افسانے میں جدیدیت روز بہ روز پاؤں پھیلا رہی تھی۔دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ قرۃ العین حیدر،عبداللہ حسین،ممتاز مفتی،شوکت صدیقی،حیات اللہ انصاری سے لے کر راجندر سنگھ بیدی تک سب نے لازوال ناول لکھے مگر یہ کیا ہوا کہ اس صنف پر نئی نسل کے لیے دروازے مقفل ہو گئے۔1988-89 کا زمانہ یاد کیجیے جب اچانک 'دو گز زمین'، 'پانی' اور 'مکان' جیسے ناول مختصر وقفے کے ساتھ منظرِ عام پر آئے اور اچانک ان کے حوالے سے ہم عصر ناول نگاری پر گفتگو شروع ہو گئی۔یہ تینوں ناول موضوعات،تکنیک اور کیفیت میں اس قدر مختلف تھے کہ پڑھنے والوں کو اور خاص طور سے ادبی نقادوں کو نئے عہد کے فکشن کی بوطیقا گڑھنے کی ذمہ داری ملی۔یہ بھی خوب رہا کہ آزادی کے بعد جس طرح سے ناول نگاری کی رفتار بڑھی تھی،ٹھیک اسی طرح گذشتہ تین دہائیوں میں سیکڑوں کی تعداد میں نئے پرانے لکھنے والوں نے اپنے ناول پیش کیے۔یہ الگ بات ہے کہ ان تینوں ناولوں کے مصنفین نے اپنی پہلی تحریروں سے شناخت کا جو سکّہ قائم کیا،اس پر شاید ہی کوئی یہ مانے کہ وہ اضافہ کر سکے۔مثال ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے کہ قرۃ العین حیدر نے 32 برس کی عمر میں 'آگ کا دریا' تو لکھا مگر کس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد کی نصف صدی میں اس سے بڑھ کر کوئی لکیر مصنفہ کی طرف سے کھینچی گئی۔

ناولوں کی ہم عصر مقبولیت کے اُسی دور میں 'شب خوں' کے شمارہ نمبر ۲۵۲ میں اچانک شوکت حیات کا ایک ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' شائع ہوا۔اس زمانے میں شوکت حیات کے سارے ہم عصر اور ہم چشم ناول نگاری کے میدان میں اُتر چکے تھے۔عبدالصمد،شفق،حسین الحق،سید محمد اشرف،شموئل احمد،غضنفر،انور خان،یہاں تک کہ مشرف عالم ذوقی جو نسبتاً بعد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے،انھوں نے بھی ناول نگاری کے میدان میں مضبوطی سے اپنے قدم جما لیے تھے۔شوکت حیات کے افسانوں پر توجہ کریں تو ان میں سے اکثر زیادہ طویل نہیں ہیں اور فکر و خیال کی چاہے جتنی بڑی دنیا اُن میں شامل ہو مگر وہ اپنے مخصوص تجریدی ایجاز اور جامعیت سے قصّے کو بے وجہ طول دینے سے بچ جاتے ہیں۔افسانوی ارتکاز کی شاید یہی مہارت تھی جس سے راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو گزرے اور ناول کو پھیلی ہوئی کائنات کو ایک ذرا سے چھو کر ہمیشہ کے لیے اپنی آزمائی ہوئی اور پسندیدہ افسانوی دنیا میں سمٹ کر رہ جانے میں کامیاب ہوئے۔

'سرپٹ گھوڑا' جب شایع ہوا تو ہمیں یہی اندازہ تھا کہ ہم عصروں کے چیلینجز کو دیکھتے ہوئے اس فکشن نگار نے ایک ادبی نمونہ طویل فارمیٹ میں پیش کر کے اپنی مہارت یا شعری اصطلاح میں قدرتِ کلام کا ثبوت پیش کر دیا ہوگا۔مگر یہ بات پھر دیکھنے میں آئی کہ شوکت حیات نے اسے ابواب بندی سے آراستہ کیا

۔قصّے میں جہاں گنجائشیں نظر آئیں،وہاں اضافے کیے اور نئی شکل میں رسالہ ''مفاہیم'' میں شائع کرنے کے لیے اسے پیش کر دیا۔کسی فن کار کے لیے یہ مشکل کام ہے کہ اپنی تخلیق کو نئے فارمیٹ میں پیش کرے۔غضنفر نے 'کہانی انکل' اور 'وش منتھن' میں 'سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے' کا فنّی کرشمہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔انھیں کامیابی ملی یا نہیں،اس سلسلے سے ابھی بھی رائے عامّہ مکمل طور پر ہموار نہیں ہے۔

اگر چہ ناول اور افسانے کا سانچہ مختلف ہے یا داستان اور ناول کا انداز بھی جداگانہ ہے مگر ایسی مثالیں ابتدائی دور سے اب تک ملتی ہی رہی ہیں کہ بعض تخلیق کاروں نے صنفی حد بندیوں کو ایک جھٹکے سے توڑ دیا۔کچھ لکھنے والوں نے تو ایسی خاموشی کے ساتھ اصول وضوابط مسمار کیے جس سے پتا ہی نہیں چلا کہ صنفی دامن میں روایتی ذہن کا خون کب ہوا اور قارئین کے ساتھ ساتھ نقادوں کا امتحان کہاں سے شروع ہو گیا؟ 'فسانۂ آزاد' کی مثال چھوڑیے جہاں داستان اور ناول کے ڈانڈے کچھ اس طرح مل گئے تھے کہ اب تک خوشی سے اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ اسے واقعتاً کہاں رکھا جائے۔اردو ناول کا وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ایسی مشکلات لازمی طور پر پیدا ہو سکتی تھیں مگر وہیں یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ کرداروں کی گہما گہمی،بیان کی کھلی کائنات اور تہذیب و ثقافت کے تازہ لہو کا پھیلاو ایسے تحدید ہیں جن سے قارئین کی فیصلہ کن نگاہیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

مگر 'ایک چادر میلی سی' کو کیا کہیں گے؟ 'اولڈ مین اینڈ دیسی' (Oldman and the Sea) یا انیمل فارم (Animal Farm) کے ظاہری اختصار کو کیا ان کی بہ طورِ ناول شناخت میں رخنہ مانا گیا؟ ہماری زبان میں یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ مختصر ناول یا ناولٹ کو آسانی سے وہ عزت و وقار اب تک حاصل نہیں ہوا جس کی وجہ سے کوئی فکشن نگار اپنی تحریر کو ناولٹ کے بہ طور پیش کرے اور یہ توقع کرے کہ اسے ہیمنگ وے یا جارج آرول کی طرح قابلِ توجہ سمجھا جائے۔ناول کی تنقید کا شاید یہی مسئلہ ہوگا جس سے بعض تخلیق کاروں نے اپنی تحریروں کو خواہ مخواہ طول دینے کی کوشش کی،لایعنی واقعات کے اضافے سے قصّے کو پھیلایا اور یہ کوشش کی کہ ان کا کارنامہ طوالتِ ظاہری میں ایسا ہو جائے کہ آسانی سے قارئین اور نقاد اسے ناول کے زمرے میں رکھیں اور پھر اسی روایت میں اس تخلیق کا جائزہ لیا جائے۔غضنفر،سید محمد اشرف سے لے کر شموئل احمد اور مشرف عالم ذوقی،خالد جاوید اور رحمان عباس تک کس کس کی مثالیں پیش کی جائیں جہاں تنقیدی جبر سے یا ہم عصر تخلیقی فضا کے دباو میں اپنے مختصر ناولوں کو غیر ضروری طور پر طول دینے کی ضرورت میں متن میں یا کبھی کبھی چھاپے میں طوالت کو راہ دینی پڑی۔

'سرپٹ گھوڑا' جدیدیت کے زور تھم جانے اور استعاراتی اسلوب بیان کے عہد شباب کے بعد کی تحریر ہے۔'شب خوں' میں اشاعت کے بعد شوکت حیات نے اس تحریر کو دوبارہ لکھنے کی کوشش کی اور اسے

ظاہری طور پر پھیلانے میں وہ کامیاب رہے۔ اسے ناولٹ کے طور پر پیش کرنے کے ارادے سے ہر چند کہ اُنھوں نے نظر ثانی کی تھی۔ مگر عبدالصمد یا مشرف عالم ذوقی کی طرح سیاسی اور سماجی واقعات اور معاملات کی شمولیت سے اس کی ضخامت بڑھانے کے شاید وہ خوگر نہ ہوئے۔ اس سے اُن کے فنی طریقہ کار کو بھی سمجھا جا سکتا ہے ورنہ کسی ماہر قصّہ گو کے لیے یہ کون سی مشکل بات تھی کہ وہ قصّے کو جہاں تہاں سے پھیلانے کے عمل میں خود کو شریک نہ کر لے۔ شوکت حیات ملک وقوم کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے بھی بہترین واقف کار تھے اور اپنے مضامین یا مجلسی گفتگو میں ان افکار ونظریات کو بہ خوبی پیش کرتے رہتے تھے مگر جیسے ہی وہ افسانہ نگار یا اِس تحریر کی حد تک ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں، اُنھیں ایجاز واختصار اور فنی حکمتِ عملی زیادہ عزیز ہے، اس لیے 'سرپٹ گھوڑا' جیسے قصّے کو سیاسی اور سماجی واقعہ نگاری کی معاونت سے ایک اچھی خاصی ضخامت کا ناول نہیں بنایا بلکہ بنیادی قصّے کو اُسی قدر پھیلنے کے لیے راستہ دیا جس قدر فطری طور پر گنجائشیں تھیں۔ یہی سبب ہے کہ 'سرپٹ گھوڑا' کی نظر ثانی کے باوجود بنیادی حیثیت ناولٹ کی ہی رہی اور اُسی طور پر شوکت حیات اسے الگ سے شائع کرنا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

'سرپٹ گھوڑا' 'شب خوں'، الہٰ آباد، شمارہ نمبر ۲۵۲ بابت جنوری ۲۰۰۲ء میں پہلی بار شایع ہوا مگر بعد میں شوکت حیات نے ابواب بندی میں اضافہ کیا۔ پہلے یہ بارہ ابواب میں منقسم تھا۔ بعد میں اسے سولہ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر باب میں عنوان کا اضافہ ہوا۔ نئے متن میں ساتواں، آٹھواں، نواں اور دسواں باب مکمل طور سے نئے ہیں۔ اُن کے علاوہ پرانے متن میں جگہ جگہ اضافے کیے گئے ہیں۔ اضافے کی یہ صورتِ حال پہلے ہی باب میں سمجھ میں آنے لگتی ہے جہاں تفصیل دوگنی ہوگئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں کوئی اضافہ نہیں۔ چوتھے باب میں سات سطریں زیادہ ہیں۔ پانچویں باب میں عنوان کی نسبت سے پوری نظم کا اضافہ ہوا ہے۔ گیارہویں باب میں ایک جگہ ایک صفحہ پورے طور پر بڑھایا گیا ہے۔ بارہویں باب میں آخری کا آدھا صفحہ اضافہ ہوا ہے۔ تیرہویں باب میں بیچ میں مکمل ایک صفحہ بڑھایا گیا ہے۔ پندرہواں باب اوّلین شکل میں نہایت مختصر تھا۔ یہاں تین صفحات کا اضافہ ہوا ہے۔ ان اضافوں پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ شوکت حیات نے نظر ثانی کرتے ہوئے جہاں جہاں ضروری معلوم ہوا، وہاں جملے بڑھائے۔ کہیں کہیں مختصر کردار بھی شامل ہو گئے ہیں۔

درمیان میں جن چار یعنی ساتویں سے لے کر دسویں ابواب تک کا جو اضافہ ہوا ہے، وہ فرقہ ورانہ صورت حال کی عکاسی کے کیے وقف ہے۔ شوکت حیات کی مہارت یہاں سمجھ میں آتی ہے کہ وہ کس طرح پرانے قصّے کی ڈور کو اپنے ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں اور نئے واقعات کی زنبیل کھول دیتے ہیں۔ چھٹے باب

سے ساتویں میں پہنچتے ہوئے کسی نئے قاری کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ باب اور اُس کے بعد آنے والے تین نئے ابواب اس ناولٹ کا اوّلا حصّہ نہیں تھے۔ اسی طرح دسویں باب سے جب ہم گیارہویں باب میں پہنچتے ہیں تو یہ کہاں یاد رہتا ہے کہ نئے متن سے پرانے قصّے کی طرف لوٹ کر آ رہے ہیں۔ حسب ضرورت نئے ماحول میں آنے کی پیش بندی مصنف اپنی مشاقی سے بہ آسانی کر لیتا ہے۔ ہر چند کہ مکمل اضافہ والے چاروں نئے ابواب ذرا تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور اس بات کا ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ناولٹ کے قصّے کو توسیع دینے اور موضوعاتی ارتکاز قائم کرنے کے لیے ان ابواب کو مصنف نے بڑھایا۔ ان اضافوں کے بعد اس ناولٹ کی موضوعاتی دنیا مزید پھیل جاتی ہے جس کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ شوکت حیات نے 'سرپٹ گھوڑا' ناولٹ کو نظر ثانی کے عمل سے گزار کر ہمیں ایک بھرپور فکشن مہیا کرایا۔

'سرپٹ گھوڑا' میں شوکت حیات نے ناول نگاری کے تمام لوازم شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کو فارم لیس آرٹ کہا گیا ہے، اس لیے شوکت حیات نے یہاں طرح طرح کے مسالے جمع کیے ہیں۔ تاریخ، سیاست، سماجیات کے ساتھ جنس، فرقہ واریت اور ٹریڈ یونین کے بہت سارے مناظر اس میں شامل کر کے پلاٹ کو استحکام دیا گیا ہے۔ افسانہ نگار کا فنّی ارتکاز اور موضوعاتی گٹھاؤ جیسے عوامل کچھ اس قدر گہرے طور پر یہاں شامل ہوئے ہیں جن سے اس بات پر ہمارا یقین بڑھ جاتا ہے کہ شوکت حیات نے محض صفحات بڑھانے کے لیے اس قصّے کو ناول کی دنیا نہیں عطا کی۔ چار پانچ صفحے میں ابواب ایسے بدلتے ہیں کہ یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہاں سے اب ناول کہاں جا رہا ہے یا جائے گا؟

ناول اچانک شروع ہوتا ہے۔ غالب کے شعر اور ایک پمفلٹ کی تقسیم سے گفتگو شروع ہوتی ہے مگر جتنے منھ اتنی باتیں۔ یہ خدشہ ظاہر ہونے لگتا ہے کہ چند سطروں کی یہ تحریر آخر سیاست اور سماج کے کتنے مسئلوں کی بنیاد کو واشگاف کرتی جائے گی۔ بالکل بے تکلفی سے سوال وجواب یا تبادلۂ خیالات اور مجذوب کی بڑ کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ ہندستان اور پاکستان کی تقسیم، سیاست کی مشکل اور پیچیدہ ڈگر سے بات بڑھتے ہوئے جرمنی کی دیوار ڈھانے تک پہنچتی ہے۔ منٹو کے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں جس طرح مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں، اسی طرح یہاں کہنے کو یہ ٹریڈ یونین کے چھوٹے موٹے لیڈر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی گفتگو کا معیار اور ان کے موضوعات قومی اور بین الاقوامی ہیں۔ جب پہلے باب میں ہی لکھنے والا موضوع کو اس معیار سے تولنے کی کوشش کرے گا تو ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ فن کار کسی بڑے فکری بت کو توڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

یہ ناولٹ متوقع خدشات اور اُس سے پیدا شدہ مسائل کی کہانی ہے۔ فساد ہو چکا ہے اور پھر سے ہونے کے آثار ظاہر ہیں۔ ایک زہریلا اشتہار نکلا ہوا ہے۔ ہندو اور مسلمانوں میں واضح تقسیم کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

آبادیاں پاکٹ میں محفوظ ٹھکانے تلاش کر رہی ہیں۔ کرفیو کچھ علاقوں سے اُٹھ چکا ہے اور کہیں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کے وجود سے خوف زدہ اور شبہات میں مبتلا ہے۔ سڑک سے تنہا گزرتے ہوئے بار بار کسی دوسرے اجنبی کو دیکھ کر اس بات کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ہمارے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہ دے۔ بچوں کا اسکولوں سے اغوا مذہبی بنیادوں پر شروع ہو چکا ہے۔ سب سے مشکل مرحلہ یہ ہے کہ بازار اور پیشے ورں کے بیچ بھی مذہبی تقسیم قائم ہو چکی ہے۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بیمار بچوں کو کس ڈاکٹر سے دکھایا جائے، اس مرحلے میں یہ سوالات زیر بحث ہوتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر اگر ہمارے مذہب کا نہیں ہے تو یہ بات مناسب نہیں کہ بچے کو اُسے دکھایا جائے۔ کیا جانے وہ کوئی مذہبی بدلہ ہی لے لے۔ دور سے چند افراد نظر آ جائیں تو پہلے یہ غور کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ یہ فسادی اگر دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں تو اُدھر سے آگے جانا درست نہیں۔ عوامی سواریوں میں بیٹھتے ہوئے یہ غور کرنا کہ اُس کا ڈرائیور اور جو کوئی دوسرا سوار ہے، اُس کا مذہب کہیں ہم سے مختلف تو نہیں؟

قصّہ یوں ابھرتا ہے کہ ناول کے مرکزی کردار کا بچہ اچانک بیمار ہوتا ہے اور کسی طرح دفتر میں اس تک یہ خبر پہنچائی جاتی ہے۔ مرکزی کردار اپنے گھر جاتا ہے اور پھر بچے کے علاج میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ مگر ایک ماہر قصّہ گو کو یہ معلوم ہے کہ ناول کا پلاٹ اس سے کچھ سوا طلب کرتا ہے۔ اس لیے شروع میں ہی یہ کیفیت ضمنی طور پر اجاگر کر دی جاتی ہے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی اور تناؤ کا ماحول ہے۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے پر کسی بھی سماجی معاملے میں بھروسہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس پہلو سے اس بیمار بچے اور اس کے علاج کے مراحل یا متعلقات میں پیچیدگی شامل کی جاتی ہے جس کے سبب کبھی تجسّس اور کبھی بوالعجبی کے احوال ناول میں اپنے آپ چلے آتے ہیں۔ یہ بات واضح طور پر ہمیں سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مصنف بھی اُس بنیادی قصّے پر نہ خود مرتکز رہتا ہے اور نہ چاہتا ہے کہ اُس کی کہانی گھریلو زندگی میں قید ہو کر رہ جائے۔ اس لیے بنیادی قصّہ سُست رفتار سے آگے بڑھتا ہے یا ذیلی قصّے کی وجہ سے جو ماحول قائم ہو چکا ہے، اُس کے خدشات پڑھنے والے کے دماغ میں حاوی رہتے ہیں۔ مرکزی کردار اگرچہ بیٹے کے علاج کے لیے لگا ہوا ہے مگر اُس کے ذہن میں اور اُس کی سرگرمیوں کے دوران شعور اور لاشعور پر بھی بدلی ہوئی صورتِ حال پورے طور پر حاوی ہے۔ اس وجہ سے بنیادی قصّے کے متوازی باہر کی دنیا کے سوال و جواب اور اندیشے بھی حسب موقع آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس سے ناولٹ کی داخلی دنیا نہ صرف یہ کہ توسیع پاتی ہے بل کہ موضوعاتی اعتبار سے بھی اس سے ایک بوقلمونی پیدا ہوتی ہے۔ مسجد کے امام اور انجانے آدمی کی طرف سے مدد کی پیش کش سے کہانی کی شاخیں پھیلتی ہیں۔ خاندان کے افراد کی مختلف مواقع سے الگ الگ روپ میں نظر آنا اور کبھی کبھی اشعار، دوہے اور عشق و عاشقی کے موضوعات کی شمولیت سے قصّہ اپنے انجام کا خوگر ہوتا ہے۔ علاج کے مرحلے میں زندگی کی اونچ نیچ اور حقیقی ڈراموں کی موجودگی بھی سانس روک کر ہمیں شوکت حیات کی فن کاری پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔

شوکت حیات بعد کے زمانے میں اپنی بے مثال کہانی 'گنبد کے کبوتر' کی وجہ سے پہچانے گئے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہندستان کی سیاست بھی بدلی اور معاشرے کے نظامِ فکر میں کچھ ایسی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن سے پورا معاشرہ بدل گیا۔ جینے کا انداز، سوچنے کا طریقہ اور برتنے کا مزاج، سب کچھ بدلا۔ یہ تبدیلی سماج کے ہر حلقے میں آئی۔ شوکت حیات نے اس موضوع کو صرف 'گنبد کے کبوتر' میں ہی نہیں برتا، یہ اُن کی اور دوسرے لکھنے والوں کی سائیکی میں ایک زندہ حقیقت کی طرح بس گیا۔ یہ ناولٹ اسی موضوعاتی پس منظر سے اپنے معنوی دائرۂ کار کی توسیع کرتا ہے۔ شوکت حیات شفاف حقیقت نگار نہیں ہو سکتے، اس لیے روایتی بیانیہ کو آزماتے ہوئے واقعات در واقعات ایک سلسلے سے پیش کرنے کا عمل اُن کے یہاں ممکن نہیں۔ جدیدیت کے اثر سے اُن کے یہاں کہانی کی حقیقت اصل قصّے میں بنیادی کرداروں میں محدود ہو جاتی تو تین دہائیوں کی افسانہ نگاری کی مشق ضائع ہو جاتی! یہیں اُن کی فنی ہنرمندی اور چابک دستی کا پتا چلتا ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ فکری طور پر کس قدر پختہ ہیں اور اُسی طرح نت نئے تکنیکی حربوں سے خود کو آراستہ کرنے کے معاملے میں چاق و چوبند ہیں۔ یہ ہنرمندی 'گنبد کے کبوتر' میں بھی واضح ہے اور 'سرپٹ گھوڑا' میں بھی بھرپور طریقے سے روشن ہوا ہے۔

شوکت حیات کی ادبی نشو و نما میں جدیدیت کے خاصے اثرات رہے ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں جدیدیت کے آزمائے ہوئے رموز و علائم ابتدائی دَور میں تو بہت زیادہ تھے مگر بعد میں بھی وہ اس رجحان سے عملی طور پر خود کو کبھی الگ کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اُن کی بہت ساری کہانیاں تو اعلانیہ طور پر جدیدیت کی زائیدہ ہیں مگر ان کے سوا دیگر تحریروں پر کم از کم اسلوب کی سطح پر تو جدیدیت کے اثرات جگہ جگہ مل ہی جاتے ہیں۔ نئے اور انوکھے استعارے وضع کرنا، تفصیلات کے بجائے اشاروں میں گفتگو اور معنوی اعتبار سے متن میں ذرا پیچیدگی اُتار دینے کی کوشش کرنا شوکت حیات کے وہ آزمودہ نسخے ہیں، جنھیں وہ اپنے فکشن کا بہر طور حصّہ بناتے رہے ہیں۔ 'سرپٹ گھوڑا' میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں، اُن سے پیدا شدہ اندیشے، ہیبت ناکی اور گھبراہٹ کی کیفیات بار بار اس ناول کا حصّہ بنتی ہیں مگر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ اشارے یا کیفیات کا بیان چند جملوں میں ختم ہو جاتا ہے اور کہانی کا سفر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پس منظر سے ہیبت ناکی کے مظاہر ابھر رہے ہیں اور اُن کے جال میں کہیں نہ کہیں سب پھنس رہے ہیں۔ گھوڑوں کی ٹاپ اور اُن سے اُس عہد کی متعلقہ زندگی پر جو اثرات قایم ہو رہے ہیں، اُن کی ماہرانہ پیش کش اس ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ کہیں بیان میں تفصیل آنے نہیں دیتے مگر ہیبت ناکی اور خوف میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ اکثر تو گھوڑوں کی ٹاپ کا ذکر بڑے لاتعلق انداز میں سامنے آتا ہے اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ناول کی بنیادی کہانی سے یہ پَرے ہیں مگر فضا بندی کے سارے کام انھیں اوزاروں سے

لینے کا ایک بالیدہ شعور سب کچھ سنبھال لیتا ہے۔ چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

■ ''دفعتاً اسے لگا کہ کہیں دور سے کوئی گھوڑا اس کی طرف سرپٹ دوڑتا چلا آرہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں گونجتی ہوئی ٹاپیں سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سرپٹ گھوڑے کی پاؤں کی دھمک بتدریج قریب آتی جارہی تھی''۔

■ ''اچانک سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ پھر سنائی دی ...ٹاپ قریب آرہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ، اس کی بیوی اور بچہ گھوڑوں کی ٹاپ کے نیچے روندے جا رہے ہیں، زدوکوب کئے جارہے ہیں۔ ان کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ جسم کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ سرپٹ گھوڑوں کا قافلہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ ایک، دو، تین...سینکڑوں، ہزاروں...انگنت ...ٹڈی دل کی طرح چھاتے جا رہے تھے۔ چاروں طرف...''

■ ''غیر مرئی سرپٹ گھوڑے یہاں سے وہاں تک دندناتے پھرتے تھے اور وہ دونوں چپ چاپ اپنے وجود کے غار میں اتر کر نامعلوم سمتوں میں بھٹک رہے تھے''۔

■ ''اچانک سرپٹ گھوڑوں کی پُراسرار آواز پہلے دور سے اور پھر نزدیک سے آتی ہوئی سنائی دی۔

عالمِ دہشت میں جلتی ہوسگریٹ اس کی انگلیوں سے گر گئی۔

ٹمپو میں دونوں نے مل کر جلتی ہوئی سگریٹ کو تلاش کیا۔

پراسرار ٹاپوں کی آوازیں ان کا محاصرہ کر رہی تھیں''۔

ماحول میں موجود کشیدگی اور متوقع ناشدنی کے لفظی پیکر بنانے میں شوکت حیات کو ناول کے مرکزی استعارے سے بہت مدد ملی ہے۔ سرپٹ گھوڑا، گھوڑے کی ٹاپ، دوڑنے اور آگے بڑھنے، بہ تدریج قریب آنے کی جو کیفیات ہیں، اُس سے وہ ہیبت ناکی بالکل سامنے آجاتی ہے جس کی پیش کش وہ اِس ناول میں چاہتے ہیں۔ اُن کا یہ بھی کمال ہے کہ اِس بنیادی استعارے کے اِرد گرد لفظوں کا نپا تلا جال ہی بنتے ہیں۔ یہ اُن کی ایسی فنّی ہوش مندی ہے جس کی کون داد نہ دے گا! کوئی دوسرا ناول نگار ہوتا تو لفظوں کے اسراف سے محل کھڑے کر دیتا مگر ایجازِ بیان کا خون ہو جاتا اور استعارے کی جو غیر مرئی دنیا شوکت حیات خلق کرنا چاہتے تھے، وہ سرِ عام نیلام ہو جاتی۔ شوکت حیات نے اِس استعارے کے سہارے جو بنیادی بیان خلق کیا ہے، اُس سے کہانی اپنے آپ بھٹکنے سے بچ جاتی ہے اور قاری واپس اُسی مرکز پر چلا آتا ہے۔

شوکت حیات یوں تو اپنے اسلوب کو شاعرانہ بنانے کے لیے مشہور نہیں۔ اچھی زبان میں ترسیل کے جو امکانات ہیں، انھیں ہی سلیقے سے آزما کر بہ حیثیت افسانہ نگار انھوں نے اپنا مقام حاصل کیا تھا۔ اِس ناول میں انھوں نے اپنے اُسی اسلوب کو قایم رکھا ہے۔ آرائش بیان پر توجہ دینے کی کوئی اضافی کوشش نظر نہیں آتی ہے مگر جب ناول کے پہلے صفحے پر غالب کا شعر لکھا ملے تو سمجھنا چاہیے کہ اِس کتاب میں کوئی علاحدہ کیفیت کی تیّاری ہے۔ متن کے داخل میں اُترنے سے مختلف ابواب میں غالب، میر، مصحفی، انشااللہ خاں انشا اور کبیر داس کے اشعار نظر آتے ہیں۔ سیاہ فام اقوام کی جدوجہد کے لیے مشہور نظم 'ہم ہوں گے کامیاب ایک دن' پورے طور پر متن کا حصّہ ہے۔ اِن اشعار اور نظموں کی شمولیت سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جہاں شعریت اور موسیقیت کے ڈانڈے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ کسی بھی ناول نگار کو موضوعاتی اور اُسلوبیاتی رنگارنگی سے اپنے ناولوں کو آراستہ کرنے اور خاص طور سے قارئین کو متوجہ کرنے لیے بہت سارے کام کرنے ہوتے ہیں۔ شوکت حیات نے یہاں بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے اور اپنے ناول کو مختلف طبقوں میں مقبول بنانے کی کوشش کی ہے۔

■ ''پرندے کے بازو اڑتے اڑتے شل ہو گئے تھے۔ بہت اونچائی پر جا کر اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی قوت پرواز جواب دے چکی تھی، اب آنکھیں بھی دھندلانے لگی تھیں''۔

■ ''ان کی کھلکھلاہٹ اور فلک شگاف قہقہے سن کر پیڑوں پر بیٹھے رنگ برنگے پرندے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے تیزی سے اڑ گئے۔ اڑتے اڑتے بل کھاتے ہوئے انہوں نے ہنسنے والوں کو اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ کیسے جیالے لوگ ہیں۔ اس عالم میں بھی دل کھول کر ہنستے ہیں۔ اور الوداع کہتے ہوئے فضا میں اونچے اور اونچے اڑتے چلے گئے اور دور آسمان میں غائب ہو گئے لیکن ہنسی کا دورہ مکمل ہونے کے بعد وہ سب گہرے سوچ میں مستغرق ہو گئے''۔

دنیا کے ہر معاشرے میں ناول کی زبان کے سلسلے سے بحث ہوتی رہی ہے۔ ہماری عام نثر اور فکشن بالخصوص ناول میں استعمال کی جانے والی زبان کیا ایک ہی ہوتی ہے یا اُن کی سطحیں بدل جاتی ہیں؟ یہ سوال اصولی طور پر جس طرح تفصیل کا تقاضہ کرتا ہے، اُسی طرح اطلاق کی سطح پر تجزیہ و تحلیل کے مرحلے سے گزر کر یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ واقعتاً ہمارے فکشن میں زبان کی کوئی مختلف سطح آزمانے کی کوشش ہوئی یا نہیں۔ 'سرپٹ گھوڑا' کی حد تک ہم اِس سوال کا ایک ابتدائی جواب تلاش کر سکتے ہیں۔ بے شک ایک ناول نگار زبان کی مختلف سطح تک آئے بغیر شہکار خلق نہیں کر سکتا۔ شوکت حیات کے اُسلوبِ بیان بالخصوص اِس ناول میں آزمائی گئی نثر میں جگہ جگہ ایک کرشمائی کیفیت پیدا ہو گئی

ہے۔ جہاں جہاں ایسے جملے یا پیراگراف آسمان میں ٹنکے ہوئے چاند ستاروں کی طرح ہمیں ملتے ہیں، وہاں کبھی اقوالِ زرّیں کی تخلیق شروع ہوجاتی ہے اور کہیں نثرِ عصری صحائف آسمانی اور اظہار کی بوقلمونی کے ساتھ ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ شوکت حیات کے اِس ناول میں زبان واُسلوب کی اعلا سطح ہمیں نہ صرف یہ کہ پورے طور پر متوجہ کرتی ہے بلکہ ہم اُس کی ساحری اور تخلیقی جنون کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ چالیس برس کی افسانہ نگاری کے بعد جب کوئی فن کار ناول کی طرف قدم بڑھائے گا تو واقعتاً اُس کے قلم سے ایسے قیمتی الفاظ اور جملے ہی ادا ہوں گے:

- ''جو بھی ہو، سیکولرزم بہت خوبصورت تصور ہے۔''
- ''بھائی عجیب زمانہ ہے کہ اب بادشاہ بھی مجرم ہے اور رعایا بھی۔''
- ''چلتے پھرتے ہندوستانی الفاظ تھے جن پر کسی زبان اور مذہب کی سکّہ بند مہر نہیں تھی''۔
- ''دراصل پڑھائی لکھائی اور تہذیب وتمدن کہتے ہی اس کو ہیں کہ انسان اپنی حد بندیوں سے بالاتر ہوجائے.....''
- ''اس کی سیاسی بیداری اور سیکولر شعور کے مقابلے میں اس اناڑی ٹمپو والے کی بےفکری کا اندازہ زیادہ قابل قدر اور دانشورانہ تھا۔''
- ''معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے.....زندگی کے حقیقی چڑیا گھر میں سانپ گھر کے شیشے شاید ٹوٹ گئے ہیں.....فوراً واپس چلیں.....!''

فرقہ وارانہ فسادات اور اُن کے نتائج پر اردو کے سیکڑوں بڑے ناول اور افسانے رقم کیے گئے ہیں۔ تقسیمِ ملک کے دَور کے منظر نامے کو اگرچہ اُن تحریروں میں زیادہ موضوعِ بحث بنایا گیا ہے مگر حالات کے بدلنے کے ساتھ اِس مسئلے کی نئی نوعیّتوں اور بابری مسجد کے انہدام کے بعد کی صورتِ حال پر مقابلتاً کم لکھا گیا ہے؛ اِس کے باجود ہم عصر ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی اِس جانب خاص توجّہ رہی ہے۔ 'گنبد کے کبوتر' لکھ کر شوکت حیات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ افسانوی فن اور فرقہ واریت کی نئی صورتِ حال میں کس طرح مطابقت قایم کر سکتے ہیں۔ 'سرپٹ گھوڑا' بابری مسجد کے انہدام کے دس برسوں کے دوران لکھا گیا۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ شوکت حیات نے واقعتاً کس سال اِسے لکھا مگر متن اِس بات کی گواہی دیتا ہے کہ فرقہ وارانہ صورتِ حال کی بدلتی کیفیات کو مکمل سنجیدگی کے ساتھ موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ فکری طور پر شوکت حیات سیکولر اور غیر مذہبی، روادارانہ مزاج کے حامل تھے جس کی عکّاسی اِس تحریر میں ہر صفحے پر نظر آتی ہے۔ فنّی اعتبار سے غور کریں تو فسادات کے حوالے سے جو اندیشے اور تشویشات کی کیفیت ہوتی ہے، شوکت حیات نے اپنے ناول میں اُس کی ایسی فطری اور زندہ

پیش کش کی ہے کہ ہم اُس خوف اور ہیبت میں خود کو موجود پاتے ہیں۔ فن کارانہ جہت سے اِس ناول کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر ناول نگار کو داد نہ دی جائے تو بے انصافی ہوگی۔ شوکت حیات نے یہ بھی اچھا کیا کہ فسادات کی تفصیل اور قتل وخون میں لت پت زندگی کی تفصیل سے اپنے ناول کو ترقی پسندانہ دَور کے انداز سے آراستہ کرنے کی کوئی مشقّت نہیں اٹھائی۔ اِس سلسلے سے اِس ناولٹ کے صرف ایک اقتباس پر ہماری خصوصی توجّہ درکار ہے:

''سورج رو بہ زوال تھا۔ تازہ لہو کی مہک، سراسیمگی اور وحشت کا سنّاٹا اندیشے کو تقویت پہنچا رہے تھے کہ شہر کے کسی علاقے میں کوئی واردات ہوگئی ہے۔''

شوکت حیات کا مطمحِ نظر اکثر وبیشتر دانش ورانہ رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ اور اپنی تحریروں کا سارا سرمایہ نئی دنیا کے خوابوں کے سپرد کر رکھا تھا۔ اِس ناول میں اُن کی یہ فکری بساط بہت آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ اُس کے کئی دوست احباب جگہ جگہ نظر آتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ سماجی کارکن اور رضا کار ہیں بلکہ اُن کے دلوں میں انسانی زندگی کو خوب صورت بنانے کے نہ جانے کتنے خواب پوشیدہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فساد جیسے نازک معاملے میں بھی اور مابعدِ بابری مسجد انہدام کی بدلتی صورتِ حال میں اُن کے مرکزی کردار اور دوسرے ساتھیوں کا فرقہ واریت کے خلاف ذہن بہ دستور قائم رہتا ہے۔ دونوں طبقوں کے اچھے لوگوں کو پہچاننا اور سماجی انتشار سے راہِ نجات حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرنا، اِس ناول میں بڑی سنجیدگی سے انجام پاتا ہے۔ شوکت حیات کے یہاں ایک اچھے معاشرے اور نئی زندگی کا بڑا صاف ستھرا خواب ہے، ایک امیّد اور ایک نئے منظر نامے کے لیے بہت حد تک اُنھیں یقینِ کامل ہے۔ فسادات، دانش مندی اور انسانیت نوازی کے اردگرد پھیلے بیانیے کو ذیل کے اقتباسات سے پہچاننا مشکل نہیں:

- ایک تقسیم کا زخم ہی ایسا کاری تھا کہ نہ جانے کتنے لوگ اب تک جانبر نہ ہوسکے، اب مزید تقسیم کسی قیمت پر نہیں۔ بلکہ موقع ملے تو.....دونوں جرمنی ایک ہو سکتے ہیں تو کیا ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش پہلی والی حالت میں واپس نہیں آسکتے؟ ہم بیدار ہوجائیں تو یہ دیواریں تحلیل ہوجائیں۔ اس نسل میں نہیں تو شاید آنے والی نسل میں لوگوں کی نیند ٹوٹے اور وہ جان لیں کہ طاقتور انسانوں نے اپنے آمرانہ مقاصد کے حصول کے لئے دھرتی پر لکیریں کھینچ دی تھیں اور آج تو ہم عالمی انسانی سماج اور گلوبل گاؤں کی سمت بڑھ رہے ہیں....
- ان دنوں عبدالمنان بے حد پریشان تھا۔ نئی نئی ملازمت تھی۔ عرصۂ دراز تک بے روزگاری جھیلنے والے عبدالمنان کی آنکھوں میں چھوٹے بڑے کئی سپنے

چھپے تھے۔مگر اس کا سب سے بڑا خواب دنیا کو بدلنے کا تھا۔سوویت یونین کے انہدام نے اس کے ارادوں کو متزلزل نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ بہت دنوں سے اسے غلط راستے پر مڑ جانے والا گمراہ ہراول دستہ سمجھتا تھا۔

اس ناول کا دسواں باب بہ عنوان 'اپنے گھر کی تلاش' اپنے موضوعاتی پھیلاو، ایجاز بیانی، مطالعۂ کائنات اور حد درجہ ڈرامائی اسلوب اختیار کرنے کی وجہ سے ایک ایسا ثبوتِ ہنر بن گیا ہے جہاں کوئی فن کار فنی گرفت میں اوجِ ثریا تک پہنچ جاتا ہے۔ایک طویل مدّت کے بعد مرکزی کردار اپنے آبائی وطن کا سفر اختیار کرتا ہے۔اسے اپنے والد اور پہلی محبوبہ یا دیگر رشتے داروں سے ملنا مقصود ہے۔کہانی میں آگے اور پیچھے کہیں ان سے لگاتار ملنے جلنے کا ذکر نہیں آتا۔اندازہ یہ ہے کہ مرکزی کردار اور اس کے آبائی وطن اور رشتے داروں سے تواتر کے ساتھ ملنا جلنا نہیں ہوتا رہا ہے۔مرکزی کردار ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر اترتا ہے۔وہاں سے رکشے پر بیٹھ کر اُسے اپنے گھر جانا ہے۔رات کا وقت ہے، اندھیرا ہے، غالباً بجلی نہیں ہے۔

رکشے پہ اندھیری رات میں اپنے گھر کا پتا اور راستہ بتاتے ہوئے یہ مرکزی کردار درجنوں راستوں سے گزرتے ہوئے بار بار کسی ویران جگہ یا چٹیل میدان پر آ کر رک جاتا ہے۔اپنے وطن میں واپسی ،آبا و اجداد کی کوٹھی اور حویلی کی تلاش، شہر کاری اور غالباً فسادات کے جبر میں آبادیوں کے بسنے اور اجڑنے کے معاملات اس اندھیری رات میں عجیب و غریب صورت حال پیدا کرتے ہیں۔مرکزی کردار رکشے والے کو اپنے گھر کا پتہ نہیں بتاتا ہے۔رکشے والے کے سوال پر اس کا جواب ہوتا ہے:

''کہاں چلنا ہے بابو جی.....؟''

''بس چلنا ہے..... باہر کا آدمی نہیں ہوں.....اسی مٹّی کا یہ جسم ہے..... چلو..... میں تمہیں راستہ بتاتا چلوں گا.....بس فی الحال سیدھ میں آگے بڑھتے چلو ...مگر جلدی جلدی نہیں..... دھیرے دھیرے۔ایک مدت کے بعد یہ سب دیکھنا مقدر ہوا ہے تو راستے کے سارے مناظر کو جذب کرنا چاہتا ہوں۔''

رات بھر مرکزی کردار اور رکشے پر سفر کا سلسلہ اپنے تمام تر ڈرامائیت کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔کبھی جانے پہچانے راستے اجنبی ہو جاتے ہیں، کبھی آبادیاں انجانی بن جاتی ہیں۔حالت یہ ہوتی ہے کہ ساری تلاش و جستجو کے باوجود وہ گھر نہیں ملتا ہے۔مرکزی کردار کے متوازی ایک ہم زاد بھی ہوتا ہے جو اس کے اندر سے نیا سوال پیدا کر دیتا ہے۔ذیل کا اقتباس ہمیں ایک شبہے میں ڈالتا ہے کہ اس کا گھر ہے بھی یا نہیں؟ گھر تھا بھی یا نہیں؟ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بد بخت تیرا گھر اور تیرا علاقہ ہے....؟''

اسے جیسے سکتہ لگ گیا۔چہرہ سرخ ہو گیا۔رکشے والے نے اسے جھنجھوڑا تو اس کا سکوت ٹوٹا۔

سچ مچ میرا کوئی گھر اور میرا کوئی علاقہ کہاں ہے.....؟''

''اس بار مسجد والے راستے سے چلو.....!''

نتیجہ پھر وہی چٹیل میدان۔مندر والا راستہ بھی چٹیل میدان ہی تک پہنچا۔یہاں تک کہ چرچ اور گوردوارے کے راستے بھی اسے چٹیل میدان کے علاوہ اور کہیں نہیں پہنچا سکے۔

اندھیری رات میں رکشے کے سفر میں شہر کی صورتِ حال اور ناولٹ کے ماحول سے جوڑے رکھنے کے لیے گھوڑوں کی ٹاپ، سرپٹ دَوڑنا اور کسی کے تعاقب میں کسی قوت کا آگے بڑھتے جانا بھی سامنے آتے رہتا ہے۔رکشے والے نے تیز قدموں سے ایک مرحلے میں رکشا بڑھانا جب شروع کیا تو مرکزی کردار سے دورانِ گفتگو میں رکشے والے کا یہ بیان ابھر کر سامنے آتا ہے۔چند جملے ملاحظہ ہوں:

''نہیں معلوم کیوں بابو جی.....کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ اَن گنت بھاری بھرکم بوٹ گھوڑوں کی ٹاپوں کی طرح سرپٹ دوڑتے ہوئے میرے رکشے کا پیچھا کر رہے ہیں..... مجھے روندنے کے لیے میرے تعاقب میں ہیں.....''

گھر کی تلاش کا سادہ سا عمل رفتہ رفتہ پیچیدہ، الجھنوں سے بھرا ہوا اور پُر اسرار ہوتا جاتا ہے۔کہانی کا سلسلہ پیچھے سے جوڑیں تو محسوس ہوتا ہے کہ فساد اور ترقی کی معکوسی دوڑ کے بگاڑ کو یہاں بہ نظرِ توجہ شامل کیا گیا ہے۔اس باب کے آغاز میں جب کسی عام راہ گیر سے بجلی نہیں ہونے کا سبب یہ مرکزی کردار پوچھتا ہے تو اس موقعے پر چند مکالمے اس طرح ادا ہوتے ہیں:

''کیوں بھئی....لائٹ کب سے آف ہے.....؟''

''کیا کہا جائے بابو جی..... جب سے بڑے شہر میں بجلی کی سپلائی بڑھ گئی ہے، یہاں کا کوٹا کاٹ دیا گیا ہے.....

''بہت دیر کے لیے روشنی غائب رہتی ہے....اور آس پاس جو گاؤں ہیں، ان کا تو حال پوچھو ہی مت....بجلی کے کھمبے ہوتے ہوئے بھی سب ایک کرن کو ترستے ہیں.....کہیں کوئی پیداواری ہی نہیں ہوئی!''

شوکت حیات اس باب میں تجسس اور پر اسراریت کو اپنی مٹھی میں قید کر کے رکھتے ہیں۔اسی بیان کی طاقت کے سبب وہ قصے کو رکشے والے کے ساتھ اندھیری رات میں صبر و ضبط کے ساتھ بڑھاتے رہتے ہیں۔رات بھر ایک دوسرے کی رہنمائی کرتے ہوئے یا ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے کسی عالم

میں ایک دوسرے کے داخل میں اتر آتے ہیں۔ مرکزی کردار خود رکشا چلانے لگتا ہے اور رکشے کی سیٹ پر رکشے والے کو بٹھا دیتا ہے۔ عین اسی وقت رکشے والا زار و قطار رونے لگتا ہے۔ بے خودی میں وہ پھٹ پڑتا ہے اور ایک حقیقی بات بول جاتا ہے جس میں مرکزی کردار کا گھر ہی نہیں غائب ہوا، رکشے والے کا بھی ذاتی مکان اس کی نذر ہوا۔ روتے ہوئے رکشے والے کی گفتگو ان لفظوں میں ادا ہوتی ہے:

> ''تم جس علاقے، جس بستی کو ڈھونڈ رہے ہو، اسے عرصہ پہلے بلڈوزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا..... میں بھی ہفتوں اسی طرح پورے شہر میں دیوانہ وار پاگلوں کی طرح چکّر کاٹتا ہوا بار بار اسی چٹیل میدان تک پہنچتا تھا..... بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا..... بھری پُری بستی کو ملبے میں تبدیل کیا اور پھر چٹیل میدان بنا دیا ..... میری دکان، میرا گھر اور تمام اہل و عیال زندہ درگور ہو گئے..... بیٹے میں نے تو صبر کر لیا تھا لیکن آج بار بار اس چٹیل میدان کو دیکھ کر پُرانے زخم ہرے ہو گئے..... بابو جی بابو جی..... تم سن رہے ہو.....؟''

یہ باب شہر کاری، اس کے عتاب، کمزور لوگوں اور پرانی تہذیب کے بہ تدریج مٹنے کی کہانی بن گیا ہے۔ ترقی کی دَوڑ اور اس اندھیرے سفر میں ہم سے کیا کیا لٹتا جا رہا ہے، اس کا کوئی احتساب نہیں کر رہا ہے۔ شوکت حیات نے اس باب سے اس ناولٹ کی فکری دنیا کو مزید استحکام بخشنے میں کامیابی پائی ہے۔ 'سرپٹ گھوڑا' میں شروع سے پراسراریت، ایک گم شدگی اور متوقع، حادثات کی فضا قائم رہتی ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپ سے لے کر پرندوں کی سرگرمیوں میں ان کے اثرات آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ فساد کی کیفیت اور بچے کی حیات و موت میں مبتلا ہونے کی بے یقینی اس پراسراریت کو مہیب اور بتدریج خوفناک بناتی جاتی ہے۔ اس باب کی کہانی نہایت مختصر ہے۔ مرکزی کردار اپنے گھر کو تلاش نہیں کر پاتا ہے اور شکست خوردگی میں باب مکمل ہوتا ہے۔ اب قصہ پھر سے اسپتال اور بچے کی بیماری اور اس کی بے یقینی صورت حال میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ ناولٹ ملک کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی پیش کش اور ذہنی تبدیلیوں کا مرقع تو ہے مگر اسے سیدھے طور پر تسلیم کرنے کا کوئی رویہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ شوکت حیات اس بدلتے ہوئے ماحول، کھلے فرقہ وارانہ بٹوارے کو خوش دلی سے قبول نہیں کرتے۔ سماجی حقیقت پیش کرنے کے لیے انھیں ضرور دکھانا تھا کہ ہمارا معاشرہ بہت آسانی کے ساتھ بدل گیا اور فرقہ وارانہ تقسیم کے ثبوت بھی واضح ہیں مگر اس کی پیش کش میں شوکت حیات نے قدم قدم پر جرح، ردّ و قدح اور فکری مجادلوں کے مرحلے سے یہ سندیش بھی دیا ہے کہ اس تبدیلی کو سب نے بہ خوشی قبول نہیں کیا۔ رہ رہ کر مختلف کرداروں کے درمیان جو مباحثے ہوتے رہتے ہیں، اُن میں اس بکھراؤ کو قبول نہیں کرنے والے

افراد بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ یہی نہیں، کہانی کا مرکزی کردار ہر مذاکرے کا حصّہ ہے اور اس فرقہ وارانہ تقسیم کو ایک لمحے کے لیے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بحث و مباحثے میں بھی اُس کی دلیلیں فرقہ پرستی کی دلیلوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور اُس کا اعتماد ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اپنے گھر میں بھی بچے کے علاج کے سلسلے سے ڈاکٹر کے انتخاب کے مرحلے میں اگرچہ بیوی اور ہم زلف کی رائے اپنے ہم مذہب ڈاکٹر سے رجوع کرنے کی ہے۔ مگر یہ شخص اُسی ڈاکٹر کے پاس اپنے بچّے کو لے جاتا ہے جو اچھا تو ہے ہی مگر دوسرے مذہب سے اُس کا رشتہ ہے۔ جہاں جہاں ایسی تبدیلی اُسے نظر آتی ہے، اُس میں انسانی سوز اور دردمندی کے ساتھ ایک بے چارگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے جس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ شوکت حیات سماج کے اندر ایسی قوتوں کی شناخت بھی کرنا چاہتے ہیں جن کے دماغ نہیں بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی و خیر سگالی پر جنھیں پورا پورا بھروسہ ہے۔

شوکت حیات ناول کی حد تک مشاق نہیں کہے جا سکتے۔ افسانے کی دنیا میں ایک طویل ریاضت سے ان کا فنی شعور وضع ہوا ہے۔ اُن کے افسانوں میں عورتوں کے کردار زیادہ مستحکم کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ شموئل احمد کی طرح شوکت حیات اپنی تحریروں میں ہر چند کہ عورتوں کے رسیا نہیں مگر ہم عصروں کے یہاں لاشعوری کے طور پر بھی لین دین کا ایک سلسلہ رہتا ہے۔ ناول کے پہلے باب میں ہی جس زہریلے پمفلٹ کا تذکرہ شروع ہوا ہے، اُس میں ذیل کی سطریں توجّہ سے پڑھی جانی چاہیے:

> ''ان کے گھروں میں کام کرتے وقت عورتوں کو رجھانے اور پھنسانے کی کوشش کرو اور اپنے لِنگ انھیں دکھاؤ تا کہ وہ تم میں دلچسپی لیں اور پھر موقع پا کر ان کے ساتھ بدکاری کرو۔''

'شب خوں' میں شایع ہوتے ہوئے اس اقتباس کا لفظ ('لنگ') غالباً مدیر کی توجّہ سے (ڈنڈبل) ہو کر تحریر کی تہذیب اور ناموس کے مدِّ نظر قارئین کے سامنے آتا ہے۔

عورتوں کے جسم کے تعلق سے بڑھی ہوئی دل چسپی کا اظہار بارہویں باب سے پندرہویں باب تک جاری رہتا ہے۔ ایسا کہنا تو مشکل ہے کہ ایسی ساری تفصیلات غیر ضروری اور قصّے سے باہر کی دنیا سے متعلق ہیں مگر ایسا یقین نہیں آتا ہے کہ قصّے کی حقیقی اور فطری دنیا کا یہ سب حصّہ ہیں۔ یہ توجیہ پیش کی جا سکتی ہے کہ اسپتال کی مشکل اور حبس زدہ صورتِ حال میں قصّے کے مرکزی کردار کی ذہنی کیفیت ان تفصیلات سے ایک سہارا پا لیتی ہے۔ Emotional Relief کی کئی صورتیں ممکن ہیں اور پیچیدہ حالات میں یہ ناممکن نہیں کہ اپنے بچے کی بیماری کی الجھن اور لگاتار اسپتال میں قید ہوئے کردار کو پڑوس میں اک جسم و جان کی الڑھ کو دیکھنے، گفتگو کرنے اور اس کے سہارے خوابوں کی ایک لمبی دنیا تیّار کر لینے کو غیر فطری ماننا پورے طور پر

درست نہیں۔ ذیل میں چند مثالوں سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ شوکت حیات صرف احتجاج اور انقلاب کی کہانیا ں لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ زندگی کے نرم، ملایم اور اصل جذبوں کو مردانہ لذتیت کے ساتھ پیش کرنے میں خصوصی توجہ رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ 'سرپٹ گھوڑا' کے بنیادی قصّے میں رومانیت، شہوانیت یا ایسی کیفیات کے لیے کچھ خاص گنجائش چھیڑ کر قارئین کے ارتکاز ذہنی کا امتحان نہیں لیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ناول میں دل چسپی بڑھانے یا قارئین کی توجہ مبذول کرانے کے لیے تھوڑا سا نمک یا مسالے کا اضافہ کیا ہے۔ چند اقتباسات بغیر تبصرے کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

■ ''اس کے باوجود کس کر لپیٹی ہوئی آسمانی رنگ کی ساری، اور تنگ سلیولیس اور بیک لیس بلاوز سے اس کا گدرایا ہوا جسم ابلا پڑ رہا تھا۔ مصیبت کے ان ناگوار لمحوں میں بھی وہ اس کے بدن کی جگمگاہٹ دیکھ کر مسحور اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔

■ ''بھینی بھینی خوشبو سے معطر عورت کا گداز کولھا مرد کی گود گرما رہا تھا۔ ہوش اڑا دینے والے مدور اشتعال انگیز کولہے مرد کے اندر شدید ابال پیدا کر رہے تھے۔ ان کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

عورت کے بدن کی گداز چرب دار پہاڑی کی سخت و نرم گولائیوں کے لمس سے مرد کے جسم میں شرارے چھوٹ رہے تھے۔

خون کا درجہ حرارت بڑھ گیا۔

نسیں پھٹنے لگیں۔

سانسیں تیز تیز اور تیز۔

گھوڑے کی چکنی پیٹھ پر سوار مرد اور عورت اشتعال انگیز ہچکولے کھا رہے تھے۔

کیف و مستی کے عالم میں قطرہ قطرہ دونوں کا وجود پگھلتے ہوئے ایک دوسرے میں سرایت کر کے ضم ہونے کا سفر اختیار چکے تھے۔''

ناول کا چوتھا باب جس کا عنوان 'مسجد کا امام' ہے، خلافِ معمول ایک نئے موضوع اور صورتِ حال کا عکّاس ہے۔ شوکت حیات مزاج سے یک سر مذہبی نہیں تھے اور اُن کی تحریریں کھلے طور پر اعلان کرتی ہوئی ملتی ہیں کہ وہ مذہبی سماج سے خود کو الگ رکھنے کے ہی خوگر تھے۔ فساد کے ماحول میں یہ باب بڑے نپے تلے انداز میں لکھا گیا ہے۔ مسجد کا امام نوجوان ہے، صحت و تندرستی کا مالک ہے اور دلیر بھی ہے۔ محلّے میں مخالف صنف میں اس کی خاموش مقبولیت کی وجہ سے اپنے ہم مذہب جوانوں میں اُس کے تئیں ایک جذبۂ رقابت

پیدا ہو جاتا ہے۔ فسادات کے دوران محلّے کے نوجوان مسلمان اُسے مار کر کنواں میں پھینک دیتے ہیں اور اِس طرح اُسی فرقے کے افراد کے ہاتھوں اُس امام کا قتل ہوتا ہے۔ شوکت حیات نے اِس باب کو بڑے نپے تلے انداز میں، بغیر کسی اشتعال کے اور نمک مرچ لگائے بغیر مکمّل کیا ہے۔ موضوع پر اُنھیں پورے طور پر قدرت حاصل ہے اِس لیے نہ اِسے چٹخارا بننے دیتے ہیں اور نہ ہی کسی سنسنی خیز کیفیت تک پہنچا کر قارئین کو الگ تھلگ کر دیتے ہیں۔ محض پانچ صفحات میں مکمّل ہوا یہ باب اپنے آپ میں ایک بہترین تخلیقی شہ پارہ ہے۔

پہلے باب میں ہی محض چار صفحے کے بعد پیڑوں پر بیٹھے رنگ برنگے پرندے اپنے پروں کو پھیلا تے ہوئے تیزی سے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صرف 'گنبد کے کبوتر' کو مت سوچیے، شوکت حیات کے یہاں گھونسلا، کوّا، تھکا ہوا پرندہ، شتر مرغ جیسے افسانوں کی آمد یوں ہی نہیں ہوئی ہے۔ پرندے شوکت حیات کے یہاں اپنے عہد اور زندگی کے کچھ ایسے زندۂ جاوید کردار کے طور پر نظر آنے لگتے ہیں جیسے یہ محسوس ہو کہ 'پنچ تنتر' اور 'منطق الطیر' کے صفحات ہم ملاحظہ کر رہے ہوں۔ یاد رہے کہ شوکت حیات بیانیہ کی اس روایت کے پیروکار نہیں، اس لیے اس کی تجرید کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ ایک ایک جملے یا بیان کی ایک لہر میں تہذیبِ انسانی کا ایک لمحہ یا ایک مکمّل دَور پیشِ نظر ہے۔

بے شک 'گنبد کے کبوتر' میں ان کا فن حیرت انگیز منتہا پر ہے۔ مگر 'سرپٹ گھوڑا' میں بھی الگ الگ ابواب میں کم از کم دس بار یہ پرندے آتے ہیں۔ کبھی زخم دے جاتے ہیں اور کبھی خود زخم سے نڈھال نظر آتے ہیں۔ کبھی ان کے پر ہمیں بے چین کرتے ہیں تو کہیں خود ان کی اڑان میں تھک جانے کی کیفیت نظر آتی ہے۔ زندگی کی یہ وہ انجانی سطحیں ہیں جہاں فکشن میں بیان اور شعر میں الفاظ تھکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی مرحلے میں بڑا فن کار استعارے گڑھتا ہے اور پیکر بناتا ہے۔ تجرید کا ایک مشکل عمل شوکت حیات کے یہاں معنوی ترسیل کے امکانات کے دروازے پہلے سے ہمارے سامنے کھلے طور پر پیش کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اس ناول کا نام 'سرپٹ گھوڑا' کیوں رکھا گیا؟ ناول کے چھٹے باب میں پہلی بار یہ گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس باب کا عنوان 'پُر اسرار گھوڑے کی ٹاپ' رکھا گیا ہے۔ چھٹے باب سے لے کر ناول کے اواخر تک گھوڑے کی ٹاپ موجود ہے۔ کسی بڑے فن کار کے کسی خاص استعارے کو حتمی طور پر یہ بتا دیا جائے کہ اس کا کون سا مفہوم یقینی ہے تو سچی بات یہ ہے کہ اس کا طلسم ہی ضائع ہو جائے گا۔ ممکن ہے، شوکت حیات کے ذہن میں 'سرپٹ گھوڑا' اقتدار اور استحصال کی قوتوں کے شکنجے کا بہ تدریج حاوی ہونے کا اشاریہ ہو مگر ناول میں جس طرح رہ رہ کر سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ اور اس کی آوازوں کا بہ تدریج بڑھنا معلوم ہوتا رہتا ہے۔ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ معنی شاید اس حد کو متعین کر دے۔ گھوڑا طاقت کا استعارہ

ہے۔سوؔدا نے اسے زوال کی علامت بنا کر پیش کیا ہے ایم۔ایف۔حسین نے اس گھوڑے کو شہوانی قوت کے طور پر رنگوں کے امتزاج سے تیار کیا ہے۔شوکت حیات بھی اس استعارے کو کچھ اور بڑے معنوں میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ناول کے آغاز میں انھوں نے غالب کا مشہور شعر یوں ہی نہیں پیش کیا ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

پہلا مطلب تو یہی واضح ہے کہ یہ 'سرپٹ گھوڑا' اصل میں زندگی کی قوت ہے۔ہار اور جیت، دوڑ اور بھاگ، سب سے ہم آخر پائیں گے کیا؟ اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ناول اپنی زندگی کی ہار اور جیت کی کہانی ہے اور 'سرپٹ گھوڑے' کی ٹاپ رفتہ رفتہ اور مدھم اور ختم ہونے کی نشانی ہے۔غالب کے شعر کو پیش کرتے ہوئے شوکت حیات نے اسی طرف ہمارے ذہن کو لے جانا چاہا ہے۔

مگر اچھا تخلیقی فن کار اپنے پڑھنے والوں کا امتحان لیتا ہے۔غالب کو تو اس کے لیے شہرت حاصل رہی ہے کہ معنی کی جتنی سطحیں آپ طے کریں، وہ اس سے سوا نظر آئیں گے۔شوکت حیات اگر اپنی زندگی یا اپنے گھر یا اپنے ماحول کی زندگی کو مرکز میں رکھتے اور عمر کے گھوڑے کے بکھراو پر مرتکز ہوتے تو قصّے میں آخر بچے کے صحت مند ہونے اور رہ رہ کر زندگی کے نئے منظر ناموں کی تلاش کے مراحل کیوں کر ابھر کر سامنے آتے۔سولہواں باب جو حقیقت میں محض چند لفظوں میں مکمل ہوا ہے۔اس میں ناول نگار نے جس احتیاط اور انضباط کے ساتھ واقعات جلدی جلدی میں جوڑے ہیں۔وہاں آخر میں یہ حالت ہو جاتی ہے کہ مرکزی کردار کی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں ہوتا۔یہ ایک دو انسانی زندگی کا زخم نہیں بلکہ تاریخ و تہذیب اور حیات و کائنات کی ازلی اور ابدی حقیقتوں کا وہ منظر نامہ سامنے آجاتا ہے جس کو میؔر نے کہا: ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں'۔شوکت حیات نے واقعی حیاتِ انسانی کا نوحہ اس ناول کے چند صفحات میں سمو دیا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

202, ABU PLAZA, NIT MORE,
Ashok Rajpath, Patna: 800006 BIHAR
EMAIL: safdarimamquadri@gmail.com
Mob: 09430466321

● ڈاکٹر سید احمد قادری

شوکت حیات اور ان کے افسانے

شوکت حیات کا پہلا افسانہ ''بکسوں سے دبا آدمی'' عابد سہیل، لکھنؤ کے مشہور زمانہ رسالہ 'کتاب' میں ۱۹۷۰ء کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔یہ افسانہ بقول شوکت حیات فاشزم کے خلاف زبردست احتجاج پر مبنی تھا۔اس افسانہ سے ان کا افسانوی سفر شروع ہوا اور بہت جلد انھوں نے اپنے منفرد اسلوب اور موضوعات کے تنوع کے باعث افسانوی ادب کے افق پر چھا گئے۔لیکن انھیں یہ احساس ہمیشہ کچوکے لگاتا رہا کہ ان کی ادبی تپسیا کا انھیں جو صلہ ملنا چاہئے تھا۔وہ انھیں نہیں ملا، اس کا قلق انھیں ہمیشہ رہا۔

شوکت حیات کا شمار ان خوش نصیب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کے ذکر کے بغیر ان کے عہد کی افسانہ نگاری کا کوئی بھی تذکرہ مکمل نہیں ہوا۔بہار سے تعلق رکھنے والے ۱۹۷۰ء کے بعد کی دہائی کے کئی افسانہ نگاروں میں ایک تثلیث شوکت حیات، شفق اور حسین الحق کی ہوا کرتی تھی، بلکہ ہندو پاک کے اس دور کے افسانہ نگاروں کے سلسلے میں بھی کوئی تذکرہ یا مضمون ہوتا، ان میں بھی شوکت حیات تقریباً پہلے نمبر پر ہی ہوتے تھے۔اتنی اہمیت کے باوجود شوکت حیات کو ہمیشہ اس بات کا شکوہ رہا کہ افسانوی ادب میں ان کی خدمات کا جو صلہ ملنا چاہئے، وہ انھیں نہیں ملا۔اپنے آپ کو پوری طرح افسانوی ادب میں گم کرنے والا یہ فنکار معاشی بدحالی کا بھی شکار رہا اور گھریلو مسائل سے بھی دوچار رہا۔ان مخالف حالات نے شوکت حیات کے اندر جھنجھلاہٹ اور دماغی الجھنوں نے جگہ لے لی تھی۔ان کا مطالعہ بلا شبہ گہرا تھا اور وہ سماجی، سیاسی، معاشرتی تبدیلیوں پر بڑی گہرائی سے سوچتے، سمجھتے تھے۔اشتراکی نظریہ سے وابستگی ان کے عہد کی خاص بات تھی اور اس دور کے بیشتر فنکار اور دانشور کا بائیں بازو سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ان کی آواز پاٹ دار تھی۔اس لیے جب کبھی وہ تقریر کرتے تو اپنے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربات کا ایسا دریا بہاتے کہ مجمع میں موجود ہر شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔جدیدیت کے عروج میں ان کے ابتدائی چند افسانوں نے جدید ناقدین اور مدیران کی توجہ مبذول کرالی تھی۔اس وقت کلام حیدری صاحب ترقی پسندی اور جدیدیت کے دوراہے پر کھڑے تھے۔انھوں نے اپنے بعد کی نئی نسل کے کئی شاعروں اور افسانہ نگاروں کو بطور خاص اپنے رسالہ ''آہنگ'' میں ''میں کا تعارف'' کے ساتھ ان کی تخلیقات کو ایک ساتھ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

شوکت حیات پر خصوصی گوشہ کلام حیدری صاحب نے ۱۹۷۱ء کے ۲۱۔۲۲ کے شمارہ میں پیش کیا تھا۔ اس خصوصی شمارہ سے قبل شوکت حیات کا ایک افسانہ بہ عنوان ''میں تم وہ میں'' اسی سال کے 'آہنگ' کے شمارہ نمبر ۱۳ر میں کلام حیدری شائع کر چکے تھے۔ شاید اسی افسانہ سے کلام حیدری نے شوکت حیات کے اندر افسانہ نگاری کی بلند پرواز کا اندازہ لگایا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے انھیں اپنے رسالہ میں اس انداز سے متعارف کرایا کہ شوکت حیات کے افسانے افسانوی ادب میں دھوم مچانے لگے تھے۔ شوکت حیات کے نام ''آہنگ'' کے اس خصوصی گوشہ میں شوکت حیات کے 'بکسوں سے دبا آدمی' 'میں تم وہ میں' 'پنڈولم' 'سبز منڈیر پر سیاہ کبوتر' 'دائرے کے کنارے' 'قطبین کے بیچ' اور 'ہواؤں کی زد میں' عنوانات سے سات عدد جدید افسانے شامل تھے۔ اس خصوصی گوشہ کی اشاعت کے بعد تو شوکت حیات کی شہرت کو پر لگ گئے۔ ہر طرف شوکت حیات کے چرچے ہونے لگے۔ ان کے افسانے کو کچھ نے سمجھنے کا دعویٰ کیا تو کچھ نے اپنی نارسائی کا اعتراف کیا۔ کئی افسانوں پر کچھ مثبت اور کچھ منفی باتیں بھی ادبی نشستوں میں ہوئیں۔ شوکت حیات کے یہ افسانے شہرت کے لیے زینہ ضرور بنے، لیکن خود شوکت حیات کی نگاہ میں وقت گزرنے کے ساتھ یہ افسانے قابل قدر نہیں رہے کہ انھوں نے ان افسانوں کا کبھی ذکر کیا اور نہ ہی ان میں سے بیشتر افسانوں کو اپنے افسانوی مجموعہ میں شامل کیا۔ اس کیا وجہ رہی یہ بہت ہی تفصیل طلب بحث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں جب علامتوں، استعاروں اور تشبیہات کا جادو فنکاروں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ہر چھوٹا بڑا فنکار جدیدیت کی دوڑ میں آگے نکل جانا چاہ رہا تھا اور اپنی شناخت بنانے کے لیے اپنے جدید افسانوں کی طرح طرح کی تاویل اور تشریح دے رہا تھا۔ نیز تجریدی، تمثیلی اور علامتی و استعاراتی افسانوں کو صنف افسانہ کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جا رہا تھا۔ اس بے راہ روی کے شکار ہونے والوں میں قمر احسن، بلراج مینرا، حمید سہروردی، سریندر پرکاش، شوکت حیات، انیس رفیع، رشید امجد، مرزا حامد بیگ وغیرہ کے نام اس زمانے میں موضوع بحث بنے لیکن ان افسانہ نگاروں میں سے جینوئن افسانہ نگاروں نے اینٹی پلاٹ، اینٹی اسٹوری، اینٹی ہیرو، سرریلزم اور شعور کی رو کی بھول بھلیوں میں خود کو زیادہ نہیں بھٹکایا اور بہت جلد انھیں اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے خاتمہ کا خدشہ بھی ستانے لگا تھا۔ ان افسانہ نگاروں نے بڑی شدت سے اس بات کو بھی محسوس کیا کہ صرف ذات کی تنہائی، کرب، گھٹن، خوف اور تذبذب میں محدود رہ کر اور معاشرتی، وسماجی مسائل سے جڑے بغیر افسانہ، قاری کو متوجہ نہیں کر سکتا۔ افسانہ یقینی طور پر افسانویت، ماجرا، پلاٹ اور کردار کے بغیر ادھورا ہے، اور یہ عناصر افسانے میں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شوکت حیات نے بھی جدیدیت کے علمبردار ہونے کے

باوجود جدیدیت کی بھول بھلیوں میں خود کو زیادہ نہیں بھٹکایا اور اس بات کو محسوس کیا کہ افسانوں میں علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں سے حسن تو پیدا کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ افسانے میں ان کی ضرورت ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترکیبیں افسانے میں خود بخود فنکارانہ طور پر در آتی ہیں، جو افسانے کے موضوع اور فن کو جلا بخشتی ہیں۔ افسانے کے موضوعات، عہد اور زمانے کے مطابق بدل سکتے ہیں اسلوب اور اسٹائل بدل سکتا ہے لیکن افسانے کے جو بنیادی تقاضے، افسانویت، ماجرا سازی اور کردار نگاری' لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں جو کامیاب افسانے کی ضمانت بنتے ہیں۔

جدیدیت اور فیشن زدگی کے اس دور کے بیشتر شہرت پائے ایسے افسانوں کو نہ صرف قاری نے بلکہ خود تخلیق کار نے ردّ کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں ہی اردو افسانہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تو ایسے افسانوں کے ساتھ ساتھ ایسے افسانے لکھنے والوں کو بھی دفن کر دینے کی بات کہی تھی۔ حالانکہ یہ وہی شمس الرحمٰن فاروقی تھے جنھوں نے اپنے رسالہ 'شب خون' میں جدیدیت کے نام پر ایسے افسانوں اور افسانہ نگاروں کو خوب خوب بانس پر چڑھانے کی کوشش کی تھی۔

بہر حال شوکت حیات کی شہرت کا وہ دور بھی رہا جب دہلی کے جامعہ ملیہ میں ۱۹۷۱ء میں منعقد ہونے والے سہ روزہ ہندو پاک سیمینار اور گوپی چند نارنگ نے اردو افسانہ روایت اور مسائل ۱۹۸۰ اور اردو افسانے پر ایک بین الاقوامی نوعیت کا پانچ روزہ اردو افسانہ ورک شاپ ۱۹۸۵ء کا انعقاد کیا تھا۔ مابعد جدیدیت کے حوالے سے ۱۹۹۷ء میں بھی ایک سیمینار کا انعقاد ہوا تھا۔ ان تمام سیمینار میں شوکت حیات سمیت ملک و بیرون ملک کے بہت سارے افسانہ نگار اور فکشن کے ناقدین نے شرکت کی تھی۔ اس فکشن سیمینار میں شوکت حیات کے افسانے اور تقاریر کی خوب پذیرائی ہوئی تھی اور شوکت حیات پوری طرح چھائے رہے تھے۔ خود شوکت حیات نے اپنے دور کے افسانوں کے ضمن میں یہ کہتے نظر آئے کہ.....

''سچ پوچھئے تو ہم ہی لوگوں نے (۱۹۷۰ کے بعد والوں نے) اردو افسانے میں تخلیقی آزادی کی فضا بحال کی''۔ اپنی تھیوری کے تعلق سے شوکت حیات نے اپنے افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' کے پہلے صفحہ پر درج کیا تھا کہ ''غیر روایتی، غیر ترقی پسند، غیر جدید، غیر مابعد جدید افسانے جنھوں نے ''انامیت''، نامیاتیت'' اور سارک رائٹرس کانفرنس ۲۰۰۵ء علی گڑھ کے موقع پر ''امکانیت پسندی'' کی تھیوریز دیتے ہوئے انام افسانے اور امکانی افسانوں کی بنیاد گزاری کی ہے۔ ان کے خد و خال کو متشکل کرتے ہوئے عصری و آفاقی افسانوں کی تخلیق کی ہے۔''

اپنی ان باتوں کی وضاحت کے لیے انھوں نے بلاشبہ کئی مضامین بھی لکھے اور اپنے انٹرویوز میں

بھی اپنی تھیوری پر دانشوارانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ جو اس دور میں بحث ومباحث کے موضوع بھی بنے۔ اردو، ہندی، انگریزی اخبارات نے بھی شوکت حیات کی تقاریر کو بہت نمایاں طور پر شائع کیا کرتے تھے۔ خاص طور اس زمانے کے ایک ہندی ہفت روزہ رسالہ 'دِنمان' نے شوکت حیات کی باتوں کو کافی نمایاں طور پیش کیا تھا۔ بعد میں گوپی چند نارنگ نے اس پورے پانچ روزہ فکشن سیمینار/ ورکشاپ میں پڑھے گئے افسانوں اور ان افسانوں پر ہونے والے تجزیوں کے ساتھ ساتھ پوری کاروائی کی تفصیل ضخیم کتاب ''نیا اردو افسانہ: انتخاب، تجزیے اور مباحث'' مرتب کر شائع کی تھی۔ جو اس دور کے افسانوی ہنگامہ آرائی اور جاری سفر پر بلا شبہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس افسانوی ورکشاپ پر کلام حیدری صاحب نے تو اپنے رسالہ ''آہنگ'' کا ایک خصوصی شمارہ ہی اپریل ۱۹۸۵ء میں شائع کر دیا تھا۔ جس میں بہت سارے اور بڑے اہم تبصرے شائع ہوئے تھے۔ اس عالمی نوعیت کے افسانوی ورکشاپ/ سیمینار کی ایک خاص بات یہ ہوئی تھی کہ میں نے ابتدا میں جس تثلیث کی بات ہے، یعنی شوکت حیات، شفق اور حسین الحق۔ اس تثلیث کے تیسرے نام یعنی حسین الحق کو گوپی چند نارنگ نے مدعو نہیں کیا تھا۔ جس کے باعث وہ بہت زمانے تک نارنگ سے خفا خفا رہے تھے۔ دہلی کے اس مزکورہ فکشن سیمینار اور پھر ۲۰۰۵ء میں سارک رائٹرس کانفرنس میں افسانوں کے فنی، فکری، حرکی، ہیتی جدلیاتی، ریڈیکل اور امکانی اختصاص پر شوکت حیات نے بہت واضح طور اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جن پر کچھ لوگوں نے جہاں حمایت کی وہیں اختلاف بھی ہوا۔ اردو افسانے کے لئے وہ وقت کئی لحاظ سے اہم تھا کہ اردو افسانے کی بنیادیں ہل رہی تھیں اور بقول کلام حیدی.....

''جتنی بڑی تعداد میں میرے ہم عمر ہونہار افسانہ نگار اردو میں معتبر ہو سکتے تھے، ان کی اچھی خاصی تعداد تھک ہار کر راستے میں ہی رہ گئی۔ یہ تو جوگندر پال، رام لعل، غیاث احمد گدّی، احمد یوسف اور خاکسار کی ڈھٹائی ہے کہ وہ یہاں تک پہنچے، مگر اس حال میں پہنچے کہ ہم سب لہولہان ہیں۔''

لیکن حقیقت یہ تھی کہ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اپنے ان تمام تخلیقی اور عہد کے بدلتے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے شوکت حیات بڑی دل جمعی کے ساتھ افسانے لکھتے رہے اور اپنی شہرت ومقبولیت میں اضافہ کرتے رہے۔ اسی زمانے میں، میں نے اپنے ہفتہ وار اخبار ''بودھ دھرتی'' میں مختلف شخصیات پر گوشے شائع کر رہا تھا۔ شوکت حیات نے مجھ سے اپنا گوشہ نکالنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ سرورق پر ان کے شاندار اسکیچ کے ساتھ ''ایک شمارہ شوکت حیات کے نام'' ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو شائع کیا۔ جو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا تھا۔ اسی خصوصی گوشہ میں شامل ہونے والے کئی مشاہیر ادب مثلاً نظام صدیقی، رام لعل، مظہر امام، حامدی کاشمیری، زبیر رضوی اور ناچیز کی آراٗ کو شوکت حیات نے اپنے افسانوی مجموعہ ''گنبد کے

کبوتر'' میں شامل بھی کیا ہے۔ اس خصوصی شمارہ کے اداریہ میں، میں نے شوکت حیات کے افسانوں سیاسی اور سماجی شعور نیز نئی حقیقت پسندی کی بابت اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ.....

''شوکت حیات نے جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں بھی زندگی کی شدتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں ہیئتی اور فنی تجربہ کرنے کے باوجود سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک طرح کی نئی حقیقت پسندی پر زور دیا ہے.....''

شوکت حیات کی خواہش تھی کہ 'بودھ دھرتی' میں شائع ہونے والے پورے مواد کو میں کتابی شکل میں ترتیب دے کر شائع کروں۔ میں رضامند بھی ہو گیا تھا۔ لیکن بہار اردو اکادمی کی مجلس عاملہ (اس وقت میں بہار اردو اکادمی کا ایکزیکیٹیو ممبر تھا) کی ایک میٹنگ میں دوست نوازی کے لیے ایک غیر اصولی تجویز کے ذریعہ بہار کے کئی نامور ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی حق تلفی کی دانستہ کوشش کی جا رہی تھی۔ میں نے شخص واحد (شوکت حیات) کے بجائے اصولی طور پر اس تجویز کی مخالفت کی اور اپنی بات میٹنگ میں منوا کر رہا۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی اکاڈمی کے سکریٹری نے اپنی خوشامدی ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے شوکت حیات کو فون کر دیا کہ میں تو تمہاری مجموعی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دے رہا تھا لیکن سید احمد قادری نے تمہاری مخالفت کر دی کہ انھیں پہلے ہی یہ اعزاز مل چکا ہے۔ اس بات کو سن کر شوکت حیات کافی چراغ پا ہوئے اور معاملہ نے طول پکڑ لیا۔ جس کی تفصیل اس زمانے میں کئی اخبارات میں بھی آئی تھی۔ وقت گزرتا رہا اور کچھ دنوں بعد شوکت حیات کا رویہ اعتدال پر آ گیا۔ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کے ایک پروگرام کے دوران ملاقات ہوئی تو وہ اسی طرح گلے لگ کر ملے اور شکوے گلے ختم ہو گئے۔ پھر پہلے کی طرح ان کے فون کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فون پر وہ اس بات کا شکوہ کرتے کہ ان کی ادبی تپسیا کا انھیں جو صلہ ملنا چاہئے تھا نہیں ملا۔ اس سلسلے میں وہ کئی لوگوں سے شاکی رہے۔ زمانے کے بے رحم رویہ پر وہ اندر ہی اندر پیچ وتاپ کھاتے رہے۔ یہاں تک کہ انھیں کئی طرح کی بیماریوں نے آ دبوچا۔ جب کبھی ٹھیک ہوتے مجھ سے فون پر بھول جانے کا شکوہ کیا کرتے تھے۔ میں انھیں دلاسہ دیا کرتا تھا کہ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور پہلے کی طرح متحرک اور فعال ہو کر افسانوی ادب میں تہلکہ مچائیں گے۔ لیکن افسوس کہ میرا دلاسہ حقیقت میں نہیں بدل سکا اور اس وقت جب افسانہ نگاروں، ناقدوں، شاعروں اور صحافیوں کا قافلہ سفر آخرت کی طرف رواں دواں تھا، شوکت حیات بھی ۲۱/ اپریل ۲۰۲۱ء کو ان کے ساتھ ہو لئے اور اس طرح یکم دسمبر ۱۹۵۰ کو میں آنکھیں کھولنے والا یہ ایک جینوئن فنکار شوکت حیات اپنے افسانوی سفر کو چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ بے چین آتما کو چین مل گیا ہوگا۔ شوکت حیات کے والد کا نام سید محمد محفوظ الحق تھا۔ جو شوکت حیات کو بچپن میں ہی داغ

مفارقت دے گئے ۔ والد کی محرومی کے اثرات شوکت حیات نے بہت شدت سے قبول کیا۔ اپنے افسانوی مجموعہ ’گنبد کے کبوتر‘ کے انتساب میں وہ اپنے والد کے تعلق سے لکھتے ہیں ’’والد سید محمد محفوظ الحق مرحوم کے نام جن کے مطالعے کے شوق اور مجھے دہلی کے سفر میں ڈائری لکھنے کی ہدایت نے مجھے افسانہ نگار بنا دیا..... بابا میں آپ کو بچپن سے مس کر رہا ہوں۔ بچپن میں ہی آپ کو کھونے کا دکھ میری زندگی کا سب سے بڑا غم ہے‘‘ اس غم اور دکھ کا اظہار شوکت حیات کے کئی افسانوں میں ملتا ہے۔ خاص طور پر افسانہ ’’گھونسلا‘‘ میں اپنے والد کے ساتھ ساتھ اپنی شاندار روایت، تہذیب اور اپنی جڑوں کی تلاش کی جو تڑپ ہے، وہ بہت گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ گھر کا بڑا ہونے کے ناطے انھیں گھر کی بہت ساری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑا ۔ شوکت حیات کے افسانوی مجموعہ کا پہلا افسانہ ’’کوبڑ‘‘ بظاہر ایک سیدھا سادہ افسانہ ہے، دو بھائیوں کے درمیان دولت کا حائل ہونا۔ بڑا بھائی پیار و محبت، ایثار کی دولت سے مالا مال ہے اور چھوٹے بھائی کو پٹرو ڈالر نے دولت مند بنایا ہے۔ لیکن لوگوں کے برتاؤ، میں محبت، ایثار کی قدر نہیں، قدر ہے تو اس دولت کی، جو چھوٹا بھائی مشرق وسطیٰ سے کما کر لایا ہے۔ لوگ اس دولت سے مرعوب ہیں، اس کی عزت و احترام، بڑے بھائی کے مقابلے زیادہ ہے، صرف اس لیے کہ روپئے پیسے اس کے پاس بے انتہا ہیں۔ چھوٹا بھائی جب واپس بیرون ملک جانے لگتا ہے تو وہ دہلی تک ہوائی جہاز سے جاتا ہے اور بڑا بھائی ٹرین سے۔ راستے میں لٹ پٹ جاتا ہے بھوکا رہتا ہے، لیکن اس کا چھوٹا بھائی اس کے حال پر ترس نہیں کھاتا۔ ہاں جب الواعی لمحے میں دونوں گلے ملتے ہیں، تو چھوٹے بھائی کا ہاتھ بڑے بھائی کی پیٹھ پر ابھر آئے کوبڑ کو چھو جاتا ہے۔

یہ کوبڑ، دراصل وہ کوبڑ نہیں ہے، جو عام طور پر لوگ دیکھتے اور سمجھتے ہیں، درحقیقت شوکت حیات نے اپنے فکر و فن کا بڑی چابکدستی سے مظاہرہ کرتے ہوئے عصر حاضر کی سماجی اور اقتصادی کوبڑ کو علامتی انداز میں دکھانے کی سعی کی ہے۔ جن لوگوں نے شوکت حیات کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس افسانہ کو پڑھنے کے بعد سمجھ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ دراصل شوکت حیات کے اپنے آنگن کا ہے۔ جس میں انھوں نے افسانوی رنگ و آہنگ سے انفرادیت بخشا ہے۔

شوکت حیات کے یہاں عصری مسائل، خواہ سیاسی ہوں سماجی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی ہوں۔ ان تمام مسائل پر ان کی فکرمندی اور فنّی ہنرمند دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شوکت حیات نے افسانوی ادب میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے اور وہ اپنے ہر قدم کے نشان بنانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ افسانوی ادب میں شوکت حیات نے جس حسن و معیار کے ساتھ گرانقدر اضافہ کیا ہے، انھیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس امر کا اعتراف کئی ناقدین ادب نے بہت ہی واضح طور پر کیا ہے۔ معروف نقاد پروفیسر

وہاب اشرفی کا شوکت حیات کے افسانوں کے سلسلے میں مجموعی تاثر یہ تھا کہ.....

’’وہ پختہ ذہن فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح متوازن بھی ہوتا ہے۔ کہیں کوئی لاتعلق دوغ دھبّہ نہیں۔ اب جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقعہ کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتاسر بڑھا دیتی ہے..... ایک انقلابی ذہن میں کیسی کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔ اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی‘‘۔

شوکت حیات نے جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں بھی زندگی کی شدتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں ہیئتی اور فنّی تجربہ کرنے کے باوجود سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک طرح کی حقیقت پسندی پر زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں شوکت حیات کے ابتدائی دور کے افسانے مثلاً ’’بانگ‘‘، ’’پاؤں‘‘، ’’تین مینڈک‘‘، ’’صدیوں کے لمحے‘‘، ’’ڈھلان پر رکے ہوئے قدم‘‘ اور سچویشن سیریز وغیرہ اور بعد میں سامنے آنے والے افسانے جیسے ’’خواب‘‘، ’’وبا‘‘، ’’جبین‘‘، ’’گھونسلا‘‘، ’’اتلاف‘‘، ’’ریگزار‘‘، ’’ستون‘‘، ’’پھسینڈا‘‘، ’’رانی باغ‘‘ اور ’’گنبد کے کبوتر‘‘ وغیرہ کئی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

شوکت حیات کا پہلا اور آخری افسانوی مجموعہ ’’گنبد کے کبوتر‘‘ ۲۰۱۰ء منظر عام پر آیا ہے۔ جس میں انہوں نے کل پچیس افسانوں کو منتخب کیا ہے۔ ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد بہت ساری رائے بن سکتی ہیں۔ لیکن سب سے اچھی رائے مجھے وارث علوی کی لگی وہ لکھتے ہیں:

’’شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پرواہ کرتے ہیں، نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہِ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔‘‘

اپنے افسانوی مجموعہ ’گنبد کے کبوتر‘ میں شوکت حیات نے ان ہی افسانوں کو ہی شامل کیا ہے، جو ان کے خیال میں جدید، مابعد جدید افسانے ہیں اور جو نامیاتی، امکانی، انامیت، نامیات کے قریب ہیں۔ ان افسانوں میں بلا شبہ عہد حاضر کے انسانی مسائل کو جس طور پر برتا گیا ہے ان میں انفرادیت کا پرتو نمایاں ہے۔ اس تناظر میں ’’کوبڑ‘‘، ’’گھونسلا‘‘، ’’میّت‘‘، ’’گنبد کے کبوتر‘‘، ’’اپنا گوشت‘‘، ’’رانی باغ‘‘، ’’مادھو‘‘، ’’مرشد‘‘، ’’سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ‘‘، ’’ڈھلان پر رکے ہوئے قدم‘‘، ’’بھائی‘‘، ’’مسٹر

گلیڈ''، ''تفتیش''، ''سرخ اپارٹمنٹ''، ''بانگ''، ''شکنجہ''، فرشتے''، ''بلی کا بچہ''، ''گھڑیاں''، ''رحمت صاحب''، ''کوّا''، ''چیخیں''، ''سکوت'' جیسے افسانے پورے اترتے ہیں نیز ان تمام افسانوں میں بیشتر افسانے ایسے ہیں جو نہ صرف مشہور ہوئے، بلکہ مقبول بھی ہوئے اور بحث مباحثہ کے موضوع بھی بنے ہیں۔اپنے ان افسانوں کے حوالے سے شوکت حیات کا خیال تھا کہ.....

''میرے افسانے اس تناظر میں دیکھیں جائیں کہ یہ وہ نئے جدید مابعد جدید افسانے ہیں جو دراصل نامیاتی، اور امکانی ہیں اور انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں۔ان افسانوں میں آج کے عہد اور آج کے انسان، اس کے مسائل کو نئے ڈھنگ، لہجے، تکنک، ٹریٹ منٹ، موضوع، فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہیں''

شوکت حیات کے اپنے افسانوں کے ضمن میں بیان کیے گئے خیالات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شوکت حیات نے زندگی کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور شدت سے محسوس کیا ہے۔مطالعہ کی گہرائی، مشاہدہ کی وسعت اور تجربات کی تپش نے ان کے بیشتر افسانوں میں حیات وکائنات کی جدت طرازی اور فنکارانہ حسن کی آمیزش سے افکار واظہار کا شاہکار بنانے کی کوشش کی ہے۔

اپنے عہد کے مسائل کو فکری وفنّی تقاضوں کو شوکت حیات نے اپنے افسانوں بخوبی برتا ہے۔اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی شوکت حیات کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''دوسری باتوں کے علاوہ ان کے یہاں جو خاص بات مجھے نظر آئی ہے وہ یہ کہ ان کی کہانیاں صرف سماجی شعور کا ہی پتہ نہیں دیتیں بلکہ ان کے یہاں 'سماجی ضمیر' کو پوری گہرائی کے ساتھ گرفت میں لینے کا رجحان بھی ملتا ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی نے شوکت حیات کے کس یا کن افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ رائے قائم کی تھی اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا۔لیکن جن لوگوں نے شوکت حیات کا افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' کو پڑھا ہے۔انھیں اس بات کا ضرور احساس ہوا ہوگا کہ شوکت حیات کے اس افسانے میں سماجی ضمیر کے احساسات کے ساتھ ساتھ اپنی گہری سیاسی بصیرت کا بھی احساس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس افسانہ کا پہلا پیراگراف بابری مسجد کے انہدام کے المناک سانحہ کی جانب اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اس افسانہ کا یہ

اقتباس ملاحظہ کریں۔

''بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔متواتر اڑتا جا رہا تھا۔اوپر سے نیچے آتا۔بیتابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اڑ جاتا...''

یہ افسانہ جس خوبصورتی اور فنکارانہ طور پر بُنا گیا ہے۔اس کی تعریف ہر طرف کی گئی ہے۔خود شوکت حیات کو اپنا یہ افسانہ کافی پسند تھا، یہی وجہ رہی کہ انھوں نے اپنے افسانوی مجموعہ کا نام اسی افسانہ پر رکھا۔ناقد وارث علوی نے اس افسانہ کے عنوان اور معنویت سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ .....

''گنبد جب تک تھا، علامت تھا ہماری تاریخ تہذیب اور مذہب کی۔اب نہیں رہا تو ایسا روحانی خلأ پیدا ہو چکا ہے جس کی ماہیت کا بھی ہمیں شعور نہیں۔اس خلا میں ان کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز گونجتی ہے جو گنبد کے نہ ہونے سے بے سہارا ہو گئے ہیں۔کبوتروں سے قطع نظر آدمی کا بے سہارا پن ایسے دور دراز اندیشوں کو جنم دیتا ہے کہ وقت کے بہاؤ میں اس کی شکستہ کشتی کو کوئی کنارہ مل سکے گا یا نہیں یا پھر یہ ہولناک انجام کا آغاز ہے۔''

شوکت حیات کے یہاں عصری مسائل، خواہ سیاسی ہوں سماجی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی ہوں، ان تمام مسائل اور موضوعات پر ان کی فکرمندی اور فنّی ہنرمندی بڑے ہی رچاؤ بساؤ کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔شوکت حیات نے افسانوی ادب میں اپنی ایک خاص شناخت بنائی ہے جو ہمیشہ قائم ودائم رہے گی، اس کا مجھے یقین ہے۔

◄◄ ● ►►

7- New Karim Gunj,Gaya-823001
Mob"99348 39110

نئی کتابیں

نام کتاب : بہار میں بچوں کا ادب کل اور آج مرتب : ڈاکٹر منصور خوشتر سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت : ۳۰۰ روپے	نام کتاب: محصور پرندوں کا آسمان مصنفہ: حمیرا عالیہ سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت : ۲۵۰ روپے

● ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

شوکت حیات کا افسانوی اختصاص

شوکت حیات ہمارے عہد کے اردو افسانے کی منفرد آواز تھے۔ ان کے اسلوب، لہجے اور موضوعات کی انفرادیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی افسانہ نگاری سب سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ بانگ، گنبد کے کبوتر، پھسینڈا، شکنجہ، سرخ اپارٹمنٹ، بھائی، کوا، کوبڑ، تفتیش، قرارداد، رحمت صاحب، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، ختم سفر کی ابتدا، ریپ، مادھو، سرپٹ گھوڑا، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، چیخیں، فارمولا اور مسٹر گلیڈ وغیرہ ان کے افسانوی شعور کی عظمتوں کی امین کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ ان کا خالق ایک زندہ، توانا اور متحرک فنکار ہے جس کی قوت متخیلہ نامیاتی، زرخیز اور کائنات گرد ہے۔

شوکت حیات خوشبوؤں، خوبصورتیوں، روشنیوں، رنگوں اور امن و آشتی کی متلاشی ایک بے چین و بے قرار شخصیت کے مالک تھے۔ یہ بے قراری اور بے چینی شاید اس لئے تھی کہ متعفن فضاؤں نے خوشبوؤں کو جلا وطن کر دیا ہے، بدصورت کرداروں نے خوب صورتیوں کو نیست و نابود کر دیا ہے اور اندھیروں نے اجالوں کو مقفل کیا ہوا ہے۔ شوکت حیات امن و آشتی کی جلا وطنی اور خوب صورتی و روشنی کی قفل بندی پر پُر زور احتجاج کرتے ہیں۔ بہتر دنیا، بہتر معاشرہ اور بہتر انسانوں کی جستجو ان کے آؤٹ لک کا خصوصی خاصہ ہے اس لئے وہ اس تلاش کو اپنے فن کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ وہ ناہمواریوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے صرف گلہ نہیں کرتے بلکہ ان سے ہمہ وقت ٹکرانے کو تیار بھی رہتے ہیں۔ اسی لئے ممتاز نقاد پروفیسر وہاب اشرفی نے انہیں بجا طور پر ''Protest کا فنکار'' قرار دیا ہے۔

شوکت حیات موجودہ عہد کے ایک جنوین اور سچے فنکار بھی تھے جو کسی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر صرف اپنے فکر و فن سے مطلب رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف تحریکوں اور رجحانوں کو دیکھا اور ان پر اپنی رائے بھی قائم کی مگر کبھی کسی تحریک و رجحان کے زیر اثر نہیں رہے اس لئے ان کی افسانہ نگاری کو کسی دبستانی فکر و سیاست سے وابستہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام نہاد اصولوں نے ان کے فن پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ وہ ہر محفل میں آزادی سے اپنی بات کہتے تھے اور ہر افسانے میں اپنا فنی اصول قائم رکھتے تھے اسی لئے ان کے افسانوں میں سماجی ناہمواریوں اور ماحول کے جبر کا تذکرہ نعرہ بازی

اور پروپگینڈے کے انداز میں نہیں ہے بلکہ سماجی بے انصافیوں اور ماحول کے نامساعد ہونے کا فنکارانہ اظہار ان کی افسانہ نگاری کا جزو خاص ہے۔ فن کے تعلق سے ان کا نقطۂ نظر خالص غیر کاروباری ہے۔ وہ آرڈر پر افسانے لکھنے کا سطحی کام نہیں کرتے نہ ہی انہوں نے قلم کی تقدیس کو نیلام گھر کی زینت بنایا ہے۔ ان کے ذہن و فکر پر جس واردات نے بھی اثر ڈالا انہوں نے اسے بغیر لگی پٹی صفحۂ قرطاس پر فنکارانہ انداز میں سجا دیا ہے۔ یہی عمل ایک سچے فنکار کی شناخت کرواتا ہے۔

شوکت حیات افسانوی ادب میں ''اَ کہانی'' کی آواز بلند کرتے ہوئے ساتویں دہائی میں داخل ہوئے۔ یہ اینٹی اسٹوری لکھنے کی تحریک تھی جس کے ڈانڈے بلراج مینرا کی ''کمپوزیشن'' سریز اور سریندر پرکاش کے ''تلقارمس'' سے ملتے تھے۔ شوکت حیات نے بھی ایسی کہانیاں بڑی تعداد میں لکھیں اور کمپوزیشن سریز کی طرح ''سچویشن سریز'' کی کہانیاں بھی لکھیں مگر ان کی شناخت احتجاج پر مبنی افسانے ''بانگ'' سے قائم ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب شوکت حیات نے محسوس کر لیا تھا کہ ''اکہانی'' مشرقی مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ لہذا ''بانگ'' شوکت حیات کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کا بھی Point Turning ثابت ہوا جس میں علامت کا پردہ بہت باریک ہے اور احتجاج کی لئے دبیز۔ یہ افساد متشدد قسم کے علامتی اور Plotless افسانوں کے خلاف بھی احتجاج تھا جس کے آر پار بڑی آسانی سے فن کے ساتھ افسانے کے مستقبل کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد شوکت حیات کے اکثر افسانے بیانیہ لہجہ لئے ہوئے سامنے آئے مگر ان کا بیانیہ بالکل برہنہ اور شفاف نہیں ہوتا۔ وہ ہلکے سے ابہام اور پردہ داری کے قائل ہیں جو تخلیق کے حسن کو بڑھاتی ہے اور تاثر کی شدت میں سرتاسر اضافہ کر کے نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔

''بانگ'' کے بعد جتنے افسانے ہمارے سامنے آئے ان میں کسی نہ کسی رویئے کے خلاف احتجاج کا پہلو نمایاں ہے اس لئے وہ سب زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سماجی زندگی سے ان کے گہرے تعہد اور وابستگی کا احساس پایا جاتا ہے اور سماجی احتجاج کی لئے شدت اختیار کرتی جاتی ہے۔ شوکت حیات تصورات کی حسین وادیوں میں وقت گزاری کے قائل نہیں۔ ان کے افسانوں میں عصری آگہی ہے، حادثات زمانہ کی دھمک ہے۔ وہ اپنی دنیا میں گم رہنے والے فنکار بھی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے دکھوں اور لوگوں کے جھمیلوں میں شامل ہوتے ہیں، ان کے کرب کو اپناتے ہیں اور پھر اسے اپنے تجربے کا حصّہ بناتے ہیں۔ ان کی کہانیاں نادار، محنت کش، محروم اور بے روزگار لوگوں کی صدائیں ہیں۔ جبر و استبداد، استحصال و دادا گیری اور تہذیب و سیاست کے نام پر مکاریوں کو اکسپوز کرتی ہیں۔ اس اکسپوزر میں ان کے اندر کا فنکار تمام واقعے حادثے اور المیے پر بہت خاموشی کے ساتھ اپنا احتجاج بھی درج کراتا رہتا ہے مگر یہ احتجاج نعرہ یا پروپگنڈہ نہیں بنتا کیونکہ

فن کارانہ چابکدستی اور حسن کاری ان کی آواز کو پرتاثیر اور پرکشش بنا دیتی ہے۔

شوکت حیات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ افسانوں کی تلاش میں ادھر ادھر نہیں بھٹکتے بلکہ اپنے اردگرد اور آس پاس کے ان واقعات اور معاملات کو افسانوں میں ڈھالتے ہیں جو ہماری نظروں کے بالکل سامنے ہیں لیکن ہم ان سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات اور موضوعات کو وسعت بخشنے کو بھی شوکت حیات نے اپنا خاصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے ان کے افسانے دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ اول ایسے افسانے جن میں مرکزیت کردار کو حاصل ہے۔ اس طرح کے بیشتر افسانے سماجی، معاشی اور سیاسی حقیقت نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ دوسری طرح کے افسانوں میں اہمیت کردار کے بجائے ماحول کو ہے اور یہاں مخصوص انفرادی اور مرکزی کردار کے بجائے ایسے کردار پیش کئے گئے ہیں جو اپنے تجربات میں اجتماعی آہنگ کو پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کے افسانے عموماً معاشی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کے مختلف عناصر سے مملو ہیں۔ مگر ہر افسانے کا موضوع الگ ہے اور موضوع کے لحاظ سے ہر افسانے کا الگ الگ ٹریٹمنٹ ہے۔ لیکن ہر افسانہ اپنی انفرادیت قائم کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہے۔ آیئے ذیل میں دونوں طرح کے چند منتخب افسانوں پر ایک نظر ڈالیں۔

''بھائی'' فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے انسانی نفسیات کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ جب ماحول بگڑتا ہے تو اس طرح ایک فرقے کا دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے کہ فریق مخالف کا ہر عمل اور ہر حرکت خوفزدہ کرتی رہتی ہے کہ وہ اس پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ تذبذب کی اس فضا میں ہر منزل، گردوپیش کا ہر منظر، غرض کہ زمین اور آسمان نادیدہ اور نامعلوم خطروں سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے آدمیوں کی دھند میں مٹی مٹی شکلیں اتنی پراسرار اور غیر حقیقی معلوم ہوتی ہیں کہ ان سے خوف آتا ہے اور دشمنی کی بو۔

''اس تندرست آدمی سے محتاط رہنا ضروری ہے.....اس نے سوچا اسے بے حد افسوس ہوا کہ آج اس کی جیب میں وہ کی رِنگ بھی نہیں تھی جس میں پھل کاٹنے والا ایک ننھا سا چاقو ہوتا تھا۔ اس کے حملہ آور ہونے کی صورت میں کچھ تو اپنا بچاؤ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ تو نہتا تھا۔ اس تنومند آدمی کی جیب میں نہ جانے کون سا ہتھیار ہوگا۔ نہ بھی ہوا تو کیا اس کا مضبوط جسم ہی اسے زیر کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس نے غور کیا کہ تنومند آدمی مستقل اپنا ہاتھ جیب میں ڈالے ہوئے تھا'' (بھائی)

یہ افسانہ ایک مخصوص فضا اور ماحول پر مبنی ہے جس میں ہر آدمی دوسرے کو خطرہ سمجھتا ہے۔ یہ وہ ماحول ہے جو ہمارے آس پاس ہر جگہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ یہ اس صدی کی کڑوی سچائی ہے۔ مگر افسانہ اپنے

خاتمے پر اِس کڑوی سچائی کو مٹھاس میں تبدیل کر کے امید کی فضا قائم کر دیتا ہے کہ اس ماحول اور فضا میں صداقت، دوستی بھائی چارگی اور زندگی بھی ہے جو ہمارے سماج کی بقا کی ضامن ہے اور جس کی وجہ سے یہ فضا دیرپا نہیں رہ سکتی۔ شوکت حیات کے کئی افسانے فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے مضمرات کے تجزیے پر مبنی ہیں۔ مثلاً ''تفتیش'' فرقہ وارانہ فساد کے اسباب وعلل کی تفتیش پر مملو افسانہ ہے اور پلاٹ کے اعتبار سے ڈھیلا ڈھالا ہوتے ہوئے بھی کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' میں ہندو فرقہ پرستی کے مکر وہ چہرے کی شناخت کی کوشش کی گئی ہے اور نئی نسل کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ اب صرف احتجاج سے کام نہیں چلنے والا، انہیں اپنی حفاظت خود کرنی ہوگی۔ متشدد صورت حال کا مقابلہ ایسی ہی جوابی کاروائی سے کیا جا سکتا ہے۔

بابری مسجد سانحے اور فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا جانے والا افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' تو شوکت حیات کی شناخت ہی بن چکا ہے۔ ''بانگ'' کے بعد ان کا یہ دوسرا افسانہ ہے جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اِس موضوع پر کئی افسانے لکھے گئے مگر دو افسانے ''گنبد کے کبوتر'' اور زاہدہ حنا کا افسانہ ''منزل ہے کہاں تیری'' زیادہ قابل اعتنا سمجھے گئے۔ اس کے باوجود دونوں میں کہانی پن، ٹریٹمنٹ اور زاویۂ نظر کا جو فرق ہے وہ شوکت حیات کے افسانے کو انفرادیت اور دائمی زندگی بخشتا ہے۔ افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے :

''بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔ متواتر اڑتا جا رہا تھا۔ اوپر سے نیچے آتا، بے تابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اڑ جاتا۔''

یہ آغاز ہی بابری مسجد کی شہادت کے بعد کی فضا کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ شام کے وقت گنبد کے اوپر بسیرا کرنے والے کبوتر لوٹتے ہیں تو ان کا آشیانہ موجود نہیں ہوتا۔ ان کبوتروں پر کیا گزری؟ یہاں پر کبوتروں اور مسلمانوں کو یکجا کر کے افسانے کی نہج اور اثر پذیری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور پھر افسانہ اِن سطور پر ختم ہوتا ہے :

''بچے اپنے بستروں میں گہری نیند میں مبتلا تھے۔ سب کے چہرے پر ایسی اذیتیں جیسے کوئی بہت ڈراؤنا اور تکلیف دہ خواب دیکھ رہے ہوں۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا.....اس کے جسم میں کاٹو تو لہو نہیں۔ بالکنی کے کھلتے ہی وہاں کے ٹوٹے پھوٹے منتشر حال زار نے اسی اپنی گرفت میں لے لیا۔ نچے ہوئے پھول، موزائک کے فرش پر مسلی کچلی بکھری ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں ٹوٹے ہوئے گملوں کی مٹیوں کے جا بجا ڈھیر.....گوریوں کے گھونسلوں کے منتشر تنکے.....گوریوں کا کوئی پتہ نہیں تھا.....گلہری، تتلیاں اور بھنورے تو اب ایک مدت تک دکھائی نہیں

دیں گے.....اس کی بالکنی کا سارا حسن ملیامیٹ ہو چکا تھا۔ آخر بچوں نے اپنے کھیل میں میرا سب کچھ .....اس کا اندیشہ صحیح نکلا۔ اُس دن اپارٹمنٹ میں گھسے سانپ کو چند بچوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اس سے کھیلنے کے خطرناک عمل کے عادی ہو گئے تھے۔ اسی لئے تو بچے اتنے زہریلے اور وحشی ہو گئے تھے۔''

آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے امان کی تلاش اور کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکر کاٹ رہا تھا۔ بیوی سے اس کی نگاہیں ملیں تو اسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میت پڑی ہے اور باہر کرفیو میں اس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔ (گنبد کے کبوتر)

افسانہ ختم کرنے کے بعد قاری تاثر کے بیکراں سمندر میں دیر تک غوطہ زن رہتا ہے۔ وہ چاہ کر بھی نہیں نکل سکتا کیونکہ کہانی کا تانا بانا، واقعات اور کردار اسے پوری طرح گرفت میں لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس موضوع پر یہ ایک جاندار و یادگار کہانی ہے جس کی بنت میں شوکت حیات نے اپنی ارفع فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔

ہندو مسلم مشترکہ کلچر کے زوال اور نکسلی آندولن کے مسائل پر مشتمل شوکت حیات کا افسانہ ''پھسینڈا'' بھی ایک کامیاب افسانہ ہے جو ایک طرف تو یہ دکھاتا ہے کہ عام معصوم انسان جو ہمیشہ امن وسکون کے حامی رہتے ہیں کس طرح دھیرے دھیرے تبدیل ہو رہے ہیں؟ حالات کیسے ان کے ذہن وفکر میں آہستہ آہستہ مسموم ہوائیں داخل کر رہے ہیں؟ دوسری طرف نکسلی آندولن جو مثبت اور اعلیٰ مقاصد کے ساتھ شروع ہوا تھا کس طرح پراگندگی کا شکار ہو کر احتجاج کے بجائے استحصال کی علامت بن گیا ہے۔ دو مختلف موضوعات کو ایک افسانے میں پیش کرنا آسان نہ تھا مگر شوکت حیات نے انہیں جس فنکاری سے پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ مزید یہ کہ محبت کی ایک کہانی بھی درمیان میں آہستہ روی کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اس افسانے میں مرکزیت ایک کردار ٹیمپو ڈرائیور کو حاصل ہے جو تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے کے باوجود بے روزگاری کے سبب کرائے کا ٹیمپو (تھری وہیلر) چلانے پر مجبور ہے۔ یہ کردار بظاہر عام سا ہے مگر مضبوط وطاقتور ہونے کے سبب ذہن پر دائمی نقش ثبت کر دیتا ہے۔ ایک دن اُسے پٹنہ شہر کے کُرجی موڑ سے گاندھی میدان کے درمیان سفر میں بدرالدین صاحب جیسا تعلیم یافتہ اور شریف آفیسر مل جاتا ہے اور وہ ''بک بکوا'' ڈرائیور شروع ہو جاتا ہے۔ ایک گھنٹے کے سفر میں وہ بے روزگاری، سیاست، نکسلی آندولن اور محبت جیسے موضوعات پر ایسی دانشورانہ وعالمانہ گفتگو کرتا ہے کہ بدرالدین صاحب حیران رہ جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ انتہائی فن کارانہ انداز میں ایک دوست کی کہانی بیان کرتا جاتا ہے مگر کہانی مکمل ہونے سے قبل ہی منزل آجاتی ہے۔ اور جب بدرالدین صاحب کہانی کا انجام جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں تو وہ کہتا ہے:

''ہمیشہ یہی ہوتا ہے جناب.....کہانی مکمل ہونے سے پہلے ہی گاندھی میدان آجاتا ہے اور کہانی درمیان میں ختم کرنی پڑتی ہے.....یہی ٹریجڈی ہے اِس کہانی کی.....اب تو واپسی کے لئے نمبر لگنا ہے جناب.....پھر کبھی۔''

دیکھتے دیکھتے وہ اپنے ٹیمپو کے ساتھ بھیڑ میں تحلیل ہو چکا تھا۔

اچانک گاندھی میدان کے آگے دھماکہ ہوا اور لوگ سرپٹ بھاگنے لگے اس نے دونوں ہاتھ جیب میں ڈال لئے۔ انگلیاں جیب میں پڑی سختیوں سے مس ہوئیں۔ چاروں طرف طائرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اطمینان کی سانس لی اور ایک جانب روانہ ہو گیا۔ ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ رینگ رہی تھی'' (پھسینڈا)

افسانہ ختم ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ نامکمل کہانی بھی قاری کے ذہن میں تکمیل تک پہنچ جاتی ہے کیوں کہ افسانہ نگار نے اشاروں اشاروں میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ قاری دیر تک سوچ وفکر میں متبلا رہنے پر مجبور ہے۔ لفظ ''پھسینڈا'' جو عنوان کے طور پر اُسے حیران کن لگا تھا اور جسے اس نے کسی ڈکشنری میں بھی نہیں پایا تھا کہانی کی قرأت کے بعد جہان معنی پیش کرتا ہے۔ یہ ایک کرداری افسانہ ہے مگر افسانہ نگار نے کردار کو اپنے عقائد واحتساب کا پابند نہیں بنایا۔ وہ کردار کے قاضی بھی نہیں صرف واقعہ نویس ہیں۔ انہوں نے اپنی ہمدردیوں کو تعطل میں ڈال کر قاری کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس کے بارے میں جو رائے چاہے قائم کرے۔

فرقہ وارانہ فسادات اور مشترکہ کلچر کے زوال کے علاوہ پرانی تہذیبوں اور قدروں کی شکست وریخت بھی شوکت حیات کو بے چین کرتی ہے۔ صداقت وبصیرت اور روایات واقدار کی تلاش، انسان کے مقدر کی شدید جستجو، موت کی قطعیت اور حیات بعد الموت کی پیچیدگی اور زندگی کی معنویت سے محروم ہو جانے کے احساس کو انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں خوب صورتی سے برتا ہے۔ ایسا ہی ایک افسانہ ''گھونسلا'' ہے جس میں ایک شخص برسوں بعد اپنے شہر لوٹ کر گھپ اندھیری رات میں اپنے گھر کی تلاش میں نکلتا ہے۔ وہ رکشے میں سوار ہو کر پورے شہر کا چکر لگاتا ہے اور بار بار رکشے والے کو نئے راستوں سے چلنے کی ہدایت کرتا ہے لیکن ہر بار اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ رکشے والا جو لوٹ کر آنے والے مسافر شخص کا باپ ہے اور جو خود بھی گھر سے محروم ہو چکا ہے ناکام تگ ودو کے بعد بالآخر اس مطلوبہ ٹھکانے کا انکشاف کرتا ہے جو اب صاف اور چٹیل میدان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ رکشے پر سوار شخص اپنے ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے بے چین ہے۔ اس تمثیلی کہانی میں شناخت کے آثار سے محروم ہو جانے والا اصل ٹھکانہ (چٹیل میدان) پرانی روایت اور تہذیب کا امین ہے اور اس ٹھکانے سے سفر کرنے والے شخص کا روحانی اور جذباتی تعلق ہے۔ زندگی ایک

سفر ہے اس لئے افسانہ بھی سفر سے شروع ہوتا ہے اور تا آخر سفر جاری رہتا ہے۔ وہ شخص بار بار راستے بدلتا ہے لیکن سارے راستے اسے اسی چٹیل میدان تک پہنچاتے ہیں۔ اس نے مندر، مسجد، چرچ اور گردوارے کا راستہ بھی اختیار کیا لیکن یہ بھی اسے وہیں تک پہنچا سکے یعنی مذہب جو روحانی اقدار وافکار کے تحفظ کا وسیلہ ہے وہ بھی مٹتی ہوئی تہذیبوں اور فنا پذیر قدروں کو محفوظ نہ رکھ سکا اور نئی تہذیبیں ان پر حاوی ہوگئیں۔ افسانہ اِن سطور پر ختم ہوتا ہے جب روتے ہوئے رکشہ والا سفر کرنے والے شخص سے کہتا ہے۔

''تم جس علاقے، جس بستی کو ڈھونڈ رہے ہو اسے عرصہ پہلے بلڈوزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا..... میں بھی ہفتوں اسی طرح پورے شہر میں دیوانہ وار پاگلوں کی طرح چکر کاٹتا ہوا بار بار اسی چٹیل میدان تک پہنچا تھا..... بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا۔ بھری پری بستی کو ملبے میں تبدیل کیا اور پھر چٹیل میدان بنا دیا..... میری دکان، میرا گھر اور تمام اہل وعیال زندہ درگور ہوگئے..... بیٹے میں نے تو صبر کر لیا تھا لیکن آج بار بار اس چٹیل میدان کو دیکھ کر پرانے زخم ہرے ہوگئے'' (گھونسلا)

افسانے کی آخری سطروں میں اس تمثیلی افسانے کو واضح کرنے والے چند معنی خیز اشارے موجود ہیں۔ بلڈوزروں (تہذیب نو) کے ذریعہ بستی (پرانی تہذیب) کو مٹا ڈالنا دراصل نظام اقدار کی کشمکش میں نئے نظام کے غلبے اور پرانے اقدار اور پرانی تہذیبوں کی شکست کا المناک منظر نامہ ہے۔ اس منظر نامے کی ترتیب میں دوسرے اجزا بھی معاون ہوتے ہیں مگر سب مل کر ایک ہی مفہوم تک پہنچاتے ہیں اور وہ مفہوم ہے ہماری روایتوں اور قدروں کا زوال..... شوکت حیات نے اس افسانے کو بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ پورا کیا ہے اور تمثیلوں کے وسیلے سے ایسی کہانی تخلیق کی ہے جو بیک وقت خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر چلتی ہے۔

جہاں مقامی سطح پر فرقہ پرستی، دہشت گردی، فرقہ وارانہ فساد اور قدروں کے زوال جیسے مسائل کو شوکت حیات نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے وہیں بین الاقوامی مسائل جیسے مغربی ملکوں کے ذریعہ نام نہاد امن عالم، مسلم ممالک میں بیداری کی لہریں، بوسنیا، عراق اور افغانستان کے مسائل اور دہشت گردی کے نام پر لڑی جانے والی جنگوں کو بھی شوکت حیات نے اپنی فکر کا حصّہ بنایا ہے۔ ان کا افسانہ ''فارمولا'' ایک ایسے ہی موضوع پر مبنی ہے جو افغانستان کی جنگ کا پس منظر لئے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں شوکت حیات نے بڑی فنکاری سے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک غریب ملک جس کے سینے میں قدرتی دولتیں دفن ہیں اس پر دودہائی سے دنیا کی عظیم طاقتیں اپنے دانت گڑائے ہوئے ہیں۔ افسانہ ان طاقتوں کی سامراجی سازشوں سے پردہ اٹھاتا ہے کہ پہلے اس ملک پر قبضہ کرنے والی ایک سپر پاور کو بے دخل

کرنے کے لئے دوسری سپر پاور وہاں کے عوام کو مسلح کرتی ہے اور جب عوام فتح حاصل کر لیتے ہیں تو بے خطر ہو کر دوسری طاقت سازشوں کا جال بن کر اس ملک پر جنگ تھوپ دیتی ہے۔ اس دوران ایک ''طویل مدتی منصوبہ'' بھی تیار ہوتا ہے اور جب اس کا نفاذ ہوتا ہے درختوں کی پتیاں زرد ہونے لگتی ہیں، جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور پھل کڑوے ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ملا محمد سالم اپنی تدبیر سے ایک حکمت عملی ترتیب دیتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں عہد حاضر کی مکروہ بین الاقوامی سیاست اور مغرب کے عیسائی ممالک کی سازشوں پر سے پردہ اٹھا کر اپنے ہم وطنوں کو ان سے نبرد آزما ہونے کی حکمت عملی پیش کرتے ہیں۔ افسانے کی اصل خوبی یہ ہے کہ بغیر افسانویت کو مجروح کئے ہوئے مغربی سازشوں اور عصر حاضر کی حقیقتوں کو افسانہ نگار نے نہایت رمزیت اور معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شوکت حیات کے یہاں موضوعات کا تنوع حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے مسائل اور تغیرات کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں، معمولی اور غیر اہم حادثوں کو بھی افسانے کا موضوع بنایا ہے جو بظاہر عام اور غیر اہم ہوتے ہیں مگر ان کے بطن سے انسانی ہمدردی، مساوات، قدروں کی پاسداری کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور استحصال، بے بسی، غریبی، بھوک جیسے مسائل اور حالات کا جبر قاری کو فکر وعمل کی دعوت دیتے ہیں۔ شکنجہ، کوبڑ، مسٹر گلیڈ، چیخیں، رحمت صاحب، قرارداد اور کوّا جیسے افسانے اسی زمرے میں آتے ہیں۔

''شکنجہ'' ایک غریب قلی کی کہانی ہے جو پیٹ کی بھوک کے شکنجے میں پھنس کر بھی اپنی قدروں سے بے نیاز نہیں ہو سکا۔ اور بیٹے کو تعلیم دلانے کی خواہش رکھتے ہوئے لاچار ہے کہ اس سے مزدوری کرائے۔ بچہ بھی باپ سے شفقت ومحبت کے بجائے صرف محنت اور مزدوری کی باتوں کی ہی توقع رکھتا ہے۔ اسی لئے حادثے میں جان بچ جانے کے بعد اسے باپ کا پیار کرنا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے (لیکن بس تھوڑی دیر کیونکہ فوراً باپ کی نگاہوں میں بھاگتی ہوئی ٹرین، اترتے ہوئے مسافر اور مزدوری کے پیسے آجاتے ہیں)

''پورا مجمع مسرت سے ہمکنار تھا۔ سب لوگ بیٹے کی جان بچ جانے پر خوش ہو رہے تھے۔ باپ نے بیٹے کو دوبارہ گلے لگایا تو اسے گہری طمانیت اور سکون کا احساس ہوا۔ ساری دنیا جیسے اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھی۔ باپ نے طرح طرح کے رنگ برنگے چہچہاتے ہوئے پرندے اپنے آس پاس دیکھے۔ اس کے سر اور کاندھوں پر پرندوں نے گیت گانا شروع کر دیا۔ باپ ایسی کیفیت سے کبھی نہیں گزرا تھا۔ بیٹا خود متحیر تھا۔ اس کے باپ نے مدت کے بعد اسے اس طرح بھرپور شفقت سے گلے لگایا تھا۔'' (شکنجہ)

لیکن یہ مسرت تھوڑی ہی دیر قائم رہتی ہے کیونکہ فوراً باپ کی نگاہوں کے سامنے بھاگتی ہوئی ٹرین اترتے ہوئے مسافر اور مزدوری کے پیسے آجاتے ہیں۔

''اچانک باپ کو کچھ یاد آ گیا۔ چل بیٹے.....دیر مت کر.....اگلی گاڑی یارڈ سے نکل کر پلیٹ فارم پر لگنے والی ہے، جلدی کر بیٹے.....اس بار ٹھیک سے دیکھ کر بوجھ اٹھاؤں گا کوئی ناطے دار نہ ہو'' بیٹے کی آنکھوں کے آگے پھر وہی کثیف دھواں تھا خوشنما پرندے کہیں غائب ہو چکے تھے''

گویا پیٹ کی بھوک کے آگے موت سے بچ جانے کی خوشی بھی اتنی اہم نہیں کہ قلی اپنا کام بھول جائے۔ غربت اور انسانی بے بسی و مجبوری کی کتنی عجیب اثر انگیز تصویر ہے یہ۔

معاشی تنگدستی سے پیدا شدہ المیے پر مبنی افسانہ ''قرارداد'' بھی ہے۔ جس میں دفتر کے ایک ایماندار کلرک ''احمد بابو'' کی زندگی پیش کی گئی ہے جو بے حد محنتی ایماندار تھے، گھر کی خوشحالی کے لئے دفتر کو وقت بھی زیادہ دیتے تھے مگر ایک زمانے سے انہیں کوئی پروموشن نہیں مل سکی تھی۔ ایک بیٹی شادی کے انتظار میں عمر کی حدیں پار کر چکی تھی۔ بیمار بیوی بستر علالت پر درد سے کراہتی رہتی۔ مگر انہوں نے دفتری ناانصافیوں کے لئے یونین کے بجائے ہمیشہ اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا تھا۔ ایک دن ایک فائل دیکھتے ہوئے اچانک ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ دیر تک فائل کو گھورتے رہے اور پھر انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور ہنستے ہنستے چیخ کر منہ کے بل فائل پر گرے اور انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال پر کمپنی میں ہنگامہ ہوتا ہے اور فائل کو ''قاتل فائل'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ دراصل وہ فائل منیجنگ ڈائرکٹر کے پاس سے آئی تھی جس میں ڈائرکٹر نے ان کی ترقی کی عرضداشت نہ صرف رد کر دی تھی بلکہ کمپلسری رٹائرمنٹ کے تحت زد میں آنے والے ملازمین کی فہرست بھی فوراً طلب کی تھی۔

''مسٹر گلیڈ'' بھی ایسی ہی کیفیت کا افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار ایک عام انسان ہے اور ہر طرح اپنی کوششوں سے سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پیسے کی ریل پیل ہو تو سبھی خوش رہتے ہیں ماں، باپ، بھائی، بہن، بچے وغیرہ۔ مگر حالات مختلف ہوں تو کیسی تصویر سامنے آئے گی؟ ایسی ہی تصویر ''مسٹر گلیڈ'' ہیں۔ معاشی تنگدستی دوسروں کی نظروں میں ہی نہیں اپنی بیوی بچوں کی نگاہ میں بھی اوچھا بنا ڈالتی ہے۔ ''مسٹر گلیڈ'' کا کردار اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ وہ اس صورت حال کو ہنستے ہوئے جھیل جاتا ہے اور قاری کو ناخوشگوار حالات میں بھی جینے کا درس دیتا ہے۔

مادیت پرستی کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان، دولت کی ہوس اور رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا المیہ ''اپنا گوشت''، ''رحمت صاحب'' اور ''کوبڑ'' میں انتہائی تاثر انگیزی کے ساتھ پیش ہوا ہے۔ ''رحمت صاحب'' کی زندگی رٹائرمنٹ کے بعد عذاب بن جاتی ہے کیونکہ اکاؤنٹ سے دھیرے دھیرے تمام پیسے نکلوا لینے کے بعد سارے لڑکے اور بہوئیں انہیں بوجھ سمجھنے لگتی ہیں۔ چاروں بیٹوں کے یہاں سال میں تین

تین مہینے قیام کا بٹوارا ہونے کے باوجود انہیں وقت پر کوئی لینے نہیں آتا اور جب وہ خود مجبور ہو کر چلے جاتے تو بہوؤں اور بیٹوں کے طعنے سے ان کے دل و دماغ میں عجیب عجیب سے سوال اٹھتے ہیں اور زندگی ایک عذاب محسوس ہونے لگتی ہے۔

''اپنا گوشت'' میں بھی یہی کیفیت ہے۔ بڑے ابو نے بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ جب تک بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر لیں گے اپنی شادی نہیں کریں گے۔ لیکن ذمہ داریوں کو ادا کرتے کرتے خود ان کی زندگی کی شام ڈھلنے لگی تو انہوں نے خود اپنی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ضرورت بھی نہیں تھی کہ گھر بھائی بہنوں اور ان کے بچوں سے بھرا پڑا تھا۔ مگر جب جائیداد کی تقسیم ہوئی تو چونکہ وہ مجرد تھے انہیں حصّہ دینا بھائی بہنوں نے پسند نہیں کیا اور ایک خاص عمر کے بعد جب بڑے ابو کو بیکار محض، نٹھلا سمجھ کر یہ کہا گیا کہ ''اس طرح بے کار افراد سے گھر کا ماحول بگڑتا ہے'' بچوں پر برا اثر پڑتا ہے'' تو انہوں نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ گھر چھوڑ دیا اور کسمپرسی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ المیے کی انتہا یہ ہے کہ ان کی موت کی خبر سے بھی اہل خاندان پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور بڑے ابو کے چھوٹے بھائی مرغ کی ٹانگ چباتے ہوئے بڑے آرام سے اپنے بیٹے سے کھانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ مگر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ''میں اپنا گوشت کھا رہا ہوں''.....افسانے کا یہ آخری جملہ بے حد اثر انگیز ہے اور قاری پر دیرپا نقش قائم کرتا ہے۔

''کوبڑ'' دو سگے بھائیوں کی کہانی ہے جس میں چھوٹا بھائی کسی طرح امریکہ نکل گیا اور خوش حال ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں بڑا بھائی جو گھر پر رہتا ہے، سب کے لئے مخلص ہے مگر غریب ہے۔ اس کا اپنا بھائی پٹرو ڈالر کما کر گھر آتا ہے تو اس کی آن بان نرالی رہتی ہے۔ ہر شخص اس کے آگے بچھا جاتا ہے یہاں تک کہ غریب بھائی بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر محبت نچھاور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے رخصت کرنے کے لئے بغیر ریزرویشن ٹرین سے دہلی جاتا ہے۔ امیر بھائی ہوائی جہاز سے جا چکا تھا غریب بھائی نے کبھی دہلی کا منہ بھی نہ دیکھا تھا اس لئے چالاکی سے کام لینے کے باوجود لٹ پٹ جاتا ہے۔ امیر بھائی اسے اچھی زندگی، اچھے کھانے اور صحت وغیرہ کی تلقین و تاکید تو کرتا رہتا ہے مگر اس کے تعاون کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ اخیر میں جب رخصت ہونے کے لئے غریب بھائی سے بغلگیر ہوتا ہے تو غریب بھائی کی پُشت کا ''کوبڑ'' اس سے مس کر جاتا ہے اور وہ بجلی کی سرعت سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

''اچانک چھوٹا بھائی چیخ مار کر الگ ہو گیا

بھیا، یہ تمہاری پیٹھ پر کیسا ابھار ہے؟.....مکروہ خبیث کے سر جیسا.....!''

بڑے بھائی کو کاٹو تو لہو نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بھائی کی اس بات کا کیا جواب دے۔ چھوٹا بھائی خوف و دہشت کا تاثر لے کر دور امریکہ چلا جاتا ہے اور جاتے جاتے اس خبیث سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تلقین کرتا جاتا ہے۔ وہ شروع سے آخر تک ہر مرض، ہر پریشانی سے نجات کی صرف تلقین ہی کرتا رہتا ہے۔ نجات کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے اسکی طرف اشارہ بھی نہیں کرتا۔ دونوں بھائیوں میں جو دوری ہے وہ معاشی دوری ہے اور اسی نے چھوٹے بھائی کو بے گانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ''کوبڑ'' معاشی عدم استحکام اور اقتصادی بوجھ کا استعارہ ہے جسے شوکت حیات نے نہایت فنکاری کے ساتھ افسانے کا حصّہ بنایا ہے۔

متذکرہ افسانوں کے تجزیے سے ایک بات تو ظاہر ہے کہ شوکت حیات کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں۔ وہ اردگرد کی زندگی کا مشاہدہ بڑی گہرائی اور باریکی سے کرتے ہیں اور زندگی سے متعلق ہر مسئلے پر غور و فکر کر کے اسے اپنے افسانے کا حصّہ بناتے ہیں۔ یہ افسانے سیدھے سادے واقعہ کی شکل میں نہیں آتے بلکہ ان کی فنی گرفت انہیں بڑی خوبی سے ادبی تخلیق کی شکل دے دیتی ہے اور یہ افسانے اپنی رمزیت، ایمائیت، اشاریت اور تہہ داری کے سبب عام بیانیہ افسانوں سے مختلف اور منفرد ہو جاتے ہیں۔ ان کی زبان، ہیئت، بنت اور اسلوب بیان متاثر کرتے ہیں۔ ہر کہانی اپنے آغاز کا سرا اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ایک فطری قصّہ گو کی طرح افسانہ نگار اس رمز سے واقف ہیں کہ نظم ہی کی طرح کہانی کہیں سے بھی شروع کی جا سکتی ہے۔ آغاز، وسط اور اختتام کی حد بندی، درجہ بندی اور نوعیت کا سوال اس لحاظ سے قطعاً بے معنی ہے۔ منٹو نے جب کہا تھا کہ کہانی کا پہلا جملہ میں لکھتا ہوں بقیہ افسانہ وہ جملہ لکھتا ہے تو اس سے منٹو کی مراد یہی رہی ہوگی کہ لکھنے والے کا اصل مسئلہ کہانی لکھنا ہے، اس کے آغاز کا تعین کرنا نہیں۔ شوکت حیات کے افسانے اسی رویّے سے مربوط ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب بیان میں آورد اور تکلف کا کوئی عنصر شامل نہیں، ہر کہانی اپنی منطق کی تعمیر خود کرتی ہے۔ کہیں اس بات کا شائبہ تک نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار کی طرف سے کسی طرح کی مداخلت ہو رہی ہے۔ جتنا فطری کہانی کا آغاز ہوتا ہے اس کا انجام بھی اتنا ہی فطری ہوتا ہے۔ موضوع کی پیچیدگی کے باوجود افسانے اپنے تاثر کی وحدت کو شروع سے آخر تک برقرار رکھتے ہیں، کہانی کا تار و پود کہیں بکھرتا نہیں۔ وہ اپنی بات کم سے کم لفظوں میں کہنے کا جادو جانتے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ نوجوان ناقد ڈاکٹر نسیم احمد نسیم شوکت حیات کے افسانوی اختصاص پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اُن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مرصع اور پرشکوہ زبان لکھ کر بھی اپنی کہانیوں کو فطری پن سے دور نہیں ہونے دیتے۔ جبکہ اُن کے کئی ہمنوں کے یہاں یہی مرصعے اور پرشکوہ زبان کہانی کا تاثر زائل کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اُن کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ کہانی مکمل کرنے کے مرصلے میں کسی عجلت یا افراتفری

کا شکار نہیں ہوتے۔ اُن کے یہاں فن کارانہ ٹھہراؤ ہے جو اُنہیں بہت متانت اور سلیقے کے ساتھ کہانی کے فطری انجام تک لے جاتا ہے۔''

شوکت حیات کا افسانوی سفر تا حیات جوش و خروش کے ساتھ جاری رہا۔ یہ ان کی بے نیازی تھی کہ سینکڑوں افسانوں کی اشاعت اور جہان فکشن میں اعتبار قائم ہونے کے بعد بھی قارئین کے شدید اصرار پر انہوں نے صرف ایک افسانوی مجموعے کی اشاعت کو منظوری دی۔ حالانکہ ان کے افسانوں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ بڑی آسانی سے کم از کم تین یا چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آسکتے تھے۔ تمام نگارشات سامنے ہوں تو فن کار کی تفہیم اور تجزیے کی صورتیں آسان اور کثیر الجہت ہو جاتی ہیں۔ اب جبکہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، ضرورت ہے کہ ناقدین اور قارئین ان کے افسانوں کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوں۔ اور اہم اشاعتی ادارے ان کی تمام تخلیقات کی اشاعت کی جانب ضرور توجہ مبذول کریں۔ اِس مختصر مضمون میں متفرق رسائل و جرائد اور ان کے واحد مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' سے افسانے اخذ کر کے شوکت حیات کے افسانوی رویّوں کی جو نامکمل تلخیص کی گئی ہے ظاہر ہے وہ ان کے افسانوی تجربات کی وسعتوں کو بس ایک حد تک ہی سمیٹ سکتی ہے۔ لیکن ان کے مطالعہ کے بعد اتنا تو یقیناً دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانے ایک مخصوص اور منفرد مزاج کے آئینہ دار ہیں اور افسانوی زبان کی توانائی، اسلوب و اظہار کی تہہ داری اور افسانوی تجربات کی نادرہ کاری کو بھرپور طریقے سے ظاہر کرتے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

Head,Departmentof Urdu
Patna University, Patna 800005
drshahabzafar.azmi@gmail.com
Mobb:8863968168

نئی کتابیں

نام کتاب : فکشن سے پرے مصنف : ڈاکٹر ہمایوں اشرف سال اشاعت: ۲۰۲۱ء قیمت : ۴۵۰ روپے	نام کتاب: ڈاکٹر احسان عالم فکر و نظر کے چند گوشے مصنف: ڈاکٹر منصور خوشتر سال اشاعت: ۲۰۲۲ء قیمت : ۲۰۰ روپے

● ڈاکٹر صغیر افراہیم

’’گنبد کے کبوتر‘‘ تہذیب کی مسماری کا استعارہ

شوکت حیات پچھلی چار دہائیوں سے اردو افسانے کے افق پر چھائے ہوئے ہیں۔ کج کلاہی شان رکھنے والے اس فن کار نے قارئین کے بے حد اصرار پر ’’گنبد کے کبوتر‘‘ کے عنوان سے ۲۰۱۰ء میں ۲۵ر افسانوں پر مشتمل مجموعہ شائع کرایا۔ قابل توجہ یہ ہے کہ اس مجموعے کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی رسالوں میں بکھرے ہوئے افسانوں کی بنیاد پر تقریباً تمام ناقدینِ فکشن نے ان کے فکری اور فنی رجحانات پر بھرپور توجہ دی۔ یہاں میں صرف ان کے ہم عصر افسانہ نگار انیس رفیع کی رائے پر اکتفا کرتا ہوں:

> ’’شوکت حیات کی کہانی ’’گنبد کے کبوتر‘‘ میں تعبیر کی کئی جہتیں ہیں۔ ہر جہت اپنی الگ معنویت رکھتی ہے۔ تہہ دار کہانی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ امکانات کے مختلف پہلوؤں کو کھنگالا جا سکے، معنویت کے اضافے کیے جا سکیں۔ اس علامتی کہانی کی کلوز ریڈنگ کئی طرح سے ہو سکتی ہے۔ یہ بیک وقت بابری مسجد کے سانحہ کی پہلی برسی کی طرف اشارہ کے ساتھ ہی ساتھ متضاد ذہنی کیفیتوں کا احاطہ کرتی ہے اور شوکت حیات کی لا اسمیت پر اصرار کرنے والے ایسے افسانہ نویس ہیں جو وجودِ ذات کو کل میں تلاش کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک ذات کی دریافت مکمل نہیں ہوتی فنکار لا اسمیت کے مرحلے میں ہوتا ہے اور یہ لا اسمیت ان کے اندر ٹکراؤ کی صورت پیدا کرتی ہے۔ انھیں صورتوں کا بیان ان کے افسانے ہیں۔ یہ صورت بلراج مینرا کی معروضی وجودیت (Objective Existantialism) سے متاثر ہے۔ ان کے یہاں ٹکراؤ اور بکھرنے کا عمل نہیں بلکہ کشمکش کو شدید کر کے حیات کے مثبت ٹکڑوں کو جوڑنے کا عمل ہے۔ ان کا افسانہ ’’گنبد کے کبوتر‘‘ اس عمل کا نمایاں حصہ ہے۔ گنبد کے ساتھ کبوتر ایک مخصوص کمیونٹی کی پہچان فراہم کرتا ہے، جو دیگر موجود ملتوں کے درمیان اپنے تشخص کی سالمیت کی خاطر اسٹیٹ آف کونفرنٹیشن (State of Confrontation) میں ہے۔‘‘ (اردو کا افسانوی ادب (تحقیقی اور تنقیدی مضامین)، ص ۴۰)

۱۹۷۰ء کے بعد بیانیہ کی واپسی پر جو خصوصی توجہ دی گئی ہے اس لحاظ سے شوکت حیات کے ہاں بیانیہ اپنی مانوس شکل میں واپس آیا ہے۔ سرپٹ گھوڑا، پھسینڈا، تفتیش، بلی کا بچہ، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، اپنا گوشت، بانگ، پاؤں، چیخیں، مادھو اور گُنبد کے کبوتر اپنے مخصوص طرزِ بیان کے اعتبار سے شوکت حیات کے کامیاب افسانے ہیں۔ ’سرپٹ گھوڑا‘ طنز سے بھرپور ہے۔ یہ کہانی آج کی تیز رفتار زندگی کے ہیجان و اضطراب کو اُجاگر کرتی ہے، کہ کس طرح اِس کے دائرے میں گھومتا ہوا انسان، اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مناظر، بے ترتیب واقعات جنھیں قاری ترتیب دیتا ہے، افسانہ نگار الگ الگ ٹکڑوں میں دکھاتا ہے، بلکہ ایک ایک اشارے میں ایک ایک واقعہ کو پرو دیتا ہے۔ ایجازِ بیان اِس طویل کہانی کی اہم خصوصیت ہے۔ یہ خوبی بیانیہ میں بھی ظاہر ہوئی ہے اور مکالموں میں بھی۔

’پھسینڈا‘ بڑے شہروں کی گہما گہمی کی کہانی ہے جس میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے زوال اور مکسل آندولن کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی اپنے واقعات اور اپنے کردار، ہر دو لحاظ سے کامیاب ہے۔ ’تفتیش‘ بظاہر فرقہ وارانہ فساد کے اسباب و عِلل کی تفتیش ہے لیکن دراصل یہ کہانی عصرِ حاضر کے ذہنی اِنتشار اور نفسیاتی دباؤ کو پیش کرتی ہے۔ ’بلّی کا بچّہ‘ میں نچلے متوسط طبقہ کی معاشی، اور ثقافتی جدّ و جہد کو، نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ’سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ‘ فرقہ پرستی کے مکروہ چہرے کی شناخت کرتا ہے۔ اِس افسانہ میں داخلی واردات کو خارجی پیکروں میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے جذباتی وقوعات اور کیفیات کو بیان کرنے کے لیے معروضی تلازمے کی تکنیک کا سہارا لیا ہے۔ ’اپنا گوشت‘ میں رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے اور نئے پُرانے کی کش مکش کو نفسیاتی Touches کے ساتھ اُبھارا گیا ہے۔ ’بانگ‘ کہانی کا موضوع اِمکانی اِنقلاب کی بشارت ہے۔ اِس میں بدلے ہوئے بیانیہ کی بہت واضح شکل سامنے آئی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اِس کہانی کے تعلق سے لکھا ہے:

> ’’یہ افسانہ اُس وقت سامنے آیا تھا جب افسانے کے کردار، پلاٹ وغیرہ، منفی صورتیں اختیار کر چکے تھے۔ لیکن شوکت حیات نے بہت پہلے، اِس کا احساس کر لیا تھا کہ Plotless افسانے یا مُتشدّد قسم کے علامتی افسانے، مشرقی مزاج سے، لگّا نہیں کھاتے۔ لہٰذا ’بانگ‘ کو اگر اُردو افسانے کا اہم Turning Point تسلیم کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔‘‘

کہانی ’پاؤں‘ میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ نئی نسل پر تقسیم کی ذمہ داری کیوں عائد کی جاتی ہے۔ جواز اور دلائل کی وجہ سے یہ کہانی نہ صرف ایک نیا موڑ لے لیتی ہے بلکہ رشتوں کی بے معنویت اور اُس کے کھوکھلے پن پر بھی طنز کرتی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اِس کا صاف شفاف بیانیہ قاری کو ہر پل اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور اُس کے تجسّس کو

بڑھاتا ہے۔ مذکورہ افسانوں کے علاوہ چیخیں، مادھو اور گنبد کے کبوتر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اِن تینوں افسانوں میں، حقیقت، علامت اور رمزیت کی باہمی آمیزش سے ایک ایسا بیانیہ خلق کیا گیا ہے جو پہلو دار بھی ہے اور جاذبِ توجّہ بھی۔ ''چیخیں'' موجودہ تعلیمی نظام کی ایک کربناک تصویر ہے کہ مقابلہ کے اِس سخت دور میں والدین کے لیے بچوں کو اچھی تعلیم دلانا بہت اہم مسئلہ ہو گیا ہے۔ افسانہ میں ایک طرف یہ اشارہ ملتا ہے کہ بچوں پر پڑھائی کا سخت بوجھ اُن سے اُن کا بچپن چھینتا جا رہا ہے تو دوسری طرف ہر قیمت پر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی سعئ پیہم نے مشرق میں تعلیم کے روایتی تصور پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ شوکت حیات نے اِس چکا چوند میں گھرے تعلیمی نظام کے ہر پہلو کا ذکر چیخ کے حوالے سے کیا ہے مثلاً ایڈمیشن ٹسٹ، منتخب طلباء کی لسٹ، فیس سلپ، اسکولوں کے رکھ رکھاؤ اور ظاہر داری وغیرہ کو دیکھ کر۔ خوبی یہ ہے کہ قاری ہر بار بے ساختہ چیخ نکل پڑنے کے الگ الگ اسباب کی شناخت کر لیتا ہے اور پھر اُس سے ذہنی اور جذباتی ربط قائم کر لیتا ہے۔ یہی افسانے کا حُسن ہے کہ پُرشور ماحول میں آزاد تخلیقی فضا کا احساس ہو۔ پریم چند کا شہرۂ آفاق افسانہ 'کفن' انسانی فطرت کی مختلف جہات کی نمائندگی کرتا ہے۔ اِس افسانہ کے مرکزی کردار گھیسو اور مادھو، گُفتار کے غازی ہیں۔ کہانی کے آخر میں دونوں باپ بیٹے، بدمست ہو کر ناچتے گاتے، ہوش و حواس کھو کر گر پڑتے اور پڑے رہ جاتے ہیں۔ پریم چند کا مادھو، نصف صدی بعد، شوکت حیات کے ہاں ایک نئی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اب وہ مٹی کا مادھو نہیں ہے، کاہل، کام چور اور حرام خور نہیں ہے بلکہ بے حد چاق و چوبند نظر آتا ہے۔ اُس میں حالات سے مقابلہ کرنے کی بھرپور طاقت آ چکی ہے۔ بدلاؤ کے ساتھ نظر آنے والا یہ کردار اصلاً بیانیہ کی رفتار میں تغیّر کا اِشاریہ ہے جسے شوکت حیات نے فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ شوکت حیات کے افسانوں میں ''گنبد کے کبوتر'' کو فکر اور فن دونوں اعتبار سے کامیاب تخلیق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس موثر کہانی میں تعبیر کی کئی جہتیں ہیں۔ ہر جہت اپنی الگ معنویت رکھتی ہے۔ تہہ دار کہانی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ امکانات کے مختلف پہلوؤں کو کھنگالا جا سکے، معنویت کے اضافے کیے جا سکیں۔ اس علامتی کہانی کی کلوز ریڈنگ کئی طرح سے ہو سکتی ہے۔ یہ بیک وقت بابری مسجد کے سانحہ کی پہلی برسی کی طرف اشارہ کے ساتھ ہی ساتھ متضاد ذہنی کیفیتوں کا احاطہ کرتی ہے اور ایک قدیم تہذیب کے مسمار ہونے کے استعارہ کے طور پر بھی اُبھرتی ہے۔

ماہنامہ آج کل، نئی دہلی کے شمارہ فروری ۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والی اس کہانی میں براہ راست بابری مسجد کا ذکر نہیں ہے۔ گُنبد کے بے گھر کبوتروں کی امیج کے توسط سے پڑھنے والے کا ذہن مسجد کے اس سانحہ کی طرف منتقل ہوتا ہے قاری محسوس کرتا ہے کہ ۶ر دسمبر کے سانحہ کی پہلی برسی ہے۔ مرکزی کردار ایک جذباتی اور حسّاس مسلمان ہے۔ وہ ایک سا شوکت حیات کی کہانی ''گُنبد کے کبوتر'' میں تعبیر کی کئی جہتیں ہیں۔ ہر جہت اپنی الگ معنویت رکھتی ہے۔ تہہ دار کہانی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے

کہ امکانات کے مختلف پہلوؤں کو کھنگالا جا سکے، معنویت کے اضافے کیے جا سکیں۔ اس علامتی کہانی کی کلوز ریڈنگ کئی طرح سے ہو سکتی ہے۔ یہ بیک وقت بابری مسجد کے سانحہ کی پہلی برسی کی طرف اشارہ کے ساتھ ہی ساتھ متضاد ذہنی کیفیتوں کا احاطہ کرتی ہے اور ایک قدیم تہذیب کے مسمار ہونے کے استعارہ کے طور پر بھی اُبھرتی ہے۔ ل پہلے پیش آئے واقعہ کو بُھلا نہیں پا رہا ہے۔ اسی وجہ سے بے حد فکر مند ہے کہ کہیں پھر کچھ نہ ہو جائے۔ اس کا پڑوسی سمجھاتا ہے:

''گھبرانے کی بات نہیں ..... سب کچھ نارمل ڈھنگ سے ہو رہا ہے۔ اضطراری چیزیں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتیں۔ امن و استقامت کی راہ اپنا کر ہی ہم اور آپ چین اور سُکھ کی زندگی گزار سکتے ہیں ..... میں تو پچھلے سال کے مقابلے میں بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔''

تسلّی اور تشفّی کے ساتھ کھوئے ہوئے اعتماد کی بات ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کو واضح کرتی ہے۔ اُتھل پُتھل اور استقامت کا ذکر بھی وقت کے بہاؤ کو نشان زد کرتا ہے کہ جوش اور جذبہ لمحاتی ہوا کرتا ہے۔ برقرار رہنے والی چیزیں امن کی راہ سے ہو کر ہی گزرتی ہیں۔

افسانہ نگار نے محدود کینوس کو فنّی ہُنر مندی سے خاصا وسیع کر دیا ہے۔ اس نے سچویشن کو اُجاگر کرنے کے لیے کبوتر اور گُنبد کے متوازی، مختلف مراحل پر سانپ، پیپل، گوریّا، پھول، گملے، فاختہ وغیرہ کے استعاروں کا استعمال کیا ہے۔ کہانی کے پہلے ہی جملے سے قاری کا ذہن کسی انہونی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے:

''بے ٹھکانا کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔''

اور پھر جیسے ہی وہ اگلے جملوں کی قرأت کرتا ہے:

''متواتر اُڑتا جا رہا تھا۔ اوپر سے نیچے آتا۔ بے تابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گُنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اُڑ جاتا۔''

اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتیں۔ وہ یکسوئی سے اگلی سطریں پڑھتا تو لاشعوری طور پر بابری مسجد کے سانحہ کی اطلاع مل جاتی:

''اُڑتے اُڑتے ان کے بازو شل ہو گئے۔ جسم کا سارا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔ بس ایک اُبال کی دیر تھی کہ چاروں طرف.....''

یہ اطلاع قاری کو تناؤ میں مبتلا کرتی ہے۔ اس کا احساس شاید افسانہ نگار کو ہے کیونکہ ہر ہُنر مند لکھنے والا، لکھتے وقت قاری کے عمل اور ردِّ عمل کا خیال رکھتا ہے۔ شوکت حیات بھی اِن باریکیوں سے واقف

ہیں۔ سچویشن کو موڑ نے بلکہ اپنے قابو میں رکھنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ وہ اس تناؤ بھری صورتِ حال کو بدلتے ہوئے راوی اور اس کے پڑوسیوں کے بچوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ قرب و جوار سے قاری کو واقف کراتے ہیں اور پھر اچانک پڑوسی کی زبانی یہ جملے ادا کراتے ہیں:

''اِس بار پچھلے سال والا اُبال نہیں۔ دن خیریت سے کٹ جائے گا۔ موسم ٹھیک ہے۔ جینے کی چاہت قائم ہے..... آپ بھی مزے سے رہیے۔ نو پرابلم.....!''

اِس اقتباس سے مسجد کی شہادت کی پہلی برسی کی تصدیق ہو جاتی ہے اور تناؤ کم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے جا سکتے ہیں، اُس کی خبر بھی مل جاتی ہے:

''سڑک پر گاڑیاں معمول کے مطابق چل رہی تھیں۔ چھٹّی کے دن چہل پہل کی جو کمی عام طور پر دیکھی جاتی ہے، وہ اس روز بھی تھی۔''

زمین اور آسمان دو متضاد زاویوں کی شکل میں اُبھرتے ہیں۔ زمین انتشار برپا کر رہی ہے، آسمان خاموش ہے۔ سین دادا اور راوی۔ ایک کو پرواہ نہیں کیونکہ اُسے سبھی کچھ میسّر ہے۔ دوسرے کے یہاں محرومی اور تشنگی ہے۔ وہ آسمان سے لو لگائے ہوئے ہے:

''سین دادا اپنی دُھن میں مگن تھے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اُن کے پاس تو پوری زمین تھی اور زمین پر آسمانی جلوے موجود تھے۔''

اِن دو متضاد کیفیتوں کے بیچ قاری اضطراب محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ کاش گنبد نہ ٹوٹتے، کبوتر بے ٹھکانا نہ ہوتے، کاش اس پُر آشوب گھڑی میں آسمان پر ابابیلیں نظر آ جاتیں تا کہ بے گھری اور بے امانی جھیل رہے کبوتروں کی آنکھوں میں خون نہیں اترتا، زمین پر فساد برپا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ کاش اُمید کا سمبل بن جاتا اور تب کہانی کی روح مجروح ہو جاتی، وہ اپنی راہ سے بھٹک جاتی۔

سوگواری کے مُوڈ میں شروع ہونے والی یہ کہانی اپنے اِس تاثر کو آخر تک برقرار رکھتی ہے۔ مرکزی کردار کے ذہنی انتشار کی حالت قابلِ رحم ہے۔ وہ اپنے آپ کو سانحہ کی یاد سے آزاد نہیں کر پاتا ہے۔ پڑوسی اُسے اس ماحول سے باہر نکالنے کا جتن کرتا ہے:

''ارے صاحب، کیوں سوگواری کا موڈ طاری کیے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں آپ اپنی بالکنی میں بچوں کے اکٹھا ہونے سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ اپنے پودوں اور گملوں کے تحفظ کے لیے بے چین ہیں..... کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کے سارے گملے خیریت سے رہیں گے۔ اب دوستوں سے ملنے چل رہے ہیں تو یوں اُداس نظر آنا چھوڑیے.....

اِنجوائے کیجیے..... دیکھیے گول گول گنبدوں کی گولائی اور نوکیلے اُبھار.....''

اِن باتوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے راوی کی بے قراری میں اضافہ ہوتا ہے:

''اُس کا دل دوسرے گُنبدوں میں اُلجھا ہوا ہولناک کیفیات سے گزر رہا تھا، جبکہ سین دادا نرم و گداز جسمانی گنبدوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چٹخارے بھر رہے تھے۔''

غور و فکر کا یہ انداز اور ان سے پیدا ہونے والا تضاد دو رویوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔ دونوں کرداروں کی سوچ الگ ہے، ذہنی کیفیت بھی الگ ہے۔ اسی لیے برتاؤ بھی الگ نظر آ رہا ہے۔ سین دادا اُس سے کہتے ہیں:

''ینگ مین، تم جوانی میں بوڑھا ہو گیا..... ذرا نظر تو اٹھاؤ،..... آگے تین قیامتیں فاختاؤں کی چال چلتی ہوئی گپ شپ میں مصروف تھیں۔''

راوی جھنجھلاہٹ محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے:

''سین دادا آپ اِن فاختاؤں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ذرا اُوپر دیکھیے۔ بے ٹھکانا کبوتروں کا غول مستقل آسمان میں چکر کاٹ رہا ہے۔ اپنے مستقر کے بے دردی اور بربریت کے ساتھ مسمار کر کے غائب کر دیے جانے کے بعد کیسی بے گھری اور بے امانی جھیل رہا ہے۔''

افسانہ نگار نے تحیّر، خوف، رقّت اور اسرار کے لیے تضاد سے خوب کام لیا ہے۔ اُس نے نوجوان میں مایوسی اور بزرگ میں ترنگ کی کیفیت کو اُجاگر کیا ہے۔ مرکزی کردار کے لیے 'جوانی میں بوڑھا'، اور بزرگ کے لیے 'ینگ مین آف سکسٹی ٹو' کا جملہ اس کی وضاحت کرتا ہے۔ دونوں کرداروں کے لیے ویسی ہی فضا تخلیق کر کے تضاد میں شدّت پیدا کی ہے۔ یہ تضاد کہیں کہیں اپنی شدّت اور تکرار کے باعث کھٹکتا بھی ہے مثلاً جب گُنبدوں کے لیے تقدّس کی فضا خلق کی گئی تو پھر اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ''نرم گداز جسمانی گنبدوں'' کی رعایت استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح لڑکی کو فاختہ کہنے کا رواج ہے مگر موجودہ سچویشن میں محض پُرکشش منظر سے جسم میں عجب ترنگ پیدا کرنے کے لیے یہ کہنا:

''تین قیامتیں فاختاؤں کی چال چلتی ہوئی گپ شپ میں مصروف تھیں۔''

کچھ مناسب نہیں ہے۔ ان کے مابین شوکت حیات صحیح تلازمہ نہیں لا پائے ہیں۔ تقدس اور شہوت کے جذبے کو ایک ساتھ لے کر چلنا مشکل امر ہے۔ اس سے جو عدم توازن پیدا ہوتا ہے وہ یہاں بھی نظر آتا ہے لیکن یہ شتُر گربہ (Mismatch) ظاہری اور وقتی ہے۔ جلد ہی کہانی اپنے اصل مرکز کی طرف واپس آتی ہے اور قاری اس کی فضا میں محو ہو جاتا ہے۔

مذکورہ کہانی میں شوکت حیات گنبد اور کبوتر کے علاوہ پیپل، گلہری، بالکنی، گملا، گوریّا، سانپ، لاٹھیاں جیسے نشانات (signs) کو بھی اُجاگر کرنے میں کامیاب رہے ہیں جس طرح گنبد مسلمانوں کا نشان بنا ہے اُسی طرح پیپل

ہندوؤں کا۔اس درخت کی ایک شاخ راوی کی بالکنی تک آئی ہے جس کے توسط سے دوست اور دشمن دونوں ہی آسکتے ہیں یعنی گلہری بھی اور سانپ بھی۔گلہری ضرر رساں نہیں مگر راستہ مُضر یا مخدُوش ہے اور وسیلہ پیپل بن رہا ہے، دشمن کو راہ دکھانے کا۔ان اشاروں کی آمیزش سے جو کولاژ بنتا ہے، اُس پر سیاہ بادل منڈلانے لگتے ہیں۔اس کولاژ کو افسانہ نگار نے رنگ برنگ پھولوں والے گملوں سے بھی جوڑا ہے اور اہلِ خانہ سے بھی، سین دادا کی اصلیت (Reality) سے بھی اور خود اپنی حقیقت سے بھی۔یہاں پر وہ ایک اہم سوال اُبھارتا ہے کہ کیا سارا خطرہ بالکنی پر ہے یا فلیٹ اور پُورا اپارٹمنٹ اس کی زد میں ہے۔اس مقام پر سانپ بیرونی دشمن کے طور پر ابھرتا ہے۔اِس مشترکہ خطرے میں سبھی (ہندو، مسلمان) ایک ہو کر موذی کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں جیسا کہ اپارٹمنٹ میں سانپ کی اطلاع تمام چھوٹے بڑے فلیٹوں کے مکینوں کو الرٹ کر دیتی ہے اور وہ اس موذی کو ختم کرنے کے مشترکہ جتن کرتے ہیں، لاٹھیاں جمع کرتے ہیں مگر جب راوی انفرادی خطرہ محسوس کرتا ہے تو دوسرا اُتنی یکسوئی سے خطرے کو ختم کرنے کے لیے کمر بستہ نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ مشورہ دیتا ہے:

”تم ینگ مین..... پازیٹو ہو کر سوچو ہر جگہ ٹھکانا ہی ٹھکانا ہے.....گنبد، پہاڑوں کی سفاک چوٹیاں، پتھریلے غار اور گھنے جنگل کے درختوں کی ڈالیاں.....موسموں کے سرد و گرم جھیلنے کے لیے تیار رہو.....یار، اپنی کھال تھوڑی کُھرکُھری بناؤ.....!“

تاویلات کے اس انداز پر قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ؎

گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئی

شوکت حیات کو بیان پر فنکارانہ دست رس حاصل ہے۔اس لیے یہاں مکالموں کا تفاعل، واقعہ یا صورتِ حال کی تشریح کا نہیں بلکہ حسّیاتی اور جذباتی تاثر کی شدّت میں اضافہ کرنے کا ہے۔Irony یہ ہے کہ مذہبی شدّت پسندی اور اُس کے نتائج سے دونوں فرقے نبرد آزما ہیں مگر تلقین اُسے کی جا رہی ہے جو زیادہ مظلوم ہے۔اُسی سے کہا جا رہا ہے کہ سوچنے کا انداز بدلو، قوتِ برداشت پیدا کرو، قناعت سے کام لو۔اگر ایک ٹھکانا کھو گیا تو یہ نہ سمجھو کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔نصیحت آمیز کلمات میں کوئی تاثیر نہیں ہے شائد اسی وجہ سے کہ ہمدردی کا اظہار کرنے والا جذباتی طور پر گنبدوں کے مسمار ہونے سے متاثر نہیں ہے ورنہ وہ اتنی سنجیدہ صورتِ حال پر شہوانی اصطلاحوں کا استعمال نہیں کرتا۔

شوکت حیات کی اس تہہ دار کہانی میں تعبیر کے امکانات کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنے تھیم سے جُڑا ہوا ہے۔کہانی میں کسی بھی واقعہ کا ذکر ہو، مرکزی واقعہ کسی بدلی ہوئی شکل میں حاوی رہتا ہے۔اس لیے یہ کہانی روایت کے مسمار ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔گنبد قدیم تہذیب کا استعارہ ہے اور اُس تہذیب کے مسمار ہونے سے جسے تکلیف پہنچتی ہے وہ کبوتر ہے۔اُس سے اُس کی جائے پناہ چھن گئی ہے۔وہ لا وارث ہو گیا ہے۔وہ اپنے مسکن، اپنی تہذیب کی حفاظت نہیں کر سکا ہے جس کے تحفظ کی ذمہ داری اس پر تھی۔اس تصور کی ہوئی عائد ذمہ داری

کی کشمکش کو افسانہ نگار نے Fore Shadowing کے سہارے اُجاگر کیا ہے۔یہ عکس احساس دلاتے ہیں کہ ہم اپنے فلیٹوں کے کمروں میں بند ہو چکے ہیں جہاں روشنی کا گزر ہماری اپنی مرضی پر منحصر ہے۔اسی لیے بجلی چلی جانے پر خوف محسوس کرتے ہیں، مصنوعی روشنی کا انتظام کرتے ہیں۔فلیٹوں کی بالکنی نمائش کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اس نمائشی زندگی نے اندر ہی اندر سب کچھ کھوکھلا کر دیا ہے۔دیمک زدہ یہ دیواریں جب کسی دباؤ کے تحت گرتی ہیں تو تہذیب کا سائبان برقرار رہ پاتا ہے۔اس ٹوٹنے اور بکھرنے کا احساس سب سے پہلے گنبد کے کبوتر کو ہوتا ہے۔

کبوتر کو ہم اگر خیال مان لیں تو خیالات یعنی گنبد کے کبوتر منتشر ہو گئے۔مُنتشر خیالات راوی کو بے چین کرتے ہیں۔اسے طرح طرح کے توہمات اور خدشات میں مبتلا کرتے ہیں۔دوسرا خیال یا تصوّر سین دادا کی شکل میں انتشار سے مبرّا ہے۔وہاں عدم دلچسپی ہے، لا اُبالیت ہے۔تھامسن کے گھر میں کبوتر منتشر خیال کی شکل میں پہنچتا ہے۔یہاں مِس ریزہ ایک خیال کی شکل میں پہلے سے موجود ہے جو تھامسن کو بہت عزیز ہے۔وہ اس میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا یعنی تبادلۂ خیال گوارا نہیں۔مسٹر جان ایک اور خیال لے کر آتا ہے کہ میرا کبوتر آپ کے گھر میں آ گیا ہے۔کلائمکس یہ بھی ہے جب ایک کے گھر کا انتشار دوسرے کے گھر سے متعلق ہو جاتا ہے۔اس گھر میں ایک خیال شراب اور عورت کا ہے اور دوسرا خیال کبوتر اور انتشار کا ہے۔سبب یہ بھی قرار پاتا ہے کہ جان اور تھامسن میں ہم خیالی اور قربت کا رشتہ ہے جسے تھامسن برقرار رکھنا چاہتا ہے لیکن جان تیسرے خیال کی مُداخلت کو برداشت نہیں کرتا ہے۔قاری اس سبب کو تلاش کرتا ہے تو اُسے راوی اور سین دادا نظر آتے ہیں۔راوی خود انتشار میں مبتلا ہے اس لیے وہ بے ضرر ہے۔ایسی صورت میں جو اندیشہ ہو سکتا ہے وہ سین دادا سے ہو سکتا ہے کیونکہ وہ حد سے تجاوز کرتا ہے، ممنوعہ چیزوں میں مُداخلت کرتا ہے۔اس لیے جان، تھامسن سے کہتا ہے کہ میرا ذہنی سکون آپ کے گھر میں ہے، اُسے واپس کر دیجیے۔تھامسن امکانی کوشش کے باوجود اسے لوٹا نہیں پاتا ہے کیونکہ خیال اُڑ جاتا ہے۔

کہانی کا یہ رنگا رنگ عکس سابقہ رنگوں سے کچھ زیادہ پُرکشش اور بامعنی ہے۔اس میں دو متضاد خیال کے نمائندے حبس کے ماحول سے آزاد فضا میں نکلتے ہیں۔کچھ اور دوستوں یعنی نئے خیالات سے ملتے ہیں۔امکانات اور ناممکنات کی تکرار سے گزرتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں۔ایک کی کیفیت نیم بیہوشی کی ہے، دوسرا فکر اور خوف کے عالم میں ہے۔خوفزدہ، شہوت زدہ خیال کو اُس کے کمرے میں بند کرتے ہوئے اپنے گھر میں قدم رکھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اُس کی دنیا برباد ہو چکی ہے۔ایسا نہیں ہے کہ منفی خیال نے مثبت پہلو کو ترک کر دیا ہو کیونکہ بالکنی میں موجود کئی چیزوں کو مثبت خیالات سے جوڑا گیا ہے لیکن آخر میں خوش کن خیالات مسمار ہو چکے ہوتے ہیں اور انتشار کی کیفیت ایک المیاتی اختتامیہ (Tragic end) اختیار کر لیتی ہے جس کی وضاحت کہانی کے اِس آخری جملے سے ہوتی ہے:

”بیوی سے اُس کی نگاہیں ملیں تو اُسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میّت پڑی ہے

اور باہر کرفیو میں اُس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔''

چُست دُرست کہانی کے لیے کہا جاتا ہے کہ بیانیہ قابل فہم اور خیال اعلیٰ ہو۔اظہار کی سطح پر کم سے کم اُلجھن ہو۔یہ خوبیاں مذکورہ کہانی میں موجود ہیں۔تانے بانے نفاست سے بُنے گئے ہیں۔طریقۂ کار گنجلک نہیں ہے۔یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کہانی کا محرّک بابری مسجد ہے۔پھر بھی ایک کھٹک باقی رہتی ہے کہ شائد ابھی کہانی پوری طرح کُھل نہیں پائی ہے۔یہ کھٹک ہے تھامسن کا گھر اور جان کی شخصیت۔وہ گھر جہاں چھوٹے بڑے تمام کردار جمع ہوتے ہیں۔کہانی شدّت اختیار کرتی ہے۔کلائمکس بڑھتا ہے۔وہ گھر غیر اہم کیسے ہوسکتا ہے جہاں واضح اشارے ہیں کہ جان کی منشا کبوتر مارنا ہے۔سبب خون کا حصول بنتا ہے جو مدران لا کے مفلوج عضو کو متحرّک کرسکتا ہے۔

مِس ریزہ جس کا جسم تھامسن کا غلام ہے مگر روح کبوتر کی مانند آزاد ہے۔جان کبوتر کو گرفت میں لینا چاہتا ہے تو روح کچوکے لگاتی ہے اور مس ریزہ کبوتر کو آزاد کردیتی ہے۔چونکہ امکانات کے دائرے محدود نہیں ہوتے ہیں اِس لیے توجیہات کا سلسلہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور جب ان کہی باتوں کو عالمی پس منظر سے منسلک کیا تو وہ گتھی جو کھٹک رہی تھی، سلجھنا شروع ہوئی۔ابھی تک ہم نے ہندوستان کے کینوس میں کہانی کو دیکھا تھا کہ کالونی ملک، فلیٹ مختلف شہر اور بالکنی گھر کی علامتیں اختیار کرتے ہیں لیکن سانپ اندرون ملک سے بیرون ملک کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے اور اس کا خوف غیر ملکی خوف کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔یہیں سے اِس زاویے کو تقویت ملتی ہے کہ کہیں جان غیر ملکی ہاتھ تو نہیں ہے جو امن کو درہم برہم کررہا ہے۔شک کی سوئی اس جانب گھومتی ہے جس کے ہاتھوں میں خون خرابے کی اصل لگام ہے۔تھامسن کو امریکہ اور جان کو امریکہ کا ہم خیال ملک مان لیا جائے تو ریزہ فسلطین کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔وہ بے گھر ہوئی ہے۔اُس کی جائے پناہ چھن گئی ہے۔دونوں نے اس سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے لیکن اُس کا اپنا وجود بکھر گیا ہے۔یہ توجیہ ضمنی سہی لیکن اس سے کہانی کے بکھرے ہوئے تار جُڑتے ہیں اور مطلع صاف ہوجاتا ہے بقول وزیر آغا ؎

جاتے کہاں کہ رات کی باہیں تھیں مشتعل　　چُھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

ان توجیہات کے توسط سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شوکت حیات کی یہ کہانی داخلی زندگی پر خارجی اثرات کی نمایاں مثال ہے۔افسانہ نگار نے پورے اعتماد اور آگہی سے فرد اور معاشرے کے مظاہر کو خوبصورت اشاروں میں متشکل کیا ہے۔اسی لیے اس کہانی میں استعاروں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ ایمائیت اور منظری ربط بھی موجود ہے۔

◄◄ ● ►►

Gul-e-Afraheim
Lane 4A By Paas Road Dhorra
Aligarh - 202002　Mob : 9358257696

● ڈاکٹر سید اشہد کریم

شوکت حیات اور ''گنبد کے کبوتر''

شوکت حیات بھی وبا کے دنوں میں افسانے کی حقیقت ہوگئے۔یعنی وہ ۲۱؍؍اپریل ۲۰۲۱ء کو اپنی رہائش گاہ پاٹلی پتر میں زندگی کی آخری سانس لے کر ۷۰ سالہ زندگی کو الوداع کہہ گئے۔

شوکت حیات کی تاریخ پیدائش یکم؍دسمبر ۱۹۵۰ء ہے اور ان کا شمار ۱۹۷۰ء کی دہائی سے ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اللہ نے انھیں بہترین تخلیقی ذہن سے نوازا تھا۔اس لئے زورِ قلم کے ذریعہ بہت جلد ان کا شمار اپنے عہد کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہونے لگا تھا۔''گنبد کے کبوتر'' ان کا اکلوتا شاہکار افسانوی مجموعہ ہے اور اس کا ٹائٹل افسانہ شوکت حیات کی افسانوی شناخت کا حصہ ہے۔شوکت حیات نے اپنے افسانوں کے متعلق ایک نوٹ لگا کر اپنے اس مجموعہ میں پیش کیا ہے جس کی عبارت یوں ہے:

> ''غیر روایتی، غیر ترقی پسند، غیر جدید، غیر مابعد جدید افسانے جنھوں نے 'انامیت، نامیاتیت، اور سارک رائٹرس کانفرنس ۲۰۰۵ء علی گڑھ کے موقع پر' امکانیت پسندی' کی تھیوریز دیتے ہوئے انام افسانے نامیاتی افسانے اور امکانی افسانوں کی بنیاد گزاری کی ہے۔ان کے خدوخال کو متشکل کرتے ہوئے عصری و آفاقی افسانوں کی تخلیق کی ہے۔''

پتہ نہیں شوکت حیات کے افسانے ان تھیوریز کی کہاں تک نمائندگی کرتے ہیں لیکن ان افسانوں کے مطالعہ میں یہ بات دھیان رکھنے کے قابل ضرور ہے۔شوکت حیات نے اپنی تحریر میں ان تھیوریز کی وضاحت بھی کی ہے۔وہ ''گنبد کے کبوتر'' میں پیش لفظ کے تحت لکھتے ہیں:

> ''جب ہماری شناخت مستحکم ہوگئی تو میں نے .....'قوت نامیہ' پر زور دیا اور اس طرح امتداد وقت کے ساتھ اپنے عصری افسانوں کے لئے 'نامیاتیت' کی تھیوری پیش کی۔''

نامیاتی افسانے کا تعارف وتصور ان کی نظر میں یوں ہے کہ کسی بھی عہد کے افسانے ہوں لیکن ہر عہد میں ان کی فکر وفنی سطح پر Grow کرنے کی صلاحیتیں نئے عہد کے تقاضوں کے تحت متن کے نئے

معنیاتی نظام قائم رکھنے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔اس کے بعد انھوں نے ''امکانیت پسندی'' پر مبنی تھیوری کی بنیاد گزاری بھی کی جو ان کے مطابق افسانوں میں فنی وفکری، حرکی، ہیئتی، جدلیاتی، ریڈیکل اور امکانی اختصاص سے بھرا ہو۔بلراج مینرا کی 'کمپوزیشن سیریز' کے برخلاف 'سچویشن سیریز' کی تھیوری کو بھی اپنایا اور 'کیفیت سیریز' کے بھی افسانے لکھے۔شوکت حیات نے اپنے افسانوں کے متعلق یہ بھی لکھا ہے:

''میرے افسانے اس تناظر میں دیکھے جائیں کہ یہ وہ نئے جدید اور مابعد جدید افسانے میں جو دراصل نامیاتی اور امکانی انامیت اور نامیاتیت اور امکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں ان افسانوں میں آج کے عہد اور آج کے انسان اس کے مسائل کے نئے ڈھنگ، لہجے، تکنیک، ٹریٹ منٹ، موضوع، فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

پتہ نہیں ترقی پسندی سے انھیں کیا بیر رہا کہ بات وہ جدیدیت، مابعد جدیدیت کی زیادہ کرتے ہیں لیکن ان کے افسانے دیکھا جائے تو احتجاجی مزاج لئے ترقی پسندی کی جڑوں سے ہی پھوٹ کر نکلے ہیں۔''بانگ'' شوکت حیات کا بالکل ترقی پسند افسانہ ہے۔جدیدیت کی لہر نے بہتوں کو برباد کیا مگر شوکت حیات کے افسانے اس لئے نئی تازگی سے بھرے پڑے ہیں کہ انھوں نے ترقی پسندی کی سماجی ڈور کو اپنے افسانوں سے باندھے رکھا ہے۔

''گنبد کے کبوتر'' کا انتساب شوکت حیات نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔جن میں اول کو چھوڑ کر بقیہ تین حصے ان کے ذاتی تعلق کی کڑی ہیں، والد سید محفوظ الحق، صرف اس لیے اہمیت نہیں رکھتے کہ وہ انھیں زندگی سے آشنا کرنے والے ہیں بلکہ انھوں نے مطالعے کے شوق کو مہمیز کیا اور ڈائری لکھنے کی ہدایت کی یہ تربیت شوکت حیات کی افسانہ نگاری میں بنیاد کا پتھر ہے۔اسو پھوپھی (بلقیس بیگم) کی حوصلہ افزائی نے کتاب کی اشاعت کو آسان بنایا اور سہیل عظیم آبادی نے افسانے کی ڈگر پر چلنا سکھایا۔مگر انتساب کا پہلا حصہ تخلیقی ارتقا سے جڑا ہے۔دیکھئے عبارت کیا کہتی ہے:

''ان ہم عصروں کے نام جنھوں نے میری طرح قدیم وجدید ادبی قبرگاہوں سے بہت آگے اپنے....سفر کی ابتدا کی ہے.....اور آنے والی نسلوں کے نام جو ذہنی کشادگی کے ساتھ آزادانہ طور پر اسی تسلسل اور تغیر وتبدل کا اہم حصہ بنیں گی۔''

شوکت حیات کے اندر بھی تخلیقی انا کی وہ آگ جو فن کی جلا کا حصہ تھی اور جمیل مظہری کے لفظوں میں وہ فریب پیہم ہی زندگی کا نام ہے۔

شوکت حیات نے کئی کہانیاں لکھیں مگر افسانوی مجموعہ صرف ایک ہی ''گنبد کے کبوتر'' کے نام سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔شاید ایک مجموعہ اور زیر اشاعت ہے۔اب دیکھئے اس کا کیا ہوتا ہے۔شوکت حیات کی پہلی کہانی 'بکسوں سے دبا آدمی' ہے جو 'کتاب' لکھنؤ میں شائع ہوئی۔''گنبد کے کبوتر'' میں کل ۲۵ افسانے ہیں۔ ہر افسانہ اپنے زبان وبیان، تکنیک اور ٹریٹ منٹ کے اعتبار سے چونکاتا ہے۔'بلی کا بچہ' ایک مشترکہ خاندان کے قدامت پسند خاتون کی کہانی ہے جہاں گھر چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھرا ہوا ہے بچوں کی ضد نے 'بلی کا بچہ' پال لیا اب اس کی ستم ظریفی یہ ہے کہ خالی وقتوں میں تو وہ پڑا رہتا ہے لیکن جیسے بوڑھی بی یعنی دادی اماں نماز پڑھنا شروع کرتی ہیں یہ ان سے لپٹ کر کھیلنے لگتا ہے یہ شرارت ضعیف العمر دادی اماں کے مزاج پر بہت گراں گزرتی ہے۔یہاں تک کہ مرحوم شوہر بھی دعائے آخرت کے خوبصورت کلمات سے نوازے جاتے ہیں۔ساس بہو کے مزاج کا تضاد اور اس میں بلی کے بچے کی حرکات وسکنات نے افسانے کو پرلطف بنا دیا ہے۔

''کوبڑ'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس کی جانفشانی بے رنگ نظر آتی ہے اپنے لوگ ہی رشتوں کے توازن میں ڈنڈی مارتے ہیں کیونکہ ماں کا چھوٹا بیٹا امریکہ میں نوکری کرتا ہے وہ بھول جاتا ہے اسے یہاں تک پہنچانے میں اس کے بڑے بھائی کی قربانی رہی ہے۔وہ جب چھوٹے بھائی کو رخصت کرنے دہلی جاتا ہے تو اس کی مشقت اور سفر کی صعوبت کی الگ کہانی ہے وہ جیسے تیسے جنرل ڈبے میں ٹرین کا سفر کرتا ہے اور واپسی کے وقت اس کے پاس کرایہ تک نہیں اس کی پیٹھ پر ایک ابھار ہے جس نے اسے 'کوبڑ' بنا دیا۔یہ علامت خاندانی بوجھ کی ہے جس نے افسانے کو ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔خودغرضی کی یہ داستان 'اپنا گوشت' کے اندر اور غضبناک ہو کر ملتی ہے لیکن موضوع ایک ہوتے ہوئے بھی ٹریٹ منٹ بالکل جدا ہے یہاں کے گھر کے تمام لوگ اس بڑے بھائی کو گھر سے ہی نکال دیتے ہیں اور وہ جب مرتا ہے تو اس کے جنازے تک میں شامل نہیں ہوتے۔سب مقدس رشتے اپنی عیش وعشرت کی دنیا میں گم ہیں لیکن راوی جس کا تعلق اسی خاندان سے ہے اور وہ نئی نسل کا ہو کر بھی اس بے حسی کی شدت کو محسوس کر رہا ہے۔افسانے کا خاتمہ بہت چونکاتا ہے:

''ڈائننگ ٹیبل پر کھاتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنا گوشت کھا رہا ہوں۔''(اپنا گوشت)

وحدت تاثر افسانے کی جان ہوا کرتا ہے اور وہ یہاں پوری شدت کے ساتھ اپنی چھاپ چھوڑتا ہے۔''گھونسلا'' تقسیم کے بعد ہندوستان میں اپنے شہر واپس آنے والے ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنا گھر اور گاؤں ڈھونڈ رہا ہے لیکن سارے چٹیل میدان ہو چکے ہیں۔سرخ اپارٹمنٹ دو دوستوں کی کہانی ہے اصول اور بے اصول، ایمانداری اور بے ایمانی کا تضاد دکھلایا ہے جہاں کہ بے ایمان دولت کی ریل پیل

حاصل کر لیتے ہیں اور ایماندار آدمی اپنی ضرورت پوری کرنے کو بھی ترستا رہتا ہے۔ شوکت حیات کے افسانے اپنے موضوع تکنیک اور ٹریٹ منٹ کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں انفرادیت رکھتے ہیں۔

''گنبد کے کبوتر'' میں شوکت حیات کی افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے تین مضمون قلم بند کئے گئے ہیں (۱) شوکت حیات کی افسانہ نگاری، وارث علوی (۲) شوکت حیات کا فنی سفر، مہدی جعفری (۳) شوکت حیات کے افسانے، ڈاکٹر ابرار رحمانی۔ ان اصحاب قلم نے شوکت حیات کی افسانہ نگاری کا بھرپور تجزیہ کیا ہے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے خود اپنی تھیوریز کے متعلق ''میری تھیوری سازی اور میرے افسانے کے عنوان سے اپنے تخلیقی تجزیئے سے روشناس کرایا ہے۔ اخیر میں اپنے مدح خواہوں کی رائے کو بھی شامل کیا ہے جن کی فہرست یوں بنتی ہے۔

''گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، مہدی جعفری، وہاب اشرفی، نظام صدیقی، دیوندر اسر، ڈاکٹر نور الحسن نقوی، رام لعل، مظہر امام، حامد کاشمیری، وارث علوی، شہنشاہ مرزا، زبیر رضوی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر نکہت ریحانہ، کمار باشی، طارق سعید، شاہد تسلیم، سید احمد قادری، ابرار رحمانی، نسیم احمد نسیم، قیصر علی، احتشام عادل، مجید رضوی، علی احمد فاطمی، مشتاق احمد نوری، عبدالرحمٰن، قاسم خورشید، مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرم۔''

شوکت حیات کی افسانوی دنیا ''گنبد کے کبوتر'' سے روشن رہے گی۔ آیئے اس کے ٹائٹل افسانے کا جائزہ لیتے چلیں۔ اس افسانے کا ذکر اس افسانوی مجموعہ میں قلم بند کئے گئے تینوں مضامین کے اندر خصوصی طور پر ہوا ہے۔ وارث علوی نے ''گنبد کے کبوتر'' کو حقیقت نگاری کے اسلوب کا مظہر بتایا ہے۔ مگر یہی افسانہ گلے تک علامت کی پانیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ مہدی جعفر کو اس میں معلوم تمام (Omniscient) راوی کا دلچسپ برتاؤ ہے جس کی وجہ سے اس افسانے میں کہانی یا اینٹی اسٹوری سے باہر نکلنے کا عمل نظر آتا ہے۔ ابرار رحمانی کا ماننا ہے کہ سین دادا کا ذاتی کیریکٹر چاہئے جتنا کمزور ہے شوکت حیات نے اپنے زبان و بیان اور قلم کے زور سے ایک مضبوط اور یادگار کردار بنا دیا ہے۔

گنبد کے کبوتر ایک علامتی افسانہ ہے جو بابری مسجد کے انہدام پر لکھا گیا ہے۔ اس افسانہ کے اندر ایک شدید اضطرابی کیفیت ملتی ہے جیسا کہ عنوان ایک خاص فکر کو لے کر دو چیزوں کے باہمی رشتے اور تعلق کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ویسے ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ملک کے بعد بابری مسجد کا انہدام بھی ایک اہم سیاسی و سماجی اور تاریخی و تہذیبی موضوع ہے جس کی بساط مذہب ہے۔ اس موضوع پر بہت سارے قلم کاروں نے زور

آزمائی کی ہے بہت کچھ لکھا گیا ہے ان میں ''گنبد کے کبوتر'' کے علاوہ دیگر قابل ذکر افسانوں میں ''دوسرا بن باس'' (سید محمد اشرف) باہم (سلام بن رزاق) اور نیو کی اینٹ (حسین الحق) فکری و فنی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ سب کی طرز نگارش الگ الگ ہے۔ فکر و فن کی جہتیں بھی جدا ہیں۔ صرف صنفی ہیئت ایک ہے۔

''گنبد'' کا رشتہ ہماری تاریخ اور تہذیب کے ساتھ ساتھ مذہبی شناخت کا بھی حصہ ہے۔ اور ''کبوتر'' امن و آشتی کی علامت ہیں۔ اس لئے گنبد کے ٹوٹنے سے ہماری تاریخی و تہذیبی خلا میں بے ضرر معصوم کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ شدت اضطراب کا اظہار لئے ہیں۔ وارث علوی کے مطابق ''کبوتر سے قطع نظر آدمی کا بے سہارا پن ایسے دور دراز اندیشوں کو جنم دیتا ہے کہ وقت کے بہاؤ میں اس شکستہ کشتی کو کوئی کنارہ مل سکے گا یا نہیں۔ یا پھر ہولناک انجام کا آغاز ہے۔'' اس خدشہ کا احساس مہدی جعفر کو بھی ہے اور وہ اسے بے اماں صورت حال کا نقش مانتے ہیں۔

واحد متکلم کے ذریعہ بیانیہ کی تکنیک اپنائی گئی ہے اور سچویشن کی ہنرمندی کو بروئے کار لاتے ہوئے جگہ جگہ استعاراتی اسلوب میں برتا گیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ ایک فلیٹ میں رہنے والے انسان کا خوف اور اضطرابی کیفیت سے تیار کیا گیا ہے اس اضطرابی کیفیت اور خوف کی بنیاد مذہب ہے کیونکہ مسئلہ سیاسی و مذہبی جنون ہے جس کا رشتہ ایک نئے تخت و تاج کے فکری و نظریاتی قیام سے ہے۔ اس فضا کی منظر کشی مصنف کے الفاظ میں افسانے کے اندر یوں پیش کی گئی ہے:

''ٹیلی ویژن آن تھا، پرائیوٹ چینل کے پروگرام چل رہے تھے۔ دودھیا اسکرین پر تاریخ کی طویل صدیاں لمحوں کی نوک پر خود آخری ہچکی لے رہی تھیں۔''

واحد متکلم کے فلیٹ کے پڑوسی یعنی سین دادا ہیں جو اسے لیکر مسٹر تھامسن کے یہاں جاتے ہیں۔ جہاں شراب کا دور چلتا ہے اور وہاں شراب کے بعد شباب لئے ایک نوجوان ملازمہ مس ریزہ بھی اپنی بے بسی کے جال میں ہے۔ بے کس عورت مرد کے جنسی تشدد کا شکار ہے۔ کہانی میں سچویشن کے مطابق استعاراتی اسلوب تعمیری اکائیاں لئے ہوئے ہیں۔ مہدی جعفر ان کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بے ٹھکانہ کبوتر، گنبدوں کے مختلف زاویے، بالکنی میں آنے والے گلہریوں اور گوریوں کو متوحش کرتا ہے۔ سین دادا کا چین و راحت سے انجوائے کرتا ہے۔ گارڈ کا افواہ پھیلانا اور گھپلا کرنا، مس ریزہ اور کبوتر کی پُر وحشت مماثلت، بلی کی کبوتر سے دشمنی، مسٹر تھامسن اور مسٹر جان کی پر امان رہائش مدران لا کے لئے کبوتر کا سوپ تجویز کرنا یہ ساری چیزیں سچویشن کو جگہ جگہ نمایاں کرنے کے استعارے ہیں۔ ایک بے توازن اور بے امان صورت حال نقش ہوتی ہے۔'' وارث علوی کے مطابق یہ خاکہ جبلتوں کا تراشیدہ ہے۔ واحد متکلم کو نہ شراب

سے دلچسپی ہے نہ زندگی کی سطحی چھچھوری حرکتوں سے رغبت۔ سین دادا اور مسٹر تھامسن کے لئے وقت میں بہاؤ نہیں ٹھہراؤ ہے۔ جمود ہے، ان کے کائی لگے ٹھہرے پانی میں اور مظلوم ملازمہ مس ریزہ کے ساتھ ان کے سلوک میں خارج کا کوئی بھی واقعہ ہلچل یا حرکت پیدا نہیں کر سکتے۔ ایک کبوتر باروچی خانہ میں گھس آتا ہے جو کہ زخمی ہے لہولہان ہے۔ پڑوس کے ایک شخص فالج زدہ بڑھیا کے ہاتھ پر خون ملنے کے لئے چھری چلائی تھی مگر کبوتر خوف کے مارے ہاتھوں کی گرفت سے نکل آیا۔ شاید یہ اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ (بقلم وارث علوی) قدیم بوسیدہ مفلوج عقائد توہمات اور رسم و رواج کو اسی طرح تازہ جوانیوں کا لہو پلا پلا کر زندہ رکھا جاتا ہے۔'' ایسا لگتا ہے کہ شوکت حیات نے اس افسانے میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اس سے کئی نثری نظمیں اور افسانچے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً نثری نظموں کے نمونے یوں پیش کئے جا سکتے ہیں:

(۱)

بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا
متواتر اڑتا جا رہا تھا/اوپر سے نیچے آتا
بے تابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا
اور پھر پرانے گنبد کو اپنی جگہ غائب دیکھ کر
مایوسی کے عالم میں اڑ جاتا
اڑتے اڑتے ان کے بازو شل ہو گئے
جسم کا سارا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔

(۲)

دن بھر کا تھکا ماندہ ہانپتے کانپتے بغیر لفٹ کے
اپارٹمنٹ کی چوتھی منزل پر پہنچ کر
وہ اپنے فلیٹ کی کال بیل بجاتا
بدحواسی پورے وجود پر طاری ہوتی
بچے پیروں سے لپٹے کاندھوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے
تم لوگ اب تک کلچرڈ نہیں ہو سکے
دوسرے بچوں کو دیکھو
سیکھو کچھ ان سے

کس طرح نہ ہونے کی طرح ہوتے ہیں
یہی تو ان کی شناخت ہے

(۳)

گوریوں کا جھنڈ چہچہاتا ہوا اپارٹمنٹ کی اس بالکنی میں
منڈلاتا رہتا اور زندگی کی خوبصورتی کے گیت گاتا
ایک نٹ کھٹ گلہری تیزی سے آئی
اور شرارت بھری آنکھوں سے اسے گھورتی ہوئی
پیپل کے درخت کی ٹہنی کے راستے پیڑ پر واپس چل دیتی
ہواؤں کی خنکی میں سورج کی سنہری کرنوں کی گرمی
من پسند دلربا اور سیم تن کی گرمی سے/ذائقہ دار
ہم آمیزی کا لطف دیتی
افسانچے کے نمونے بھی ملاحظہ کریں:.....

(۱)

ٹیلی ویژن آن تھا۔
پرائیوٹ چینل کے پروگرام چل رہے تھے
دودھیا اسکرین پر تاریخ کی طویل صدیاں لمحوں کی نوک پر
خود آخری ہچکی لے رہی تھیں!!!

(۲)

اس عمر میں دادا آپ.....
اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا
اس کا دل دوسرے گنبدوں میں الجھا ہوا ہولناک کیفیتوں سے گزر رہا تھا.....
سین دادا نرم و گداز.....جسمانی گنبدوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چٹخارے مار رہے تھے۔
اس کے مشفق باپ کی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب تھے؟
وہ باپ سے لپٹ گئی.....
ننھے پیروں سے اس کے کندھوں پر چڑھ گئی.....

اس کے لئے کوئی اور راستہ بھی نہ تھا
کئی دروازے اس نے بدلے تھے
ہر دروازے پر زبانیں لپلپاتے سرخ آنکھوں والے
حیوان موجود تھے۔

اس افسانے میں اسلوب کی بنت ایسی ہے کہ ہر پیراگراف اپنے علامتی اظہار میں ایک اضطرابی کیفیت کی کہانی لئے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں وہ خوشگوار مناظر بھی ملتے ہیں جو راوی کی زندگی میں اس کے ذوق وشوق کا حصہ ہے اس میں اس کے جینے کی خوش رنگ جھلک ملتی ہے۔

کردار نگاری کے لحاظ سے اس افسانہ میں سین دادا کا کردار اپنی تمام تر اخلاقی پستیوں کے باوجود ناقابل فراموش سا لگتا ہے۔ وہیں مس ریزہ کا کردار ایک بے کس و بے بس عورت کا ہے جو کبوتر بازوں کا حصہ ہے۔ مسٹر تھامسن نے اپنے فلیٹ کا دروازہ امن وامان کے لحاظ سے کھلا رکھا ہے مگر یہاں ان کی اپنی زندگی کی سرشاری ہے۔ اور پرتکلف دوستوں کا خیر مقدم ہے۔ مسٹر جان مسٹر تھامسن کے پڑوسی ہیں لیکن ان کا مزاج ان سے الگ ہے۔ راوی کا کردار اس افسانے میں ڈرے سہمے ایک خوفزدہ انسان کا ہے جس کے جینے کے سلیقے میں خوش مزاجی، انسان دوستی، پرندوں سے محبت، پھولوں سے رغبت ہے۔ ان سب کچھ کے باوجود حالات سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ سحر البیان کا بے نظیر ہے۔ مسٹر تھامسن کے یہاں کے خوشگوار ماحول نے بھی راوی کے دل کو اندر سے ہلائے رکھا۔

''لیکن یہ صاحب تو اتنے سوگوار ہیں کہ انھوں نے کوئی مزہ نہ لیا۔''
کیونکہ راوی کی باطنی دنیا ہلچل مچائے ہوئے تھی۔
''اب کیا ہوگا.....آئندہ کیا ہونے والا ہے.....؟
وہ اب اوب گیا تھا۔ تھامسن کے ہاں اس نے بھی مئے نوشی کی۔ لیکن
اسے نشہ آنا تو دور، ہلکا سرور بھی نہ ہوا۔ رہ رہ کر اسے اپنے گملے کے پودوں، بالکنی اور
بچوں کے اجتماع کا خیال آرہا تھا ایک عجیب تشویش میں وہ تمام وقت مبتلا رہا۔''

اور آخرش اس خدشے کا انجام بھی ویسا ہی ہوا جو اس طرح کے حالات پیدا کرتے ہیں جسے مصنف نے علامتی اظہار میں بیان کیا ہے۔ مرجھائے ہوئے پھول، مسلی کچلی ہوئی پنکھڑیاں، ٹوٹے پھوٹے گملے خوں ریزی کا منظر نامہ اور درد لئے ہوئے ہیں۔

اس افسانے کے آخر کے دو پیراگراف اضطراب کی لہر سے اٹھتا ہوا حقیقت کا ایسا جوار بھاٹا ہیں

جہاں زندگی ملیامیٹ ہو کر عبرت کا نشان چھوڑ جاتی ہے۔

''آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے اماں کی تلاش
اور کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکر کاٹ رہا تھا۔''
''بیوی سے اس کی نگاہیں ملیں تو اسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میت
پڑی ہے باہر کرفیو میں اس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔''

عالمی وملکی سطح پر ابھرنے والی اضطراب کی کچھ ایسی حقیقتیں اس میں مذہبی جبر اور سیاسی رشتوں کی گہرائی بہت دور تک دکھائی دیتی ہے اور اس میں چند سوال افسانہ نگار نے ادھورے چھوڑ دیئے ہیں جن کا جواب فی الوقت بہت مشکل ہے۔

کیا ہماری زندگی تھامسن کے فلیٹ کی محتاج ہوگئی ہے؟ کیا لٹے پٹے قوم کی بیٹیوں کا مقدر مس ریزہ جیسا ہوگا؟ کیا حکمت اور دانشوری سین دادا جیسے لوگوں کی سرشار و سرمست نگاہوں میں بھٹک کر رہ گئی ہے؟ کیا گھر کی نگہبانی ایک ایسے شرافت کے پیکر میں تبدیل ہوگئی ہے جو حالات کا سامنا نہیں اس کا ماتم کرنا چاہتا ہے؟ راوی کی پست ہمتی تقدیر کا المیہ ہے یا تدبیر کی موت؟ منشی پریم چند کا مشہور اور شاہکار افسانہ کفن کو شمس الرحمٰن فاروقی Black Humory اور گوپی چند نارنگ Irony بتاتے ہیں تو کیا ''گنبد کے کبوتر'' شعور کی غفلت نہیں ہے ایک باشعور آدمی جس طرح سے بیوی بال بچوں کو آتشیں حالات میں چھوڑ کر شراب کی محفل میں اپنے دکھ کا ماتم منا رہا ہو اور وہ گھر میں اس وقت پہنچتا ہے جب اس کے گھر کی زندگی کے تانے بانے ٹوٹ چکے ہیں۔ اور وہ گھر میت لئے قبرگاہ بن گیا ہو.....؟

بیسویں صدی کا نصف آخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی حصے کی تاریخ کے دھندلے صفحات جب بھی صاف ہوں گے تو اخبار کے تراشے ٹی وی کے اسکرین شارٹ اور شوکت حیات کے افسانے اس 70 سالہ ہندوستان کو سمجھنے میں معاون ہوں گے۔

شوکت حیات اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کے افسانے زندہ وتابندہ رہیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے وقت کی دھڑکنوں کو اپنے افسانوں میں برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Assistant Proessor & Head Department of Urdu
SVP College Bhabhua Kaimur 821101
Mob: 9616730727

● ڈاکٹر محمد حامد علی خان

شوکت حیات کا فن

شوکت حیات نام ہے ایک نہایت ہی حساس افسانہ نگار کا، ایک پُر مغز اور مفکر تنقید نگار کا جسے عبور حاصل ہے نہایت ہی ہموار نثر اور غیر معمولی زبان لکھنے پر، جسے قدرت حاصل ہے بیان قصہ کے دوران یا نقطۂ نظر کی وضاحت کے دوران زبان و بیان میں سبک رفتاری کا رس گھولنے پر اور یہی ہو خوبیاں رہیں کہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس جب شوکت حیات نے افسانہ نگاری شروع کی تو چند افسانوں کی اشاعت کے بعد ہی نہ صرف یہ کہ سنجیدہ قریوں کا ذہن ان کی طرف متوجہ ہوا بلکہ ادبی رسائل کے مدیران نے بھی ان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا اور شوکت حیات کا قلم نت نئے بلکہ ان چھوٹے موضوعات کو اپنی مخصوص رواں و سبک زبان میں افسانوں کا لباس دیتے ہوئے برق رفتاری کے ساتھ آگے نکلتا گیا گویا یہ وسیم بریلوی نہیں شوکت حیات فرما رہے ہیں کہ:

آگے بڑھنا ہے تو آوازیں سنی جاتیں نہیں　　راستہ دینے کا مطلب ہے کہ خود پیچھے رہیں

جی ہاں شوکت حیات سے میری ملاقات پٹنہ کے ایک امتحانی مرکز پر ہوئی تب ان کی بیگم اور ایک عدد سالی جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان میں شامل ہو رہی تھیں۔ شوکت بھائی روزانہ ان دونوں کو امتحان مرکز پر لے کر آتے ہیں امتحان مکرکز کے برابر کے مکان میں اپنے منجھلے بھائی محمد آصف علی خاں (شومی قسمت کہ ان کا انتقال ۱۰ر جون ۲۰۰۵ء) کو ایک سواری گاڑی کے حادثے میں ہو گیا) کے ساتھ رہ رہا تھا اور ان سے شوکت حیات کے دیرینہ روابط تھے لہٰذا امتحان شروع ہوتے ہی شکوت بھائی میرے ڈبرے میں آجاتے اور ہم دونوں چار پانچ گھنٹے خوب باتیں کرتے کیوں کہ بھائی جان تو دس بجے بینک چلے جاتے تھے کہ وہ ان دنوں بینک آف انڈیا، فریزر روڈ پٹنہ میں ملازم تھے۔ یہ زمانہ ۹۰۔۱۹۸۶ء کے دوران کا ہے اور میں چونکہ تازہ تازہ اردو ادب کا طالب علم ہوا تھا سائنس سے ہجرت کرتے ہوئے اور تمام اردو والے نہ جانے کیوں مجھے حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ لہٰذا میں نے شوکت بھائی کی ملاقات کو اپنی تربیت کے لیے غنیمت جانا۔ ادبی چھیڑ چھاڑ کے ذریعہ ان کی باتوں کو سننے میں بڑا لطف آتا کیوں کہ اس وقت بھی ان کی زبان کافی سلجھی ہوئی صاف و شفاف اور دلوں کو متاثر کرنے والی ہوا کرتی تھی۔ لیکن کوئی ہفتہ بھر کی اس مسلسل بے تکلف ملاقات میں انہوں نے کبھی بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ بڑے فن کار ہیں۔ ہاں میری بڑی منت و آرزو پر انہوں نے ایک رسالہ مجھے پڑھنے کو دیا جس میں ان کی ایک کہانی بھی تھی اس وقت مجھے نہ تو اس کہانی کا عنوان

یاد ہے اور نہ رسالہ کا نام لیکن اس اعتراف حقیقت سے مجھے کوئی عار نہیں کہ اس وقت میں ان کی کہانی تو نہیں سمجھ سکا تھا پر اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ کاش آپ کی زبان کو سمجھنے کا سلیقہ میسر آجائے اور آج بھی یہ سچ ہے کہ میں ان جیسی زبان نہیں لکھ پاتا۔ ہاں ان کی کہانیوں کی ترسیل کسی طرح ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ۱۹۹۰ء کے بعد شائع ہونے والے ان کے اکثر افسانوں کو میں نے بار بار پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ میری یہ کوشش مجھے اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد جو بھی افسانہ نگار افسانوی منظر نامے پر نمودار ہوئے ان میں کوئی بھی شوکت حیات سے بہتر زبان یا نثر نہیں لکھ سکے۔ موضوعات کے تئیں بھی شوکت حیات کا نہ صرف یہ کہ مطالعہ و مشاہدہ بہت ہی وسیع ہے بلکہ وہ ہر لمحہ اس کی فنی اہمیت اور معیار کے تئیں فکر مند بھی رہتے ہیں اور افسانہ نگاروں سے متعلق ان کا اپنا ویژن یہ ہے کہ:

> ”افسانہ کوئی ہوا میں معلق چیز نہیں۔ شاعری سے یہ زیادہ مشکل کام ہے کہ اس میں استدلال کی سطح بحال کرنی پڑتی ہے۔ سماج، سیاست، معاشرے اور انسان اور اس کے عمل و تعامل کے بغیر افسانے کا وجود ممکن نہیں۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ افسانے کی جڑیں زندگی میں پیوست رہتی ہیں۔ افسانہ ہر حال میں انسانی صورتِ حال کے بیانیے سے عبارت ہے اور اس کی پیش کش کے ’طور‘ کو مواد کی فوقیت کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مواد پیش کش، بیانیہ اور محوریت سے افسانے کو گلو خلاصی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔“
>
> (رسالہ ’ایوان اردو‘ ستمبر ۲۰۰۹ء دہلی اردو اکادمی، دہلی، قمر رئیس نمبر، ص ۸۱)

جی ہاں شوکت حیات کے اس بیان سے عام قاری تک کم از کم یہ پیغام تو پہنچ جاتا ہے کہ وہ افسانوں میں تجربات اور امکانات کے دروں کو نہ صرف یہ کہ وا رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ہم عصر افسانہ نگاروں کو بھی دعوتِ فکر دیتے ہیں اسی مستحکم ارادے اور عزم کے ساتھ شوکت حیات ۱۹۷۰ء میں اردو افسانہ کے منظر نامے پر رونما ہوئے اور ان کا پہلا باضابطہ افسانہ ”بکسوں سے دبا آدمی“ رسالہ کتاب لکھنؤ میں شائع ہوا تو قاری کو ذہنی ورزش کی ضرورت پڑی کہ شوکت حیات کو بھی دیکھا اور سمجھا جائے۔ لیکن جدیدیت کے اس دور میں علامت نگاری اور تجریدیت کے قائلوں نے ان کی طرف دیکھنا مناسب نہیں سمجھا اور قاری کا ایک گروہ بھی علامت نگاری اور تجریت کی بھول بھلیوں میں کھو گیا لیکن شوکت حیات کے قلم نے جس روانی کے ساتھ ایک کے بعد ایک نئے تجربے سے بھرے ”شگاف دراڑ، خلا، انت کا انت، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، بانگ، تین مینڈک، کاغذ کا درخت، ہوسٹل، سیلاب اور پھر گنبد کے کبوتر“ جیسے شاہکار افسانے ہندو پاک کے ممتاز و مشہور رسائل کے ذریعہ قاریوں تک پہنچائے تو قاری تو بے چارہ انگشت بدنداں رہا۔ ناقدین افسانہ کے ضمیر نے بھی انہیں للکارا کہ فکری، فنی اور داخلی زندگی کے مقدس آتش کدہ سے تپا ہوا علامتی تمثیلی افسانہ کا دور شروع ہو چکا ہے۔ لہٰذا ناقدین نے ان کے افسانہ ”بانگ“ مطبوعہ ”تناظر“ ستمبر ۱۹۷۷ء کو سنجیدگی کے ساتھ اپنے مطالعے میں شامل کیا:

''شوکت حیات نے بہت پہلے ایک افسانہ ''بانگ'' تخلیق کیا تھا اس میں بھی امکانی انقلاب کی بشارت تھی۔ یہ افسانہ اس وقت سامنے آیا تھا جب افسانے کے کردار پلاٹ وغیرہ منفی صورتیں اختیار کر چکے تھے۔لیکن شوکت حیات نے بہت پہلے اس کا احساس کر لیا تھا کہ Plotless افسانے یا متشدد قسم کے علامتی افسانے مشرقی مزاج سے لگا نہیں کھا سکتے۔لہٰذا بانگ کو اگر اردو افسانے کا اہم Truning Point تسلیم کیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔اس میں علامت کا ایک ہلکا پردہ ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد سوم، وہاب اشرفی، ص ۱۳۴۹)

جب کہ مہدی جعفری کا بیان ہے کہ ''شوکت حیات کا افسانہ 'بانگ' اردو افسانے کا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانے میں بھرپور کہانی پن کی واپسی اسی کہانی کے بعد ہوئی۔'' شوکت حیات کی کہانی ''بانگ'' پر قمر رئیس نے بھی پسندیدگی کی مہر لگائی ہے۔

دراصل ''بانگ'' طبقاتی کشمکش کی کہانی ہے اور یہ طبقاتی کشمکش مذہبی یا فرقہ دارانہ نہیں بلکہ معاشی صورت حال کی عکاسی ہے۔اس میں مرغے زرخرید ہیں یا Pet Servant کے طور پر علامتی تمثیلی صورت میں ابھرے ہیں جیسا کہ اس کے ابتدائی دو پیراگراف سے ظاہر ہوتا ہے:

''ایک صبح جب نیند کے مارے کافی دیر سے اٹھے اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ سورج کی پہلی کرن کا غسل نہ لینے کے سبب وہ ہتھیلیوں کی ساری لکیروں کی تا بنا کی کھو چکے ہیں تو سارا غصہ حسب معمول مرغوں پر اترا۔''

''.....ان حرامزادوں کے بانگ نہ دینے کے سبب ہم دیر سے اٹھے۔ یہ جواز پیش کرتے ہوئے کہ مرغ بانگ دینا بھول گئے ہیں اور انہیں یاد بھی ہے تو جان بوجھ کر جی چراتے ہیں جس میں ان کی سازش، کاہلی یا سستی کو دخل ہے۔ انہوں نے فوراً ہی مرغوں کو ذبح کر ڈالا۔''

یہ افسانہ آگے بڑھتے ہوئے Clash of Interest کے سبب War between ہی نہیں چھوٹا بلکہ تاریخ کے اس المیے نے بہت کچھ لوٹ لیا۔ ہندو اپنے گھر بار اور اپنے گھر کے دیوتاؤں کو چھوڑ کر بھاگے۔مسلمانوں نے امام باڑے، کربلا اور مسجدیں چھوڑیں لیکن جو چھوٹ گیا اس کے غم سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ظالمانہ، سرمایہ دارانہ سیاسی اقتدار نے انسانی اخلاق و اقدار کی ریڑھ ماردی۔ایمان اور

دھرم تک کو محفوظ نہیں رہنے دیا۔شوکت حیات کا ''گھونسلا'' اسی مسئلہ کا استعارہ ہے کہ مسافر اپنے پُرکھوں کی رنگا رنگ تہذیب سے پُر گھونسلے کی تلاش میں ہے جسے نئی تعلیم اور نو دولتیوں نے ملیا میٹ کر دیا ہے۔انیس اشفاق نے شوکت حیات کے اس افسانے کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شوکت حیات کا افسانہ ''گھونسلا'' پرانے اور نئے نظام اقدار کی کشمکش میں نئے نظام اقدار کے غلبے اور پرانی اور نئی (روحانی اور مادی) تہذیبوں کے تصادم میں پرانی تہذیبوں کی شکست کا المناک منظر نامہ ہے۔اس منظر نامے کی ترتیب میں دوسرے جزئیات بھی معاون ہوتے ہیں۔ان جزئیات کی افسانے میں انفرادی حیثیت بھی ہے۔ دوسری طرف یہ جزئیات افسانے کے بنیادی مفہوم کے ساتھ ساتھ بھی چلتے ہیں۔ یہ بنیادی مفہوم ہے ہماری روایتوں اور قدروں کا زوال۔ یہ روایات وقدار ہماری صداقت، بصیرت اور استقامت کی آئینہ دار تھیں اور ہماری ذہنی اور روحانی شناخت کا حوالہ۔ان سے ہماری جذباتی وابستگی تھی لیکن اب پروں اور تیلیوں کی مدد سے تعمیر کیا جانے والا یہ انسانی گھونسلا اجاڑ دیا گیا ہے اور انسان دور آسمان میں اس چھوٹے سے طائر کو حسرت بھری گاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جو پوری طاقت یعنی پورے اعتماد کے ساتھ اپنے آشیانے کی طرف جا رہا ہے اور اس کی اُڑان میں محرومی یا تذبذب کا کوئی نشان نہیں۔''

(نیا اردو افسانہ: انتخاب تجزیے اور مباحث مرتبہ گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۰)

جب کہ ''گنبد کے کبوتر'' شوکت حیات کا وہ شاہکار افسانہ ہے جو ''بابری مسجد'' کی شہادت سے متعلق کم وبیش سو برسوں کے مسلسل تاریخی اور تہذیبی تصادم کو علامتی تمثیلی پیرائے میں کامیابی کے ساتھ ڈھال دینے کے فن پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ جب سیاسی سازشوں کے ذریعہ کسی عالمی شخصیت کے مکمل Stablishment کے مقابل کسی دوسری شخصیت کو Stablish کرنے کی کوشش میں تاریخ اور تہذیب سب ملیا میٹ کرنے کی سوچی سمجھی سازشیں ہوتی رہیں۔قانون خاموش تماشائی رہا کیا ایسے میں ایسے حالات کو کسی فن پارے کے قالب میں ڈھالتے ہوئے کسی فن کار کا قلم کس قدر لہولہان ہوگا، ہوا ہوگا اور فن کار کو اس کے بیان میں کس قدر خون کے آنسو رونے پڑے ہوں گے کس طرح بیانیہ کی ضرورت ہوگی اور کس طرح اصطلاحات ولوازمات سے گزرنا پڑا ہوگا یا پڑتا ہے اس کا مشاہدہ ومطالعہ کرنا مقصود ہو تو یقیناً شوکت حیات کی کہانی ''گنبد کے کبوتر'' کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ شوکت حیات کے قلم اور فکر نے نہ صرف

لہولہان تاریخ وتہذیب کا منظر نامہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ بہرصورت حق وناحق کی جنگ کو زندہ رہنے کی علامت کے طور پر جاری وساری رکھنے کے مثبت رجحان کو بھی قائم رکھنے کے منت وسماجت کردی ہے۔

شوکت حیات نے اپنے افسانہ ''نصف'' میں شخصیت اور ذات کے اس تضاد کو موضوع بنایا ہے جو ہر لحظہ ٹوٹتا اور بکھرتا رہتا ہے۔لیکن پھر بھی اپنے شیرازے کو مٹنے نہیں دیتا بلکہ اسے پھر چننے اور سمیٹنے کی پرعزم اور مجاہدانہ کوشش کرتا ہے۔اپنے افسانہ ''میت'' میں اس رجحان کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جس میں آج عورتوں کے سہارے Status Symbol حاصل کرنے کی مسلسل سعی کی جارہی ہے اور عورتیں اس بات پر خوش ہیں کہ انہیں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کے مواقع میسر ہورہے ہیں اور وہ مردوں کو اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب ہوچکی ہیں ہر چند کہ انسانیت ہی نہیں حسن زن بھی مردہ ہوچکا ہے اور تو اور زندوں کی سیاست کرنے والے میت کا بھی مذاق اُڑا رہے ہیں۔عام انسان تو آخر عام علماء کی علمیت بھی گنگ ہے۔اس افسانے کے ابتدائی جملے ملاحظہ ہوں:

''بیسویں صدی اپنے آخری پڑاؤ پر کینچلی بدل چکی تھی۔ اگر اس نے دھیان نہ دیا ہوتا تو سڑک پر اوندھے منہ گرتا۔''

اور پھر کیا پتا کسی ٹرک، موٹر یا بس کے نیچے آکر کچل گیا ہوتا اور اس دنیا س.....''

اور افسانہ ان جملوں پر ختم ہوجاتا ہے کہ:

''اور پھر کیا پتا کسی ٹرک، موٹر یا بس کے نیچے آکر کچل گیا ہوتا اور اس دنیا سے.....''

اور افسانہ ان جملوں پر ختم ہوجاتا ہے کہ:

''میت تربت کے لیے ترس رہی تھی اور بیسویں صدی اپنے آخری پڑاؤ پر کینچلی بدل چکی تھی اور آمر درّانی.....

وہ تو.....''

''اس کو بہت غصہ آیا۔ عجیب جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس نے سب سے مخاطب ہوکر چلانا چاہا پوری کمیونٹی.....کیا ہم سب لوگ میت میں تبدیل ہوچکے ہیں جو معاملہ ایک جگہ ٹھہر گیا ہے؟''

لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہی گئی۔

اس افسانے کا حسن یہ ہے کہ اس افسانے میں 'میت' جس خاتون کی ہے وہ راوی یا افسانہ نگار یعنی شوکت حیات کے ایک دوست کی بیوی ہے اور راوی اسے بھابھی کہتا ہے اور میت تربت کو ترستے ترستے ایک موقع پر فن کار کو جھنجوڑنے کے لیے کفن سے منہ نکال کر مخاطب ہوتی ہے:

''میں نہ کہتی تھی:

تو شوکت حیات کی تخلیقی تجلیوں کا حسن وجمال نکھر کر انہیں ان کے معاصرین میں وہ مقام خاص عطا کردیتا ہے جہاں تک رسائی ہر کسی کو میسر نہیں۔ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شوکت حیات کی کہانی 'میت' عہد حاضر کی تلخ حقیقتوں کا تخلیقی اظہار ہے۔انہوں نے کہانی کے تانے، زبان وبیان، واقعات کی تفصیل، قصے کی مکرزیت وغیرہ سے ایک ایسا افسانوی ماحول تیار کیا ہے جسے Black Satire کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔یہ ایسے واقعات کا بیان ہوتا ہے جن میں انتہائی معیوب اور طنز ومعنی بھری بات سے بھی استفادہ حاصل کرنے کی کوشش ہو.....کہانی موجودہ سماج کے مصنوعی جذبات کی بھی قلعی کھولتی ہے۔'' (ایوان اردو، دہلی، جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۲۰)

دراصل شوکت حیات کا فن کے تئیں یہی مزاج ورجحان بھی ہے کہ ہمیں مصنوعی جذباتیت سے گریز کرتے ہوئے حقیقی زندگی کا مقصد سمجھنا چاہیے تاکہ فن ہی میں نہیں بلکہ فن کار میں بھی وسعت، تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہوتا کہ سماج کا بھی ایک اپنا روشن معیار ومزاج متعین ہو۔اس سلسلے میں خود شوکت حیات کا بیان ملاحظہ ہو:

''۷۰ء کے بعد نامیاتی افسانہ عمومی طور پر ہجرت اور تقسیم کے المیہ جیسے موضوعات کو ازکار رفتہ سمجھتا ہے۔اس کے برخلاف وہ عصری حسیات سے لیس فساد، فسطائیت، دہشت گردی، زندگی کے نظام اور عہد کی سنگینی اور تضادات، ہلاکت خیزی، تانیثیت، دردانگیزی، سیاسی جبر واستبداد، معاشی ناہمواریوں، سماجی اور سیاسی تضادات، سچویشن کے پیراڈ کسیز، متغیر ذہنی، سماجی وسیاسی صورت حال، نام نہاد نجات دہندگان کی درندگی، انسان کی بنایدی ضرورتوں کی راہ میں حائل مزاحمت، مفلوک الحال دلت اقلیت اور دیگر نچلے طبقے کی زبوں حالی اور احتجاج، انسانی رشتوں کے کھوکھلے پن اقتدار کی شکست اور نئی اقدار کی تشکیل، انسانی غم وغصہ اور اضطراب، انسانی سائیکی پر پڑنے والے دباؤ اور انگنت دیگر مسائل وموضوعات کا گہرا ادراک رکھتے ہوئے انہیں اپنے اندر جذب کرنے میں منہمک ہے تیسری دنیا کے قومی اور مقامی مسائل پر اس کی گہری نظر ہے۔'' (نامیاتیت اور نامیاتی افسانہ (اشاریہ) شوکت حیات، کتاب نما، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۳ء ص ۱۹۔۲۰)

میں اسے اردو افسانے کے لیے ایک فال نیک تصور کرتا ہوں کیوں کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۹۵ء کے

درمیان اردو افسانہ جس اکہرے پن اور سپاٹ بیانی و یکسانیت کا شکار ہو گیا تھا اس سے قاری کے اندر ایک قسم کی بیزاری اور جھنجھلاہٹ پیدا ہونے لگی تھی لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد یا آس پاس کی نسل نے اردو افسانوں کو یہ محسوس کرتے ہوئے سنبھالا دیا کہ ابہام سے پُر افسانوں کی عمر تو زیادہ ہو نہیں سکتی اور ترقی پسندیت اب وہ احساس پارینہ رہ گیا ہے کہ جس سے عام قاری بیزار کن یکسانیت محسوس کرنے لگا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ شوکت حیات اپنے عہد کے افسانہ نگاروں کو سن ستری، نامیاتی افسانہ نگار مانتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ:

''۱۹۷۰ء صرف نشانِ وقت نہیں جہاں ۷۰ کے بعد والے رک گئے ہوں بلکہ روایت، بغاوت انحراف، گریز اور توسیع و مسلسل کے پیچیدہ مراحل سے گزرتے ہوئے مخصوص معنویت، تہہ داری اور ہمہ جہتی سے متصف ہو کر باضابطہ اصطلاحی شکل اختیار کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا عمل ہے اور اردو افسانے کے انتہائی اہم موڑ کی نشاندہی کرتا ہے..... ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانے کے اس کارنامہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اردو افسانے میں آزاد فضا کی بحالی پر اصرار کیا اور روز افزوں اس میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ آج افسانہ براہ راست بیانیہ تکنیک میں ہو یا علامتی، استعاراتی، تجریدی یا فنتاسیائی..... اپنے فارم یا وسیلے کی بنا پر نا قابل اعتنا نہیں ٹھہرتا سب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ افسانہ اولاً اور آخراً افسانہ ہے یا نہیں۔ گویا تمام آزادی اور تجربے کی گنجائش ان کے بنیادی صنفی امتیازات کو چھوڑ کر دیگر فنی امور میں مضمر ہے۔'' (سن ستری اور نامیاتی افسانے: انحراف اور تسلسل (اشاریہ) شوکت حیات، کتاب نما، نئی دہلی، اگست ۱۹۹۷ء ص ۳۔۴)

شوکت حیات کے تخلیقی تیور اور روایت سے انحراف و بغاوت کے میلان کو دیکھتے ہوئے ترقی پسند ادیبوں نے ان کی طرف خوب ڈورے ڈالے اور اپنی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی دعوت دی۔ شوکت حیات شریک بھی ہوئے لیکن ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا بقول فخر الکریم:

''شوکت حیات محض تخلیق کار نہیں ہیں وہ ایک مفکر اور دانشور بھی ہیں۔ انہوں نے ۷۰ کے بعد افسانہ نگاری پر چونکا دینے والے مضامین لکھے اور اپنی نسل کو کبھی انامیت، کبھی انام نسل کہا۔ مابعد جدید خیالات پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا۔ ان کا خیال ہے کہ آج کی نسل کے پاس سیاسی شعور تو ہے وہ سماج کے مسائل پر لکھ بھی رہی ہے لیکن

اپنے آپ کو کسی مخصوص نظریہ سے وابستہ نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن بابری مسجد کی شہادت اور گجرات کے حادثہ کے بعد ان کا خیال ہے کہ اب قلم کو ہتھیار بنانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو حقیقت پسند اور Radical Free Thinker کہتے ہیں۔ وہ خواہ کتنا بھی کہیں کہ وہ روایتی ترقی پسند ہیں نہ جدید لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی کہانیاں آج کے عہد کا احتجاجی و انقلابی اسشاریہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی اور سماج کے مسائل پوری سنجیدگی اور وابستگی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔''

شوکت حیات اپنی کہانیوں کو جو بھی نام دیں لیکن ہمشیہ وہ اپنا رشتہ بائیں بازو کی سیاست سے جوڑے رہے ہیں۔''

(ترقی پسند ادب کے معمار۔ مرتب: قمر رئیس، ص ۳۲۵۔۳۲۶)

جناب فخر الکریم نے شوکت حیات کو بائیں بازو کی سیاست سے جوڑنے کی اپنی کاوش میں پنکج پچوڑی کا بیان بھی نقل کیا ہے جسے انہوں نے اپریل ۱۹۸۵ء کے ہفتہ وار Link سے ماخوذ کیا ہے:

Shaukat feels that a writer should always be in the opposition of the existing status quo. "those who toe the establishment line can never be authentic." As long as "We have a society bassed on economic, political and psychological esploitation every committed writer should reamain in opposition."

Shaukat believe in Marxism as a philosophy, but will not really want to get branded as one. The left is cut of, unorganised and there are too many petty contradictions, he feels. It is really saddening for us."

دراصل یہ گمان اس طرح پیدا ہوا ہوگا کہ ۱۹۷۰ء کے بعد جو آواز ابھری اسے ''تیسری آواز کے نام سے بھی پکارا گیا کیوں کہ یہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رجحان سے الگ ایک رجحان کے طور پر ابھرنے لگی

تو سیاسی اصطلاح اسے Third front سمجھا گیا جو مارکسزم سے کسی طرح متاثر ہوتی ہے یا مارکسزم کی گود میں پروان چڑھتی ہے۔ ورنہ اس حقیقت سے بھلا کون مکر سکتا ہے کہ فن یوں بھی کسی ازم (Ism) اور کسی نظریے کا پابند نہیں ہوتا تاہم فن کی تخلیق میں نظری، فکری اور علمی محرکات وعوامل کی کارفرمائی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ جب بھی کسی فن پارہ کا تجزیہ کرنا مقصود ہو تو خیال رہے کہ کوئی بھی فنی نمونہ ایک ہمکار واقعہ ہوتا ہے جس میں داخلی خارجی عناصر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ جب داخلی جہت کو پیش نظر رکھتے ہیں تو فن کار کی نسلی میراث اور ذہنی تحفظات تک کی تحلیل کرتے ہیں اور مفید معنی مرتب کرتے ہیں اور خارجی عوامل ومحرکات کی تحلیل وتجزیے میں تاریخی عہد اور سماجی، سیاسی مذہبی اور معاشی تناظرات تک پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کیوں کہ فن کار کی نشو ونما میں سارے عوامل ومحرکات کارفرما ہوتے ہیں جو فن کی تخلیقی توانائی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر ان باتوں کو خاطر نشان نہ رکھا جائے تو ادب یک سرے پن کا شکار ہو جائے گا اور اس کا قاری گھٹ کر رہ جائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ شوکت حیات کا ادب تو آوازوں کا ایسا نگار خانۂ رقصاں ہے جسے اچھے قاری کی ضرورت ہے کہ ان کے پاس کہنے کو ایسے ایسے موضوعات ہیں اور اپنی باتوں کو رکھنے کے لیے جو زبان اور اندازِ بیان ہے وہ بہتوں سے جدا اور عام فہم نہیں۔ ان کے ادب پاروں سے ایسا لگتا ہے کہ شوکت حیات کا ادب کے ساتھ ایک Passionate Commitment ہے اور اس Passionate Commitment کو سمجھنا قاری کی ذمہ داری ہے۔ کیوں کہ ان کہانیوں میں انسان دوستی اور روشن خیالی کی جھلک ملتی ہے۔ ان کی کہانیوں کا حسن یہ ہے کہ یہ ہر کہانی میں ایک نئی دنیا خلق کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ مستقبل کی بشارت بھی دے دیتے ہیں اور اس سے نپٹنے کی تیاری کرنے کی ہدایت بھی دے جاتے ہیں لیکن اگر سماج زندگی کے تئیں بیدار نہیں ہے یا سیاسی شعور کی حد تک بالیدہ ذہن نہیں ہے تو پھر اسے قاری کی حیثیت سے کوئی رائے دینے سے قبل سوچنا چاہیے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک زمانہ اور انتظار کے بعد ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ جس میں صرف ۲۵ کہانیاں شامل ہیں۔ وہ بھی سنجیدہ قاریوں کے مسلسل تقاضے کے بعد۔ انہوں نے یہ زحمت گوارہ کی۔ ہر چند کہ اب تک ان کے کئی مجموعے شائع ہو جانے چاہیے تھے بشمول مجموعہ مضامین کہ ان کی یقیناً ادب میں قیمتی ضرورت ہے۔

◄◄ ● ►►

Department of Urdu
B.R.A Bihar University, Muzaffarpur
Muzaffarpur, Bihar,
Mob: 6203065107, 9431073172

● ڈاکٹر منصور خوشتر

شوکت حیات: اردو افسانے کی منفرد آواز

جدیدیت سے انامیت اور انامیت سے اجتماعیت تک کا بہت کامیاب سفر طئے کرنے والے معروف افسانہ نگار کا نام شوکت حیات ہے۔ اپنے عصر کی زمانی اور مکانی احساسات کو جس طرح شوکت حیات نے تخیئلی طور پر سوچا اور تخلیقی طور پر برتا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ان کی کہانیاں ادبی شعور کے ساتھ ذہنی ارتقاء سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ حیات نے سائنسی بصیرت اور عہد موجود کی کڑوی سچائیوں کو ساتھ لے کر دور رس روشنیاں بکھیری ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے کو امکانیت کی نئی تھیوری دیتے ہوئے، اپنے ہم عصروں کے درمیان منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ستّر کے بعد کے افسانہ نگاروں میں شوکت حیات بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' اس امر کا بین ثبوت ہے۔

اپنی Redical فکر اور طرز احساس کے ساتھ انقلابی ذہن رکھنے والے اس افسانہ نگار نے اپنی انفرادی شناخت بنائی ہے۔ شوکت حیات کامیاب افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ انام نسل کے حوالے سے انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ کہانی پسند قارئین انہیں کبھی بھلا نہیں پائیں گے۔

سلگتے احساس کی ترجمانی کرنے والے شوکت حیات کی کئی کہانیاں اپنے عہد کی نمائندگی کرنے کے ساتھ اپنے عہد سے بہت آگے کا سفر طے کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ رنگ برنگے سیاسی، سماجی اور معاشیاتی منظر کی دیواروں پر وقت کو سچا محضر لکھنے کا ہنر شوکت حیات کو خوب آتا تھا۔

شوکت حیات یکم دسمبر ۱۹۵۰ کو پٹنہ بہار میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی سائنس کالج سے سائنس میں گریجویشن کی ساتھ ہی مگدھ یونیورسٹی سے اردو میں طلائی تمغے کے ساتھ ایم اے کی سند حاصل کی۔ وہ یو جی سی (نیٹ کوالیفائیڈ) تھے۔ ایک جدید اور مابعد جدید ہندوستانی مصنف رہے۔ وہ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی لکھتے تھے۔ ان کی پہلی کہانی ''بکسوں سے دبا آدمی'' ماہنامہ ''کتاب'' لکھنو میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی کہانیوں میں اکثر قیاس آرائی، سپاٹ بیانیہ اور کبھی کبھی ترقی پسند تحریک کی بنیادی اقدار شامل ہوتی ہیں اور بعض اوقات کہانی سنانے سے انحراف ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانی ''گنبد کے کبوتر'' کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا انتقال ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء بروز بدھ ہوا۔

اپنے افسانے کے تعلق سے شوکت حیات لکھتے ہیں:

''میرے افسانے اس تناظر میں دیکھیں جائیں کہ یہ وہ نئے جدید اور مابعد جدید افسانے ہیں جو دراصل نامیاتی اور امکانی ہیں اور انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں۔ان افسانوں میں آج کے عہد اور آج کے انسان،اس کے مسائل کو نئے ڈھنگ، لہجے، تکنیک، ٹریٹمنٹ، موضوع،فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

شوکت حیات کے افسانوں کا فکری محور انسان ہے۔وہ فرد کے داخلی اور خارجی بحران کا مطالعہ اس کے سماجی احوال کے ساتھ کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے بعض کرداروں کے ذریعہ سماج کے کھوکھلے نظام اور دوغلے رویوں کے خلاف پرزور آواز بلندکی ہے۔اخلاقی و جذباتی بحران،سماجی و سیاسی ظلم و جبر،مسابقتی عہد میں زندگی کی بے مقصدیت اور بے معنویت، عالمی دہشت گردی کے نتیجے میں پنپنے والی بے یقینی اور بے نام خوف،طبقاتی استحصال کے منطقی نتائج وغیرہ کوانہوں اپنے افسانوں کے وسیلے سے پیش کیا ہے اوران تمام مراحل میں تخلیقی ضبط کے دامن کوخوش اسلوبی سے تھامے رکھنا ہی ان کا فنی امتیاز ہے۔

شوکت حیات کی فکری اور فنی رچاؤ کے متعلق وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''وہ پختہ ذہن فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح متوازن بھی ہوتا ہے۔اب جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقعہ کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتاسر بڑھا دیتی ہے۔ایک انقلابی ذہن میں کیسی کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہوسکتی ہے۔اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔''

شوکت حیات کے تعلق سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے بڑی عمدہ باتیں پیش کی ہیں۔ان کے افسانے کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''شوکت حیات افسانوی ادب میں ''اَ کہانی'' کی آواز بلند کرتے ہوئے ساتویں دہائی میں داخل ہوئے۔ یہ اینٹی اسٹوری لکھنے کی تحریک تھی جس کے ڈانڈے بلراج مینرا کی ''کمپوزیشن'' سریز اور سریندر پرکاش کے ''تلقارمش'' سے ملتے تھے۔شوکت حیات نے بھی ایسی کہانیاں بڑی تعداد میں لکھیں اور کمپوزیشن سریز کی طرح ''سچویشن سریز'' کی

کہانیاں بھی لکھیں مگر ان کی شناخت احتجاج پر مبنی افسانے ''بانگ'' سے قائم ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب شوکت حیات نے محسوس کرلیا تھا کہ ''اکہانی'' مشرقی مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔لہذا ''بانگ'' شوکت حیات کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کا بھی Point Turning ثابت ہوا جس میں علامت کا پردہ بہت باریک ہے اور احتجاج کی لئے دبیز۔ یہ افسانہ متشدد قسم کے علامتی اور Plotless افسانوں کے خلاف بھی احتجاج تھا جس کے آر پار بڑی آسانی سے فن کے ساتھ افسانے کے مستقبل کو دیکھا جا سکتا تھا۔اس کے بعد شوکت حیات کے اکثر افسانے بیانیہ لہجہ لئے ہوئے سامنے آئے مگر ان کا بیانیہ بالکل برہنہ اور شفاف نہیں ہوتا۔ وہ ہلکے سے ابہام اور پردہ داری کے قائل ہیں جو تخلیق کے حسن کو بڑھاتی ہے اور تاثر کی شدت میں سرتا سر اضافہ کر کے نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔''

شوکت حیات نے ستّر کی دہائی سے افسانہ نگاری کی ابتدا کی اور سو سے زائد افسانے معتبر و مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہوئے،لیکن ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔تقریباً چالیس سالہ افسانوی سفر کے دوران مجموعہ شائع نہ کرانے کا سبب خواہ جو بھی ہو لیکن ابرار رحمانی کے لفظوں میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کتاب گردی کے اس دور میں بھی شوکت حیات کا اس طرف دھیان نہ دینا ان کے جینوئن فنکار ہونے پر دال ہے۔'گنبد کے کبوتر' ان کی پچیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ان کہانیوں میں سے بہترین،اوسط یا کمزور کہانیوں کی درجہ بندی مشکل ہے، کیونکہ ہر افسانہ زندگی کے نئے افق، معاشرے کے نئے پہلو کو پیش کر رہا ہے۔کوئی افسانہ کردار کا افسانہ ہے تو کوئی واقعات کا،کوئی احساس کے پیچ وخم کھول رہا ہے تو کوئی تاریخی لمحے کی خطا کو گرفت میں لے رہا ہے،کہیں عشق کا ترفع ہے تو کہیں دبی کچلی نفرت کا ترشح۔ ہر افسانے کی قرأت ایک جہان دگر کی سیر کراتی ہے۔

معروف قلمکار اعجاز علی ارشد نے شوکت حیات کے افسانہ نگاری سے متعلق لکھا ہے:

''افسانوی مجموعے'' کی فہرست کے مطابق اس طرح کا پہلا افسانہ ''رانی باغ'' ہے۔اس پر شوکت کے اپنے نظریۂ حیات کا اثر نمایاں ہے۔خاص طور پر رحمت صاحب کا امریکہ سے ہندوستان واپس آکر اپنے آبائی گاؤں میں قیام کرنا، وہاں کی بچی کھچی جائداد مارکسی انقلابیوں کے سپرد کر دینا اور خود بھی ان کی تحریک میں یہ کہتے ہوئے شامل ہوجانا کہ ''ہم شعلے نہیں رہے مگر ایندھن کا حصہ تو بن ہی سکتے ہیں۔'' افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کا واضح اشارہ ہے۔مگر میری نظر میں

افسانے کے دو اور پہلو ایسے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔ ایک تو اس کا آغاز ہے۔ رحمت اور رانی کا افلاطونی عشق جو خاصے روایتی انداز میں شروع ہوتا ہے اور اسی انداز سے جاری رہتے ہوئے انجام تک بھی پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بین المذہب عشق و عاشقی کی ہمارے معاشرے میں آج بھی گنجائش نہیں ہے اور کل تو اور بھی نہیں تھی۔ ایسے میں رحمت صاحب کا امریکہ چلے جانا اور رانی کے گھر والوں کا اس کی شادی کر دینا حقیقت پسندانہ بیان ہے مگر میرا سوال یہ ہے کہ آخر اس میں شوکت حیات کا انفرادی رویہ کہاں ہے۔ ایسا تو دوسرے افسانوں میں بھی ہوتا رہا ہے۔ دوسرا پہلو اسلوب سے متعلق ہے۔ پوری کہانی بیانیہ کے پیرائے میں ہے۔ فطرت کا بیان ہو یا پھر ناسٹلجک رجحان کا، ہر جگہ انداز بیان سادہ ہے۔ کوئی استعارہ یا علامت نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ تشبیہات بھی سامنے کی اور کلاسیکی انداز کی ہیں۔ گویا افسانہ روایت سے بہت قریب ہے۔'' (دربھنگہ ٹائمز، یادرفتگاں نمبر، ص:۱۷۱)

فرقہ وارانہ فسادات اور مشترکہ کلچر کے زوال کے علاوہ پرانی تہذیبوں اور قدروں کی شکست وریخت بھی شوکت حیات کے یہاں نظر آتی ہے۔ صداقت وبصیرت اور روایات واقدار کی تلاش، انسان کے مقدر کی شدید جستجو، موت کی قطعیت اور حیات بعد الموت کی پیچیدگی اور زندگی کی معنویت سے محروم ہو جانے کے احساس کو انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں خوب صورتی سے برتا ہے۔ ایسا ہی ایک افسانہ ''گھونسلا'' ہے جس میں ایک شخص برسوں بعد اپنے شہر لوٹ کر گھپ اندھیری رات میں اپنے گھر کی تلاش میں نکلتا ہے۔ وہ رکشے میں سوار ہو کر پورے شہر کا چکر لگاتا ہے اور بار بار رکشے والے کو نئے راستوں سے چلنے کی ہدایت کرتا ہے لیکن ہر بار اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ رکشے والا جو لوٹ کر آنے والے مسافر شخص کا باپ ہے اور جو خود بھی گھر سے محروم ہو چکا ہے ناکام تگ ودو کے بعد بالآخر اس مطلوبہ ٹھکانے کا انکشاف کرتا ہے جو اب صاف اور چٹیل میدان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ رکشے پر سوار شخص اپنے ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے بے چین ہے۔ اس تمثیلی کہانی میں شناخت کے آثار سے محروم ہو جانے والا اصل ٹھکانہ (چٹیل میدان) پرانی روایت اور تہذیب کا امین ہے اور اس ٹھکانے سے سفر کرنے والے شخص کا روحانی اور جذباتی تعلق ہے۔ زندگی ایک سفر ہے اس لئے افسانہ بھی سفر سے شروع ہوتا ہے اور تا آخر سفر جاری رہتا ہے۔ وہ شخص بار بار راستے بدلتا ہے لیکن سارے راستے اسے اسی چٹیل میدان تک پہنچاتے ہیں۔ اس نے مندر، مسجد، چرچ اور گردوارے کا راستہ بھی اختیار کیا لیکن یہ بھی اسے وہیں تک پہنچا سکے یعنی مذہب جو روحانی اقدار وافکار

کے تحفظ کا وسیلہ ہے وہ بھی مٹتی ہوئی تہذیبوں اور فنا پذیر قدروں کو محفوظ نہ رکھ سکا اور نئی تہذیبیں ان پر حاوی ہو گئیں۔ افسانہ اِن سطور پر ختم ہوتا ہے جب روتے ہوئے رکشہ والا سفر کرنے والے شخص سے کہتا ہے۔

شوکت حیات کے افسانوں کا مکالمہ بھی بہت عمدہ ہوا کرتا ہے۔ ایک خاص انداز میں افسانے کے کردار گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانہ ''بھائی'' سے ایک مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

''کئی چہرے آگے آئے اور چاروں طرف سے انہوں نے ٹمپو کو گھیر لیا۔ غالباً تندرست آدمی کی شناخت سے ان میں سے کئی لوگ واقف تھے۔ دبلے آدمی کی طرف وہ لپکے۔

''تم اپنا نام بتاؤ۔''

''راجہ!''

''پورا نام؟''

تندرست ہم سفر نے فوراً اپنے ہونے کا احساس کرایا، ''نام کیا پوچھنا ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔''

''جھوٹ۔ پینٹ اتارو۔'' کسی کینہ پرور اور شر پسند نے زمین پر اپنی لاٹھی پٹکتے ہوئے کہا۔

ان میں سے کئی ہنسنے لگے۔ کئی واقعی پینٹ کھول کر دبلے آدمی کی بے حرمتی کرنے کے لئے آگے بڑھے۔

اسی وقت اس تندرست آدمی نے بل کھاتے ہوئے زور دار آواز میں چیخ لگائی، ''خبردار۔ میری لاش سے گزر کر ہی یہ کام کر سکتے ہو۔''

شوکت حیات کے افسانوں کا اسلوب بھی نرالا ہے۔ وہ اپنے منفرد انداز میں افسانے کے بیانیہ میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانہ ''گھونسلا'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''دباؤ بڑھتا گیا۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں نے اسے حیرت واستعجاب سے دیکھا اور اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے کہ اسے قلب کا دورہ پڑنے والا ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے سوچا کہ سچ مچ اس کا اور اس کے جیسے کروڑوں لوگوں کا اس بھری پری دنیا میں کہیں کوئی اسٹیشن نہیں۔

پورے سفر میں دو افراد کے متعلق وہ شدت سے سوچتا رہا تھا۔ ایک وہ جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔ اس کا باپ۔ اور دوسرا وہ جس سے کسی طرح کا کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب سا نامعلوم تعلق تھا۔ جس کے ادھ کھلے کھڑے ہونٹ کا ذائقہ اب بھی اس کی شریانوں میں سنسنی کی لہر دوڑا دیتا تھا اور جس کے سانولے سلونے وجود کے تصور کی گرمی بھی خود اس کے وجود کو موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔ یہ لوگ ملاقات ہونے پر کسی طرح چونک جائیں گے۔ پہلے تو حواس باختہ ہو جائیں گے پھر جب ان کے اوسان بحال ہوں گے تو سوچیں گے کہ ان واحد میں انہیں فرطِ انبساط کی کیسی بیش بہا دولت مل گئی۔''

اس طرح شوکت حیات کے افسانے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں سماجی اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ افسانوی مکالمہ اور اسلوب بھی کافی دلچسپ ہوا کرتا ہے۔

شوکت حیات کے بعض افسانوں کے واقعات اور کردار پہلی نظر میں فرضی معلوم ہوتے ہیں لیکن جیسے جیسے آپ اس کردار کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ واضح ہوتا چلا جاتا ہے کہ ایسا ممکن ہے چاہے ایک لاکھ میں کوئی ایسا واقعہ اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے ذاتی طور پر ان کے افسانوں کا مطالعہ بھی کیا ہے اور مشاہدہ بھی۔ وہ ہر افسانے میں وہ کوئی نہ کوئی نئی تکنیک پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

افسانے کے فنی تصورات پر جب نقاد گفتگو کرتے ہیں تو وہ شوکت حیات کی فنی بالیدگی اور ان کے کینوس کی بوقلمونی سے متحیر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان کے یہاں اخلاقیات کی کچھ حدیں مقرر ہیں، وہ ان سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ جملوں میں ایسی چاشنی پیدا کرتے ہیں کہ اس میں خود بہ خود تہذیبی رومانیت ابھر آتی ہے... اور وہ قاری پر ایک نشہ بن کر اس پر ایسا سحر طاری کرتی ہے کہ وہ اس میں اپنی زندگی کے ناآفریدہ نقوش تلاش کرنے لگتا ہے۔

شوکت حیات جب نظام اقتدار کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور اس نظام سے وابستہ کرداروں پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کرداروں کی منافقتیں خود بہ خود قاری کے روبرو ہو جاتی ہیں۔ یہ کردار اپنے سیاسی مفاد کے لیے سماجی اور مذہبی منافرت کو کس طرح پروان چڑھاتے ہیں، اس کا ایسا منظر سامنے آتا ہے، جیسے یہ بالکل سامنے کی بات ہو۔

جب ہم شوکت حیات کی تحریروں میں حزن و یاس اور المیہ عناصر کو تلاش کرتے ہیں تو ان کی تحریروں کے آہنگ میں ارسطو کی 'بوطیقا' پوری طرح اپنی تمام کیفیتوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہے... اسی طرح ارسطو کے نزدیک المیہ کا اہم ترین اصول پلاٹ ہے اور یہی المیہ کی روح بھی ہے۔ پلاٹ کی ترتیب میں

خارجی عوامل کے بجائے داخلی وحدت کو پیش نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔ شوکت حیات کے یہاں افعال ان کے کرداروں کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کرداروں پر جو صدمے گزرتے ہیں، ان کے کردار ان سے پریشان نہیں ہوتے، بلکہ ان میں امید کی ایک خوش گوار کرن نظر آتی ہے اور ان کی امید مرگِ ناگہاں پر جب اختتام کو پہنچتی ہے تو بہ ظاہر ان کی حالت قابل رحم نظر آتی ہے، لیکن ان کے دلوں میں ایک جذبہ جنوں اپنی حقیقی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے... اور ان کو شوکت حیات کا خاص اسلوب نئی اثر آفرینی عطا کرتا ہے۔

لارنس (Paud Herbea Lawrence-1885-1930) نے لکھا ہے کہ 'فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوتا' اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر واقعہ کوئی عمدہ اور بہترین کہانی نہیں ہوتا۔ البتہ فکشن نگار کا تخلیقی ذہن اور وژن کسی معمولی واقعے کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ شوکت حیات اس معاملے میں بھی اپنے عہد کیا مابعد عہد کے تخلیق کاروں سے دو قدم آگے ہی ہیں، وہ آگے کی سوچتے ہیں اور پیش آمدہ واقعات کی روشنی میں مابعد اپنے فکری تنوع کے سبب ایسا خیال پیش کرتے ہیں جو واقعی آنے والے وقت کے لیے ایک شہادت بن جاتا ہے۔ ان کی تخلیق کی گہرائی اور تہہ داری کو سمجھنے کے لیے حالات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جب تک قاری اپنے معاشی، سیاسی اور سماجی سروکار سے واقف نہیں ہوگا، اسے شوکت حیات سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ شوکت حیات کی فن کارانہ تجسیم کو سمجھنے کے لیے آپ جتنا اپنے ماحول سے واقف ہوں گے، اتنا ہی شوکت حیات کی تحریروں سے لطف اندوز ہوں گے۔ مثال کے لیے ان کے افسانوں کے بہت سے کرداروں سے، بہت سے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن میں یہاں طوالت کی ڈر سے مثالوں سے گریز کروں گا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آپ خود ان کی تحریروں کا مطالعہ کریں تاکہ صحیح معنوں میں قاری اور شوکت حیات کے مابین رشتوں کو اُجاگر کیا جا سکے۔ شوکت حیات بلاشبہ ایک عظیم فنکار تھے، جن کی کمی کوئی دوسرا پوری نہیں کر سکتا، میں انھیں کلمات کے ساتھ اس شعر پر میں اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا کہ:

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

☆☆☆

Shaukat Ali House, Purani Munsafi
Lalbagh, Darbhanga Bihar
Mob: 9234772764

● ڈاکٹر صالحہ صدیقی

حیات اردو افسانہ: شوکت حیات کا فکری و فنی مطالعہ

شوکت حیات نے خاموش رہ کر اردو فکشن کی لافانی خدمات کو انجام دیں۔ اپنے افسانوں کے ذریعہ قاری کے دلوں میں تاثر کی تیکھی لہر چھوڑنے والے شوکت حیات دسمبر ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ خصوصاً ستّر کی دہائی کے افسانہ نگاری کے میدان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماج کی تلخ حقیقتیں اور صداقتیں پوشیدہ ہیں۔ انھوں نے اپنے گرد و معاشرے کی برائیوں پر پردہ پوشی کی بجائے موضوعِ سخن بنایا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں اپنے افسانے کے ذریعہ سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' شہرہ آفاق حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں انہیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ساتھ ہی ان کو قومی کتھا ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ مشہور افسانہ نگار اور بہار اردو اکیڈمی کے سابق سیکریٹری مشتاق احمد نوری نے شوکت حیات کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''اردو فکشن کی شوکت، شوکت حیات سن ستر سے افسانہ نگاروں کی امامت کرنے والا 'گنبد کے کبوتر' کا خالق اور انامیت کا اسیر، فکشن کی آبرو کہلانے والا فکشن کا جادوگر ہمارے درمیان سے خاموشی سے چلا ہوگیا۔ وہ ایک عرصے سے بیمار تھے، محفلوں سے دور ہوتے جا رہے تھے اور لکھنا پڑھنا بھی بند تھا۔ اپنے آپ میں گم رہنے لگے تھے لیکن اس کے قہقہے میں اب بھی جان تھی۔ کسے معلوم تھا کہ قہقہہ بکھیرنے والا اپنے دوستوں کو سسکیوں کے حوالے کر جائے گا۔''

معروف نقاد اور صاحب طرز ادیب حقانی القاسمی نے بھی شوکت حیات کے انتقال کو فکشن کا ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ شوکت حیات اپنی ابتدائی زندگی، بچپن کی زندگی عہد و ماحول اور والدین کی تربیت کو یاد کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''میری پیدائش یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو صدر گلی، پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں، اُس گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ میرے دادا مناظر احسن گیلانی پڑھے لکھے اور قابل آدمی تھے۔ اُن کی علمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کے Constitution بناتے ہوئے اُن کو بھی مدعو کیا

تھا۔ دادا کے علاوہ والد صاحب کو بھی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ اُن کی ایک ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں کتابوں کی بھرمار تھی۔ والد صاحب اپنے ساتھ بچوں کے ذوق کا بھی خیال رکھتے اور اُن کے لیے کہانیوں کی کتابیں اور ماہنامے پابندی سے منگواتے۔ نیرنگِ خیال، عالم گیر، کھلونا، شمع، بیس ویں صدی، ماہِ نو اور آج کل وغیرہ وہ رسائل ہیں جو والد صاحب کی لائبریری کی زینت تھیں۔ والد صاحب کی اُس منی لائبریری سے مجھے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا۔ پڑھائی کی جانب اور بہ طورِ خاص اردو ادب سے رغبت پیدا ہوئی اور لکھنے کی طرف میرا رجحان یوں ہوا کہ پٹنہ سے دلی کے سفر کے دوران والد صاحب نے ایک ڈائری دی اور پورے سفر کی روداد لکھنے کو کہا جسے لکھنے کے بعد میرے اندر کہانیاں لکھنے کا شوق جاگا، سو مَیں نے افسانہ نگاری کی ابتدا کر دی۔ ایک خاص بات اور یہ ہے کہ جب والد صاحب کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہوا تو ایک پریشانی یہ آن پڑی کہ لائبریری کو کس طرح منتقل کیا جائے۔ آخر یہ طے ہوا کہ والدہ کے نام ایک لائبریری قایم کی جائے لہٰذا والد صاحب نے ''قمر النسا لائبریری'' کے نام سے ایک کتب خانہ قایم کیا اور تمام کتابیں وہیں منتقل کر دیں تاکہ اردو ادب کا فروغ ہو سکے اور نوجوان، بچے اور عورتیں اُن کتابوں سے مستفید ہو سکیں۔''

اسی طرح اپنے تخلیقی سفر پر شوکت حیات ۲۰۱۰ء میں دیئے گئے اپنے انٹرویوں میں کہا تھا:

> ''حیات..... میرے والد ''سید محفوظ الحق'' کا انتقال میرے بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے ایک خلا کا احساس ہوتا تھا اور ایک عجیب سی اداسی میرے اردگرد چھائی رہتی تھی۔ دِن میں تو اِس طرح کی بے چینی کم ہوتی لیکن جوں ہی آفتاب غروب ہونے کو ہوتا مَیں ڈپریشن کا شکار ہونے لگتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ میری زندگی کا تانا بانا بس یوں ہی چلتا رہے گا۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر میں نے آپ بیتی لکھنا شروع کیا جس سے افسانہ نگاری کی جانب راغب ہوں۔ میں نے ابتدا میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں لیکن کچھ بزرگ افسانہ نگاروں نے یہ مشورہ دیا کہ ''تمہارے اندر وہ خوبی موجود ہے جو ایک افسانہ نگار میں ہوتی ہے''۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''تمہاری کہانیاں بچوں کے معیار سے بالاتر ہیں''۔ اُن بزرگ ادیبوں میں ظفر اوگانوی، سلطان اختر، ظہیر صدیقی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں..... جیسا کہ میں نے کہا ڈائری لکھنے سے میرے اندر حرکت پیدا ہوئی اور

مجھے طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر انہی اوراق میں کچھ ترمیم کی گئی تو اس کی شکل افسانے کی سی ہو جائے گی، سو میں نے محنت و لگن سے افسانے لکھنے لگا۔ میرا پہلا افسانہ ''بکسوں سے دبا آدمی''، ''کتاب'' (لکھنؤ) سے ۱۹۷۰ء میں شایع ہوا تو اگلے تین شمارے تک اس کی تعریف ہوتی رہی۔ کسی معیاری رسالے میں پہلی کہانی کا چھپنا میرے لیے مسرت کی بات تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، فضیل جعفری، مہدی جعفر اور نظام صدیقی وغیرہ نے مفید مشوروں سے نوازا۔''

شوکت حیات کو افسانے سے شغف کا اندازہ ان کے انٹرویو کے اس حصے سے تفصیلی طور پر ہو جاتا ہے۔ ان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا بھر کے افسانہ نگاروں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے متاثر بھی تھے۔ عالمی ادب میں کافکا، کامیو، چیخوف، موپاساں، ٹالسٹائی، دوستوفسکی اور خلیل جبران وغیرہ ایسے فن کار ہیں جن کی کہانیاں انھوں نے پڑھیں اس کے علاوہ کچھ کے تراجم سے بھی استفادہ کیا تھا۔ جس کے سبب انھیں عالمی ادب کے رجحانات سے واقفیت ہوئی اور اس کا اثر ان کے تخلیقی وجدان پر بھی پڑا۔ ان کے افسانوں کی تکنیک پر بھی اس کا اثر صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں منٹو اور بلراج سے وہ راہ راسے متاثر تھے۔ بلراج مینرا سے خصوصاً ان کو شغف تھا۔ لیکن ان تمام فکشن نگاروں سے متاثر ہونے کے باجود ان کا اپنا رنگ تھا۔ ان کا ماننا بھی تھا کہ انسان کی اپنی شناخت خود سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اِن فن کاروں سے لکھنے کی ترغیب تو لیتے تھے لیکن ان سے مرعوب کبھی نہیں ہوئے۔ شوکت حیات کے افسانوں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہیں کہ وہ قصہ پن کے قائل تھے۔ ان کی کہانیوں کا آغاز ایسے ہوتا ہے کہ قاری فوراً اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور جلد تجسس کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ خاتمے پر یہ کہانیاں ہمارے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور کچھ ایسے سوالیہ نشان اُبھار دیتی ہے جن کے جوابات ہم آئندہ زندگی میں تلاش کرتے رہتے ہیں جو ان کے فن کا کمال ہے۔ شوکت حیات کی افسانہ نگاری کی بنیادی خصوصیات 'حقیقت نگاری اور اصلاح معاشرہ' ہے۔ اس لیے وہ مقصدی افسانے لکھنے میں ذرا بھی نہیں کتراتے۔ ان کی یہ حقیقت نگاری ان کی حق گوئی، بے باکی، خلوص، انسان دوستی، دردمندی، سیاسی اور سماجی شعور کا نتیجہ ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور مقصدیت کو اولیت حاصل ہے۔ شوکت حیات خاص نقطۂ نظر کے حامل تھے جس کی پیش کش کے لیے وہ قلم اُٹھاتے تھے۔ مثلاً ہندو مسلم نفاق، فسادات، ملک کے ابتر حالات، پچھڑے ہوئے طبقے کی خراب و خستہ حالت نے ان کو کافی رنج پہنچایا۔ ان حالات سے ملک کو روشناس اور قوم کو بیدار کرنے کے لیے اُنھوں نے افسانے لکھے۔ انھوں نے داستانوی اور افسانوی کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ اپنے گرد و پیش کے حقیقی واقعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ شوکت حیات ایک سچے قوم پرست، وطن پرست اور سوشلسٹ تھے جن کی کہانیوں کا مقصد اصلاح معاشرہ

تھا۔ وہ سماج کے ہر پہلو اور وطن کے ہر فرد کی اصلاح چاہتے تھے۔ شوکت حیات ایک نئے معاشرے کے ڈریمر اور اصلاح و انقلاب کے قائل تھے وہ ایک جہد کار تھے اور اپنی کہانیوں اور کردار کے ذریعے ملک کے مظلوم اور بے سہارا طبقے کی نمائندگی کرتے رہے۔ جس کی زندہ مثالیں ان کے افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ شوکت حیات نے پسماندہ سماج کو اپنی تحریروں کے ذریعے بہتری کی طرف لانے کی ہر ممکن کوشش کی وہ برصغیر میں امن و امان، خوش حالی کے خواہش مند تھے اس لیے وہ اپنے افسانوں میں ہر جگہ حق گوئی اور حق پرستی کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ آپ نے کئی لا زوال افسانے تخلیق کیے جن میں بکسوں سے دبا آدمی، گھونسلا، گنبد کے کبوتر، سرخ اپارٹمنٹ، رانی باغ، پاؤں، ڈھلان پر رُکے ہوئے قدم، چیخیں وغیرہ کے نام خصوصی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ آپ نے ہم عصر افسانہ نگاروں کے حوالے سے کئی اچھے مضامین بھی تحریر کیے۔ مثلاً سَن ستری اور نامیاتی افسانے: انحراف و تسلسل، نامیاتیت اور نامیاتی افسانے، امکانیت پسندی وغیرہ اسی ضمن کے مضامین ہیں۔ ان مضامین میں انہوں نے ہم عصر افسانہ نگاروں کے حوالے سے اس بات پر اصرار کیا کہ:

''میں اور میرے ہم عصر افسانہ نگار انامیت پسند ہیں اور وہی افسانہ عصری و آفاقی ہے جو عصریت و آفاقیت کے امتزاج، انجذاب اور وفاق سے سرشار ہو کر افسانے کی توانائی میں افسانے کا سبب بنتے ہیں''۔

شوکت حیات کا فکشن متنوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بے خوف فکشن نگار تھے۔ وہ بانگ دہل اپنی بات افسانوں میں کہنا جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو تنقید کا بھی نشانہ بنایا گیا۔ خواجہ صاحب ایک مضبوط اور بے باک قلم کار تھے جن کے اندر حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس نے انھیں ایک سچا نیشنلسٹ اور پختہ فکر ادیب بنا دیا۔ ان کا ادب فکری ادب ہے انھیں ہمہ وقت ملک و قوم کے ہر فرد کی فکر لگی رہتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر افسانے میں ایک بے چین شوکت حیات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تمام افسانوی تحریریں حب الوطنی کے جذبے اور سیاسی و سماجی شعور سے بھرپور ہیں۔ لوگوں میں بیداری اور معاشرے کی فلاح و بہبود کا کام اُنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے بڑے فنکارانہ اور سنجیدہ انداز میں کیا ہے۔ منفرد اسلوب اور نئے تجربے بھی شوکت حیات کے افسانوں کی اہم خوبیاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک نیا تجربہ ملتا ہے جو نئی تکنیک اور پلاٹ کا افسانہ ہے۔ شوکت حیات کی کہانیوں کا پلاٹ سادہ اور غیر پیچیدہ ہے انداز بیان بے حد آسان اور مؤثر ہے جس سے قاری کا ذہن الجھنے سے بچا رہتا ہے اور آسانی سے فن کار کا ہمسفر بنا رہتا ہے۔ ان کی کہانیوں کی مقبولیت میں اسلوب یا اسٹائل کا بھی بڑی حد تک ہاتھ ہے۔ ان کے افسانوں کا کینوس چھوٹا ہے جن میں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہی گئی ہیں۔ ان کے افسانے کہانی پن کے قائل ہیں اور چونکہ کہانی پن واقعات سے پیدا ہوتا ہے اس لیے ان کے افسانوں کے واقعات

میں کہیں ظاہری طور پر تو کہیں پوشیدہ طور پر ربط ضرور ہے جو ان کے پلاٹ کی جان ہے۔ان کی ایسی کہانیاں بھی ہیں جن میں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ تقسیم کا موضوع بھی اپنے عروج پر ہے۔ یہ کہانیاں تقسیم کے بطن سے جنمی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شوکت حیات نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے وہ ہر بوڑھے بزرگ سے غلامی، آزادی اور تقسیم کی داستان سن رہے تھے۔حساس طبیعت ہونے کی وجہ سے غلامی کا تصور بھی ان کے لئے اذیت ناک تھا، اور آزادی کے بعد سے ہونے والے دنگے اور فسادات نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان کا یہی احساس اور درد ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ایسی ہی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے شوکت حیات صاحب کہتے ہیں:

''۱۹۷۵ء میں ایک کہانی ''بانگ'' کے عنوان سے لکھی تھی جو ایمرجنسی اور فاشزم کے خلاف احتجاجی کہانی تھی۔ چوں کہ میری کہانیاں ''شب خون'' میں چھپتی تھیں لیکن جب میں نے یہ کہانی فاروقی صاحب کو بھیجی تو انہوں نے مصلحت کی بنا پر کہانی معذرت کے ساتھ واپس کردی۔اس کے بعد یہ کہانی ''تناظر'' دہلی میں شائع ہوئی۔کہانی شائع ہونے کے بعد مخالفت کی بھی شروعات ہوئی۔اسی مخالفت نے شہرت کی بھی کھڑکی بھی وا کردی۔اس کہانی کو کافی پسند کیا گیا۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں کہانی پن بھرپور موجود تھی جو کہ ستّر کی دہائی میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔اس کہانی کے متعلق مہدی جعفر نے اس بات کا اظہار کیا کہ ''بانگ'' کہانی پن کی واپسی کا پیش خیمہ ہے۔''

شوکت حیات کی کہانیوں کے کردار ہندوستانی معاشرے کے کردار ہیں جن میں ہر مذہب اور ہر ملت کے افراد شامل ہیں۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، بد نیک، ظالم مظلوم، سنگ دل رحم دل، صابر شاکر جلد باز، کاہل انقلاب پسند ہر قسم کے کردار ان کی کہانیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کے کردار جامد اور ٹھہرے ہوئے کردار نہیں ہیں بلکہ راؤنڈ کردار ہیں جو حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔شوکت حیات کا افسانہ ''بھائی'' فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا ایک اہم افسانہ ہے۔اس میں انھوں نے انسانی نفسیات کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ جب ماحول بگڑتا ہے تو کس طرح ایک فرقے کا دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے، لوگ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں کہ فریق مخالف کا ہر عمل اور ہر حرکت خوفزدہ کرتی رہتی ہے کہ وہ اس پر حملہ آور نہ ہو جائے۔تذبذب کی اس فضا میں ہر منزل، گرد و پیش کا ہر منظر، غرض کہ زمین اور آسمان نادیدہ اور نامعلوم خطروں سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔خوف و ہراس کا عالم چہار سو چھا جاتا ہے، ایسے ہی ماحول کی عکاسی ان کے افسانے کے اس اقتباس سے لگائی جاسکتی ہیں:

''اس تندرست آدمی سے محتاط رہنا ضروری ہے.....اس نے سوچا اسے بے حد افسوس

ہوا کہ آج اس کی جیب میں وہ کی رِنگ بھی نہیں تھی جس میں پھل کاٹنے والا ایک ننھا سا چاقو ہوتا تھا۔اس کے حملہ آور ہونے کی صورت میں کچھ تو اپنا بچاؤ کر سکتا تھا۔لیکن وہ تو نہتا تھا۔اس تنومند آدمی کی جیب میں نہ جانے کون سا ہتھیار ہوگا۔نہ بھی ہوا تو کیا اس کا مضبوط جسم ہی اسے زیر کرنے کے لئے کافی نہیں۔اس نے غور کیا کہ تنومند آدمی مستقل اپنا ہاتھ جیب میں ڈالے ہوئے تھا'' (بھائی)

شوکت حیات نے اپنے افسانوں میں عصری زندگی کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل کو بڑی خوبی سے بیان کیا اور جدید معاشرے کے کھوکھلے پن کو ہنرمندی سے دکھایا ہے۔ وہ انفرادی انسان سے زیادہ معاشرتی انسان کی تصویر کشی کرتے ہیں جس میں ظلم کے خلاف ان کا سیاسی نقطۂ نظر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ بیشتر افسانوں میں انسان کا ارتقا سماجی ارتقا سے وابستہ دکھانے کی کوشش کی ہے اور انسان اور اس کے معاشرتی یا اجتماعی وجود کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بحیثیت مجموعی ایک دردمند دل اور روشن فکر کی جھلک بہر طور نظر آتی ہے۔شوکت حیات اپنے انداز کے سب سے توانا اور منفرد فکشن رائٹر تھے۔ وہ روایتی انداز میں بنی گئی کہانیوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ایک طرف جہاں وہ اپنے افسانوں میں علامتوں کا استعمال کرتے ہیں وہی دوسری طرف اس میں خوبصورت بیانیہ اور فنٹسی کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ایک طرف جہاں ان کے افسانوں میں سماجی اور سیاسی شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہی ان میں تاریخ کی گونج کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جو دھیرے دھیرے ان کے ناولوں میں اپنی جگہ متعین کرتی ہیں۔ یہی وہ اندازِ بیان ہے جو برصغیر میں بہت کم افسانہ نگاروں یا ناول نگاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی اندازِ بیان اور مخصوص اسلوب شوکت صاحب کو دوسروں سے منفرد بناتا ہے۔انھوں نے ہمیشہ نئی چیزوں کو اپنایا حتیٰ کہ شوکت صاحب اپنی کہانیوں کے اسلوب اور تکنیک بھی بدلتے رہتے تھے۔جس کو عوام بھی خوب پسند کرتی تھی۔ان کی ہر کہانی قاری کو بے چین کرتی ہے اور ذہن میں کئی سوالات کو اُٹھاتی ہے۔نئی نسلوں میں در آئی تبدیلیاں جو اضطرابی کیفیات پیدا کرتی ہے وہ ہمیں اپنی باوقار تاریخ، تبدیلی اور روایت کی طرف پھر سے غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔آج کا ادب عصری زندگی کے شعور سے پیدا ہوتا ہے اور شوکت حیات زندگی کو فکشن میں لکھنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔وہ زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتے تھے، بیانیہ پر قدرت حاصل تھی اور کہانی کے فن سے بخوبی واقف تھے، موصوف کی مختلف موضوعات پر پکڑ تھی، کردار ہمارے معاشرے کے چلتے پھرتے انسان ہیں، مکالمے دلچسپ اور دلکش ہیں، اسلوب منفرد اور انداز بیان مختلف ہے، پلاٹ میں ترتیب ہے، ماحول و فضا حالات و واقعات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے' آغاز و اختتام پر کشش و پر اثر ہے، مقصدیت اور حقیقت نگاری کو کہانیوں میں

اولیت حاصل ہے، استعارے اور علامتوں کا استعمال بڑی ہوشیاری سے کیا گیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر دوسری اصناف کی بہ نسبت افسانے میں انھیں زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ وہ اپنے افسانوی انداز پر کہتے تھے:

''میں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی ملی جلی تھیوری کو اختیار کیا۔ کسی ایک تھیوری کے افسانے نہیں لکھے۔ ایک فن کار کو ان تمام چیزوں سے ماورا ہو کر لکھنا چاہیے۔ سو میں نے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر نئے انداز کی کہانیاں لکھیں تو تھیوری کی سطح پر اس بات کا اعلان کیا کہ مَیں اور میری نسل جینیس افسانہ نگار نہ تو ترقی پسند ہیں اور نہ جدید۔ وہ مابعد اور ہیئت وفکر کی سطح پر اِن دونوں سے الگ ہیں۔ لہٰذا اُن کی الگ شناخت ہونی چاہیے۔ اس شناخت کو میں نے ''انام نسل'' اور ''انامیت'' کا نام دیا۔ ناقدوں اور دیگر حضرات سے مضمون لکھ کر گزارش کی کہ ہمیں ترقی پسند یا جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے برانڈ نہ کریں بل کہ ہمیں نئی نسل کا فرد سمجھتے ہوئے نئی شناخت کو تسلیم کریں۔''

تسلیم کرنا چاہیے کہ فکر وخیال اور موضوعات کے اعتبار سے شوکت حیات کی کہانیاں بے حد اہم ہیں۔ فن اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے انھیں اعلیٰ پیمانے کے افسانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ افسانے میں مقصدیت کا ہونا معیوب نہیں لیکن محض مقصد کو افسانوی پیرائے میں پیش کرنے کے عمل کی بھی تحسین نہیں کی جا سکتی۔ لیکن شوکت حیات کے افسانوں میں مقصدیت ایک نئے انداز میں پیش کی گئی ہے، اسے اس طرح سے افسانوں میں بنا گیا ہے کہ وہ ان کے افسانوں کا اہم جز معلوم ہوتی ہے۔ سچ کو سچی صورت میں اور واقعی افراد کو بطور کردار افسانے میں پیش کرنے کی روایت ہمارے یہاں موجود رہی ہے۔ لیکن فکشن پر جوانی اور اس کے جوبن پر نکھار تب آتا ہے جب جھوٹ کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ سچ لگے اور غیر حقیقی یا لاموجود کرداروں کو افسانہ نگار اپنی خلاقی سے یوں ڈھالے کہ وہ جیتے جاگتے انسان دکھیں۔ اس معاملے میں شوکت حیات کا معاملہ پرفکٹ ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کے پلاٹ سچے اور گزرے ہوئے واقعات سے تشکیل پاتے ہیں افسانوں میں یہ واقعات حقیقی اور سچے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی کہانیوں میں بطور کردار فطری اور زندہ انسانوں کو داخل کرتے ہیں اور یہی اافسانوی عمل کے دوران بھی فطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت نگاری شوکت حیات کا خاص وصف رہا ہے۔ وہ بنا کسی خوف کے اپنی بات رکھنا جانتے تھے۔ شوکت حیات موجودہ عہد کے ایک جنوین اور سچے فنکار بھی تھے جو کسی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر صرف اپنے فکر وفن سے مطلب رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف تحریکوں اور رجحانوں کو دیکھا اور ان پر اپنی رائے بھی قائم کی مگر کبھی کسی تحریک ورجحان کے زیر اثر نہیں رہے اس لئے ان کی افسانہ نگاری کو کسی دبستانی فکر وسیاست سے وابستہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام نہاد اصولوں

نے ان کے فن پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ وہ ہر محفل میں آزادی سے اپنی بات کہتے ہیں اور ہر افسانے میں اپنا فنی اصول قائم رکھتے ہیں۔ آج ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ آگے ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں شوکت صاحب نے انھیں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ یہی وجہ بھی تھی کی ان کے ہر افسانہ، اور کہانیوں میں درد اور کڑوی سچائی نظر آتی ہے۔ ان کی تحریروں کی انھیں خوبیوں کے سبب ان کے لکھنے کے انداز سے ان کے قارئین اور چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ بن گیا ہے جو ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے ہیں۔ شوکت صاحب نے اپنے گرد وپیش کی محرومیوں، ناکامیوں، ظلم و زیادتیوں، ناانصافیوں کو ہر پل محسوس کیا۔ انھوں نے جس دور اور جس سماج میں آنکھ کھولی، وہاں دنگے، فساد اور نسلی امتیاز سے قدم قدم پر سامنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک گہرا دکھ اور المیہ سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کہیں تو شوکت صاحب کا قلم قاتل کی سمت اشارہ ہی نہیں کرتا اس کی مکمل نشاندہی بھی کر دیتا ہے۔ وہ پوری تاریخ کو اشاروں میں بیان کر دیتے ہیں جہاں سوچتا ذہن باآسانی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمارے ناقدوں ومحققین نے شوکت حیات کو کافی حد تک نظر انداز کیا ہے اور جن لوگوں نے ان پر لکھا ہے انھوں نے ان کے مکمل فن کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بالعموم ان کے یہاں کوئی اہم کردار نہ ہونے کی شکایت تو سبھوں نے کی ہے لیکن ان کی جدتِ فن کو، ان کے موضوعات کے تنوع کو، فکر وخیال کی وسعت کو، بیان کے توازن کو اور بیبا کی اظہار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی کہانیوں کے پس منظر اور ان کی فضا پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کی، جن میں ایک نئے ہندوستان کے تصور اور ہندوستانیوں کی نئی فکر کو پروان چڑھانے کی کوشش واضح طور پر نظر آتی ہے۔ قبول کہ انھوں نے فن پر مواد کو ترجیح دی اور کرافٹ پر قصہ پن کو، لیکن یہ عیب کہاں؟ حسن ہے۔ اور کیا ان کا یہ کارنامہ کم اہم ہے کہ انھوں نے کہانی کو افسانہ نگاروں کی تخیلاتی اقلیم سے نکال کر عوام کی حقیقی دنیا سے روشناس کرایا، اور شعری صداقت کے مقابلے میں علی الاعلان واقعی صداقت پر فکشن کی بنیاد رکھی۔

بہر حال ان کی فکشن کی دنیا کے بے شمار قصے فکر وفن کی بے شمار باتیں ہیں کس کا ذکر کریں کس کا نہیں.....، کیا بھولوں کیا یاد کروں..... ان کا ایک مختصر مضمون میں تمام باتوں کا احاطہ کرنا بھی ناممکن ہے۔ القصہ مختصر یہ کہ ان کا جانا یقیناً اردو فکشن کے لئے بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ بہت سارے موضوعات پر لکھ رہے تھے۔ لیکن ان کو اردو والوں سے ایک شکایت تا عمر رہی کہ ان کی حوصلہ افزائی، عزت افزائی اس طرح نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، ان کی اچانک موت نے ان کی قلم پر پاور بریک لگا دیا۔ لیکن جو کچھ وہ لکھ گئے اردو کی خدمات کر گئے وہ اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یقیناً اردو فکشن کی تاریخ ان کے نام کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

◀◀ ● ▶▶

House No. 267/2B Ward No. 24 Mohalla Newada
PrayagRaj (Allahabad) : 211001 Mob 9899972265

● عرفان رشید

شوکت حیات: صداقتوں کا کہانی کار

جن فن کاروں نے اردو افسانے کو ۱۹۷۰ء کے بعد آگے بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے ان میں شوکت حیات کا نام بھی شامل ہے۔ اگر چہ انہوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہی کیا تھا لیکن ان کا پہلا افسانہ ''دو بکسوں سے دبا آدمی'' ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ 'کتاب' لکھنو میں شائع ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ستر کی دہائی میں شوکت حیات ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے اور جلد ہی انہوں نے اپنا نام اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں لکھوایا۔ اپنے عصر کی کہانی کو ''انامیت'' یا ''انام نسل'' سے منسوب کرنے والے اس فن کار نے اپنے عہد کو سن ستری اور تغیر پسندی، جیسی اصطلاحوں سے مالا مال کیا۔ انہوں نے خود کو کسی رجحان تک محدود نہیں کیا بلکہ آزاد تلازمہ خیال کے ذریعے اپنی کہانی کو معنوی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے جدید افسانہ پر جو لیبل قائم کی تھی کہ اس میں روایتی موضوعات سے بغاوت ہے انہوں نے اسے اپنے افسانوں کے موضوعاتی تنوع سے غلط ثابت کیا۔ بیانیہ اُسلوب کے ذریعے انہوں نے بہترین علامتی افسانے تحریر کیے ہیں۔ سچویشن سریز کے ذریعے جدید افسانے کو انہوں نے توقیت عطا کی کیونکہ انہوں نے جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں بھی زندگی سے ادب کے رشتے کو مضبوطی سے قائم رکھا اور ہئیت اور تکنیک کے تجربوں کے باوجود بھی حقیقت پسندی پر اپنے افسانوں میں زور دیا۔ پاؤں، بانگ، گھونسلا، تین مینڈک، سیلان، سچویشن سیریز جیسے افسانے اُن کی حقیقت پسندی کی عمدہ مثال ہیں۔

افسانہ ''گھونسلا'' شوکت حیات کا ایک خوبصورت علامتی افسانہ ہے جس کا موضوع قدروں کی پامالی، پرانی تہذیب کی شکست وریخت اور identity crises جیسے مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ افسانہ دراصل بیانیہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اور اس میں مستعمل علامتوں قاری پر کے معنی دھیرے دھیرے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ افسانہ ایک ٹرین کے سفر سے شروع ہو جاتا ہے جس میں مسافر کو ایک اسٹیشن پر اپنے اندر سے آواز سنائی دیتی ہے کہ:

''بد بخت تیرا کوئی اسٹیشن ہے.....؟''

اس خود کلامی پر غور کرتے کرتے اسے احساس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں مجھ جیسے کروڑوں انسان

ہونگے جن کا کوئی گھر یا ٹھکانہ نہیں ہے اور اسی سوچ میں گُم ہو کر وہ ایک اسٹیشن پر اترتا ہے۔ اس کہانی کے پلاٹ میں کوئی جھول نہیں ہے بلکہ ایک گھٹتے ہوئے پلاٹ کو لے کر کہانی آگے بڑھتی ہے۔ جب مسافر اسٹیشن پر اترتا ہے تو باہر گھپ اندھیرا دیکھ کر وہ ایک آدمی سے پوچھتا ہے:

''کیوں بھائی.....لائٹ کب سے آف ہے.....'' ''کیا کہا جائے بابو جی
.....جب سے بڑے شہر میں بجلی کی سپلائی بڑھ گئی ہے، یہاں کا کوٹا کاٹ دیا گیا ہے
.....بہت دیر کے لیے روشنی غائب رہتی ہے.....اور آس پاس جو گاؤں ہیں، ان کا تو
حال پوچھو ہی مت.....بجلی کی لائن ہوتے ہوئے بھی سب ایک کرن کو ترستے ہیں
.....کہیں کوئی پیداوار ہی نہیں ہوتی۔۔۔'' (گنبد کے کبوتر، افسانوی مجموعہ، ص ۵۴)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ افسانہ نگار گاؤں اور شہر کی زندگی کا موازنہ کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کس طرح سے گاؤں میں استحصال اور ظلم جوں کو توں باقی ہے اور وہاں کے باشندوں میں سے کوئی ایک احتجاج کرنے کا نہ ہی حوصلہ رکھتا ہے اور نہ احساس۔ مسافر شہروں کو گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے اور رکشے والوں کی قطار دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ قلی ایک رکشا میں اس کے سامان کو رکھ دیتا ہے اور رکشا والا مسافر سے پوچھتا ہے:

''کہاں چلنا ہے بابو جی؟''
بس چلنا ہے.....باہر کا آدمی نہیں ہوں.....اسی مٹی کا یہ جسم ہے.....

مذکورہ بالا سطور سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ مسافر برسوں بعد اپنے علاقے کی طرف بڑھتا ہو انظر آتا ہے اور اسے اپنے اندر کی آواز بار بار ٹوک کر کہتی ہے کہ:

''بد بخت تیرا کوئی شہر ہے.....''

جب رکشا والا اسے بار بار پوچھتا ہے کہ بابو کہاں چلنا ہے۔ مسافر جس راستے سے بھی رکشا والے کو جانے کے لیے کہتا ہے وہاں سے وہ ایک چٹیل میدان میں پہنچ جاتا ہے۔ مساجد، مندروں، گرجا گروں، گردواروں سے ہو کر بھی اسے اپنا گھر نہیں ملتا۔ افسانہ نگار قاری کو باور کرانا چاہتا ہے کہ اس صارفینی دور میں مذہب اور مذہبی رہنما بھی جدید انسان کے مسائل کا حل نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ رکشا والا تھک کر ہار جاتا ہے اور مسافر رکشا والے سے روتے سسکتے ہوئے پوچھتا ہے کہ تم کیوں روتے ہو:

''تم جس علاقے، جس بستی کو ڈھونڈ رہے ہو، اسے عرصہ پہلے
بلڈزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا.....میں بھی ہفتوں اسی طرح شہر میں

دیوانہ وار پاگلوں کی طرح چکر کاٹتا ہوا بار بار اسی چٹیل میدان تک پہنچتا رہا
.....بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا.....بھری پڑی بستی کو ملبے میں تبدیل کیا اور
پھر چٹیل میدان بنا دیا.....میرا دکان، میرا گھر اور تمام اہل وعیال زندہ درگور ہو گئے
.....بیٹے میں تو صبر کر لیا تھا لیکن آج بار بار اس چٹیل میدان کو دیکھ کر پرانے زخم
ہرے ہو گئے.....بابو جی.....بابو جی.....تم سن رہے ہو.....؟''

اس بار رکشے والے کے بار بار جھنجھوڑنے پر بھی بابو جی کا سکوت نہیں ٹوٹا۔''

افسانے کے اس طویل اور آخری اقتباس سے اس کہانی کا موضوع عیاں ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ لفظ بلڈوزر اصل میں علامت ہے، نئی تہذیب کی جس نے روایت کی عمارت کو منہدم کر دیا ہے اور مسافر آج کی Generation اور رکشا والا مسافر سے پہلی والی Old Genreration کی علامت ہے جو ایک ساتھ روایت کی مٹتی ہوئی تہذیب کا رونا رو رہے ہیں اور ایک دوسرے کو جھوٹا سہارا دے کر تسلی دیتے ہیں۔

انیس اشفاق اس افسانے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس طرح شوکت حیات کا افسانہ گھونسلا پرانے اور نئے نظامِ اقدار کی
کش مکش میں نئے نظامِ اقدار کے غلبے اور پرانی اور نئی (روحانی اور مادی)
تہذیبوں کے تصادم میں پرانی تہذیبوں کی شکست کا المناک منظر نامہ ہے۔''[1]

افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' نہ صرف شوکت حیات کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ یہ اردو کے نمائندہ افسانوں میں شامل ہیں۔ اس افسانے کا بنیادی موضوع بابری مسجد کا انہدام ہے۔ موصوف نے اسے علامتی اور استعاراتی رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے۔ افسانہ واحد متکلم کی ذات سے پر نظر آتا ہے یعنی واحد متکلم کی ذات افسانے کی جان ہے اور اسی کے اردگرد افسانہ رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں بیانیہ تکنیک کا نہایت خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے، منضبط پلاٹ، کردار نگاری، اور منظر کشی افسانے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس افسانے کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ اس کا بنیادی موضوع ابتدائی جملوں میں ہی سامنے آجاتا ہے۔ مصنف کو افسانے کے فن پر پورا عبور حاصل ہے جس کی دلیل وہ ضمنی واقعات ہیں جو 'سین دادا' کی شخصیت سے منسلک ہیں۔ کبوتروں کا گنبد ختم یا مسمار ہو جانا اپنے آپ میں ایک مکمل کہانی ہے۔ افسانہ نگار کو صرف مسجد کا انہدام دکھانا مقصد نہیں ہے بلکہ یہ اس مغلیہ سلطنت اور مشترکہ تہذیب کا خاتمہ ہے جس نے کئی صدیوں تک ہندستان کو سمیٹا تھا۔ افسانہ نگار کو بار بار یہ فکر رہتی ہے کہ گنبد کے کبوتر (ہندستان کے مسلمان) اب کہاں جائیں گے۔ کیوں کہ انہوں نے ایک بار اس جمہوری ملک کے قوانین پر

لبیک کیا ہے اور تقسیم کے وقت انہوں نے اپنی پرکھوں کی وراثت میں جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی تھیں لیکن اب انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کے پیڑ پودوں، کلیوں، گملوں اور کبوتروں کو کوئی تباہ نہ کر دے۔ اس لیے واحد متکلم بار بار 'سین دادا' سے کہتا ہے:

''دادا میرا دل نہیں لگ رہا ہے.....اب واپس چلیں.....نہ معلوم
میرے پھولوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔''

''دادا.....میرا دل نہ جانے کیوں گھبرا رہا ہے.....یہ بے اماں کبوتروں
کا اڑتا ہوا غول دماغ میں عجیب قسم کی وحشت پیدا کر رہا ہے۔ ان کی جائے اماں ان
سے چھن گئی۔ گنبدوں کی بلندی دھول چاٹ رہی ہے.....یہ کبوتر اب کہاں جائیں
دادا.....انہیں کہاں آسرا ملے گا.....!''

افسانہ نگار قارئین کو باور کرانا چاہتا ہے کہ ہندستانی مسلمان ہجرت کا درد و کرب اب بھی جیل رہے ہیں نہ جانے کب ان بے چاروں کو اس کرب بھری زندگی سے نجات مل جائے گی۔ اب بھی انہیں یہاں کا دشمن اور مجرم قرار دیا جاتا ہے اور جس ملک کو انہوں نے اپنے خون سے سینچا ہے وہیں پر ان سے اب غیروں سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ آزادی کی جدوجہد میں انہوں نے بھی دوسرے فرقوں سے کہیں زیادہ حصہ ادا کیا ہے لیکن اس قربانی اور وفاداری کا صلہ انہیں یہ ملے انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ انہیں ہر جگہ اور ہر طرف ذلالت و خواری سے جھوجھنا پڑتا ہے۔ کہیں انہیں دہشت گرد اور کہیں انہیں فسادی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

یہ افسانہ اس تلخ حقیقت کو منعکس کرتا ہے کہ ہندستان میں مسلمان تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کی بے بسی اور کسمپرسی کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''سین دادا آپ ان فاختاؤں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ذرا اوپر
دیکھئے۔ بے ٹھکانا کبوتروں کا غول مستقل آسمان میں چکر کاٹ رہا ہے۔ اپنے مستقر
کے بے دردی اور بربریت کے ساتھ مسمار کر کے غائب کر دیے جانے کے بعد کیسی
بے گھری اور بے امانی جھیل رہا ہے۔ آپ ان کبوتروں کی آنکھیں دیکھ رہے ہیں
.....ان میں اترنا خون، بیچارگی اور کچھ کر گزرنے کی تڑپتی ہوئی آرزوئیں محسوس کر
رہے ہیں.....!''

موصوف نے اس افسانے کے حوالے سے اِن عصری حالات و واقعات کی ایسی خوب صورت عکاسی کی ہے کہ کس طرح سے مسلمانوں کو موجودہ حالات سے بے خبر رکھ کر بہ آسانی اپنا کام نکالا جاتا تھا۔

افسانہ نگار اس وقت کے مسلمانوں پر طنز کے تیر بھی برساتے ہیں کیوں کہ وہ فساد، بربریت، اور لوٹ مار سے اتنے خوف و دہشت میں مبتلا ہو گئے تھے کہ مسجد کے انہدام پر بھی بات کرنے میں انہیں ڈر لگتا تھا:

''اس روز کئی دوستوں کے ہاں دونوں گئے تھے۔ سب نے اس روز کے اہم ترین واقعے پر بات چیت کرنے سے گریز کیا تھا۔ لوگ دل ہی دل میں یا تو رو رہے تھے یا ہنس رہے تھے۔ عجیب بے بسی اور دلی خوشی کی کیفیتیں تھیں۔ جن سے مختلف لوگ اپنے اپنے حساب سے گزر رہے تھے۔ لیکن تمام کیفیات اور بے نیازی کے باوجود ایک سوال سب کو کرید رہا تھا۔''

اس افسانے کا ایک کردار 'سین دادا' ہے جس کو افسانہ نگار نے محض ایک کردار کے طور پر ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ ہندستان میں جتنے بھی مذاہب کے لوگ رہتے ہیں ان کی نمائندگی 'سین دادا' کے حوالے سے کی گئی ہے۔ شوکت حیات اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے بغیر کسی طرح سے بھی یہاں کے بسنے والے خوشی اور سکون کی زندگی بسر کر سکتے۔ چاہے ساٹھ سالہ 'سین دادا' ہی کیوں نہ ہوں اور جب 'سین دادا' واحد متکلم سے پوچھتا ہے:

''کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کے سارے گملے خیریت سے رہیں گے۔ اب دوستوں سے ملنے چل رہے ہیں تو یوں اداس رہنا چھوڑیے.....انجوائے کیجیے .....دیکھیے گول گول گنبدوں کی گولائی اور نوکیلے اُبھار.....اُف سامنے کے پرکشش منظر سے جسم میں عجب ترنگ پیدا ہو رہی ہے۔ ذرا دیکھیے آپ بھی۔''

''اس عمر میں دادا آپ.....؟''

''ینگ مین تم جوانی میں بوڑھا ہو گیا۔۔۔ ذرا نظر تو اُٹھاؤ۔''

افسانہ نگار اس افسانے کے ذریعے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ یہاں افراتفری کے اس ماحول میں زندگی کی معنویت کھو گئی ہے۔ شکست و ریخت، تنہائی اور اپنی ذات میں گم ہونا لوگوں کا کارِ حیات بن گیا ہے۔ اس افسانے کی قرات کے دوران قاری کے رونگٹے اس وقت کھڑے ہو جاتے ہیں جب ایک بلی ایک زخمی کبوتر کا شکار کرنے کے لیے بے چین ہو رہی ہے اور کبوتر لڑکھڑاتا ہوا 'مسٹر تھامسن' کے کچن میں گر جاتا ہے۔ جب پڑوسی 'مسٹر جان' زخمی کبوتر کو لینے اس لیے آتا ہے کیوں کہ اسے کبوتر چاہیے تاکہ اس کی Mother in Law کے لقوے کی بیماری کا علاج ہو سکے۔

کبوتر اور بلی کے استعارے کو معنی پہناتے وقت ہمیں اُس وقت کے حالات و واقعات کا منظر

آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اس وقت ہندستان میں مسلمانوں کی کیا حالت تھی اور کس طرح سے ہر طرف لوگ ان کے جانی دشمن بن گئے تھے کس طرح انہیں گاجر اور مولی کی طرح کاٹا جا رہا تھا اور یہ بے چاری قوم اُف تک نہیں کر پا رہی تھی، اس بے بسی کو افسانہ نگار نے تاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس نے سوچا، اس کے اور مس ریزہ کے دکھ میں کس کا دُکھ بڑا ہے۔ غٹرغوں کرتے ہوئے کبوتروں کا غول اس کے سر پر منڈلانے لگا۔ اس نے ہامی بھر لی۔ اس سے بڑا غم تو ان بے امان کبوتروں کا ہے۔ جنہیں اب ساری عمر، ہجرت کا عذاب جھیلنا ہے.....کئی نسلوں سے وہ ان گنبدوں کے باشندے تھے.....لیکن اب.....''

''لڑ نہیں سکتے تو کم از کم بھاگ تو سکتے ہو.....ہائے نامراد.....تو نے تو یہ صلاحیت بھی کھو دی.....''

اگر ہم دوسرے اقتباس پر ذرا غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن اسلامی تاریخ کی طرف رجوع کرتا نظر آتا ہے اور موصوف کو اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں نے چونکہ وہ راستہ چھوڑا ہے جو انہیں اپنے اسلاف دکھا کر گئے تھے ان کے اسلاف نے اپنی وقت ایمانی سے ایک ایسی سلطنت قائم کی تھی جس میں حق والے کو اپنا حق مل جاتا تھا اور کسی پر ظلم و زیادتی سے احتراز کیا جاتا تھا۔ افسانہ نگار عصری مسلمان پر طنز کے تیر برساتے ہیں کہ اس نے وہ صداقت، خلافت اور شجاعت چھوڑ دی ہے جو اسے اپنے اسلاف سکھا کر گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ عصر حاضر کے مسلمان بزدل اور کمزور ہو گئے ہیں۔

اگر ہم اس افسانے کی علامتوں اور استعاروں کی پرتوں کو کھولنے کی اور کوشش کریں گے تو اس افسانے کا بیانیہ، علامتوں کی معنویت اور استعارات کی اشاریت اسے مزاحمتی تخلیق کی ذیل میں لا کھڑا کرتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے کے حوالے سے موجودہ نظام اور عصر حاضر کے انسان پر طنز کیا ہے کہ کس طرح سے انسان ظلم و جبر اور بربریت کا عادی ہو گیا ہے کیسا بھی دلسوز واقعہ ہو، چند روز کرفیو، ہڑتال کے بعد لوگ پھر اپنے کام کاج میں مصروف ہو کر اس سانحہ کو دھیرے دھیرے ایسے بھول جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ ایسے ہی منظر کا نقشہ افسانہ نگار نے کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''کیا حال ہے۔ میرے پھولوں کا.....؟''

''خود دیکھ لو جا کر.....!''

بچے اپنے بستروں میں گہری نیند میں مبتلا تھے۔ سب کے چہروں پر

ایسی اذیتیں جیسے کوئی بہت ڈراؤنا اور تکلیف دہ خواب دیکھ رہے ہوں۔آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا.....''

افسانہ''گنبد کے کبوتر'' پر بات کرتے ہوئے ممتاز ناقد وارث علوی کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''گنبد جب تک تھا، علامت تھا ہماری تاریخ، تہذیب اور مذہب کی۔اب نہیں رہا تو ایسا روحانی خلاء پیدا ہو چکا ہے جس کی ماہیت کا بھی ہمیں شعور نہیں۔اس خلاء میں ان کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز گونجتی ہے جو گنبد کے نہ ہونے سے بے سہارا ہو گئے ہیں۔کبوتروں سے قطع نظر آدمی کا بے سہارا پن ایسے دور دراز اندیشوں کو جنم دیتا ہے کہ وقت کے بہاو میں اس کی شکستہ کشتی کو کوئی کنارہ مل سکے گا یا نہیں۔یا پھر یہ ہولناک انجام کا آغاز ہے۔''

حقیقی معنوں میں یہ افسانہ صرف مسجد کے انہدام کی نوحہ گری نہیں بلکہ ایک تاریخ وتہذیب کے خاتمے کی داستان ہے اور اس کے ذریعے افسانہ نگار نے ایک تہذیب یافتہ قوم اور اس تاریخی سانحہ کو تاریخی اوراقوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید کر لیا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱:انیس اشفاق، نیا اردو افسانہ انتخاب، تجزیے اور مباحث، مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۱۵ء، ص ۱۸۰

۲:نور الحسنین، نیا افسانہ۔نئے نام، (حصہ دوم) عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۶ء ص ۶۵،

Recearch Scholar
Depat. of Urdu Kashmir University
Kashmir Pin code : 190006
9622701103/7780877932
irfanrasheedf@gmail.com

● ڈاکٹر قسیم اختر

شوکت حیات کے افسانوں کا اختصاصی پہلو

ہر معروف فن کار کے فن پاروں پر لکھتے وقت اکثر یہ ضرور لکھا جاتا ہے کہ انھوں نے کبھی کسی ایک تحریک کا خیال نہیں رکھا مگر اپنے زمانے کی تمام تر تحریکات سے استفادہ کیا ہے۔جب خلوص کے ساتھ ایسے فن کاروں کے یہاں ہم متعلقہ زمانے کی تمام تر تحریکات کے اثرات ڈھونڈتے ہیں تو ڈھاک کے تین پات ہی ملتے ہیں۔گویا اکثر کے یہاں ایک ہی رنگ کی کثرت تکرار بن کر نمودار ہوتی ہے۔مذکورہ مفروضے کے تناظر میں اگر شوکت حیات کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے افسانوں میں مختلف تحریکات کے اثرات انفرادی رویوں کے ساتھ واضح نظر آتے ہیں۔اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ انھوں نے تمام تر تحریکات سے دشمنی گانٹھ کر ایک ہی رنگ کو اپنے اوپر غالب کر لیا۔یہاں پر ہم انتظار حسین کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ان کو ترقی پسندوں سے ازلی دشمنی تھی۔جدیدیت کا جھنڈا وہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔اس لیے انھوں نے اپنا الگ رنگ جمایا۔سچائی یہ ہے کہ ان کا رنگ چوکھا ضرور ہوا، مگر انھوں نے اپنے فن پاروں میں اس قدر تکرار کو راہ دی کہ چوکھا رنگ بدرنگ ہو گیا۔

شوکت حیات کے افسانوں میں ہر رنگ کے افسانے ملتے ہیں۔انھوں نے علامتی افسانے بھی لکھے اور جذباتی بھی۔ان کے یہاں مزاحمتی تیور بھی ہیں اور سماجی اصلاحات کے اثرات بھی۔انھوں نے جہاں سیاست گزیدہ خیالات کو تخلیقی پیرہن عطا کیا، وہیں انھوں نے اندرون خانے کی نفسیات کو افسانوی خلعت عطا کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شوکت حیات کے افسانوں میں زندگی کی نیرنگیاں پائی جاتی ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دراصل ان کے افسانے شوکتِ حیات ہیں۔کیوں کہ زندگی کی کشاکش، حیات کے تضادات، فلسفے کی ماہیئت اور زندگی کی حقیقت؛ ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے اپنے عہد کے تمام تر تحریکی اثرات کے باوجود منفرد ہیں۔

بہت سے فن کار گروپ بندی کے شکار تو نہیں ہوتے، تاہم بیچ بیچ کا راستہ اپناتے ہوئے اپنے نظریے کی وضاحت بھی نہیں کرتے ہیں۔کہیں گروپ کے سربراہان برا نہ مان لیں۔شوکت حیات ایسے فن کار تھے جنھوں نے ہمیشہ اپنے نظریے کی وضاحت کی اور اپنی فکری اور تحریکی حیثیت کی وضاحت کی۔ان کا یہ رویہ دراصل ان کی فن کاری کی صداقت بھی ہے، ساتھ ہی فن اور فن کاروں کی شایان شان بھی۔شوکت حیات نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

''جدید نسل کے جدید افسانوں میں کہانی کے صنفی ڈھانچے کو مسمار کر دیا گیا تھا اور کہانی سے کہانی

پن غائب ہوگئی تھی۔ جدید ترین افسانوں نے جنھیں میں ''انام'' افسانوں سے تعبیر کرتا ہوں ، یعنی 1970 کے بعد کے افسانہ نگاروں نے کہانی کے بنیادی خدوخال کو بحال کیا۔ اس طرح افسانے کا بنیادی طور پر افسانہ ہونا ضروری قرار پایا۔''(۱)

مذکورہ اقتباس میں ہم شوکت حیات کی فکری صداقت اور فنی انفرادیت کی وضاحت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے واضح لفظوں میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ ان کے افسانے گرچہ علامتی بھی ہیں، تاہم جدیدیت کے احساسات سے معمور نہیں ہیں۔ موضوعاتی برتاؤ اور کہانی کے انسلاک سے انھوں نے جو کہانیاں بننے کی کوشش کی ہے، وہ جدیدیت کے فلسفیانہ نظام سے قدرے مختلف ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں کو جدیدیت کی حد بندیوں میں قید کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہی ان کے فن کے ساتھ انصاف ہے۔ ذیل میں ان کے چند افسانوں کا خصوصی تجزیہ کیا جا رہا ہے جن سے ان کی انفرادیت قائم ہوگی۔

شوکت حیات کا ایک افسانہ ''سیلاب'' ہے جو موضوعاتی اعتبار سے بہت منفرد تو نہیں ہے، تاہم انھوں نے سیلاب کے ضمن میں جو انسانی ہمدردی، رقت آمیزی اور انسانی رویوں کو پیش کیا، وہ بہت خوب ہے۔ کیوں کہ موضوعاتی خوب صورتی فنی برتاؤ میں مضمر ہے۔ ''سیلاب'' آج بھی آتا ہے اور کل بھی آئے گا۔ یہ ایک سیاست کا بھی حصہ ہے اور معاشرتی پسماندگی کی علامت بھی ہے، تاہم فن کار سیاست اور معاشرت کو مدغم کرتے ہوئے ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اس فلسفے میں حقیقت بھی ہوتی ہے اور زندگی کی سچائی بھی۔ ''سیلاب'' میں زندگی کی حقیقت، سیلاب کے قہر اور سیاسی اثرات کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے کامیاب افسانہ پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ ان کے سادہ بیانیہ کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

''گنبد کا کبوتر'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں تہذیبی محرکات بھی بہت زیادہ واضح ہیں اور سیاسی پہلوؤں کی عکاسی بھی ہے۔ کیوں کہ اس افسانے کی قرأت میں تہذیبوں کی تبدیلی کے معاملات واضح ہوتے ہیں اور بابری مسجد کے سانحہ کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ گویا انھوں نے ایک سلگتے موضوع کو بھی ایسے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے کہ اس میں جذباتیت کا گمان بھی نہیں گزرتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ شوکت حیات نے انتہائی غور و خوص کے بعد لکھا ہوگا، کیوں کہ گنبد کے کبوتروں نے اس افسانے میں احساس دلایا کہ عبادت گاہوں کی پاکیزگی نہ صرف انسانوں سے جڑی ہوتی ہے، بلکہ پرندوں کے پروں کا سکون بھی گنبدوں سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ فلسفہ لامکانی کی صورت کو پیش کرتا ہے۔ لامکانیت کا سلسلہ بھی جذبات سے جڑا ہوتا ہے، تاہم اس کے اظہار میں سکون و اطمینان کا احساس ہو تو افسانہ فنی اور منطقی عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ کیوں کہ تخلیقی لب و لہجے میں گداز پن کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ''گھونسلا'' بھی ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں رقت آمیزی ہے۔ کیوں کہ ایک بیٹا

اپنے علاقے لوٹ کر آتا ہے، مگر تہذیبوں کے مٹنے کا سلسلہ اس قدر ہے کہ اپنے گھر کا پتا کر پانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ چونکنے والی کیفیت اس وقت سامنے آتی ہے، جب باپ بیٹے کو پہچان پاتا ہے اور نہ ہی بیٹا باپ کو۔ کیوں کہ باپ اور بیٹا دونوں مل کر ایک ایسے گھر کی تلاش کر رہے ہیں، جس کے نشانات مٹ گئے ہیں۔ ایسے واقعے کے اظہار میں بھی شوکت حیات جذباتی نہیں ہوتے ہیں۔ مہدی جعفر نے اعتراف کیا ہے کہ شوکت حیات کے افسانوں میں ترشی و تلخی نہیں ہے، اگر کہیں اس کا اظہار بھی ہوتا ہے، وہ دراصل تخلیقی بیانیہ کا ایک انداز ہے۔(۲) افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' کے تناظر میں مہدی جعفر کے مذکورہ قول کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اس افسانے کا گٹھا ہوا اسلوب اور فکری بالیدگی ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اس نے بڑے پیار سے سین دادا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت بھرا بوسہ دیا اور ان کا پیگ بنا کر گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک لمحے کے لیے ان کی مدت کی پیاس بجھ گئی۔ دل کو قرار آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے ان کی تڑپ اور شدت اختیار کر گئی۔ شریانوں میں خون کا دباؤ بڑھ گیا۔ ان کی انگلیاں ایک بار پھر مس ریزہ کی برہنہ پنڈلی چھوتی ہوئی اس کی سڈول جانگھوں کی طرف رینگنے لگی۔''(۳)

مذکورہ اقتباس سے انداز کرنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ شوکت حیات ایک شعلہ بار ایشو پر افسانہ لکھ رہے ہیں، تاہم انھوں نے جنسی جذبات اور رومانی پہلو کو بھی اس قدر ابھارا ہے کہ اس میں تہذیبی معاملات اور نفسیاتی پہلوؤں کی شمولیت ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی مذکورہ اقتباس میں ان کے اسلوب کا تیکھا، طنزیہ اور ستھرا اسلوب کو بھی ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے انتہائی چابک دستی سے اپنی فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ گویا یہ افسانہ علامتی ہے، جس کی تہہ داریوں میں سماج کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں۔

اگر علامتی افسانوں کی بات کریں تو کئی ایک بہترین افسانے اس ضمن میں مل جائیں گے، تاہم یہاں ہم ''کوا'' کو پیش کریں گے۔ یہ علامتی افسانہ انتہائی کامیاب افسانہ ہے، تاہم اس افسانے میں تھوڑی عجلت ہے۔ عجلت کا جواز نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ چھ صفحے پر مشتمل افسانہ تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ باپ کی پریشانی سامنے آتی ہے۔ بیٹے کی پریشانی واضح ہوتی ہے۔ ''کوا'' پلیٹ سے کھانا غائب کر دیتا ہے۔ گویا یہ بھوک کا فلسفیانہ اظہار ہے۔ اس اظہار سے افسانہ خوب صورت بن جاتا ہے، تاہم فی الفور ہجرت کا واقعہ صرف بھوک کے مسئلے پر پیش آتا ہے۔ اس سطح پر افسانے میں کسی حد تک عجلت راہ پا جاتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ راقم کا یہ مفروضہ کہانی کا کمزور پہلو ہی بن جائے، یہ بس ایک مفروضہ ہے۔ اس افسانے کو بھوک کی بنیاد پر ہجرت آشنا بنانے کے لیے طوالت درکار تھی، تاہم انھوں نے بھوک کے فلسفیانہ اظہار اور سرحد پار سے اپنے ملک کا موازنہ کر کے افسانہ کو خوب صورت بنانے کی کوشش کی ہے۔ کہانی کا اختتامی مکالمہ دیکھیں:

''بہت دیر تک کنڈی کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ کھلا۔اس کا جی چاہا کہ بھائی سے لپٹ جائے اور جی بھر کر روئے،لیکن اجنبی چہرے کو دیکھ کر وہ رک گیا۔اس نے پوچھا۔

''رحمت صاحب؟''

اجنبی سب کچھ سمجھ گیا۔اس نے کہا۔

شاید وہ سرحد پار کسی رشتے دار کے ہاں چلے گئے۔یہاں کے حالات سے وہ بے حد عاجز آ چکے تھے۔اور سب کچھ دانے پونے بیچ کر چلے گئے۔ہم لوگوں کے بہت منع کرنے پر بھی نہیں رکے۔

یہ سب سنتے ہوئے اس کا دل ڈوب رہا تھا اور چھپڑ سے اڑ کر اس کے سر پر منڈلاتا ہوا کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔''(۴)

اس اقتباس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ سرحد کے اِس پار سے کوئی فرد اُس پار سکون کی تلاش میں گیا تھا، تاہم اُس پار سے بھی اِس پار سکون کی تلاش میں کوئی کوچ کر رہا ہے۔گویا کہانی کا یہ تصادم کہانی کو ایک نئے موڑ سے گزارتا ہے۔یہ مکالمہ انتہائی عام فہم ہے، تاہم اس میں تاریخ کا جبر بھی ہے اور سکون کا متلاشی انسان بھی۔اس لیے اس مکالمے میں سادگی کے باوجود ایک فلسفیانہ اظہار بھی ہے۔چناں چہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے ساختگی سے شوکت حیات وہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں جو فن کاری کا متقاضی ہے۔

دل جمعی سے نہ سہی، تاہم کئی ایک معتبر لکھنے والوں نے شوکت حیات کے افسانوں کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔اگر وہ دل جمعی اور تواتر کے ساتھ شوکت حیات پر توجہ دیتے تو ان کا افسانوی مقام الگ نظر آتا۔وارث علوی اور وہاب اشرفی نے ان کی افسانوی خصوصیات کا احترام تو کیا ہے اور ان کا تجزیہ بھی کیا ہے، مگر اختصار کے ساتھ۔وارث علوی ان کے افسانوں کی مزید شناوری کرتے، جیسا کہ وہ بہت سے افسانہ نگاروں کے متعلق خوب خوب گفتگو کرتے، تو شوکت حیات کی مزید انفرادیت سامنے آتی۔تاہم انھوں نے اختصار کے ساتھ لکھا ہے اور چند اہم اشارے کیے ہیں۔ان کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''شوکت حیات کو زبان اور بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ان کے معمولی افسانوں میں بھی یہ حسن برقرار رہتا ہے۔ان کی نثر بڑی ہموار ہے۔ایک کے بعد دوسرا جملہ سمندر کی لہروں کی مانند سبک ساری سے آتا ہے۔بہت سے لکھنے والوں کی زبان میں جو ہلکا پن ملتا ہے اس سے وہ صاف بچ گئے۔ان کے یہاں پیچیدگی ہے لیکن الجھاؤ نہیں، اشارے، کنائے اور اجمال ہے جو اہمال سے بارہ پتھر دور رہتا ہے۔چوں کہ ان کے زیادہ تر افسانے نفسیاتی اور سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔''(۵)

وارث علوی کے تمام جملوں کی تصدیق کے لیے شوکت حیات کے افسانوں میں مواد موجود ہے۔

کیوں کہ شوکت حیات نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں تہہ داری کے ساتھ اپنی فکر کو پیش کیا ہے۔معمہ سازی سے اجتناب کیا ہے۔فلسفہ طرازی سے دوری بنائی ہے۔کہانی کو کہانی کے لوازمات سے اس قدر جوڑ کر رکھا ہے کہ قارئین کو افسانے کے ہر مقام پر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ساتھ ہی قاری نہ سحر انگیزی کی کسی دنیا میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ارضیت سے دور ہو جائے۔شوکت حیات نے نفسیاتی گرہوں کی تحلیل نفسی بھی کی ہے اور پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ بھی کیا ہے۔یہی سبب ہے کہ قاری نہ صرف تجسس کی کسی کائنات میں پہنچتا ہے، بلکہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے اپنے احساسات کی تسکین کے لیے ان کے افسانوں سے حظ اٹھاتا ہے۔اسی وارث علوی نے شوکت حیات کے زبان و بیان کی تعریف کی ہے، جس نے عبدالصمد کے بارے میں لکھا کہ کوئی اسکول کا بچہ بھی اس زبان میں لکھے تو میں بید سے پھٹکار دوں۔عبدالصمد کے متعلق وارث علوی کا یہ رویہ خواہ جانب دارانہ کیوں نہ ہو، تاہم شوکت حیات کے لیے مذکورہ اعتراف ایک بڑی بات ہے۔

وارث علوی کے علاوہ معتبر ناقد وہاب اشرفی نے بھی شوکت حیات کے افسانوں کے متعلق ایسے مفروضات قائم کیے ہیں جو انھیں ان کے معاصرین سے ممتاز بناتے ہیں۔یہ حقیقت بھی ہے کہ شوکت حیات کے معاصرین میں ان کا کوئی مقام متعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ جستہ جستہ ناقدوں نے شوکت حیات کا اعتراف کیا ہے۔وہاب اشرفی ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شوکت حیات کے افسانے فکری اور فنی افسانے کے ارتقاعی کیف کی مثالیں ہیں جن میں زندگی کی دھڑکنیں ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہیں۔ایک انقلابی ذہن میں کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہو سکتی ہے۔اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں، اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔...عرفان ذات پھر اس کے شعور کے حصول کے بعد احساس کم مائیگی، سب کچھ کان کے افسانوں میں موجود ہے۔''(۶)

یہ سچی بات ہے کہ شوکت حیات نے انقلابی ذہن کو تخلیقی فکر سے ہم آہنگ کیا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں واقعات کی محض کھتونی نظر نہیں آتی ہے بلکہ فکری ارتباط، سماجی سروکار، ذہنی کیفیات اور فنی ابعاد نے ان کے افسانوں کا الگ رنگ جمایا ہے۔

شوکت حیات نے نہ اپنے افسانے کو فلسفیانہ معراج عطا کیا ہے اور نہ ہی تاریخی ارتباط سے محض واقعاتی بیان بنا دیا ہے۔اسی طرح انھوں نے دیہی کشاکش کو اس قدر پھیلایا کہ ان کے یہاں سے شہری تعاملات غائب ہو جائیں۔انھوں نے شہری اور دیہی رویوں کو اس قدر مدغم کیا ہے کہ تو کبھی پریم چند کے معیارات بولنے لگتے ہیں تو کبھی شہری کائنات کا تجزیہ اس سلیقہ مندی سے سامنے آتا ہے کہ حیات اللہ انصاری مسکرا اٹھتے ہیں۔کیوں کہ شوکت حیات نے ان کی خصوصیات میں اپنی خصوصیات کو مدغم کر کے ایک

منفرد خصوصیت ثابت کردی ہے۔اسی طرح ان کے بعض افسانوں کا انجام وآغاز اس خوب صورتی سے سامنے آتا ہے کہ منٹو کی افسانوی ہنرمندی کا نیا روپ نکھرنے لگتا ہے۔شوکت حیات نے سیاست کی نفسیات اور عباداتی حسیت کو اس قدر آمیز کیا کہ سماج کا برہنہ چہرہ سامنے آجاتا ہے۔

شوکت حیات کے افسانوں کی بے ساختگی اور مانوس لہجہ نہ صرف قاری کے اندر رقت آمیزی پیدا کرتا ہے، بلکہ وہ سماج میں اپنی جڑیں بھی مضبوط کرتا ہے۔ان کے افسانوں کی ارضیت نہ معماتی سروکار بن کر سامنے آتی ہے اور نہ فلسفیانہ پیچیدگیوں کو جنم دیتی ہے۔کیوں کہ وہ واقعات کو انگیز کرنے کے بعد ہی کہانی کو قلم کی نوک کے حوالے کرتے ہیں۔اس لیے ان کے افسانوں کا مانوس لہجہ اور بے ساختگی ان کی انفرادیت قائم کرتی ہے۔اسلوبیاتی سطح پر ان کے افسانوں میں شاعرانہ غنائیت نہیں ہے اور نہ ہی لفظی تکرار ہے اور نہ ہی موضوعاتی تکرار۔یہی سبب ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں کی کائنات نئے فنی آسمان وزمین سے تشکیل پاتی ہے۔

شوکت حیات نے تہذیبی بیان اور سیاسی اظہار میں بھی جذباتیت کا سہارا نہیں لیا ہے۔ورنہ عموماً سیاسی حسیت میں صحافتی اسلوب کی آمیزش ہوجاتی ہے،تاہم انھوں نے اتنی سنجیدگی سے واقعات کو کھولنے اور انھیں حالات میں مدغم کرنے کا کام کیا ہے کہ ان کی فن کاری ہر پہلو پر غالب آجاتی ہے۔شوکت حیات نے زندگی کی نیرنگیوں کا بیان اس سطح پر کیا ہے، جہاں فلسفیانہ معاملات اور موضوعاتی سروکار کے انضمام کی ایک قابل قدر صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) نثار احمد صدیقی، آئینہ، (انٹرویو کا مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2012، ص266

(۲) مہدی جعفر، نئے افسانے کے معمار، شوکت حیات کا فنی سفر، مشمولہ: ذہن جدید دہلی، شمارہ30، مارچ تا اگست، 2000۔

(۳) شوکت حیات، گنبد کے کبوتر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2010، ص80۔

(۴) افسانہ ''کوا''، مشمولہ گنبد کے کبوتر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2010، ص276۔

(۵) وارث علوی (مضمون نگار)، شوکت حیات کی افسانہ نگاری، مشمولہ: گنبد کے کبوتر، ص12

(۶) پروفیسر وہاب اشرفی، بہار میں اردو افسانہ نگاری، بہار اردو اکادمی پٹنہ، 1989، ص52۔

◀◀ ● ▶▶

Asst. Professor, Marwari college,Kishan Gunj(Bihar)
9470120116
qaseemakhtar786@gmail.com

● ایم۔ خالد فیاض

سن ستّری افسانے کا قضیہ اور شوکت حیات کے نظریات
(تنقیدی مجموعہ ''بانگ'' کے تناظر میں)

شوکت حیات سن ستّر کی دہائی میں اُبھرنے والے چند اہم افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔سن پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں اُردو افسانے میں جدیدیت کا زور رہا جس کی بدولت افسانوں میں آہستہ آہستہ داخلیت اور فردیت کا عمل دخل مریضانہ حد تک بڑھ گیا دوسری طرف پیرائیۂ اظہار علامتی سے ہوتا ہُوا تجرید کی حدوں کو چھونے لگا جس سے جدید افسانہ ایک چیستاں بن کر رہ گیا اور جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے قاری سے بھی محروم ہوتا چلا گیا۔ایسی صورت میں ایک گروہ ایسا سامنے آیا جس نے اُردو افسانے کو جدیدیت کے اِن مضر اثرات سے گلو خلاصی کرانے میں بہت مدد کی اور اُس کا وقار اُس کے قاری میں ازسرِنو قائم کیا۔اسی گروہ کو سن ستّر کا گروہ کہتے ہیں جس نے اپنا بھرپور تخلیقی اظہار آٹھویں دہائی میں کیا۔

شوکت حیات نے ''بانگ'' اور ''گنبد کے کبوتر'' کے عنوان سے بہترین افسانے ہی تخلیق نہیں کیے بلکہ افسانوی تنقید بھی لکھی، گو وہ خود کو کوئی باقاعدہ نقاد نہیں سمجھتے لیکن اس کے باوجود سن ستّر کے اس افسانوی گروہ اور افسانے کی شعریات مرتب کرنے میں اُن کا اہم کردار ہے۔اُنھوں نے اس عہد کے افسانے کا مقدمہ بھی لڑا ہے اور اس عہد کے افسانوی نظریے کو واضح بھی کیا ہے۔اُن کا تنقیدی مجموعہ ''بانگ'' اس حوالے سے بہت اہم تصنیف ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ شوکت حیات کی نظر میں ''افسانہ ہر حال میں انسانی صورتِ حال کے بیانیے سے عبارت ہے۔'' (ص:۶۱) اسی لیے اُن کا کہنا ہے کہ ''مواد، پیش کش، بیانیہ اور محوریت سے افسانے کو کبھی گلو خلاصی حاصل نہیں ہوسکتی۔'' (ص:۶۱ تا ۶۲) یہ وہ پہلا اصول ہے جس نے سن ستّر کے افسانے کی صورت وضع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس طرح حد سے بڑھی ہوئی جدیدیت اور ہیئت پر بے جا انحصار کرنے والی افسانوی روش کو بدلنے میں ایک مثبت افسانوی عمل سامنے آیا۔مواد سے مجرمانہ حد تک بے اعتنائی برتنے کے رویے کی حوصلہ شکنی ہوئی۔شوکت حیات صاف صاف کہتے ہیں ''میرا اور تمام جینوئن سن ستّری افسانہ نگاروں کا یہ خیال تھا کہ Content کی اہمیت مسلم ہے۔اس کے تئیں کسی قیمت پر

مفاہمت نہیں کی جاسکتی (جب کہ) ہیئت کے معاملے میں کسی حد تک مفاہمت کی جاسکتی ہے۔'' (ص:۶۲)

شوکت حیات کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ سن ستّر کا یہ افسانہ اس قدر طاقت ور اور مضبوط تھا کہ اس سے پہلے کے کئی مانے ہوئے افسانہ نگاروں کو ان نئے لکھنے والوں سے سیکھنے کی ضرورت پیش آئی اور اُنھیں اپنی پرانی لایعنی روش چھوڑ کر اُن اوصاف کو اپنانا پڑا جن کے ذریعے سن ستّری افسانہ نگاروں کی نسل اپنا لوہا منوا رہی تھی۔ اس ضمن میں شوکت حیات باقاعدہ اُن افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اُن کے افسانوں کو بھی نشان زد کرتے ہیں جن پر اُن کے خیال میں سن ستّری افسانہ نگاروں کے اثرات مرتب ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس میں بُرا ماننے کی بات نہیں کہ غیاث احمد گدی کی 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' سریندر پرکاش کی 'بالکونی' رتن سنگھ کی 'ہزاروں سال لمبی رات' جوگیندر پال کی 'باشندے' اقبال متین کی 'گریویارڈ' اقبال مجید کی 'پوشاک' احمد ہمیش کی 'کہانی مجھے لکھتی ہے' کلام حیدری کی 'سخی' نند کشور وکرم کی 'راستے' احمد یوسف کی 'وہ ایک شخص' انور سجاد کی 'کونپل' دیویندر اِسّر کی 'جنگل وغیرہ جیسی کہانیاں سن ستّری افسانے کے انحراف، اعتبار، بازیافت اور تسلسل کی تھیوری کے تحت عالم وجود میں آنے والے افسانوں کے اوصاف کے زیر اثر لکھی گئی تھیں۔'' (ص:۶۴)

سن ستّر کا یہ افسانہ حقیقت نگاری کا موید تو ہے لیکن یہ حقیقت نگاری پریم چند کی حقیقت نگاری یا منٹو، بیدی اور غلام عباس کی حقیقت نگاری سے بھی مختلف ہے اور جدیدیت پسندوں کے حقیقت کے تصور سے بھی الگ ہے۔ اگرچہ شوکت حیات جدیدیوں کے ہاں کسی قسم کی حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں بہرحال یہ اُن کا خیال ہے راقم کے خیال میں بڑے سے بڑا تجریدی تصور بھی حقیقت کا کوئی نہ کوئی پہلو لیے ہوتا ہے مسئلہ اُس کو حقیقت کی تعریف سے متعلق کرنے کا ہوتا ہے۔ بہرحال یہاں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سن ستّر کی افسانوی حقیقت نگاری کیا ہے بالخصوص شوکت حیات کی نظر میں یہ کون سی حقیقت نگاری ہے۔ اُن کے بقول:

> ''آج کی حقیقت نگاری مخصوص فوٹو گرافی تک محدود نہیں بلکہ حقیقت کا سینہ چیر کر گہرائی میں جا کر وسیع و بسیط تہ نشیں امکانی اور تخلیقی حقیقت کو سامنے لانے والی حقیقت نگاری ہے جہاں علامتیت، تجریدیت، فنطاسیہ اور دیو مالائی عناصر کا استعمال محض وسیلے کے طور پر ہوتا ہے جب کہ یہ وسیلے سن ستّری نسل سے پہلے والوں کے لیے مدّعا اور مقصد کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، جس نے افسانے کو غیر تخلیقی، معمہ اور چیستاں بنا دیا تھا۔'' (ص:۶۶)

اسی حقیقت نگاری کو شوکت حیات ''جدلیاتی، نامیاتی، حرکی اور تخلیقی قوتوں کے ادراک سے عبارت'' (ص:۶۶) قرار دیتے ہیں۔ اب یہاں یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ سن ستّر کے افسانے کے لیے شوکت حیات نے ''انامیت''، ''انام نسل'' اور ''انام افسانے'' کی اصطلاحات بھی وضع کیں؛ اس کا مطلب تھا کہ اس نسل کو کسی پرانے ازم سے وابستہ یا منتھی نہ کیا جائے، نہ کوئی نام دیا جائے؛ اور بتایا کہ انام افسانوں نے اُردو افسانے کو معروضیت، بیانیہ اور سماجی سروکار اور سب سے بڑھ کر 'کہانی پن' کے وصف سے لیس کرتے ہوئے اُسے اُس کے بنیادی خدّ و خال واپس کیے۔

شوکت حیات 'مابعد جدید افسانہ' بھی اسی افسانے کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ ذہن میں رہے کہ شوکت حیات کے ہاں 'سن ستری افسانہ''، ''انام افسانہ'' اور ''مابعد جدید افسانہ''؛ تینوں اصطلاحات اُس افسانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں جس نے جدید افسانے کے منفی اور شدت پسند عناصر سے بغاوت کرتے ہوئے افسانے کو سماجی اور معروضی زندگی اور اُس کے سیاسی مسائل سے بھی جوڑا اور کہانی پن یا افسانویت کے عنصر کو بھی تقویت دی لہٰذا اُن کے ہاں مابعد جدید افسانہ ''جدید افسانے کے نام نہاد منفی عناصر کی ادعائیت سے انکار اور زندگی اور ثقافت کے مثبت عناصر کی بحالی کی تخلیقی کوششوں پر دال ہے۔ زندگی کی تغیر پذیر قوتوں اور جدلیاتی پہلوؤں کی توثیق ہے۔'' (ص:۷۲تا۷۳)

ترقی پسند اور جدید افسانے کی بنیادی خصوصیات کو نشان زد کرتے ہوئے مابعد جدید افسانے کے امتیازات شوکت حیات نے بڑی خوبی سے سمجھائے ہیں۔ اس ضمن اُن کا موقف بڑا واضح ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند افسانہ عصری حقیقتوں کا علم بردار تھا، جدید افسانہ صرف آفاقی حقیقتوں تک مرتکز تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کا افسانہ عصری و آفاقی حقیقتوں کی آمیزش سے زندگی کو نئی سطحوں پر دریافت کرنے اور معنوی اُبعاد پیدا کرنے سے دوچار ہے۔ اس طرح وہ افسانہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے بعد بڑے رینج، ویژن اور بڑے کینوس کا متحمل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج مابعد جدید افسانہ توسیعی صورت اختیار کرتے ہوئے آج کی عام زندگی کے زندگی پن، اس کے کھردرے پن اور ٹھوس پن سے آنکھیں چار کر رہا ہے۔ مابعد جدید افسانے نے زندگی اور فرد کو پوری Totality میں پیش کیا۔ فرد اور سماج کو لازم و ملزوم گردانا۔۔۔ اُن کے Interact پر خصوصی استغراق کے بعد زندگی پن اور اُس کی سچائی کو اپنے فن کا محور و مرکز بنایا۔ آج کا افسانہ نگار اپنی ثقافت، تشخص اور سماجی سروکاروں نیز سیاسی

بصیرت کے ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو اکٹھا کر رہا ہے۔ اُن کے رشتوں کی اہمیت کو تسلیم کر رہا ہے۔ علامت و ابلاغ آمنے سامنے مصافحہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ فارم کا کوئی..... جبر نہیں۔'' (ص:۷۴،۷۵اور۷۷)

اور یہ کہ:

''آج کا افسانہ Critical Cultural Discourse کے ذیل میں آتا ہے۔ آج فکشن کی جدید ترین شکلوں میں بیک وقت افسانہ نگار اپنے فن اور زندگی کی حقیقتوں میں ناقدانہ حیثیت سے بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اپنے تجربوں کے نتائج کی روشنی میں بصیرت افروز مفکر کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے..... مابعد جدید افسانہ وہ تخلیقی صنف ہے جس میں بیک وقت فکر، استدلال، لاشعور، تحت الشعور، شعور، Delibration، واردات، تکنیک، ہیئت، اسلوب، ادراک، ویژن رچے بسے اور گھلے ملے ہوتے ہیں۔'' (ص:۷۸اور۷۹)

ایک اصطلاح ''امکانی حقیقت نگاری'' یا ''امکانیت پسندی'' سے بھی شوکت حیات نے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے اس کی کوئی واضح تعریف بیان نہیں کی لیکن افسانوں کی مثالوں سے جس طرح بات کی ہے اُس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس سے اُن کی مراد یہ ہے کہ جب کوئی افسانہ نگار اپنے افسانے میں ایسے عناصر رکھ چھوڑے جو ہمارے ذہنوں میں تغیر و تبدل کو راہ دیتے ہوئے امکانی پہلوؤں کو روشن کریں اور فن کار صرف موجود حقیقت کو بیان کرنے کے بجائے جیسی حقیقت وہ دیکھنا چاہتا ہے، اُس کا اظہار کرے تو وہ شوکت حیات کی نظر میں ''امکانی حقیقت نگاری'' ہے۔ اس ضمن میں وہ پریم چند کے ''کفن''، منٹو کے ''کھول دو''، ''ہتک''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''نیا قانون'' کے ساتھ ساتھ غیاث احمد گدی کے افسانے ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ وہ ان افسانوں کی دائمی اہمیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اِن میں امکانی حقیقت نگاری کا حربہ استعمال کیا گیا ہے۔

''نامیاتی افسانے'' یا ''نامیاتیت'' کی اصطلاح بھی شوکت حیات کے ہاں ملتی ہے اس کا بھی بنیادی تعلق شوکت حیات سن ستری افسانے سے ہی جوڑتے ہیں لیکن یہ محض سن ستر کے افسانے تک محدود نہیں (گو اس تصور کو واضح کرنے میں وہ سن ستری افسانہ نگاروں کا کردار زیادہ سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کے افسانے ''نامیاتیت'' کی شکل اختیار کرنے کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں)۔ شوکت حیات کے بقول نامیاتی افسانوں میں دراصل ''ہر عہد میں نمو پانے، اُگتے جانے اور اپنی گہری بصیرت کے چلتے ہر عہد کے

رُوبرو ہونے کی تازگی مضمر ہے۔'' (ص:۱۲۰) ''نامیاتیت'' سے وہ افسانے کی ایسی قوتِ نمو مراد لیتے ہیں جو ہر عہد میں زندہ اور مسلسل Grow کرتے ہوئے پڑھنے والوں کے شعور کو جلا بخشے۔ دوسرے لفظوں میں یہ افسانوں کو آفاقیت اور دوامیت عطا کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ ''نامیاتی کہانی'' جسے وہ بڑی کہانی مانتے ہیں اپنی فطری قوتِ نمو یا ''نامیاتیت'' کے بغیر کچھ نہیں اور آج کا افسانہ نگار اصل میں اسی قوتِ نمو یا ''نامیاتیت'' کی دریافت و جستجو کے چیلنج سے دوچار ہے۔

نامیاتی افسانے یا کہانی کا رشتہ زندگی کے امکانات سے کافی گہرا ہے۔ اس لیے شوکت حیات کے ہاں یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اُن کا کہنا ہے کہ ''بڑی کہانی یا نامیاتی کہانی۔۔۔ امکانی زندگی کی تلاش و جستجو اور دریافت کی کاوشوں سے مربوط ہیں۔ امکانی زندگی کی نیرنگی اور زرخیزی ہی دراصل کہانی کو لازوال وقت کے دھارے سے جوڑ کر اسے نامیاتی جوہر عطا کرتی ہے۔'' (ص:۱۲۰)

اپنے اِنہی نظریات کے تحت شوکت حیات اپنے اس ادبی مضامین کے مجموعے ''بانگ'' میں انور قمر، محمود ایوبی، احمد یوسف، انجم عثمانی اور غیاث احمد گدی جیسے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تجزیہ کرتے اور اُن کی افسانہ نگاری کو ان نظریات کے تحت نئی جہات عطا کرتے ہیں؛ لیکن میرے خیال سے ان مضامین میں ''غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری'' پر اُن کا مضمون انتہائی اعلیٰ پائے کا ہے۔ یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ غیاث احمد گدی کی افسانوی تفہیم کے ذیل میں جو مضامین ہمارے ناقدین نے لکھے ہیں اُن کی معتبر فہرست اس وقت تک مکمل نہیں کہی جا سکتی جب تک اُس میں شوکت حیات کا مذکورہ مضمون شامل نہ ہو۔

غرض یہ کہ اُردو کی افسانوی تنقید میں شوکت حیات سن ستّر کے بعد کی افسانہ نگاروں کی نسل پر باقاعدگی سے اظہارِ خیال کرنے والوں میں ایک اہم نام کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔ اور اس عہد کے افسانے کے لیے طرح طرح کی اصطلاحات وضع کرنے کے حوالے سے بھی اُن کا نام ضرور لیا جاتا رہے گا۔

◄◄ ● ►►

Ideal Book Center
Dr. Sarver's Street
Railway Road Gujrat, Pakistan
Pin : 50700
Mob: 03334284895

● ڈاکٹر زر نگار یاسمین

شوکت حیات کے امتیازات

اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں شوکت حیات کا سب سے نمایاں امتیاز میری نظر میں ان کی فکری اور عملی آزادروی ہے۔انہوں نے اپنے عہد کی مروّج ادبی گروہ بندیوں کو نہ صرف ناپسند کیا اوران سے اپنی برأت کا اظہار کیا بلکہ اپنے افسانوں کی شکل میں اس کا عملی ثبوت بھی دیتے رہے۔دراصل کلاسیکیت کے مقابلے میں ترقی پسندی اوراس کے مقابلے میں جدیدیت کی ادبی دنیا میں آمد زیادہ نقصان دہ یا غلط نہیں تھی کیونکہ ادب بھی زندگی کا ایک حصہ ہے اور زندگی کا تغیر وتبدّل سے آشنا ہونا فطری ہے مگران نظریوں کی بنیاد پر جو حلقے تشکیل دئے جارہے تھے اور جس طرح فنکاروں کو سکّہ بند قرار دے کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی کی کوشش ہورہی تھی، وہ بے حد قابل اعتراض تھی۔بعض ناقدوں یا ادبی حلقوں کی جانب سے کی جانے والی ان کوششوں سے گھٹن اور حبس کی کیفیت میں اور بھی فنکار مبتلا رہے ہوں گے لیکن اس کا برملا اور بہ آواز بلند اظہار پہلی بار شوکت حیات نے کیا اور عملی طور پر اپنے افسانوں کے ذریعہ یہ ثبوت بھی پیش کیا کہ فکر واظہار کی سطح پر آزادرہ کر بھی کامیابی کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے۔یہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس کا زمانہ تھا جب جدیدیت اپنے پاؤں جمارہی تھی اور ترقی پسندی اپنے بال وپر سمیٹ کر مقابلہ آرائی کی کوشش میں مصروف تھی۔ایسے میں شوکت حیات کا وہ ''انام ادبی رویہ'' جسے وہ مختلف نام دیتے رہے نہ صرف فوری طور پر نئی ادبی نسل میں مقبول ہوا بلکہ عمر بھر کے لیے ان کی شناخت بھی بن گیا۔ان کے کئی نقادوں نے شوکت حیات کے اس ''طرز دیگر'' کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اس پر سب سے زیادہ اصرار خود شوکت حیات ہی کرتے رہے ہیں۔یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ''غیر روایتی، غیر ترقی پسند، غیر جدید، غیر مابعد جدید افسانے جنہوں نے 'انامیت' 'نامیاتیت' اور سارک کانفرنس ۲۰۰۵ء علی گڑھ کے موقع پر امکانیت پسندی کی تھیوریز دیتے ہوئے انام افسانے، نامیاتی افسانے اور امکانی افسانوں کی بنیاد گزاری کی ہے۔''

یہ شوکت حیات کے اکلوتے افسانوی مجموعے ''گنبد کے کبوتر'' کی تعارفی سطور ہیں جو خود افسانہ نگار کی تحریر کردہ ہیں مگر یہ سلسلہ رکتا نہیں ہے۔دوسرے ہی صفحے پر ''انتساب'' کے تحت پھر کہتے ہیں:

> 'ان ہم عصروں کے نام جنہوں نے میری طرح قدیم وجدید ادبی قبرگاہوں سے

> بہت آگے اپنے اننت سفر کی ابتداء کی ہے۔اور آنے والی نسلوں کے نام جو ذہنی کشادگی کے ساتھ آزادانہ طور پر اس تسلسل اور تغیر وتبدّل کا حصہ بنیں گی۔''

اس اقتباس کے جارحانہ تیور سے قطع نظر افسانہ نگار کے ذہنی تناؤ کا اندازہ لگایا جائے تو یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ قدیم اور جدید یعنی کلاسیکیت کے علاوہ ترقی پسندی اور جدیدیت وغیرہ کو بھی مردہ قرار دے کر قبروں میں دفن کردینے کا رویہ آخر کیا ہے؟ یہی کہ افسانہ نگار ہر حال میں اپنی انفرادیت پر اصرار کرتا ہے اور یہ بھی تصور کرتا ہے کہ جو طرز بیان وہ اختیار کررہا ہے وہی درست ہے۔ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر شدت پسندی اور انانیت کی طرف لے جاتی ہے اور شوکت کے کئی ناقدین نے ان کی شخصیت یا فن میں ان عناصر کی بھی تلاش کی ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ خود افسانہ نگار نے اپنے بعض دوسرے بیانات میں خاصا معتدل لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔شاید اس لیے کہ اسے اپنے مخصوص طرز اظہار سے متعلق کچھ سمجھانا ہے۔افسانوی مجموعے میں ''میری تھیوری سازی اور میرے افسانے'' کے عنوان سے لکھی ہوئی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

> '۱۹۷۰ء کے آس پاس میں نے باشعور طریقے سے افسانے کی تاریخ کے تسلسل میں رہتے ہوئے تخلیقی سطح پر لکھنا شروع کیا تو وہ زمانہ اتفاق سے بیک وقت ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے عروج وزوال کا تھا.....دونوں مذکورہ رجحان اس وقت اپنے اپنے وجود کے اثبات کی لڑائی لڑ رہے تھے اور اس کا انہیں بے حد آسان طریقہ یہ دکھائی دیا کہ ۱۹۷۰ء سے ابھرنے والی نئے ذہین افسانہ نگاروں کی بھیڑ کو انہوں نے اپنے اپنے ازم اور رجحان سے برانڈ کرنا شروع کردیا۔میں چونکہ سائنس کا آدمی تھا اور اپنے ڈھنگ سے افسانے لکھ رہا تھا۔سوچنے، سمجھنے برتنے کا تمام میرا افسانوی نظام، فکر، لہجہ، تیور، رویہ، تکنیک، ٹریٹ منٹ اور عندیہ اپنا تھا.....میں نے خود کو اور اپنے دوستوں کو ترقی پسندی اور جدیدیت سے مختلف اور نیا سمجھتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ ہمیں برانڈ نہ کیا جائے اور ہم نے خود کو (چونکہ اس وقت اور کوئی نام ذہن میں نہیں آرہا تھا) انام، انامیت پسند اور بے نام نسل کے افسانہ نگار کہنا شروع کردیا تاکہ ہماری اپنی علیحدہ شناخت قائم ہو۔ہم اس میں کامیاب ہوئے.....سچ پوچھئے تو ہم ہی لوگوں نے (۱۹۷۰ء کے بعد والوں نے) اردو افسانے میں تخلیقی آزادی کی فضا بحال کی۔''

ظاہر ہے کہ افسانہ نگار کی اس وضاحت پر کوئی گفتگو کرنا یہاں بے محل ہوگا کیونکہ مجھے ان کے افسانوں پر بات کرنی ہے۔مگر دو چار جملوں میں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ کسی بھی ادبی یا غیر ادبی تجربے

یا طرزِ عمل کا سائنس پڑھنے یا نہ پڑھنے سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ آزادیٔ فکر کہیں بھی اور کسی بھی وجہ سے نشوونما پا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی افسانہ نگار کو برانڈ نہ کیا جائے یعنی ترقی پسندی یا جدیدیت سے کلّی طور پر وابستہ نہ کیا جائے یہ خواہش تو قابلِ تعریف ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر فنکار اپنی انفرادی شناخت پہ اصرار کرے۔ بہرحال اب ان کی افسانہ نگاری کی طرف براہ راست رخ کرتی ہوں۔ میں نے برسوں پہلے اپنی کتاب ''نئے پرانے افسانے: متن اور تجزیے'' میں شوکت حیات کے افسانے ''گنبد کے کبوتر'' کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے جو باتیں لکھی تھیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(الف) شوکت حیات ترقی پسند تحریک کے آخری دور اور جدیدیت کے ابتدائی زمانے میں ادبی منظرنامے پر ابھرے۔ یہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس کا عہد تھا جب ترقی پسندی اپنے بال و پر تقریباً سمیٹ چکی تھی.....ایسے ماحول میں جن گنے چنے افسانہ نگاروں نے اپنی راہ خود نکالی، کہانیوں کو چیستاں اور معمہ بننے سے بچایا اور استعاروں سے رشتہ جوڑنے کے باوجود کبھی ابہام پر اصرار نہیں کیا، ان میں شوکت حیات بھی ایک ہیں۔

(ب) ان کے مزاج کی ایک خرابی مشہور ہے کہ وہ ضدّی بہت ہیں.....مزاج کا یہ انداز ان کی افسانہ نگاری سے بھی وابستہ رہا۔

(ج) شوکت حیات کے اندرون میں جو فنکار پوشیدہ ہے اس کی فطرت میں احتجاج ہے اس لیے وہ ایسے مواقع پر بھی احتجاج کی گنجائش نکال لیتے ہیں جہاں اس کا موقع نہیں ہوتا۔

(د) ''گنبد کے کبوتر'' میں ایک اشاراتی کیفیت موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ احتجاج تو اس سلسلے میں ہر سطح پر ہوا ہے اور دوسروں نے بھی کیا ہے مگر اس موضوع کے ساتھ جو Treatment شوکت حیات کا ہے وہی اس افسانے کو خاص بناتا ہے۔

پہلے اور آخری نکتے کا تعلق طرزِ اظہار سے ہے جب کہ دوسری اور تیسری بات کا تعلق افسانہ نگار کے ذہنی اور تخلیقی رویے سے ہے جس کی سرحدیں کہیں نہ کہیں موضوعات کے انتخاب سے مل جاتی ہیں۔ یہاں عرض کروں کہ طرزِ اظہار میں جدّت پیدا کرنا کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ ہر فنکار اپنے طور پر اس کی کوشش کرتا رہا ہے۔ جدیدیت اور اس سے قبل ترقی پسندی نے اپنے اپنے موضوعات کے ساتھ اسالیب بھی متعین کئے تھے مگر دونوں ہی حلقوں سے وابستہ کئی بڑے فنکاروں کے یہاں انحراف کی مثالیں موجود ہیں۔ اب سوال موضوعات کا ہے اور یہ درست ہے کہ ترقی پسندوں نے جس شدت کے ساتھ بعض موضوعات کی پیش کش پر زور دیا اسی شدّت کے ساتھ جدیدیوں نے کچھ دوسرے موضوعات کی وکالت کی۔ ایک جملے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ترقی پسندوں نے معاشرے کے اجتماعی اور خارجی احوال کے بیان پر توجہ دی تو ان کے مقابلے میں

خود اپنی ذات کے باہری اور داخلی احوال کے مطالعے پر جدیدیت کا اصرار رہا۔ گرچہ یہ کام آسان نہ تھا اور بہت سارے افسانوں کو معمّہ بناتا گیا۔ بہرحال، ان نکات کو ذہن میں رکھ کر شوکت حیات کے تمام تر افسانوں کا انفرادی طور پر مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو نتائج ان کے اپنے دعووں سے کچھ مختلف برآمد ہوتے ہیں۔

اپنے اس دعوے کی دلیل کے طور پر میں ان افسانوں کے تجزیاتی مطالعے کو بھی پیش کر سکتی ہوں جو رسالہ ''تکمیل'' (ششماہی) بھیونڈی کے ''شوکت حیات نمبر'' میں شریک اشاعت ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ تجزیہ نگاروں میں انیس اشفاق اور علی احمد فاطمی جیسے بزرگ ناقدوں کے پہلو بہ پہلو عہد حاضر کے اہم ناقد بھی شامل ہیں بلکہ دو افسانے ایسے ہیں جن کے دو مختلف مطالعے شریک محفل ہیں اور دونوں کے نتائج میں خاصا فرق ہے۔ یہ بھی حیرت ہے کہ ''گنبد کے کبوتر'' پر جو ان کا مشہور ترین افسانہ ہے، کوئی تجزیہ موجود نہیں ہے۔ گرچہ معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق کا ایک مختصر سا مضمون جسے وہ نامکمل تاثر کہتے ہیں، دعوت نگاہ دیتا ہے۔ بہرحال، ان تمام نکات کے پیش نظر میں پہلے ان افسانوں کی طرف رجوع کرتی ہوں جو ان کے افسانوی مجموعے میں شریکِ اشاعت ہونے کے باوجود زیادہ گفتگو کا موضوع نہیں رہے ہیں۔ ویسے حوالے کے طور پر دوسرے افسانے بھی زیر گفتگو آئیں گے۔

افسانہ ''رانی باغ'' پر شوکت حیات کے نظریۂ حیات کا اثر نمایاں ہے۔ خاص طور پر رحمت صاحب کا امریکہ سے ہندوستان واپس آ کر اپنے آبائی گاؤں میں قیام کرنا، وہاں کی بچی کھچی جائداد مارکسی انقلابیوں کے سپرد کر دینا اور خود بھی ان کی تحریک میں یہ کہتے ہوئے شامل ہو جانا کہ ''ہم شعلے نہیں رہے مگر ایندھن کا حصہ تو بن ہی سکتے ہیں۔'' افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کا واضح اشارہ ہے۔ مگر میری نظر میں افسانے کے دو اور پہلو ایسے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔ ایک تو اس کا آغاز ہے۔ رحمت اور رانی کا افلاطونی عشق جو خاصے روایتی انداز میں شروع ہوتا ہے اور اسی انداز سے جاری رہتے ہوئے انجام تک بھی پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بین المذہب عشق و عاشقی کی ہمارے معاشرے میں آج بھی گنجائش نہیں ہے اور کل تو اور بھی نہیں تھی۔ ایسے میں رحمت صاحب کا امریکہ چلے جانا اور رانی کے گھر والوں کا اس کی شادی کر دینا حقیقت پسندانہ بیان ہے مگر میرا سوال یہ ہے کہ آخر اس میں شوکت حیات کا انفرادی رویہ کہاں ہے۔ ایسا تو دوسرے افسانوں میں بھی ہوتا رہا ہے۔ دوسرا پہلو اسلوب سے متعلق ہے۔ پوری کہانی بیانیہ کے پیرائے میں ہے۔ فطرت کا بیان ہو یا پھر ناسٹلجک رجحان کا، ہر جگہ انداز بیان سادہ ہے۔ کوئی استعارہ یا علامت نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ تشبیہات بھی سامنے کی اور کلاسیکی انداز کی ہیں۔ گویا افسانہ روایت سے بہت قریب ہے۔

اب ایک اور افسانے کے متن پر نظر ڈالئے۔ ''مادھو'' میں پریم چند کے مشہور افسانے ''کفن'' کا

کردار مادھو ایک نئے روپ میں سامنے آتا ہے۔ کہانی ابتداء میں کوئی خاص نہیں۔ پراسرار طور پر وہ گہری اور لمبی نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اسے تمام پرانے واقعات یاد آتے ہیں اور اپنے کئے پر پچھتاوا بھی ہوتا ہے۔ بیوی کی خوبیاں یاد آتی ہیں تو اس کے مرنے کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے باپ پر بھی نفرت بھری نگاہ ڈالتا ہے اور اپنے طرز عمل پر غور کر کے شرمندہ ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ کہانی معمول کے مطابق تھوڑی بہت آگے بڑھتی ہے لیکن اس میں جو نکات نئے ہیں وہ افسانہ نگار کے رویے کا احساس دلاتے ہیں۔ جنسی طور پر کمزور گھیسو جس طرح مادھو اور اس کی بیوی بدھیا کے جسمانی رشتوں میں لذت کے پہلو تلاش کرنے کے بعد لطف اندوز ہوتا ہے وہ قابل دید ہے۔ دراصل وہ ایک طرف خود لذّتیت اور دوسری طرف رقابت کی نفسیاتی کیفیات میں مبتلا ہے۔ ابتدا میں لگتا ہی نہیں کہ یہ افسانہ شوکت حیات جیسا جدید افسانہ نگار لکھ رہا ہے۔ انفرادی انداز ضرور ہے مگر ان کے عام طرز فکر سے الگ۔ ایک اقتباس دیکھئے جس سے اندازہ ہوگا کہ گھیسو اور مادھو کے رشتوں کی نوعیت صرف باپ بیٹوں کی ہے یا اس سے بڑھ کر کچھ اور۔ افسانہ نگار لکھتا ہے:

> ''اس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بوڑھے گھیسو کو اپنی بیوی چھمیا کی یاد دلاتی اور اس کا سونا محال ہو جاتا۔ تانبے کی طرح ٹن ٹن کرتی ہوئی گٹھیلی چھمیا کی اسے یاد آتی تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ اس کے خیال میں بدھیا کے جسم میں زوردار چھمیا والی بات نہ تھی لیکن..... بدھیا بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس کے سڈول جسم اور سانولی رنگت والی جلد سے شہد ٹپکتا تھا۔ مادھو کی کھس پھس بوڑھے گھیسو کو بہت ناگوار گزرتی۔ اس کی ڈھیلی رگوں میں بھونچال آجاتا اور اسے کھانستے ہوئے ریگزاروں کے سفر پر روانہ ہونا پڑتا..... اس کے دل سے آہ نکلتی اور وہ نیم تاریکی میں مادھو کی کوٹھری کی طرف بے بسی سے دیکھتا ہوا مسلسل کھانستا رہتا۔''

غور کرنے کی بات ہے کہ باپ بیٹے کے ہی نہیں خود افسانہ نگاروں کے بھی طرز فکر میں کس قدر فرق ہے۔ یہ پریم چند اور شوکت حیات کے رویوں سے زیادہ زمانے کے بدلنے کا فرق ہے اور اسی فرق کو آگے بڑھاتے ہوئے افسانہ نگار اپنے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے جب مادھو زمیندار کے ظالم اور خونخوار کتّے سے مقابلہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اس طرح افسانہ نگار یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ نئی نسل پرانی نسل سے مختلف ہے۔ وہ ظلم سے پنجہ لڑانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے اور اسے شکست دینے کی صلاحیت بھی۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر افسانے کے آخری حصے میں مادھو کی جنگل کی طرف پراسرار مراجعت کو نظر انداز کر دیا جائے تو افسانے کا بنیادی مقصد ظلم و ستم کے خلاف نئی نسل کا احتجاج ہے جو خالص ترقی پسند نظریہ بھی ہے اور کسی حد

تک شوکت حیات کی مارکزم سے قربت کا آئینہ دار بھی۔

کم و بیش یہی ترقی پسند نقطۂ نظر ''مسٹر گلیڈ'' اور ''تفتیش'' جیسی کہانیوں میں بھی جاری و ساری رہتا ہے۔ اول الذکر ایک کرداری افسانہ ہے جس کے مرکزی کردار کی خستہ معاشی حالت اور انسان دوستی کی عکاسی کرتے ہوئے مسٹر گلیڈ یعنی نہال صاحب کی بیوی کے رویے یا وسیلے سے بھی خود افسانہ نگار کا نظریہ بیان ہوتا ہے، مثلاً:

> ''گھوٹالوں کے اس شہر میں اب شریف آدمی کا جینا مشکل ہو گیا ہے..... دنیا میں فکرِ معاش سے بڑا کوئی غم نہیں۔ بیشتر مسائل کی جڑیں اس کی کوکھ میں پیوست ہیں..... انصاف اتنا مہنگا ہو چکا تھا کہ پی۔ ایف میں بچے کھچے پیسے سے زندگی کو نیم مردہ لاشوں کی طرح گھسیٹتے ہوئے ملازمین کے لیے چندہ اکٹھا کرنا آسان نہ تھا..... لوگوں نے مسجد کے اندر جا کر نماز پڑھنے کے لیے بہت کہا لیکن انہیں اس کی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔

افسانہ نگار نے اس میں بعض غیر متعلقہ امور مثلاً طوطے کی کہانی یا نہال صاحب اور ان کی بیوی کے جنسی رشتوں کا ہیجان انگیز بیان شریک کر کے افسانے کو قدرے نیا رخ دینا چاہا ہے مگر بنیادی فکر بہت واضح ہے۔ ''تفتیش'' میں تو یہ فکر براہ راست سامنے آتی ہے۔ خود افسانہ نگار یعنی راوی اور اس کے دوست ایم۔ ٹی۔ خاں کے بیانات کچھ اس طرح کے ہیں جیسے ظالموں سے لڑنے کی دعوت دے رہے ہوں مثلاً:

> ''امن پسند لوگ اپنے دروازے کیوں بند کر لیتے ہیں..... طوفان سے ٹکرانے کی جسارت کیوں نہیں کرتے؟..... لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ تم جیتو گے..... اور ہار جیت اضافی چیزیں ہیں..... اصلی چیز ہے کہ تم نے مزاحمتوں سے لڑائی کی..... یہ لڑائی اپنے آپ میں ایک جیت کی حیثیت رکھتی ہے۔''

دوسری طرف آفتاب صاحب کا کردار تو اعلانیہ طور پر ترقی پسند فکر کا حامل ہے۔ وہ مشترکہ تہذیب کے نہ صرف وکیل ہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں اور آخر دم تک یہ مانتے ہیں کہ مل جل کر رہنا ہی انسانیت کا تقاضہ ہے۔ حالانکہ ایک مسلم محلے (غالباً نیو عظیم آباد) میں جا کر ان کی بے بسی قابل دید ہے لیکن ان کا عزم قابل دید ہے۔ برسوں پہلے لکھی گئی کہانی آج بھی معنویت کی حامل ہے اور ہندوستان کے حالات پر ایک واضح نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

ایک اور کہانی ''مرشد'' کے متن کا جائزہ لیجئے تو کچھ اور ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ خانقاہوں کی خستہ حالی اور وہاں بیٹھے ہوئے بزرگ کی ایمان داری کے ساتھ ساتھ مریدوں کی عقیدت مندی کے پس منظر میں یہ سچائی بیان کرنا کہ انسان دنیا کی ہوس میں مبتلا رہ کر غم زدہ ہے اور جیسے ہی وہ اپنے انجام یعنی موت سے آگاہ

ہوجاتا ہے، اس کے گناہ کرنے کی عادت بدل جاتی ہے کیونکہ دنیا اس کی نظر میں بے وقعت ہوجاتی ہے، کسی صوفی اور مذہبی انسان سے ہی ممکن ہے۔ اب افسانہ نگار ان دونوں میں سے کیا ہے، یہ فیصلہ قاری کو کرنا ہے۔

بس ایک افسانے کا اور تذکرہ کرنا چاہتی ہوں۔ ''فرشتے'' تین ایسے فنکاروں کی کہانی ہے جو نیک اور رفرشتہ صفت ہیں۔ دنیا میں انقلاب لانے کی جدوجہد میں خود حالات کے جبر تشدد کا شکار ہیں۔ وہ جس شہر میں جاتے ہیں وہاں خود کو اشترا کی کہنے والے ادیبوں کی منافقت اور موقع پرستی کے ساتھ ساتھ عیش پسندی انہیں بے حد بددل کرتی ہے مگر آخر میں جب ایک نیم ترقی یافتہ علاقے میں پسماندہ کہلانے والے ادیبوں کے پسندیدہ ہوٹل میں راجدھانی سے آئے ہوئے مہمان کے ساتھ وہ شراب پیتے ہوئے تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو بالکل فری موڈ میں گاتے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کی بھیڑ ان کے گرد جمع ہوجاتی ہے۔ پھر وہ مہمان ادیب کو اس کی ٹرین تک پہنچا کر خود لوکل ٹرین میں سوار ہوتے ہیں تو بے خودی کے عالم میں مطلوبہ اسٹیشن سے آگے نکل جاتے ہیں اور واپسی کے لیے جس ٹرین میں بیٹھتے ہیں اس کے بارے میں اسٹیشن ماسٹر یہ اعلان کردیتا ہے کہ اس ٹرین کے انجن میں خرابی پیدا ہوگئی ہے اس لیے نئے انجن کے آنے یا مرمت ہونے کے بعد ہی یہ ٹرین آگے جائے گی۔ ظاہر ہے کہ افسانے کے پیچ وخم میں کئی سفاک سچائیاں موجود ہیں۔ عام طور کے لکھنے والے اشترا کی فنکاروں کا رویہ تو ابتداء ہی میں ہے اور راجدھانی کے بڑے ادیبوں کا رویہ درمیانی حصے میں، لیکن جو لوگ سچے دل سے لکھ رہے ہیں وہ بھی غفلت اور نیم غنودگی کے عالم میں ہیں، بیداری کے نہیں۔ اب انقلاب آئے تو کیسے؟ یہ سوال افسانہ نگار نے ہمارے غور وفکر کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

میں اور بھی کچھ افسانوں کا تذکرہ کرسکتی تھی مگر موضوعات کے جس تنوع کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتی تھی وہ مذکورہ بالا افسانوں کے تجزیے سے بھی ظاہر ہے۔ ویسے دوسرے افسانوں پر بھی نگاہ ڈالیں تو کم وبیش یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ''کوبڑ''، ''میت''، ''پاؤں'' اور ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' کے موضوعات الگ الگ ہی نہیں متوازی ہیں۔ افسانہ نگار کہیں ناسٹلجک ہے اور کہیں ترک روایت کا حامی ہے۔ غور کیجیے کہ ''اپنا گوشت'' لکھنے والا افسانہ نگار کیا وہی ہے جو ''رانی باغ'' جیسا افسانہ لکھ رہا ہے۔ ''بڑے ابو'' کے حوالے سے عہد حاضر کی صارفیت کی طرف جو اشارہ افسانہ نگار نے کیا ہے وہ کچھ اور افسانوں میں بھی موجود ہے۔ ایسے لوگ کئی جگہ کرداروں کی شکل میں ابھرے ہیں جو اپنی ضرورتوں کو قربان کرکے سماج کے لیے یا خاندان کے دوسرے افراد کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ مسٹر گلیڈ جیسے لوگ جو گھر سے مدتوں بعد گوشت خریدنے بازار نکلتے ہیں اور جوڑ جاڑ کر رکھے ہوئے پیسے کسی مریض کے علاج کے لیے دے آتے ہیں۔ ''بلی کا بچہ'' کے برہان الدین اور بچوں کے والد جیسے کردار جن کی زندگیاں دوسروں کے لیے

وقف ہوجاتی ہیں۔ ''تفتیش'' کے آفتاب صاحب اور ایم۔ ٹی۔ خاں جیسے لوگ جو ہر حالت میں غلط کاریوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ''رانی باغ'' کے ''رحمتے'' اور ''گھڑیال'' کے سمیع صاحب کا سعیدہ کے ساتھ التفات، ان رویوں کو ہم کس خانے میں رکھیں؟

صاف ظاہر ہے کہ افسانہ نگار کسی ایک موضوع کا پابند نہیں ہے۔ زندگی کے جتنے چہرے ہیں یا ہوسکتے ہیں، وہ سب اس کی نگاہ میں ہیں اور وہ طوطے کو دانا کھلاتے ہوئے اچانک جنسی ہیجان میں مبتلا ہوجانے والے مسٹر نہال کی تبدیلیٔ حالات کے اسباب پر بھی نظر رکھتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ ایک خاص فکر کا مالک ہے جس کو ترقی پسند فکر کہہ سکتے ہیں مگر اس کا پابند نہیں ہے۔ اس کے رویے کو زیادہ سے زیادہ ہمدردانہ کہا جاسکتا ہے، مقلدانہ نہیں۔ دوسری طرف وہ عہد حاضر کی پروردہ تہذیب اور کلچر کے بعض پہلوؤں کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بناتا ہے۔ یہاں تک کہ تلاشِ ذات کے مرحلے بھی پیش کرتا ہے مگر یہاں بھی ٹھہرتا نہیں۔

اب ان کی افسانہ نگاری کے دوسرے پہلو یعنی طرز بیان کی طرف بھی دیکھئے۔ یہ بات ماننی ہی پڑے گی کہ ''گنبد کے کبوتر'' یا ''ڈھلان پر رُکے ہوئے قدم'' اور ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' کا جو اسلوب ہے وہ ''بھائی''، ''تفتیش'' یا ''رحمت صاحب'' کا اسلوب نہیں ہے۔ ''مرشد'' یا ''چیخیں'' میں چند جملوں، سوالوں یا حادثوں کی مدد سے جو پراسرار فضا پیدا کی گئی ہے وہ بھی اول تو افسانہ نگار کے مزاج کا حصہ نہیں ہے، دوسرے اس کے پیغام کی ترسیل میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس لیے افسانہ نگار کا یہ دعویٰ تو درست ہے کہ وہ سکّہ بند فنکار نہیں ہے اور نہ ہی کسی حلقے سے وابستہ ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اس نے حسب ضرورت ہر روایت اور رجحان سے استفادہ کیا ہے اور اس کا بھی اقرار ہیں کرنا چاہتا۔

گویا بات یہ ٹھہری کہ وہ سوفی صد انام جذبوں کے حصار میں نہیں ہے۔ دوسروں سے بالکل مختلف بھی نہیں ہے۔ روایت سے گریزاں یا ہراساں بھی نہیں ہے۔ حال سے نالاں بھی نہیں ہے۔ بس یہ کہ کسی کا پابند نہیں ہے۔ البتہ ایک صفت ایسی ہے جو اس کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے اور وہ بامعنی احتجاج سے اس کی قربت ہے۔ میں نے بامعنی کی شرط اس لیے لگادی کہ بقول دشینت کمار ؎

صرف ہنگامہ کھڑا کرنا مرا مقصد نہیں　　میری کوشش ہے کہ یہ صورت بدلنی چاہئے

شوکت حیات بھی اکثر کہانیوں میں اسی نظریے کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی مارکسیت کو اعتدال کی قبائیں پہناتے ہیں۔ احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر مصلحتوں کے شکار نہیں ہوتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ اپنے کو جو بھی نام دیں لیکن دراصل وہ ایک آزاد منش انسان ہیں جو قدیم وجدید کی درمیانی منزل پر ردّ وقبول کے جذبوں سے معمور آزادانہ لکھ رہا ہے۔ اس کی یہ آزاد خیالی بے راہ روی نہیں ہے نہ یک طرفہ آگہی ہے۔

افسانے کے بارے میں ویسے بھی یہ بات مشہور ہے کہ ہر کہانی اپنا اسلوب خود وضع کر لیتی ہے۔شوکت حیات کے متنوع موضوعات کو الگ الگ اسالیب میں دیکھ کر اس بات کی صداقت مان لینی پڑتی ہے۔

آخر میں شوکت حیات کی افسانہ نگاری کا یہ جائزہ جس سوال پر ختم کرنا چاہتی ہوں وہ اظہار افسوس اور ندامت کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے لیے ایک دعوت بھی ہے۔خود افسانہ نگار نے اور دوسروں نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کے افسانوں کی مجموعی تعداد پچاس کے قریب ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان کے افسانوی مجموعے میں تو صرف پچیس کہانیاں ہیں۔باقی افسانے کہاں ہیں؟ کیا ان کی تلاش اور اشاعت ان کے ہم عصروں سے زیادہ ان نئی نسل کے فنکاروں پر قرض نہیں ہے جو ہمہ دم تیشہ بدست رہتے ہیں؟ مگر کیا میں بھی اس نئی نسل کا حصہ نہیں ہوں؟؟

◄◄ ● ►►

H.O.D URDU
Maulana Mazharul Haque
Arabic & Persian University,Patna
Email: zarnigaryasmeen@gmail.com
Mob: 9835662098

ادب اور زندگی کی صحت مند قدروں کا ترجمان

ایک رسالہ.....ایک تحریک

سہ ماہی

''اندیشہ''

کی تجدید اشاعت عنقریب

مدیر :ڈاکٹر ارشد رضا

رابطہ:''اندیشہ''۳۔بھیکن پور،اسلام نگر بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱(بہار)

موبائل۔ Email. : razaa8445@gmail.com9471627786

● **ڈاکٹر وصیہ عرفانہ**

شوکت حیات:اردو افسانے کا سنگ میل

بیسویں صدی کے آغاز میں مختصر افسانے کے نین ونقش ابھر رہے تھے۔یہ وہ عہد تھا جب مختصر افسانہ رومانی حکایات اور خواب آگیں فضا کے سایے میں اپنی صنفی پہچان قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں دو متوازی لہریں جاری وساری نظر آتی ہیں۔سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے کو رومانی لہجہ عطا کیا تو منشی پریم چند نے سماجی صداقتوں اور دیگر معاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ترقی پسند تحریک نے حقیقت پسندی اور سماجی صداقت نگاری کے اسی رجحان کو تقویت بخشی۔یہ زمانہ عالمی سطح پر تغیر وتبدل کا تھا۔زندگی تلخ حقائق سے روبرو ہو رہی تھی۔لہٰذا ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب میں در آنے والی حقیقت نگاری کو قاری کی جانب سے بھرپور پذیرائی ملی۔افسانے کی سطح پر بات کی جائے تو بے شمار افسانے اس عہد کی یادگار اور ارتقائے تاریخ کا اہم حصہ بنے۔لیکن ہر تحریک ورجحان کی طرح یہاں بھی افراط وتفریط نے جگہ بنالی۔رفتہ رفتہ مختصر افسانے میں خارجیت پسندی کا تناسب بڑھتا گیا اور افسانہ سپاٹ بیانیہ کی شکل میں مختلف افکار و نظریات کا پروپیگنڈہ بن کر رہ گیا۔آزادی کے حصول اور اس کے حوصلہ شکن نتائج نے فرد کو داخلیت پسند بنا دیا تھا۔ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔لہٰذا سیدھی سادی حقیقت نگاری اور سپاٹ بیانیہ کو یکسر رد کرتے ہوئے ادیبوں کی نئی نسل نے کہانی کو جدیدیت اور تجریدیت کے ذائقے سے روشناس کرایا۔مختصر افسانے میں موضوعاتی،ہیئتی ،اسلوبیاتی اور تکنیکی سطح پر گوناگوں تجربات ہونے لگے۔اشاروں ،کنایوں،استعاروں اور علامتوں کے وسیلے سے کہانی بیان کرنا افسانوی فن کا منتہا ٹھہرا۔لیکن نت نئے تجربات نے رفتہ رفتہ افسانے سے کہانی پن کو ختم کر دیا اور بے چہرگی کرداروں کا وصف قرار پایا۔افسانہ محض کنایوں اور علامتوں کا پشتارہ بن کر رہ گیا جن کی گرہ کشائی میں قاری کو پسینے آنے لگے اور کہانی لطف اندوزی کا ذریعہ نہ رہ کر ذہنی ورزش کا استعارہ بن گئی۔نتیجتاً ادب اور قاری کے درمیان ترسیل کی ناکامی کا المیہ پیدا ہو گیا۔

۱۹۷۰ء کا وہ عہد،جب ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں اپنے وجود کی بقا کی جنگ پر آمادہ تھیں،شوکت حیات نے 'باشعور طریقے سے افسانے کی تاریخ کے تسلسل میں رہتے ہوئے تخلیقی سطح پر لکھنا شروع کیا۔شوکت حیات نے ترقی پسندوں کی کھردری خارجیت اور جدیدیوں کی شدید داخلیت کے بین

بین ایک نئی، متوازن اور صحت مند راہ اپنائی۔ انہوں نے سپاٹ بیانیہ سے بھی پرہیز کیا اور کہانی میں کہانی پن کے بنیادی عنصر کی بھی بازیافت کی۔ انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ علم و آگہی نے انسانی ذہن کو زیادہ حساس، باریک بیں، فعال اور زرخیز بنا دیا ہے۔ معاشرتی مسابقت، افراط زر، سیاسی ہتھکنڈوں، مذہبی و تہذیبی رشتوں، قومی و بین الاقوامی تبدیلیوں نے انسان اور انسانی رشتوں کو بیش از پیش متاثر کیا ہے۔ ایک مکمل مشینی نظام ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کو ظاہری و باطنی طور پر ہر لحظہ متاثر کر رہا ہے۔ آج مسائل کی نوعیت پہلے سے زیادہ گنجلک ہو چکی ہے۔ ایسی صورت حال میں آج کا قاری نہ تو سیدھی سادی حقیقت بیانی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور نہ ہی پُر پیچ علائم و ابہام سے کیف کشید کر سکتا ہے۔ لہٰذا، شوکت حیات نے زندگی اور اس کے نشیب و فراز کو سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کیا۔ یہ الگ سی بات ہے کہ ان کے یہاں معانی کی پرتیں اکہری نہیں ہیں بلکہ ان کے افسانوں میں ذوق قصہ گوئی کی تسکین کے ساتھ ساتھ اہلِ بصیرت اور صاحب شعور کے لئے دعوت غور و فکر کا ایک بسیط جہان بھی آباد ملتا ہے۔ شوکت حیات نے شعوری طور پر اپنے افسانوی پیشکش میں اس امر کا ہر لحظہ خیال رکھا کہ ان کے افسانے اور قاری کے درمیان ترسیل کا رشتہ قائم رہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں قاری کو اپنے مسائل، اپنی فکر، اپنی خوشیوں، اپنی ترجیحات، اپنی الجھنوں، اپنا خوف، اپنے اندیشوں سے قدرے واضح، قدرے مبہم انداز میں روبرو کرایا۔ انہوں نے زندگی سے فرار یا گریز کی راہ اختیار کرنے کی بجائے زندگی سے متصادم ہونے کو مقدم جانا اور عرفان ذات کی ابدی جستجو کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔

شوکت حیات نے انسان کے باطن کی بیکرانی کو دراصل اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے انسان کے اندرونی اضطراب کو اپنے افسانوں کے حوالے سے پیش کیا۔ اس اضطراب کی بے شمار وجوہات تھیں۔ یہ رشتوں کی شکستگی کی وجہ سے ہو یا محبتوں کی صارفیت کی وجہ سے، سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے ہو یا معاشرتی کشاکش کی وجہ سے، اجتماعی نظام اس کا سبب ہو یا انفرادی گھٹن اس کی وجہ۔ مختلف اور متنوع اسباب یا حالات کی وجہ سے انسان کا باطن جن کیفیات کا اسیر ہوتا ہے، ان کو متشکل کرنا شوکت حیات کا امتیازی وصف ہے۔ ان کی ابتدائی کہانیوں میں عصری علامتی رنگ گہرا رہا، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی الگ راہ خود متعین کر لی۔ بقول وارث علوی:

> ''شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔''

اپنے فکری و فنی رویئے کے متعلق خود شوکت حیات رقمطراز ہیں:

> ''میرے افسانے اس تناظر میں دیکھے جائیں کہ یہ وہ نئے جدید اور مابعد جدید افسانے ہیں جو دراصل نامیاتی اور امکانی ہیں اور انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں۔ ان افسانوں میں آج کے عہد اور آج کے انسان، اس کے مسائل کو نئے ڈھنگ، لہجے، تکنیک، ٹریٹمنٹ، موضوع، فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

یہ واقعہ ہے کہ شوکت حیات کے افسانوں کا فکری محور انسان ہے۔ وہ فرد کے داخلی اور خارجی بحران کا مطالعہ اس کے سماجی منسلکات کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض کرداروں کے توسط سے سماج کے کھوکھلے نظام اور دوغلے رویوں کے خلاف پرزور آواز احتجاج بلند کی ہے۔ اخلاقی و جذباتی بحران، سماجی و سیاسی ظلم و جبر، مسابقتی عہد میں زندگی کی بے مقصدیت اور بے معنویت، عالمی دہشت گردی کے نتیجے میں پنپنے والی بے یقینی اور بے نام خوف، طبقاتی استحصال کے منطقی نتائج وغیرہ کو انہوں اپنے افسانوں کے وسیلے سے پیش کیا ہے اور ان تمام مراحل میں تخلیقی ضبط کے دامن کو خوش اسلوبی سے تھامے رکھنا ان کا فنی امتیاز ہے۔ شوکت حیات کی فکری اور فنی رچاؤ کے متعلق وہاب اشرفی کا یہ خیال درست ہے:

> ''وہ پختہ ذہن فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح متوازن بھی ہوتا ہے.....اب جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقعہ کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتاسر بڑھا دیتی ہے....ایک انقلابی ذہن میں کیسی کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔ اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔''

شوکت حیات نے ۷۰ء کی دہائی سے افسانہ نگاری کی ابتدا کی اور اب تک سو سے زائد افسانے معتبر و موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ تقریباً چالیس سالہ افسانوی سفر کے دوران مجموعہ شائع نہ کرانے کا سبب خواہ جو بھی ہو لیکن ابرار رحمانی کے لفظوں میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ..... کتاب گردی کے اس دور میں بھی شوکت حیات کا اس طرف دھیان نہ دینا ان کے جینوئن فنکار ہونے پر دال ہے۔ 'گنبد کے کبوتر' ان کی پچیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں میں سے بہترین، اوسط یا کمزور کہانیوں کی درجہ بندی مشکل ہے، کیونکہ ہر افسانہ زندگی کے

نئے افق، معاشرے کے نئے پہلو کو پیش کر رہا ہے۔کوئی افسانہ کردار کا افسانہ ہے تو کوئی واقعات کا، کوئی احساس کے پیچ وخم کھول رہا ہے تو کوئی تاریخی لمحے کی خطا کو گرفت میں لے رہا ہے، کہیں عشق کا ترفع ہے تو کہیں دبی کچلی نفرت کا ترشح۔ ہر افسانے کی قرأت ایک جہان دگر کی سیر کراتی ہے۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'کوبڑ' ہے۔کوبڑ علامت ہے مجبوری، بے کسی، بدصورتی، کم مائیگی اور بے چارگی کی۔افسانے کے مرکزی کردار واحد غائب کو بغیر رزرویشن کے بذریعہ ٹرین دلی جانا پڑتا ہے تاکہ اگلے دن جب اس کا چھوٹا بھائی ہوائی جہاز سے دلی پہنچ جائے، تو وہ اسے امریکہ کے لئے سی آف کر سکے۔ایرپورٹ پہنچنے تک اس کی جیب بھی کٹ چکی ہے اور وہ اپنی واحد قیمتی چیز گھڑی بھی لٹا چکا ہے۔اس کا بھائی اپنے امریکن دوستوں کے لئے ہزاروں کے تحائف خریدتا ہے اور اس کے پاس دلی سے پٹنہ واپسی کا کرایہ بھی نہیں ہے۔یہ افسانہ دراصل کردار پر مبنی افسانہ ہے۔چھوٹے موٹے واقعات اور سیدھے سادے مکالمات کے ذریعے مرکزی کردار کی شخصیت اور نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔کردار نگاری کے توسط سے ہی کردار کی زندگی، اس کے حالات اور کہانی کا پس منظر واضح ہوا ہے۔

(۱) وہ محنت کش، ذمہ دار اور بامروت ہے۔شادی کے ہنگاموں میں اسے سونے تک کی مہلت نہیں ہے۔گھر کے تمام افراد کو ایرپورٹ پہنچانے کا اہتمام کرنا ہے۔لیکن اماں کے اچانک دلی جانے کے حکم پر بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچتا ہے ورنہ ذرا سی تاخیر سے ٹرین چھوٹ جاتی۔

(۲) وہ کمزور صحت کا ناتواں شخص ہے۔وہ حالات سے مزاحمت کرنے کی قوت سے محروم ہے لیکن اس نے اپنی کمزوری کو ہی اپنی طاقت بنالیا ہے۔یہ الگ سی بات ہے کہ خود کو بے جان اشیاء میں تبدیل کرنے کے جاں گسل مرحلے سے گذرنا اس کی ذہنی توانائی کا ہی مظہر ہے۔

(۳) بھائی امریکہ میں لاکھوں کماتا ہو لیکن اس کی اپنی آمدنی اور حیثیت نے اس کی خودداری کو مجروح نہیں کیا، البتہ اس کی جانفشانی اور قوت برداشت میں اضافہ کیا ہے۔وہ ٹرین کے ایک کونے میں دبک کر دلی تک کا طویل سفر طے کر سکتا ہے۔

(۴) وہ شریف اور خوددار ہے۔اس لئے تمام اثاثوں کے لٹ جانے کے باوجود اس کی حمیت یہ گوارا نہیں کرتی کہ بظاہر معمولی سی ضرورت کے لئے بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

اس کہانی کے ٹریٹمنٹ میں افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ کہانی کی واقعہ نگاری میں لفظوں کی فضول خرچی کے بغیر قاری کے سامنے حالات وواقعات کی پوری تفصیل منتقل ہو جاتی ہے۔والد کے انتقال کے بعد بڑا بھائی مزدوری ومحنت کشی کے ذریعے اپنی اور اپنے خاندان کی گاڑی کھینچتا ہے۔زندگی نے اسے کبھی بھی

خود کے متعلق سوچنے یا کوئی رنگین خواب دیکھنے کا موقع نہیں دیا۔

محنت کشی نے پیٹھ پر کوبڑ نکال دیا اور حالات کی دھکا مکی نے اسے گٹھری میں تبدیل کر دیا۔عورتوں کے شباب آور جسم سے لطف اندوزی کی بجائے کچلے جانے کا خوف اس کے ذہن میں جاگزیں ہے۔چھوٹا بھائی بہت ہشیار اور دنیادار ہے۔اپنی ہشیاری کی بدولت امریکہ پہنچ چکا ہے۔لیکن بڑے بھائی اور ماں کی زندگی اب بھی کرائے کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں بسر ہو رہی ہے۔چھوٹے بھائی کو اپنی شادی اور اپنی اولاد کی فکر ہے۔اسے بھائی کی عمر بھر کی دوڑ دھوپ اور جدوجہد نظر نہیں آتی، صرف اس کی غیر متاثر کن شخصیت دکھائی دیتی ہے۔اس کی پیٹھ کا خبیث کوبڑ دکھائی دیتا ہے۔اس کوبڑ کو مزید بڑھنا ہے کیونکہ بڑے بھائی کو بے رحم زندگی کے راستے پر سفر کا پہاڑ ڈھونا ہے اور اس کے ساتھ تہی دامنی ہے۔

یہ کہانی رشتوں کی ایثار پسندی اور خودغرضی دونوں کو پیش کرتی ہے۔اس کہانی میں شوکت حیات نے نہایت دل سوزی اور دردمندانہ لاتعلقی سے کرداروں کے نین ونقش ابھارنے کی کوشش کی ہے۔کچھ اس طرح کہ قاری تمام اَن کہے حالات وواقعات سے خود روبرو ہوتا ہے۔روبرو ہونے کا یہ خودساختہ عمل ہی کہانی کی اثرانگیزی کو شدید کرتا ہے۔یہاں پر میں جوگندر پال کے اس خیال سے متفق ہوں:

> ''شوکت حیات کی واضح تر خوبی بھی اس امر میں مضمر ہے کہ اس کی کہانی بھی اپنے پاؤں خود آپ چل چل کے عین اختتامیہ پر آ پہنچتی ہے۔مانو کہانی نے اپنے آپ کو عین بہ عین پورا کر دیا ہو، اب جو کہنا سننا ہے قاری آپ ہی سمجھ سمجھا لے۔''

'گھونسلہ' بے نشان منزل کا المیہ ہے۔ایک گم کردہ منزل کی باطنی کیفیات کا بیان ہے۔عرصۂ دراز کے بعد صعوبتوں بھرے سفر سے نجات حاصل کر کے اپنے گھونسلے کے قریب پہنچ کر نامراد رہنے والے پرندے کی داستان ہے۔درپردہ یہ جدید صنعتی تہذیب اور قدیم روایتی تہذیب کے تصادم کا افسانہ ہے جس میں بالآخر روایتی تہذیب کی شکست اور جدید تہذیب کی فتح ہوتی ہے۔لیکن یہاں پر المیہ یہ ہے کہ جدید تہذیب اپنے جلو میں مردنی، بے حسی، بے سمتی اور لاتعلقی کے عذاب بھی لے کر آئی ہے۔اس افسانے کو کیفیات اور ان کے اثرات پر مبنی افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔شوکت حیات کے زیادہ تر افسانوں میں ایک قدر مشترک یہ نظر آتی ہے کہ ان کے یہاں واقعات کی ترسیل کے لئے تسلسل آمیز بیانیہ شرط نہیں ہے بلکہ مختلف مناظر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، مختلف استعاروں اور کنایوں کے حوالے سے مختصر اور بظاہر غیر متعلق تبصرے ملتے ہیں لیکن کہانی کے اختتام پر یہ تمام اشیاء مربوط ہو کر قاری کو حالات وواقعات کی تفہیم کی منزل تک پہنچا دیتی ہیں اور معانی کی تمام پرتیں روشن ہو جاتی ہیں۔اس کہانی میں بھی یہی ٹریٹمنٹ نظر آتا ہے۔

'میّت' مقابلے اور مسابقت کی دوڑ میں شامل آدمی کی خودغرضی اور خودنمائی کی کہانی ہے۔ آج کا وہ انسان، جو اچیومنٹ کے لئے کسی حد تک جا سکتا ہے اور جس کے لئے موت کا واقعہ بھی ایک 'موقع' کی حیثیت رکھتا ہے، اس کہانی کا کردار ہے۔

'گنبد کے کبوتر' کا شمار شوکت حیات کے نمائندہ افسانوں میں ہی نہیں بلکہ اردو کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ بابری مسجد انہدام کے پس منظر میں بہت سے افسانے لکھے گئے لیکن جو اثر انگیزی اور اس کے نتیجے میں جو مقبولیت 'گنبد کے کبوتر' کو حاصل ہوئی وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ واقعات تو جو بھی ہیں، سب کے سامنے ہیں لیکن شوکت حیات نے اپنے ٹریٹمنٹ، جاندار کرداروں، بامعنی محاوروں اور یاس انگیز فضا آفرینی کے ذریعے اس کہانی کو ایک یادگار مرقع بنا دیا ہے۔ 'گنبد کے کبوتر' کے سلسلے میں ادیبوں اور ناقدوں کی یہ مشترکہ رائے ہے کہ بابری مسجد سانحے پر اردو ادب میں اور کچھ بھی نہ لکھا جائے تو اکیلی یہ کہانی کافی ہے۔ بابری مسجد انہدام کے پس منظر میں اس افسانے کے عنوان کی معنویت پر وارث علوی لکھتے ہیں:

> ''گنبد جب تک تھا، علامت تھا ہماری تاریخ تہذیب اور مذہب کی۔ اب نہیں رہا تو ایسا روحانی خلا پیدا ہو چکا ہے جس کی ماہیت کا بھی ہمیں شعور نہیں۔ اس خلا میں ان کبوتروں کے پروں کی پھر پھڑاہٹ کی آواز گونجتی ہے جو گنبد کے نہ ہونے سے بے سہارا ہو گئے ہیں۔ کبوتروں سے قطع نظر آدمی کا بے سہارا پن ایسے دور دراز اندیشوں کو جنم دیتا ہے کہ وقت کے بہاؤ میں اس کی شکستہ کشتی کو کوئی کنارہ مل سکے گا یا نہیں۔ یا پھر یہ ہولناک انجام کا آغاز ہے۔''

اقلیتی طبقے کا یہی احساس بے یقینی اور حالات کے نئے آغاز کا اندیشہ پورے افسانے میں روح کی طرح جاری و ساری ہے۔ بات صرف ایک گنبد کے ٹوٹ جانے کی نہیں ہے بلکہ مشترکہ تہذیب کی عمارت میں دراڑ پڑی ہے۔ بھائی چارے اور مذہبی رواداری کے خاتمے کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ جو ایک بے نام اندیشہ بابری مسجد کے انہدام کی شروعات کے ساتھ اقلیتی طبقے کے شعور میں جاگزیں ہوا، وہ آج بیش از پیش قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار واحد متکلم اقلیتی طبقے کا استعارہ ہے۔

معاشرے کا سب سے زیادہ قناعت پسند اور امن پسند حصہ۔ یہ قناعت پسندی اس کی جبلت بھی ہے اور اس کی مجبوری بھی۔ اقلیتی طبقہ اس تلخ حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ جو مٹھی بھر راحت اس کے حصے میں آئی ہے اسی پر قناعت کر امن و سکون کی زندگی جینا ہے۔ 'بالکونی' استعارہ ہے آزادی کے اس احساس کا جس میں پھولوں کی تازگی و شادابی اور چڑیوں کی چہچہاہٹیں ہیں۔ واحد متکلم کا اپنی بالکونی، اپنے پودوں اور

گملوں کے تحفظ کے لیے بے چین ہونا اپنی آزادی کی بقا کے لئے بے چین ہونا ہے۔ ایک طبقے کے لئے گنبد تحفظ اور بقا کی علامت ہے تو دوسرے طبقے کے لئے لذت کشید کرنے کی۔ گنبد کی مسماری کے نتیجے میں بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول دراصل اقلیتی طبقے کا وہ کمزور کردار ہے جو بے امانی جھیل رہا ہے۔ جس کی آنکھوں میں اترتا خون دراصل بے چارگی اور کچھ کر گذرنے کی تڑپتی آرزو ہے۔ اپارٹمنٹ میں نظر آنے والا سانپ مذہبی شدت پسندوں کی زہرناکیوں کی علامت ہے۔ واحد متکلم کو سانپ کے ڈسے جانے کا خوف نہیں ہے بلکہ اسے اندیشہ ہے کہ گلہری اور چڑیوں کا جھنڈ یعنی احساس آزادی نہ متوحش ہو جائے۔ رنگ برنگے پھولوں، گملوں، گلہری اور گوریوں سے جو تہذیبی کولاژ بنتا ہے، کہیں اس پر نہ سیاہ بادل منڈلانے لگیں۔ بے آسرا ہونے کا احساس، اس پر مستزاد پڑوسی کی تسلیاں اسے ایک عجیب جذباتی شکستگی سے دوچار کرتی ہیں۔

> ''تم ینگ مین..... پازیٹو ہو کر سوچو تو ہر جگہ ٹھکانہ ہی ٹھکانہ ہے..... گنبد، پہاڑوں کی سفاک چوٹیاں، پتھریلے غار اور گھنے جنگل کے درختوں کی ڈالیاں..... موسموں کے سرد و گرم جھیلنے کے لئے تیار رہو..... یار..... یار، اپنی کھال تھوڑی کھری کھری بناؤ۔''

پوری کہانی میں خارجی و باطنی دونوں سطح پر تناؤ کی کیفیت ہے جسے علامتوں کے توسط سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسٹر تھامسن کے کچن میں کبوتر کا گھس آنا، بلّی کا جھپٹنا، بوڑھے ہاتھوں کی سنسناہٹ دور کرنے کے لئے کبوتر کا خون کرنا، بالکونی کا منتشر حال زار پھولوں و گملوں کی بربادی، پرندوں کی موت، بچوں کا سانپ سے کھیلنے کا خطرناک عمل اور ان کا زہریلا پن گویا کہانی کا ہر منظر علامتی پیرائے میں وسیع پس منظر رکھتا ہے۔ آغاز سے انجام تک یہ کہانی علامتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن معانی کی تفہیم و ترسیل میں کوئی ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے۔ اس افسانے کا شمار شوکت حیات کے ان افسانوں میں کیا جا سکتا ہے جن کا حسن اور معنویت اجاگر کرنے کے لئے بقول وارث علوی جز رس مطالعے اور تجزیے کی ضرورت ہے۔ یہ افسانہ ختم ہو کر بھی ختم نہیں ہوتا اور قاری کا ذہن یاس انگیز تاثر میں ڈوبا انگنت سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ بلاشبہ، یہ افسانہ تہذیبی تاریخ کے ایک المناک عہد کا شناخت نامہ ہے۔

'اپنا گوشت' ایک مختصر اور سیدھی سادی کہانی ہے۔ یہ رشتوں کی ٹوٹتی قدروں اور پامال اخلاقی قدروں کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے مرکزی کردار بڑے ابو والد کی موت کے بعد بھائی بہنوں کی ذمہ داریوں کو ادا کرتے کرتے اپنی بڑھتی عمر اور اس کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی شادی نہ ہونے کو جواز بنا کر ان کی جائداد بھی دیگر بھائی بہن آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ اب وہ

گھر والوں کے لیے ایک عضو معطل ہیں جن سے گھر کا ماحول بگڑنے کا اندیشہ باقی بھائی بہنوں کو ستانے لگتا ہے۔شکستہ جذبات سے دوچار ہوکر بڑے ابو گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ایک دن انتہائی کسمپرسی کی حالت میں دنیا بھی چھوڑ جاتے ہیں لیکن گھر کے معمولات میں انکی موت کی خبر کوئی رخنہ نہیں ڈالتی۔دنیاوی آسائشات کو ترجیح دینے والے خود غرض رشتوں کی یہ کہانی معاشرے کی بے حسی پر ایک تازیانہ محسوس ہوتی ہے۔

'رانی باغ' شوکت حیات کے ایک مختلف انداز تحریر کا شاہکار ہے۔یہ وسیع کینوس میں لکھا گیا ایک رومانی افسانہ ہے جس میں محبت آب حیات کی صورت نظر آئی ہے۔کہانی کی ابتدا خاک اور خمیر کی نسبت کے نکتے سے ہوتی ہے اور ایک وسیع پس منظر تخلیق کرتی ہوئی ذہن کو مبہوت کرتی جاتی ہے۔رحمت صاحب مہلک مرض میں مبتلا ہونے کے بعد اپنے بیٹوں سے وطن لوٹنے کی ضد کرتے ہیں تاکہ خاک اپنے خمیر کے پاس پہنچ جائے۔دراصل اس ضد کے پس پشت عنفوان شباب کی ایک گم صم سی تمنا ہلکورے لے رہی تھی۔لڑکپن اور جوانی کی سرحدوں والی عمر میں آزاد باغ میں کھیل کے دوران رانی کے نسائی لمس نے دونوں کو نئے اور انوکھے احساسات و کیفیات سے آشنا ہی نہیں کرایا بلکہ شام کی پراسراریت نے جذبوں کی ساری مسافت طے کرادی تھی۔رحمت صاحب ساری عمر انہیں لمحات کے اسیر رہے اور زندگی کے تمام شکستہ مراحل میں انہوں نے یادوں کے اسی گہوارے میں جا کر سکون حاصل کیا۔اپنے گاؤں واپس آنے پر ان کی ملاقات رانی سے ہوتی ہے جو اب ودھوا ہو چکی ہے۔رانی سے ملنے پر انکشاف ہوتا ہے کہ انہیں جاں گسل لمحات نے اس کے قلب پر بھی عشق کی وحی نازل کی تھی اور اس کی عمر بھی اب تک اسی پراسرار شام میں جھاڑیوں تلے ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔پیار کے دونوں البیلے پنچھی باغ میں بیٹھ کر ماضی کے خوبصورت لمحات پر یادوں کا پانی چھڑکتے ہیں اور جذبوں کی تازہ کاری کا عمل انجام دیتے ہیں۔اسی باغ میں پناہ گزیں ایک انقلابی گروہ کو اس بوڑھے جوڑے کی دلچسپ اور دلربا ادائیں متاثر کرتی ہیں اور اس گروہ کے نوجوان ان کی پذیرائی کرتے ہیں۔رحمت صاحب انقلابی سرگرمیوں میں اپنی جانب سے ایندھن کا حصہ ڈالنے کے لیے اپنی جائداد گروہ کو سونپ دیتے ہیں۔رحمت صاحب اور رانی کی رفاقتوں کے درمیان اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور وہ دونوں البیلے پنچھی بن کر ایک دوسرے کے لیے سکون کا گہوارہ بن گئے۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے رومان کے الوہی کیف کو احساسات کی تمام گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔انہوں نے اس حقیقت کا ادراک کرایا ہے کہ عشق تمام حد بندیوں سے،خواہ وہ مذہب اور ذات پات کی ہوں یا عمر کی،ماورٰی ہے۔شوکت حیات نے قاری کو نئے اسرار و رموز سے آشنا کرایا ہے کہ عشق عہد شباب کا مرہون منت نہیں بلکہ خود شباب آور ہے۔لمس اگر عشق کا زائیدہ ہو تو ذہنوں میں تقدس جگاتا

ہے۔نوجوانی کے عشق میں اگر بلا خیزی ہوتی ہے تو ڈھلتی عمر میں عشق رگ و پے میں پیوست ہو کر سانس کی سرگم میں شامل ہو جاتا ہے۔'رانی باغ' کی پوری افسانوی فضا عشق کی شعلگی کی تاثیر سے جگمگا رہی ہے۔اس افسانے میں شوکت حیات کے فنکارانہ برتاؤ کا کمال یہ ہے کہ قاری کی روح بھی بالیدگی کی اسی منزل پر پہنچ جاتی ہے،جہاں ان اسیرانِ عشق کے لمس کا ارتعاش محسوس کیا جا سکے۔

'مادھو' پریم چند کے افسانے ''کفن'' کا سیکوئل ہے۔کفن کی کہانی جہاں ختم ہوتی ہے،وہی مادھو کا نقطۂ آغاز ہے۔پریم چند نے اپنے افسانے میں گھیسو،مادھو اور بدھیا کی کہانی کو حقیقت نگاری کی سطح پر پیش کیا تھا لیکن شوکت حیات نے ان کرداروں کے باطن کا سفر کیا ہے،ان کے عمل و فعل کا تحلیل و تجزیہ کیا ہے اور معانی کی زیریں پرتوں کو اجاگر کیا ہے۔جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ مادھو اور آج کے مادھو کے شخصی امتیازات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ابتدا سے ہی پریم چند کے رنگ میں تحریر کی جانے والی یہ کہانی اچانک انجام کے قریب پہنچ کر قاری کو ایک نئے تناظر میں کہانی کی قرأت کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔دراصل یہی شوکت حیات کا فنی امتیاز ہے۔مادھو کو انہوں نے صدیوں سے دبے کچلے طبقے کے فرد کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جو معاشرے کے تسلیم شدہ نظام اور اس کے آلہ کاروں کو اپنے ہی جیسے ایک مظلوم کردار جلیل نداف کی مدد سے شکست یاب کرتا ہے۔کتوں کے بھونکنے کی آواز،نگاڑوں کی آوازیں،مغرب کی اذان کی آواز،مادھو کی پراسرار مسکراہٹ اور اس کا جنگل کی طرف کوچ کر جانا..... یہ ساری غیر مربوط تصویریں قاری کی سوچ کو گذشتہ دہائیوں کی سیاسی،سماجی،معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں کی جانب منتقل کر دیتی ہیں۔

'مرشد' میں افسانہ نگار نے نہایت دلکش پیرایے میں انسانی نفسیات کا تجزیہ پیش کیا ہے اور اس نکتے کی اثر انگیزی کو متشکل کیا ہے کہ زندگی پر موت کی پرچھائیں بے داغ زندگی کی ضامن بن جاتی ہے۔افسانہ دراصل اشاریت کا فن ہے۔اس لئے افسانے میں جتنی باتیں کہہ دی جاتی،اس سے زیادہ معانی ان کہی کے ذریعے واضح ہوتی ہیں۔مذکورہ افسانے میں سوالی کے ذریعے اٹھانے والے سوال کی بہ نسبت مرشد کی کیفیات اور تاثرات زیادہ معنی خیز ہیں جنہیں ابھار کر شوکت حیات نے اپنی بے پناہ خلاقانہ صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔مرشد سے سوالی کا یہ سوال.....''اپنی بے داغ اور پاک و صاف زندگی کا راز بتانے کی مہربانی کریں''.....مرشد کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوتا ہے۔کیفیتوں کا ایک متلاطم دریا ان کے اندر موجزن ہو جاتا ہے،عرفان ذات کی منزل ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور ان کا باطن ان کے ظاہری بزرگانہ شان و شکوہ کو جھنجھوڑنے لگتا ہے۔ماہیئت قلب کے لئے صدیاں درکار نہیں ہوتیں۔ایک لمحہ،ایک اشارہ،ندامت کا ایک آنسو وجود کے باطنی تعفن کو دھو ڈالتا ہے۔مرشد سوالی سے جواب کے لیے مہلت طلب کرتے ہیں۔ایک خاطر خواہ

مدت کے بعد مرشد رحمت خداوندی کے طفیل خود کو جواب دینے کے لائق سمجھتے ہوئے سوالی کو تشفی بخش جواب دیتے ہیں۔ جواب سوالی کی سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن مرشد کے آبدیدہ ہونے کا سبب وہ نہیں سمجھ پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ستار العیوب کے شکرانے کا اظہار بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ شوکت حیات کے اسی فکری وفنی رویئے کے پیش نظر شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

''دوسری باتوں کے علاوہ ان کے یہاں جو خاص بات مجھے نظر آئی ہے وہ یہ کہ ان کی کہانیاں صرف سماجی شعور کا ہی پتہ نہیں دیتیں بلکہ ان کے یہاں 'سماجی ضمیر' کو پوری گہرائی کے ساتھ گرفت میں لینے کا رجحان بھی ملتا ہے۔''

'سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ' فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ مرکزی کردار عبدالمنان مزدور طبقے کا ایک فرد ہے جو ہمہ وقت انقلاب کی باتیں کرتا ہے۔ سوویت یونین کے انہدام نے بھی اس کی انقلابی توانائی کو متاثر نہیں کیا ہے لیکن اس کی معاشی مجبوریاں اور اس کی گھریلو ذمہ داریاں اسے اضطراب میں مبتلا کرنے لگتی ہیں۔ اس کے بیوی بچے دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ اس کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اس کا دوست کہانی کا راوی اس کے لئے قرض کا بندوبست کرا دیتا ہے۔ قرض کی فراہمی کے بعد یوں لگتا ہے کہ اس کے سارے دکھ دور ہو گئے۔ وہ اپنی فیملی کے لئے تحائف خریدتا ہے اور دوست کے ساتھ ہوٹل میں بہترین کھانا کھاتا ہے۔ رزرویشن کرانے اور چھٹی کی درخواست دینے کے بعد وہ راوی کے ساتھ بوٹینیکل گارڈن جاتا ہے جہاں پہلے وہ کبھی بیوی بچوں کے ساتھ گیا تھا۔ وہ قدم قدم پر بیوی بچوں کو یاد کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ خود سانپوں سے ڈرتا ہے لیکن اس کے بچے سانپوں سے نہیں ڈرتے۔ اس کے لئے یہ تصور اطمینان بخش ہے کہ مستقبل میں بچوں کے لئے سانپ مسئلہ نہیں رہیں گے۔ گارڈن میں گھومنے کے دوران انہیں ایک سراسیمگی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے اور گیٹ مین انہیں بتاتا ہے کہ شہر میں کشیدگی کی کیفیت ہے۔ دونوں دوست کسی طرح اپنے علاقے میں پہنچ جاتے ہیں۔ خوف و دہشت کا ایک نادیدہ احساس پوری فضا پر حاوی تھا۔ راوی کے نہ چاہنے کے باوجود عبدالمنان اپنے بیوی بچوں کے علاقے کی جانب روانہ ہو جاتا ہے، جہاں انسانی اجسام پھول گوبھیوں میں تبدیل کئے جا رہے تھے۔ عبدالمنان سے راوی کی وہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے کانپتے ہاتھ اور خوف سے زرد چہرہ راوی کی یادداشت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

کہانی کا آخری حصہ شوکت حیات کے مخصوص فنی رویئے اور ان کے تخیلی اڑان کا اصل مظہر ہے۔ راوی کو یہ یقین ہے کہ عبدالمنان کا سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ یقیناً زندہ بچ گیا ہوگا۔ راوی کے چشم

تصور میں وہ بچہ جوان ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھیار ہے اور دور کہیں دھماکوں کے درمیان اونچی اونچی بلڈنگوں کے زمین دوز ہونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں جبر واستحصال کا شکار ہونے والی نسل اور میٹروپولیٹن سیٹیز میں سیریل بم دھماکوں کے آپسی ربط کا یہ اشاریہ ہے۔ ایک امن پسند انسان کے لئے دونوں صورت حال تکلیف دہ اور اذیت ناک ہے۔ شوکت حیات نے تمام صورت حال کی اذیت کو نہایت فن کاری کے ساتھ تجسیم کیا ہے۔

'پاؤں' شوکت حیات کی خالص علامتی کہانی ہے۔ جب ذہنی اذیت حد سے تجاوز کر جائے اور روح پر بے شمار مسائل کا بوجھ پڑ جائے تو ایسی تمام اذیتوں کی یکدم نکاسی کے لئے علامتی پیرایہ زیادہ معاون ہوتا ہے۔ یہی کام اس افسانے میں افسانہ نگار نے کیا ہے۔ بے زمینی کا احساس، شناخت کا مسئلہ، بے حسی اور خود غرضی کا عفریت، طبقاتی تفریق کی اذیت، مسائل کا انبوہ، سرحد کی حد بندیاں، ہم وطنوں کی نفرتوں کا سیلاب غرضیکہ ذہنی کشاکش کی ایک طویل داستان ہے جس کا آغاز تقسیم ملک کے المناک سانحے سے ہوا اور آج تک اقلیتی فرقہ اس سے نبرد آزما ہے۔ اپنی وفاداری اور جاں نثاری کے بے شمار ثبوت فراہم کرنے کے باوجود احتجاج کا ایک قابل رحم پیکر بن کر کھڑا ہے:

''..... یہ مٹی میری ہے اس لئے کہ اس کے تخم سے اگا ہوں..... میں اب اور معلق نہیں رہ سکتا..... کھڑا ہونے کے لئے مٹھی بھر زمین میرا ازلی حق ہے۔ پرکھوں نے جو کچھ کیا، شمشانوں اور قبرستانوں میں جل سڑ رہا ہے۔ اگر اس مٹی سے مجھے دستبردار ہونے کا اشارہ بھی کیا تو تم سب کے نرخرے چبا جاؤں گا..... مجھے دکھاؤ وہ بے جان دستاویز..... بتاؤ اس پر کہیں میرا بھی دستخط ہے..... اس دستاویز سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے..... میں صرف اس مٹی کو جانتا ہوں جہاں سے مجھے کوئی نہیں ہٹا سکتا..... میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس مٹی کی گود میں میں نے جنم لیا اور یہ مٹی میری ماں ہے۔''

اس افسانے میں شوکت حیات نے لاکھوں ہندوستانی مسلمانوں کے باطنی کرب کو کمال خوبی سے منعکس کیا ہے۔ برسوں سے فضا میں معلق پاؤں کے نیچے مٹی کے جانے پہچانے لیکن نایافتہ لمس کو محسوس کرانے کی کوشش کی ہے۔

'ڈھلان پر رکے قدم' اسطوری فضا میں بنی گئی ایک علامتی کہانی ہے۔ انسان کی محدود سی حیات میں خواہشات کے لامحدود سلسلے ہیں۔ ہر خواہش کی تکمیل ایک پہاڑ سر کرنے کے مساوی ہوتی ہے۔ ہر پہاڑ

سر کرنے کے بعد انسان امیدوں آرزوؤں کے نئے چراغ روشن کر لیتا ہے۔شاید اب اس کے متحرک وجود کو سکون وسکوت کی راحت نصیب ہو۔زندگی کا سفر یونہی رواں دواں رہتا ہے۔راستے کی مشکلات قدم تھامتی ہیں۔انسان کے وجود کو دیدہ اور نادیدہ زخم دیتی ہیں۔لیکن امید...خوش رنگ امید اس کے دریدہ حوصلوں کو تازہ دم بھی کرتی رہتی ہے۔یہ عجیب بات ہے کہ سکون وسکوت کی منزل انسان کی جبلی بے اطمینانی کے باعث پھر سے متحرک ہونے کا جواز پیدا کر دیتی ہے۔

اس افسانے کی فلسفیانہ اور غیر مرئی تشریح کے متوازی و مساوی ایک ٹھوس اور زمینی تعبیر بھی سامنے آ سکتی ہے۔اگر کہانی کے تمام مراحل کو تقسیم ملک اور ایک نئے خطے کی تشکیل سے جوڑ کر دیکھا جائے۔تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے پس پشت یہی سراب آسا امید تھی کہ آزادانہ طرزِ حکومت میں سکون وراحت کی وہ منزل ملے گی جس کے خواب بینائی کے پردے پر نقش ہو چکے تھے۔لیکن ان جاں گسل مرحلوں کے جو حوصلہ شکن نتائج سامنے آئے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔اس افسانے کی فضا بندی نے فیض کی نظم ''چلے چلو کہ منزل وہ ابھی نہیں آئی'' کو مجسم کر دیا ہے۔یہ افسانہ شوکت حیات کی تخلیقی توانائی کا مظہر ہے اور جدیدیت کے زائیدہ افسانوں میں ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔

''بھائی'' فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے جس میں انسانی نفسیات کا نہایت ماہرانہ اور فنکارانہ جائزہ لیا گیا ہے۔اس افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح بگڑے ہوئے ماحول میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور ایک دوسرے کی حرکتیں مشتبہ اور مشکوک نظر آتی ہیں۔شوکت حیات کا یہ افسانہ انسانیت کے زوال کے منظر نامے میں اعلیٰ انسانی قدروں پر ٹوٹتے بکھرتے یقین کو از سر نو بحال کرتا ہے۔یہ افسانہ یقین دلاتا ہے کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کہیں اجالے کی کوئی کرن بھی مل جاتی ہے۔

''مسٹر گلیڈ'' خاکہ کی طرز پر لکھا ہوا ایک جذباتی افسانہ ہے۔نہال صاحب ایک شریف، با مروت ایثار پسند اور دوست نواز انسان تھے۔ان کی فطرت کا یہ پہلو قابل ستائش ہے لیکن اہل وعیال کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں تھا۔بد حالی سے تنگ آ کر بیوی بچوں سمیت میکے جا بیٹھتی ہے۔یہ واقعہ ان کے لئے ایک بڑا سانحہ ثابت ہوتا ہے اور بالآخر ان کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔یہ محبتوں کے خمار اور عذاب کی کہانی ہے جسے افسانہ نگار نے نہایت دلسوزی سے بیان کیا ہے۔انسانی رشتوں کی مادہ پرستی اس کی جبلت بھی ہے اور مجبوری بھی کہ بیشتر مسائل کی جڑیں معاش کی کوکھ میں پیوست ہوتی ہیں۔شوکت حیات نہایت باریک بینی سے انسانی نفسیات کو گرفت میں لیتے ہیں۔مذکورہ افسانے میں

انہوں نے وصل یار کے خمار اور ہجر یار کے انتشار....دونوں کیفیتوں کا ماہرانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔

''تفتیش'' فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھی گئی ایک سیکولر کردار کی کہانی ہے جو زندگی کے تئیں مثبت نقطۂ نظر رکھتا ہے لیکن حالات کی آندھی میں اس کے نظریات تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔آفتاب صاحب فرقہ واریت کے زہر کو محبتوں کے تریاق سے ختم کرنا چاہتے ہیں۔بھائی چارگی، رواداری اور اخوت ان کا ایمان ہے۔انہیں اس بات کا یقین ہے کہ مستقل امن انسان کی فطری اور جبلی ضرورت ہے، لہٰذا شر کی مٹھی بھر قوتیں خیر کی قوتوں کو تادیر شکست نہیں دے سکتیں۔آفتاب صاحب کو اپنے اعلیٰ وارفع خیالات ونظریات کے باوجود مخلوط محلے سے ہجرت کر کے اقلیتی محلے میں پناہ گزیں ہونا پڑتا ہے۔

شوکت حیات نے فرقہ وارانہ پس منظر میں متعدد افسانے تحریر کئے ہیں لیکن انہوں نے کہیں بھی خود کو دہرایا نہیں ہے بلکہ فسادات کے مختلف پہلوؤں، مختلف نتائج، مختلف کیفیات اور مختلف اثرات کو الگ الگ پیرایے میں بیان کیا ہے۔شوکت حیات کا کمال یہ ہے کہ مختلف اور متنوع پہلوؤں کی پیشکش میں کہیں بھی ان کا تخلیقی شعور مجروح نہیں ہوا ہے۔واقعات کی پیشکش کے دوران تخلیقی ضبط کا دامن انہوں نے مضبوطی سے تھامے رکھا ہے۔دراصل یہی فنکارانہ ضبط ان کی شناخت ہے۔شوکت حیات کے فکر وفن کے تجزیئے کے ذیل میں گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

> ''شوکت حیات ہمارے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں.....وہ اپنے افسانوں میں ادبیت اور سماجی احساس و شعور دونوں پر اصرار کرتے ہیں۔وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے طے شدہ نتائج اور سیاہ وسفید میں بٹے ہوئے افسانے کی روایت سے گریز کرتے ہوئے سچائی کی تلاش اپنے طور پر جاری رکھی اور نئی کہانی کا رشتہ نئی سماجی حقیقتوں سے جوڑا۔''

''سرخ اپارٹمنٹ'' مزدوروں کی مارکسوادی تحریک کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے جس میں انقلاب کی ظاہری صورت اور اندرونی کرب کو نمایاں کیا گیا ہے۔کوئی بھی تحریک یا انقلاب حالات کے افراط وتفریط کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔یہ تحریک یا انقلاب جدوجہد زندگی کا حصہ بنتا ہوا کبھی فتح یاب ہوتا ہے تو کبھی چند گام چل کر ہی بے سمتی اس کا مقدر بنتی ہے۔انقلابی عمارت کی تعمیر فرد کی جانفشانیوں اور قربانیوں کے مٹی گارے سے ہوتی ہے۔اجتماعی مفاد اور انفرادی لاغرضی جس انسان کی اولین ترجیح ہوگی، وہی اس عمارت کے لئے نیو کی اینٹ ثابت ہو سکتا ہے۔لیکن ایسے لوگوں کی تعداد مٹھی بھر ہوتی ہے۔بیشتر افراد جانکاہی کے اس عمل سے برگشتہ ہو کر اپنی زندگی کا چلن درست کرنے لگتے ہیں۔ایسی صورت حال

میں انقلابی عمارت کی بنیاد لرزنے لگتی ہے اور بالآخر وہ زمین بوس ہو جاتی ہے۔شوکت حیات نے اس افسانے میں عبدالمنان اور عامر کے کرداروں کے توسط سے انقلاب کی اسی صورت حال کو واضح کیا ہے۔

''بانگ'' آغاز تا انجام علامتی پیرایے میں بیان کی گئی کہانی ہے۔اس افسانے کی معنویت کئی سطحوں پر اجاگر کی جاسکتی ہے۔اگر 'مرغ' کو اقلیتی طبقے کا کردار مان لیں تو پوری کہانی یوں روشن ہوتی ہے کہ طاقتور طبقے کو مظلوم کردار پر وار کرنے کے لئے کسی تسلیم شدہ جواز کی حاجت نہیں ہوتی۔سینکڑوں جواز پیدا کئے جاسکتے ہیں۔اہم ترین جواز تعداد میں اضافہ اور کارکردگی میں بہتری بھی ہوسکتی ہے۔اس علامتی کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہانی کی قرأت کی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ...جب بھی ان (مرغ) کے چونچ مضبوط ہوئے انہیں ذبح کر دیا گیا۔یعنی ہر وہ جگہ جہاں اقلیتی طبقہ مضبوط و مستحکم معیشت کے حامل رہا، وہیں ان کی سرکوبی کی گئی۔مسلسل استحصال کے نتیجے میں اقلیتی فرقے میں پیدا ہونے والی شدت پسندی اور انتہا پسندانہ حملے مرغ، مرغیوں اور چوزوں کے تصادم کی صورت میں نظر آتے ہیں۔شدت پسندی کی روک تھام کے لئے صحیح اقدامات کا مشورہ مرغ فروش کے ذریعے انہیں ملتا ہے لیکن وہ انہیں کمزور اور ناتواں سمجھ کر نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔دوسری سطح پر مرغ کو اگر مزدور اور محنت کش طبقے سے تعبیر کیا جائے تو بدلتے ہوئے صنعتی نظام، مشینوں کی ترقی، محنت کش طبقے کی خود آگہی اور توانائی، گلوبلائزیشن، طبقاتی احتجاج وغیرہ کا مکمل منظر نامہ واضح ہو جاتا ہے۔معانی کی دونوں لہروں کو متوازی و مساوی بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔کہانی کے خاتمے پر سرخ اور زرد رنگ کا حوالہ یوں بھی ذہن کو مزدوروں کی انقلابی تحریک اور بھگوا دہشت گردی دونوں کی جانب مبذول کرتی ہے۔شوکت حیات کے اس افسانے پر Reception Theory کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے اپنے تخیل کے کسی خاص فکری موڑ کو نہایت فنکاری سے پیش کر دیا ہے۔اب قاری اور ناقد اسے کون سا معنی پہنائیں، یہ ان کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے۔

''شکنجہ'' ایک قلی کی کہانی ہے جس میں نہایت دردمندی سے اس کی زندگی کی تشنہ خواہشوں، نامرادیوں اور اس کی غربت کو پیش کیا گیا ہے۔غریب آدمی کی غربت اس کی پوری ذات کو بے اعتبار ٹھہراتی ہے۔اسی المیہ کی جانب افسانہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔قلی جب اپنی استطاعت سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے تو لاشعوری طور پر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ منزل پر جلد از جلد پہنچ کر اپنے ناتواں وجود کو ہلکا کر لے۔اسی لئے عموماً قلی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔وہ سامان لے کر کہیں فرار نہ ہو جائے، یہی اندیشہ صاحب مال کو ہانپتے کانپتے قلی کی رفتار کا ساتھ دینے پر مجبور کرتا ہے۔راوی اخلاقی طور پر اس عمومی رویے کو ناپسند کرتا ہے اور عملی طور پر اختلاف کرتا ہے۔اسے انسان کی اعلیٰ اخلاقی قدروں پر یقین ہے اور اس کا یہ یقین سلامت رہتا

ہے۔اس کہانی میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ زندگی کی کشاکش اور زاد حیات کی تگ و دو نے غریب انسان کو اپنے فطری جذبات سے بھی تہی داماں کر دیا ہے۔اس لئے ایک حادثے کے بعد اپنے بچے کو صحیح سلامت پا کر قلی بے اختیار لپٹا کر اسے چومنے لگتا ہے۔بچے کے لیے باپ کی شفقت و محبت کا یہ بے ساختہ مظاہرہ نامانوس اور اجنبی محسوس ہوتا ہے۔شوکت حیات کی بیشتر کہانیوں کی طرح اس افسانے میں بھی تفریح محض سے گریز پائی ملتی ہے۔یہ افسانہ انسانی رشتوں، قدروں اور مجبوریوں کے حوالے سے غور و فکر کا ایک بے کراں جہاں اپنے اندر آباد کیے ہوئے ہے۔یہ شوکت حیات کی پیشکش کا کمال ہے کہ ان کے کردار اپنی خوشی ناخوشی سمیت قاری کے دل و دماغ میں رچ بس جاتے ہیں۔

''فرشتے'' سیدھے سادے پلاٹ میں بیان کی گئی ہلکی پھلکی کہانی ہے۔شاعر، افسانہ نگار اور نقاد کے تین کردار تخلیق کر کے شوکت حیات نے موجودہ ادبی صورت حال، دنیائے ادب کی صارفیت اور موقع پرستی پر لطیف طنز کیا ہے۔دیگر میدان کار کی مانند ادبی پلیٹ فارم کے بھی ایمان داری، خلوص اور صداقت سے عاری ہو کر کرپٹ ہونے کے موضوع پر نہایت احتیاط کے ساتھ خیال آرائی کی گئی ہے۔

''بلی کا بچہ'' ایک پراسراریت سے لبریز کہانی ہے۔کہانی کی ابتدا میں گھر کے بچے پڑوس سے ایک بلی کا بچہ لے آتے ہیں۔باپ اور دادی کی شدید مخالفت کے ردعمل میں ماں کی پرزور حمایت بچوں کو مل جاتی ہے۔دادی کے لئے یہ صورتحال اذیت ناک ہے۔انہیں بلی کے بچے سے اپنی طہارت کے تئیں خدشہ اور عبادت میں خلل محسوس ہوتا ہے۔علاوہ ازیں، بلی کے بچے سے انہیں یک گونہ نفرت بھی محسوس ہوتی ہے۔جوانی کے زمانے میں ان کے شوہر مولوی برہان الدین کو ایک بلے سے جذباتی لگاؤ تھا جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک دادی کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔مولوی برہان الدین مجموعی طور پر اپنی زندگی میں ایک ناکام شخص تھے۔ان کی زندگی کی تمام تر مصروفیات تقسیم ملک کے خلاف تقریریں کرنے، تعویز گنڈہ کرنے اور بلے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے پر محیط تھیں۔تین بیٹے فکری گمراہی کا شکار ہو گئے اور بیٹیوں کو تشنہ کام جوانی نے گمراہ کر دیا۔چوتھا متوسط ذہن کا لڑکا زندگی میں اوسط درجے کی کامیابی حاصل کر پایا۔اسی لڑکے کے ساتھ دادی رہ رہی تھیں۔بلی کا بچہ دادی کی نفرتوں سے بے نیاز نماز کے دوران اکثر دادی کے کندھوں پر جھول جاتا۔ایک دن اچانک بلی کا بچہ غائب ہو جاتا ہے۔گھر والوں کے ساتھ ساتھ دادی بھی اسے ڈھونڈتی ہیں لیکن ناکامی ہاتھ آتی ہے۔کچھ دنوں بعد دادی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ایک دن بلی کا بچہ دادی کے مصلے پر نظر آتا ہے۔بیٹے نے دادی اور بلی کے بچے کے گتھم گتھا ہیولے کو نماز ادا کرتے دیکھا۔یہ منظر دیکھ کر دہشت سے اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔بلی کا بچہ پھر کبھی نظر نہیں آتا ہے۔شروع سے آخر تک یہ افسانہ رمز و اسرار کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔بلی کا بچہ پالنے کے لئے بچوں

کا شوق، گھر والوں کی مخالفت، ساس بہو کا ازلی معاندانہ رویہ، بلی کے بچے کا غائب ہو جانا اور دادی کا مر جانا.... یہ تمام واقعات ایک عام سی کہانی کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن دادی کا بلی کے بچے کو نگوڑا نامراد کہنا اور اس کے تعلق سے مولوی برہان الدین کی عجیب وغریب شخصیت کو پیش کرنا، ان کی زندگی کی پراسراریت، نامرادیوں وناکامیوں کا کرب، بیٹوں کی بے اعتدالیاں، بیٹیوں کی فریب خوردگی، بلے کے ساتھ مولوی صاحب کا ارتباط واختلاط اور دادی کا اضطراب، بلی کے بچے کے غائب ہو جانے کے بعد دادی کی مضطربانہ کیفیت، دادی کے انتقال کے بعد بلی کے بچے کا آنا اور دادی کے لئے بے چین ہونا، بیٹے کا عجیب منظر دیکھ کر یادداشت کا غائب ہو جانا وغیرہ واقعات کا تسلسل اپنے اندر اس قدر پراسراریت سمیٹے ہوئے ہے جس نے اس کہانی کو عام کہانی کے زمرے سے الگ کر کے فنٹاسی کی شکل عطا کر دی ہے۔ یہ تمام چیزیں ایسی علامات کی شبیہہ پیدا کرتے ہیں جس کی پیچیدگیوں میں قاری ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے۔ شوکت حیات کی بعض کہانیوں کے طلسمات قرأت مکرر سے بھی نہیں کھلتے۔ ''بلی کا بچہ'' بھی ایسی ہی کہانیوں میں سے ایک ہے۔

موجودہ سماجی ڈھانچے، مسائل کے انبوہ، حالات کی کشاکش اور وقت کی ستم ظریفی میں جذبات کے پل اس طرح کھو جاتے ہیں جیسے مٹھی میں بند پھسلتی ریت۔ حالات کے بے رحم شکنجے رومان کی ازخود رفتگی کو کس طرح چکنا چور کر دیتے ہیں، اسی کرب کو شوکت حیات نے ''گھڑیال'' کا موضوع بنایا ہے۔ قدرت کے رنگین نظارے، کائنات کے رومانی اشارے اور ماضی کی سنگین یادیں سب وقت کے جبر کا شکار ہو جاتی ہیں۔ عام انسان حالات کے جبر پر رو لیتا ہے لیکن حساس اور ذی شعور آدمی درد سے لبریز کھوکھلا قہقہہ لگا کر جینے کو آسان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی گداختگی سے اس افسانے کا تانا بانا بنا ہے جو دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

''رحمت صاحب'' انسان کے آخری پڑاؤ کی کہانی ہے۔ ایک آفاقی سوال کی کہانی ہے کہ جن بچوں کے لیے والدین اپنے حال اور مستقبل کو قربان کر دیتے ہیں، وہی بچے والدین کی کفالت نہیں کر پاتے۔ رحمت صاحب ساری زندگی جد و جہد کر کے اپنے بچوں کے لئے آسودگی بھرا حال اور خوش آئند مستقبل کا انتظام کر دیتے ہیں لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا وجود ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ بیٹوں کے بیگانہ رویے اور بہوؤں کے حقارت آمیز برتاؤ نے ان کی عزت نفس کو ذلت سے ہمکنار کر دیا۔ زندگی ہر آن خوش رنگ امید کے جلوے بھی دکھاتی ہے۔ وہ نئی توانائی کے ساتھ پوتے کو گود میں اٹھاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ان کا پوتا ارتقا کی تاریخ میں مذموم روایات کے گرد آلود چہرے کی تطہیر کرے گا۔ عام انسان کی عمومی کہانی کو شوکت حیات نے احساسات کی دبازت سے لمحۂ فکریہ بنا دیا ہے۔

''کوا'' ہجرت وطن کی کہانی ہے۔ افسانہ نگار نے کوا کو معاشی کشاکش، مہنگائی کے عفریت اور

رزق کی نافراہمی کی علامت بنایا ہے۔ کوا جو بڑی دیدہ دلیری سے بچوں کی پلیٹ سے روٹی اچک لے جاتا ہے۔ اب کوا نظر بھی نہیں آتا اور تھالی سے رزق غائب ہو رہا ہے۔ وافر رزق اور آسائش کی تلاش میں لوگ ہجرت وطن کر رہے ہیں۔ کیا ہزار دقتوں اور زخمی مسافتوں کو طے کر کے سرحد پار کی وہ خواب آسا منزل مل جائے گی جہاں نئے سرے سے آسائش بھری زندگی کی ابتدا ہو سکے؟ یا سرحد پار کے مکیں بھی انہیں سرابوں کی تلاش میں ہجرت آمادہ ہو چکے ہیں؟؟ ایسے ہی سلگتے سوالوں کو اس کہانی میں افسانہ نگار نے اٹھایا ہے۔ امید کے سنگلاخ راستوں پر لہولہان ہوتے وجود کا المیہ اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی بے یقین مسافتوں کے منفی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کہانی میں واقعات بھی ہیں، کردار بھی اور مکالمہ بھی لیکن بنیادی طور پر محض حوادث زمانہ کی صعوبتوں سے مجروح ہوتے ہوئے احساسات کی کہانی ہے۔ اس افسانے میں تقسیم ملک کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی عدم استحکام اور ہجرت وطن کے کرب کو تخلیقی سطح پر نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ کہانی شوکت حیات کی نمائندہ کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام کے نقائص کو ''چیخیں'' میں پیش کیا گیا ہے۔ پرائیوٹ انگلش اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دلانا اسٹیٹس سمبل سمجھا جاتا ہے۔ ایجوکیشن مافیا والدین کی اسی دکھتی رگ کا استحصال کرتے ہیں۔ مختلف مد کے نام پر سیکڑوں ہزاروں کی فیس طلب کی جاتی ہے۔ بطور فیشن بچوں کا ہی نہیں والدین کا بھی انٹرویو لیا جاتا ہے۔ سلیکشن ہونے نہ ہونے کا آسیب الگ سر پر سوار رہتا ہے۔ ہوم ورک کے باعث بچوں کے حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ روح سے کربناک چیخیں بلند ہوتی رہتی ہیں لیکن مقابلے کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا خوف مہر بہ لب رکھتا ہے۔ بچے اپنا بچپن بھی نہیں جی پاتے اور ناقابل برداشت ذمہ داریوں کے بوجھ سے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ سارے تلخ حقائق سے واقف ہونے کے باوجود ایک اندھی دوڑ ہے جس میں چیختی ہوئی روحوں کے ساتھ لوگ دوڑے جا رہے ہیں۔ شوکت حیات نے اس افسانے کے وسیلے سے معاشرے کے ایک اہم مسئلے کی جانب نہ صرف توجہ مبذول کرائی ہے بلکہ ہیبت ناک انجام کو بھی علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ آندھیوں کے زور میں جب ہمارے پاؤں اکھڑنے لگے ہیں تو ان ننھے منے مخملی پیروں کا کیا ہوگا؟ کیا خرگوشوں کی معصومیت درندگی کا پیرہن اوڑھ لے گی؟؟

''کہ'' فسادات اور دہشت گردی کے نتیجے میں تشکیل پانے والے ذہنی افتاد کی کہانی ہے۔ حادثوں کے شہر میں آج کا ہر انسان بے یقینی کی منزل سے گذر رہا ہے۔ انسان کی ایسی ہی کیفیات کو شوکت حیات نے انوکھے اور اثر انگیز پیرایے میں بیان کیا ہے۔ دہشت گردی کے دھوئیں سے محیط شہر کی سڑکیں تقریباً سنسان ہیں وہ آدمی جو گھر والوں کی زندہ سانسوں کی بقا کی خاطر تپتی سڑک پر تلاش رزق میں

نکل آیا ہے لیکن اس کی روح کی شگافوں میں خوف ودہشت کی لرزتی ہوئی کیفیتیں ہیں۔ ہر آہٹ اسے چوکنا اور لرزیدہ کئے ہوئی ہے۔ اس کے تعاقب میں دولڑکے ہیں جو تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالتے ہیں۔ اس کا سراسیمہ ذہن تخیلی ہیولے تیار کر لیتا ہے کہ بس وہ اب چند ساعتوں کا مہمان ہے۔ خوف نے اس کے قدموں میں تیزی لادی ہے لیکن لڑکے بھی اسی رفتار میں متعاقب ہیں۔ لڑکے اپنی بند مٹھی والے ہاتھ کو بلند کئے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ہر لحظہ قریب آتی فنا کی منزل کو دیکھ کر وہ دوڑنے لگتا ہے۔ دوڑتا ہوا لڑکا انتہائی سرعت سے بازو گھماتے ہوئے کچھ پھینکتا ہے۔ وہ آدمی دہشت کی انتہا پر پہنچ کر زمین پر لڑھک جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کا وجود دھماکے کی زد میں آکر خاک وخون میں تبدیل ہو جاتا کہ لڑکے نعرہ بلند کرتے ہیں..... گڈ بالنگ..... گڈ بالنگ! گرے ہوئے آدمی کے قدموں پر ایک چیتھڑوں والی گیند پڑی ہوئی تھی۔ لڑکے حیرت و استعجاب کے عالم میں آدمی کی آنکھوں اور اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شوکت حیات نے اس افسانے میں شدت خوف اور شدت رفتار کو ہم آمیز کر کے احساسات کی جو امیجری بنائی ہے، اس کی نظیر مشکل ہے۔ آدمی کی دہشت کو مجسم اور متشکل کر دینا انہیں کا کمال ہے۔

شوکت حیات کی بیشتر کہانیوں کی طرح اس کہانی میں بھی کرداروں کا کوئی نام نہیں ہے۔ دراصل وہ کرداروں کی کہانیاں کہتے بھی نہیں بلکہ ان کے افسانے حالات، واقعات اور کیفیات کے منظر نامے ہیں۔ وہ خود اپنے افسانوں کو انام افسانے کہتے ہیں جن میں سارا زور قوت نامیہ پر رہتا ہے۔ یعنی نام اور لیبل سے آزاد افسانے جو ہر دور میں زندہ رہیں۔ ہر عہد میں فکری وفنی سطح پر عہد کے تقاضوں کے مطابق معنیاتی نظام قائم کر سکیں۔ ان کے افسانے عصری مسائل اور آفاقی صداقتوں کے افسانے ہیں۔ لہٰذا کرداروں کے نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار میں، وہ یا تم کے صیغے میں ہوتے ہیں۔ البتہ جن افسانوں کے ذریعے وہ مذہبی یا علاقائی مسائل پیش کرتے ہیں، ان میں مذہبی، لسانی یا علاقائی تفریق قائم کرنے کے لئے کرداروں کو نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً ''گنبد کے کبوتر'' کے سین صاحب اور مسٹر تھامسن، ''رانی باغ'' کے رحمت صاحب اور رانی، ''مادھو'' کا مادھو اور جلیل نداف، ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' کا عبدالمنان، ''تفتیش'' کے آفتاب صاحب وغیرہ۔ تقریباً یہی صورت حال پلاٹ کے سلسلے میں بھی ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ افسانوں کی پلاٹ سازی میں بھی وہ بندھے ٹکے فارمولے کی بندش سے خود کو آزاد رکھتے ہیں۔ واقعات، کیفیات اور احساسات کی جزئیات نگاری ان کے فکر وفن کا منتہائے مقصود ہے۔ انہیں جو کہنا ہے، پُر اثر کہنا ہے۔ اس کے لئے کبھی وہ روایتی پلاٹ کی تکنیک استعمال کرتے ہیں تو کبھی اینٹی پلاٹ کی تکنیک۔ بوقت ضرورت وہ مختلف طریقہ کار اپناتے ہیں لیکن پوری صداقت اور

ایمانداری سے اس طریقہ کار کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شوکت حیات نے اپنے افسانوں کے وسیلے سے عصری کرب کو پیش کیا ہے۔ زیادہ تر افسانہ نگار اپنے افسانوں کے ذریعے عصری مسائل کی عکاسی کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا عنصر ہے جو انہیں اپنے ہمعصروں سے ممیّز کرتا ہے۔ دراصل شوکت حیات کی تخلیقی نثر اور ان کا اسلوب انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ شوکت حیات کے یہاں اختصار میں جامعیت کا فن درجہ کمال پر ہے۔ ان کے یہاں کہانی میں برتا جانے والا ہر لفظ اپنے اندر جہانِ معنی رکھتا ہے۔ ان کی کہانیاں بالعموم مختصر ہوتی ہیں لیکن معانی ومفاہیم کی ایک وسیع کائنات ان کے یہاں ملتی ہے۔ لمبے چوڑے پس منظر کو اکثر ایک یا دو جملے میں پیش کر دینے کے ہنر سے وہ واقف ہیں۔ دراصل یہ کوزے میں سمندر کو سمونے کا فن ہے جو فن شاعری کا وصف ہے۔ ان کے افسانوں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں جن سے کہانی یا کردار کا پورا پس منظر روشن ہو جاتا ہے:

۱۔ یہ ہنر اسے معلوم تھا کہ بچپن سے اب تک اکثر اوقات سنگین حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے خود کو بے جان اشیاء میں تبدیل کر دینا پڑتا تھا۔ (کوبڑ)

۲۔ بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔ (گنبد کے کبوتر)

۳۔ گنگا میں کتنا سارا پانی بہا لیکن بڑے ابو کی زندگی اسی پڑاؤ پر کھڑی رہی، جہاں انہوں نے اپنے والد کو اپنے بچپن میں سپرد خاک کیا تھا۔ (اپنا گوشت)

۴۔ وہ جس علاقے میں گیا تھا وہاں انسانی اجسام پھول گوبھیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ (سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ)

۵۔ بہت دیر بعد لڑکھڑاتے ہوئے سرخ پانی سے وہ باہر نکلے تو زرد ہو چکے تھے۔ (بانگ)

۶۔ دودھیا اسکرین پر تاریخ کی طویل صدیاں لمحوں کی نوک پر خود بخود آخری ہچکی لے رہی تھیں۔ (گنبد کے کبوتر)

لفظی کفایت شعاری میں کہیں کہیں شوکت حیات کا فن منٹو کے فنی رویے کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ کہانی کی روداد میں ان کی نکتہ آفرینی ذہن کے تاریک گوشوں کو منور کرنے کی کاریگری انجام دیتی ہے۔

۱۔ دراصل پڑھائی لکھائی اور تہذیب وتمدن کہتے ہی اس کو ہیں کہ انسان اپنی حد بندیوں سے بالا تر ہو جائے۔ (بھائی)

۲۔ دنیا میں فکرِ معاش سے بڑا کوئی غم نہی..... بیشتر مسائل کی جڑیں اس کی کوکھ میں پیوست ہیں۔ (مسٹر گلیڈ)

۳۔شاید سماجی ارتقا کے پیچیدہ عمل کا یہ لازمی نتیجہ ہے، آگے بڑھتے ہوئے چکے کے پیچھے گرد اڑتی ہی ہے۔(رحمت صاحب)

۴۔زندگی پر موت کی پرچھائیں بے داغ زندگی کی ضامن بن جاتی ہے۔(مرشد)

معانی کی ترسیل کے لئے لفظوں کے انتخاب میں انہیں خاصی مہارت حاصل ہے۔نازک سے نازک سچویشن کو وہ فنکارانہ اور ماہرانہ انداز میں پیش کرنے پر قادر ہیں۔انہوں نے کئی افسانوں میں جنسی مراحل کو بھی پیش کیا ہے لیکن کہیں پر فحاشی یا ابتذال کی صورت نہیں پیدا ہونے دی۔''رانی باغ'' میں رحمت صاحب اور رانی کے جنسی اتصال کی عکاسی انہوں نے یوں کی:

> شام کی نیم تاریکی میں باغ کے کونے کی گھنی جھاڑیوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ہوا ہلتی ہوئی شاخوں کو چھوتی ہوئی ان دونوں کی سرگوشیوں سے لپٹی ہوئی پراسرار گونج پیدا کر رہی تھی۔دور آسمان میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی لال ٹکیہ اور گھنے کالے بادل کے درمیان زبردست دھینگا مشتی جاری تھی۔اچانک گھنے کالے بادل کا دبیز ٹکڑا بھاری پڑا اور سورج کا سر قلم کرتے ہوئے نیچے کی طرف گرا۔سورج کی گردن سے لہو کا فوارہ ابلنے لگا۔شفق کی تیز سرخی سے افق کا ایک کونا لہولہان ہو گیا...شفق کی سرخی کے کچھ چھینٹے چھٹک کر زمین میں جذب ہو گئے۔

اس طرح کی عکس بندی وہی فنکار کر سکتا ہے جس کا مشاہدہ گہرا ہو، جسے انسانی کیفیات کا صحیح ادراک ہو اور جس کی زبان و بیان پر مکمل دسترس ہو۔انسان کی باطنی کیفیات کے موہوم ارتعاشات کو شوکت حیات کی نگاہیں نہایت باریک بینی سے گرفت میں لینے کا ہنر جانتی ہیں۔

۱۔کسی نے اس کے اندر اس کے پھیپھڑے کو بے دردی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔دباؤ بڑھتا گیا۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ (گھونسلہ)

۲۔ٹھنڈک کے باوجود اس کے بدن میں حرارت کی ایک لہر دوڑ گئی....پیشانی پر خوف کے پسینے کی بوندیں جھلملانے لگیں۔ (بھائی)

۳۔پل دو پل کے لیے بھی آدمی جہاں اپنی سانسیں درست کرنے کے لئے رک جاتا ہے وہ جگہ اس کے وجود میں پیوست کر جاتی ہے۔ (کوا)

۴۔مسلسل دوڑتے ہوئے آخری بار سہمی سہمی نگاہوں سے پیچھے کی جانب دیکھتے ہی وہ ''دھماکہ.....دھماکہ.....بچاؤ.....بچاؤ'' چیخنے لگا...لیکن اس کی آوازوں کی مچھلیاں خشک گلے میں تڑپ کر

رہ گئیں۔ (کہ)

تشبیہیں اور مماثلتیں پیش کرنے کے معاملے میں بھی شوکت حیات خود کفیل ہیں۔وہ اپنے گہرے مشاہدے کی بناء پر مماثلتیں تراش لیتے ہیں:

۱۔بیوی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔سر بازار رکشہ الٹ جانے سے جیسے کپڑے اوپر اٹھ آئے ہوں۔(مسٹر گلیڈ)

۲۔ آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔سمندر اچھل اچھل کر اس کے وجود کے کناروں کو ریزہ ریزہ کرنے کے درپے تھا۔(کوبڑ)

۳۔بڑے ابو قبروں کے درمیان جیتے جی سینڈوچ بن گئے۔(اپنا گوشت)

۴۔جاڑا لمبی راتوں اور چھوٹے دنوں کے لئے لوک کتھاؤں کی طرح شہرت رکھتا ہے۔(بھائی)

۵۔اسے لگا کہ وہ رات کے سناٹے میں کسی مرگھٹ میں بیٹھا ہے۔دور کہیں سے کتوں کے رونے کی آواز آ رہی ہے.....چاروں طرف گہرا اندھیرا ہے۔بجز اس روشنی کے جو ایک جلتی ہوئی لاش سے برآمد ہو رہی ہے۔(کوبڑ)

شوکت حیات کی زبان، ان کا اسلوب بیان، ان کی نکتہ سنجی، ان کی رمزیت، ان کی قادر الکلامی اور ان کی معنی آفرینی کی بے شمار مثالیں ہیں جو ان کے افسانوں سے فراہم کی جا سکتی ہیں۔یہ واقعہ ہے کہ شوکت حیات کی طرز ادا ان کی امتیازی شناخت ہے۔فکشن کے ماہر نقاد وارث علوی نے بھی ان کی اس امتیازی خوبی کا اعتراف کیا ہے:

> ''شوکت حیات کو زبان اور بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ان کے معمولی افسانوں میں بھی یہ حسن برقرار رہتا ہے۔ان کی نثر بڑی ہموار ہے۔ایک کے بعد دوسرا جملہ سمندر کی لہروں کی مانند سبک ساری سے آتا ہے۔بہت سے لکھنے والوں کی زبان مین جو ہکلا پن ملتا ہے۔اس سے وہ صاف بچ گئے ہیں۔ان کے یہاں پیچیدگی ہے لیکن الجھاؤ نہیں۔اشارے، کنائے اور اجمال ہے جو اہمال سے بارہ پتھر دور رہتا ہے۔''

ایسا نہیں ہے کہ شوکت حیات کے افسانوں میں کمزور علاقے نہیں ہیں۔ان کے لہجے کی بلند آہنگی کہیں کہیں کہانی کی تاثیر میں اضافہ کرنے کی بجائے ان کے افکار و نظریات کا پروپیگنڈہ محسوس ہونے لگتی ہے۔''سرخ اپارٹمنٹ'' کا تعلق اسی قبیل کے افسانوں سے ہے۔بعض اوقات وہ اپنے سیاسی، سماجی

اور اخلاقی نظریات کو یکدم پیش کر دینے کے اضطراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ افسانہ ''تفتیش'' کا شمار اسی زمرے میں کیا جا سکتا ہے، جس کو انہوں نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار محض کا وسیلہ بنایا ہے۔ شوکت حیات کے بعض افسانوں میں فطری انجام کے بعد بھی اضافی جملے لطیف احساسات پر گراں گذرتے ہیں۔ ''چیخیں''، ''شکنجہ''، ''سرخ اپارٹمنٹ'' وغیرہ افسانوں کی آخری سطروں کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مجموعی طور پر شوکت حیات کے فکری و فنی رویے کو چند جملوں میں سمیٹا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ایسے دور میں جب مختصر افسانہ ترسیل کے المیے کا شکار ہو رہا تھا، انہوں نے اکہری خارجیت اور شدید داخلیت کے درمیان ایک نئی متوازن راہ اپنائی۔ مختصر افسانے کو کہانی کی گمشدگی کے کرب سے آزاد کرایا۔ سپاٹ بیانیہ کو تہہ داری اور معنی خیزی عطا کی۔ افسانے کو نامیاتیت اور امکانیت کے آفاقی عناصر سے متعارف کرانے کی سعی کی۔ انسان کے باطن کی بیکرانی کو تخلیقی و ترسیلی سطح پر پیش کیا۔ عصری مسائل کی پیشکش کے ساتھ ساتھ انسان کے اندرونی اضطراب و کیفیات اور اس کے ردعمل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انسانی کردار کی تعمیر و تشکیل اور اس کی شکستگی کے عناصر پر روشنی ڈالی۔ شوکت حیات کا کمال یہ ہے کہ ان تمام مراحل میں انہوں نے زبان کے خلاقانہ استعمال سے کہیں بھی صرف نظر نہیں کیا۔ ان کی کہانیوں کے توسط سے اردو افسانے کی زبان نے نئی تخلیقی توانائی حاصل کی ہے۔ گویا شوکت حیات نے مختصر افسانے کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت نئی منزلوں سے آشنا کرایا ہے۔ ان کے افسانے اردو ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔ بلاشبہ اردو افسانے کی ارتقائی تاریخ میں شوکت حیات کی حیثیت ایک سنگ میل کی سی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

KHAYABAN
Behind RJD Office
Chaknoor road, Dharampur
Samastipur-848101Bihar
Mob : 9031119464

نئی کتابیں

نام کتاب : آبیاژہ (غضنفر کے ناول)	نام کتاب: مخمور سعیدی کا شعری خمار
مرتبہ :ڈاکٹر ریشا قمر	مصنف: عرفان رشید
سال اشاعت: ۲۰۲۲ء	سال اشاعت:۲۰۲۱ء
قیمت : ۱۲۰۰/روپے	قیمت :۴۰۰/روپے

● ڈاکٹر گلاب سنگھ

شوکت حیات کے افسانوں میں سانس لیتی سچائیاں

شوکت حیات ہمارے عہد کے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے افسانے کو نئی راہ دکھائی، غلو و مبالغہ نگاری سے حد درجہ پرہیز کرنا سکھایا اور افسانہ نگاری میں مختلف تجربے کیے۔ ان کے تجربات کو ادبی دنیا نے سراہا بھی اور قبول بھی کیا۔ شوکت حیات نے جس دور میں لکھنا شروع کیا وہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے عروج و زوال کا دور تھا۔ ایک طرف ترقی پسند نظریئے کے تحت لکھے گئے افسانے مستقل ایک ہی جیسی کیفیات کے سبب اباؤ سے محسوس کیے جانے لگے تھے اور دوسری طرف تجریدیت، اسطوریت، پیکر طرازی اور علامت نگاری کے رجحانات زور پکڑ رہے تھے۔ ایک طرف جہاں ترقی پسند افسانہ محض نعرہ بازی بن کر رہ گیا تھا وہیں جدید افسانہ استعاروں، علامتوں اور اسطوری رجحانات کی وجہ سے ابہام کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اس دور میں یہ شکایت عام تھی افسانے سے کہانی غائب ہوگئی ہے۔ وارث علوی نے ''گنبد کے کبوتر'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''مئے خانۂ ادب میں ترقی پسند تحریک ساغر کا وہ دور تھا کہ 'نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی'۔ اس تحریک کے ساتھ تاریخ ادب میں ادوار و ابواب ختم ہوئے اور شاعر و ادیب دہائی کی رضائیوں سے برآمد ہونے لگے۔ شوکت حیات کا نام ۷۰ء کی دہائی میں برآمد ہوا جو جدیدیت کی لائی ہوئی علامت پسندی، تجریدیت اور اسطور پسندی کے ادھ کچرے تصورات سے کھد بدا رہی تھی۔''[1]

ترقی پسندیت اور جدیدیت کے اسی عروج و زوال کے دور میں شوکت حیات نے ایسے افسانے سے روبرو کرایا جو اپنی فکر و تخلیق، طرز و اسلوب، انداز و نگارش، تیور و تکنیک، ٹریٹ منٹ اور عندیہ کے اعتبار سے بالکل الگ، سب سے جدا اور سب سے منفرد تھا۔ انہوں نے ایک طرف افسانے سے گم ہوتی کہانی کے مطالبے کو پورا کیا اور دوسری طرف ابہام کی دلدل سے افسانے کو نکال کر اپنی جدت، امتیاز اور انفرادیت کا سکہ جاری کیا۔ اس عہد میں لکھے گئے اپنے افسانوں کو انہوں نے نامیاتی افسانہ کہا۔ شوکت حیات نے گنبد کے کبوتر میں شامل اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

''نامیاتی افسانے وہ ہیں جو کسی بھی عہد کے ہوں لیکن ہر عہد میں ان میں فکری وفنی سطح پر gorw کرنے کی صلاحیتیں اور نئے عہد کے تقاضوں کے تحت متن کے نئے تقاضوں کے معنیاتی نظام کو قائم رکھنے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں''۲؎

شوکت حیات نے اپنی تھیوری کے مطابق نامیاتی افسانے لکھ کر ادبی سفر کا آغاز کیا۔انہوں جہاں روایت سے کہانی لی وہیں ترقی پسندیت سے جرأت مندی،حق گوئی اور بے باکی کو قبول کیا اور جدیدیت سے علامت نگاری کا اثر حاصل کیا۔انہوں نے زبان وبیان میں بھی نئی روشنی پیدا کی چنانچہ ان کے نئے لہجے،کھرے زبان و بیان،ہئیت کے مختلف تجربوں،تکنیک کے نئے استعمال،فکری تعمق اور تخلیقی شعور کی روشنی میں لکھے گئے افسانوں کو ادبی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔شوکت حیات کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے کہانی کو واپس لے کر آئے اور ادب میں تخلیقی جمود کو توڑنے کی بھی کامیاب کوشش کی۔ان کے بہت سے افسانوں میں ایک سے زائد کہانی در کہانی بھی ملتی ہیں۔شوکت حیات کی اس جدت نے افسانے کو مزید وقیع اور دلچسپ بنا دیا۔ان کے افسانوں میں واقعہ نویسی نہیں ہوتی بلکہ واقعہ ان کی کہانیوں کے پس منظر میں ہوتا ہے۔شوکت حیات جو دیکھتے ہیں اور جیسا دیکھتے ہیں اس کو من وعن افسانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے فنکارانہ اظہار میں اپنے فکری وفنی کمال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ان کے اکثر افسانوں میں ایک حساس انسان کا دھڑکتا ہو دل اور بے چین ضمیر کی گونج سنائی دیتی ہے۔پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شوکت حیات کے افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شوکت حیات ہمارے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں۔وہ ادب اور ادبی مسائل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے اور اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں ادبیت اور سماجی احساس وشعور دونوں پر اصرار کرتے ہیں۔وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے طے شدہ نتائج اور سیاہ وسفید میں بٹے ہوئے افسانے کی روایت سے گریز کرتے ہوئے سچائی کی تلاش اپنے طور پر جاری رکھی اور نئی کہانی کا رشتہ نئی سماجی حقیقتوں سے جوڑا۔''۳؎(گنبد کے کبوتر صفحہ ۲۷۶)

شوکت حیات کا افسانہ 'گنبد کے کبوتر' اردو کے شاہکار افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔فساد زدہ اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے ماحول میں لکھا گیا یہ افسانہ اپنے ماحول اور حالات کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔مذکورہ افسانے میں شوکت حیات کا سماجی ضمیر پوری طرح بیدار نظر آتا ہے۔افسانے کا ہر کردار ایک کہانی لیے ہوئے

اپنے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ایک طرف داداسین ہیں جو ہر چیز میں اپنی جنسی ہوس کا سامان تلاش کرتے رہتے ہیں یہاں تک کے عبادت گاہوں کے گنبد بھی انہیں عورت کے پستان اور جنسی تلذذ کا سامان نظر آتے ہیں۔وہ سماج میں میں پھیلی ہوئی بدامنی اور خون خرابے کے اندیشوں کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کو انجوائے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہمارے سماج کے اس بے حس طبقے کی علامت بن جاتے ہیں جو صرف اپنے آرام وآسائش اور عیش وعشرت کو ہی زندگی اور مقصد حیات سمجھتا ہے۔دوسری طرف ایک استحصال زدہ لڑکی مس ریزہ جو مجبوری میں ایک ظالم،جابر،بے رحم اور عیاش شخص کے یہاں ملازم ہے۔یہ لڑکی نہیں چاہتی کہ اس کے جیسی زندگی کوئی دوسرا بسر کرے۔وہ بربریت،ظلم وتشدد کے ماحول سے آزاد ہونا چاہتی ہے لیکن مجبوریاں اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہیں۔یہ لڑکی مظلوم،استحصال زدہ خواتین کی نمائندگی کرتی ہے اور بھارت میں عورت کے جبر کی کہانی بیان کرتی ہے۔کہانی میں ایک گارڈ کا کردار ہے جو ایک افواہ سے تمام مکینوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے۔یہ اس طبقے کی علامت ہے جو کشیدگی کی فضا میں مزید خوف پیدا کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔افسانے میں ایک مسٹر تھامسن ہیں جو دولت مند ہیں اور زر ومال کے لالچ میں ضرورت مندوں اور مجبوروں کو اپنے نرغے میں پھانس کر نہ صرف ان کا ذہنی،جسمانی،روحانی اور جنسی استحصال کرتے ہیں بلکہ کمزوروں،ناداروں اور بے سہارا افراد پر جبر وتشدد کے پہاڑ توڑنا بھی اپنا حق سمجھتے ہیں۔یہ افسانہ Omnicient Narration یا واحد متکلم کے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''بے ٹھکانا کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔متواتر اڑتا جا رہا تھا۔اوپر سے نیچے آتا۔بے تابی اور اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گُنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اڑ جاتا۔اُڑتے اُڑتے ان کے بازو شل ہو گئے۔جسم کا سارا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔بس ایک اُبال کی دیر تھی کہ چاروں طرف.....''۴؎

شوکت حیات نے افسانے کی تمہید میں ظاہر کر دیا کہ کہانی کا پس منظر کیا ہے۔کبوتر امن وآشتی کی علامت ہے اور گنبد روحانی تسکین کا مرکز جسے مذہبی جنون کے لوگوں نے توڑ کر امن پسندوں سے رہنے سہنے کا ٹھکانا چھین لیا تھا۔امن پسند بے ٹھکانا گھوم رہے تھے اور مذہبی جنون کے ردعمل نے ہمیشہ بے ضرر رہنے والوں میں بھی انتقامی جذبات کا جنون پیدا کر دیا تھا۔واحد متکلم یا Narrater مستقل حالات پر غور کرتا ہے۔اس نے اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں دل بہلانے کے کے لیے پیڑ پودے لگا رکھے تھے اور وہاں کئی طرح کی چڑیاں بھی رکھ چھوڑی تھیں تا کہ خارجی کشیدگی کے اثرات کو گھر پر اثر انداز نہ ہونے دے لیکن اسے

مستقبل کی فکر، فسادات کے اندیشے اور فرقہ پرستی کے لاینحل مسائل پریشان رکھتے ہیں۔اس کے اپارٹمنٹ کے گارڈ کی طرف سے خبر آتی ہے کہ بلڈنگ میں ایک سانپ گھس آیا ہے۔اپارٹمنٹ کے سارے لوگ رات بھر خوف دہشت میں بسر کرتے ہیں۔اگلے دن معلوم ہوتا ہے کہ سانپ کی خبر محض افواہ تھی۔افواہ گارڈ کے علاوہ اسی کے اردگرد اور اسی کے علاقے میں ایسے بھی لوگ تھے جو حالات کی زہرناکی اور مستقبل پر منڈلاتے خطرات کے بادلوں سے یک سر بے نیاز اور بے خبر ہیں۔وہ اپنی دولت کے انبار سے ہر عیش و آسائش خرید لینا چاہتے ہیں۔بارود کے ڈھیر پر کھڑے شہر کی ممکنہ تباہی و بربادی کے خوف سے وہ بے اعتنائی برتتے ہیں۔شہر کے ویران ہو جانے کا انہیں کوئی ڈر نہیں وہ تو ہر حال میں زندگی کو انجوئے کرنے کی جگت میں رہتے ہیں۔پڑوس میں رہنے والے باسٹھ سالہ داداسین اس کو سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر کہتے ہیں:

''انجوائے کیجئے..... دیکھئے گول گول گنبدوں کی گولائی اور نوکیلے ابھار.....اُف.....سامنے کے پُرکشش منظر سے جسم میں عجیب ترنگ پیدا ہو رہی ہے.....ذرا دیکھئے آپ بھی.....!'' اس کا دل دوسرے گُنبدوں میں الجھا ہوا ہولناک کیفیات سے گزر رہا تھا۔سین دادا نرم و گداز جسمانی گنبدوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چٹخارے بھر رہے تھے۔''۵

'گنبد کے کبوتر' میں اسی قبیل کا ایک اور کردار مسٹر تھامسن کا ہے۔جنہوں نے عیش کرنے، ہوس مٹانے اور خدمت کرانے کے لیے ایک مجبور اور مظلوم لڑکی مس ریزہ کو ماہانہ اجرت پر ملازم کیا ہوا تھا۔مسٹر تھامسن کے یہاں آئے دن شراب و کباب کی محفلیں جمتی تھیں۔ان کے دوست اور آس پاس والے روز آتے اور ایک طرف شراب کے سرور و کیف، بھنے ہوئے گوشت اور دیگر پُر ذائقہ اشیاء سے لذتِ کام دہن حاصل کرتے وہیں دوسری طرف مسٹر تھامسن کی نوکرانی کے پرکشش جسم اور دلفریب اداؤں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔مسٹر تھامسن شراب و کباب میں تو دوسروں کو شریک کر لیتے تھے لیکن شباب کا مزا وہ تنہا لیا کرتے تھے یہاں تک کہ داداسین جیسے دیرینہ دوست کو بھی شریک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ایک دن شراب و کباب کی محفل جاری تھی کہ ان کے باورچی خانے میں پڑوس سے ایک بسمل کبوتر پھڑ پھڑاتا ہوا پناہ لینے آ جاتا ہے۔پڑوسی آتا ہے اور کہتا ہے کہ:

''میرا کبوتر آپ کے یہاں آ گیا ہے.....آپ جانتے ہیں، میری مدران لاپرانی مریض ہیں.....آجکل ان کے ہاتھوں میں سنسناہٹ رہتی ہے۔ڈاکٹر نے ان کو کبوتر کا سوپ تجویز کیا ہے.....میں اسے ذبح کر ہی رہا تھا کہ اڑ کر آپ کے یہاں چلا آیا۔''۶

مسٹر تھامسن اپنی ملازمہ کو بلاتے ہیں اور کبوتر واپس کرنے کا حکم دیتے ہیں۔کچھ ہی دیر میں

نوکرانی کبوتر کو لے کر آتی ہے۔بسمل کبوتر سکڑا سمٹا ڈرا سہما مس ریزہ کے کی ہاتھوں میں دبکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ریزہ یہ کیفیت دیکھ کر زیر لب بتاتی ہے:

''لڑ نہیں سکتا تو بھاگ جا نامراد.....اُڑ جا.....بستیوں سے دور وسیع آسمانوں اور جنگلوں کی طرف بھاگ جا.....''۷

مس ریزہ پڑوسی کو سونپنے کے بجائے کبوتر کو فضا میں اڑا دیتی ہے۔مسٹر تھامسن اس حرکت پر اسے زناٹے دار طمانچہ رسید کرتے ہیں۔اس کا دل شراب کباب کی محفل میں بھی اداس رہتا ہے۔طرح طرح کے خوف اور اندشے ذہن میں سر ابھارتے رہتے ہیں اسی کیفیت میں وہ اپنے فلیٹ پر واپس آتا ہے۔جب بیوی سے اس کی نگاہیں ملتی ہیں تو اسے اچانک احساس ہوتا ہے کہ گھر میں میت پڑی ہے اور باہر کرفیو لگا ہوا ہے۔

یہ کہانی گو کہ حتی المقدور سہل ممتنع میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن سارا افسانہ گلے گلے علامتوں میں ڈوبا ہوا ہے۔گنبد کے کبوتر میں کچھ قابل گرفت اور کمزور پہلو بھی ہیں۔پہلا یہ کہ کبوتر جنگل کی طرف نہیں بھاگتا ہمیشہ آبادیوں میں رہنا پسند کرتا ہے دوسرے واپسی کے وقت جب شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہو چکا تو وہ آسانی سے گھر کیسے آ گیا؟ان کے علاوہ کہانی پوری طرح کسی ہوئی اور فلمی منظروں کی طرح قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول رکھتی ہے۔

شوکت حیات کے افسانوی مجموعے میں اسی طرح کی ایک کہانی 'بھائی' ہے جس میں کشیدگی کے ماحول میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے بدظن، خوف زدہ اور بے اعتبار ہونے کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔'گھونسلا' بھی ایسا ہی افسانہ ہے جو چند لوگوں یا گروہوں کے ذریعے نفرت کا ماحول تیار کرنے اور انسانی ٹھکانوں کو مسمار کرنے کی داستان ہے۔

'گنبد کے کبوتر' شوکت حیات کے پچیس افسانوں کا مجموعہ ہے اس میں شامل 'کوبڑ' اور 'اپنا گوشت' افسانے سماج کے ہر طبقے اور ہر علاقے کی کہانیاں ہیں کہ ماں باپ کی موت کے بعد بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائیوں کو آباد کرنے کے لیے خود برباد ہو جاتا ہے۔'شکنجہ' 'مسٹر گلیڈ' اور 'قلی' بھی مصیبت زدہ لوگوں کے ذہنی، جسمانی استحصال اور سماجی ناہمواری کا روزنامچہ ہیں۔'چیخیں' ہمارے تعلیمی نظام کی سچی کہانی ہے۔اس میں دکھایا گیا ہے کہ لوگ خود کو بڑا ظاہر کرنے کے کس طرح اپنے بچوں کو مہنگے اور عالی شان اسکولوں میں پڑھانے کی تگ و دو کرتے ہیں۔مذکورہ افسانے میں اعلیٰ و معیاری اسکولوں کی لوٹ مار، اسٹیٹس سمبل کے کھوکھلے پن اور بچوں سے چھنتے بچپن کی داستان ہے۔'سرخ اپارٹمنٹ' میں ایک سچے اور کھرے کمیونسٹ کے دردناک انجام کو افسانہ بنایا گیا ہے 'سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ میں' موجودہ حالات کا آنے والی نسلوں کے خوفناک اثر اور اگلی نسل کے ردعمل کو ظاہر کیا گیا ہے۔'بلی کا بچہ' اور 'رانی باغ' افسانے شوکت حیات کے شاندار اور رومانی

افسانے ہیں۔گوکہ اس طرح کی کہانیاں بہت پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں لیکن ان میں بھی طرز ادا کی جدت پیدا کر کے پرانے مفاہیم کو ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔'میت' 'مادھو' 'مرشد' 'پاؤں' 'ڈھلان پر رکے ہوئے قدم' 'تفتیش' 'بانگ' 'فرشتے' 'گھڑیال' 'رحمت صاحب' 'کوّا' 'سکوت اور' 'کہ' شوکت حیات کی جدت طبع اور فکر وفن کا مظاہرے کرتے ہوئے افسانے ہیں۔انہوں نے تقریباً ایک سو افسانے لکھے ہیں جن میں سے ۲۵ ہی 'گنبد کے کبوتر' میں شامل ہیں باقی ۷۵ افسانوں میں سے کچھ تو ادبی رسائل کی زینت بن چکے ہیں اور کچھ شاید ان کے گھر تک ہی محدود ہوں گے۔ادبی تنظیموں کو چاہیے کہ بقیہ افسانوں کی اشاعت کا بھی انتظام کریں کیوں کہ ان سب کی اشاعت اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے افسانوں میں ہمارے عہد کی تلخ وترش سچائیاں ،نفسیاتی الجھنیں ،سماجی بے چینیاں اور سانس لیتی حقیقتیں ہیں۔انہوں نے پچاس برس ادب کی خدمت کی ہے اور پچاس برس کی تاریخ ان کے افسانوں میں قید ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱: دیباچہ گنبد کے کبوتر، وارث علوی، ص ۱۱، مطبع عفیف آفسیٹ پرنٹرس دہلی ۲۰۱۰

۲: افسانوی مجموعہ گنبد کے کبوتر، مضمون میری تھیوری سازی اور میرے افسانے، شوکت حیات ،ص ۳۶ مطبع عفیف آفسیٹ پرنٹرس دہلی ۲۰۱۰

۳: ایضاً، ص ۲۹۶

۴: ایضاً ص ۷۳

۵: ایضاً ص ۷۶

۶: ایضاً ص ۸۲

۷: ایضاً ص ۸۳

Village Beoli
District & Tehsil , Doda UT. JAMMU & KASHMIR
Pin Code 182202 Mobile No 7006847561

● ڈاکٹر نزہت پروین

شوکت حیات کے افسانے

شوکت حیات نے ۱۹۷۰ء سے لکھنا شروع کیا۔ان کا پہلا افسانہ ''بکسوں سے دبا آدمی'' کتاب لکھنؤ میں شائع ہوا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔دوسرا مجموعہ آنے ہی والا تھا کہ ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

شوکت حیات اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے اور جب انہوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تو ان کی وابستگی مزید بڑھتی گئی اور یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند سوچ کے ساتھ انہوں نے اپنے افسانوی سفر کو آگے بڑھایا۔جب ہم شوکت حیات کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کے یہاں ترقی پسند رجحان واضح طور پر نظر آتا ہے۔چاہے وہ افسانہ ''بانگ''، ''ڈھلان پر رکے ہوئے قدم''، ''گنبد کے کبوتر''، ''کاغذ کا درخت''، ''کہ''، ''خواب''، ''شہر''، ''پاؤں'' وغیرہ افسانوں میں ترقی پسندی صاف نظر آتی ہے لیکن ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ شوکت حیات نے افسانے میں ایک نیا تجربہ کیا جس کا نام انہوں نے انامیت رکھا۔شاید اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں اس طرح ترقی پسندی نظر نہیں آتی جس طرح انور عظیم، کلام حیدری، احمد یوسف وغیرہ کے یہاں نظر آتی ہے۔باتیں وہ بھی وہی کرتے ہیں جو ترقی پسندوں کا رویہ رہا تھا لیکن اسلوب کی سطح پر وہ ترقی پسندوں سے تھوڑا سا الگ نظر آتے ہیں۔

شوکت حیات کا ایک افسانہ ''سرخ اپارٹمنٹ'' ہے۔اس میں دو کرداروں عامر اور منان کے ذریعہ کمیونسٹ پارٹی کے نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔دونوں دوست ہیں پر ایک بیڑی کارخانے میں ملازم ہیں لیکن دونوں کی زندگی فاقہ مستی میں گزرتی ہے۔عامر سرخ اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر چکا چوندھ بھری زندگی میں چلا جاتا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''عامر تو ایسا حواس باختہ ہوا کہ اس نے خندوق میں چھلانگ لگا دی۔ مضبوطی سے جما کر رکھے ہوئے پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ ڈھلان پر پھسلتا چلا گیا۔اس پستی تک پہنچ گیا جہاں پہلے والا عامر مر چکا تھا۔ایک نیا عامر جنم لے چکا تھا.....عام سا لالچی عامر.....ہوس کا مارا ہوا.....عمارتیں اور زمینیں خریدتا ہوا .....فرضی فنانس کمپنیز قائم

کرتا ہوا.....روپ بدل کر اس نے مختلف کمپنیاں قائم کیں.....مختلف اداروں کی بنیاد رکھی اور راتوں رات اپنا بریف کیس بھاری کر کے روپوش ہو گیا۔

ایک مدت تک روپوش رہنے کے بعد وہ پھر نمودار ہوا.....بدلے ہوئے میک اپ میں.....نئے رنگ و روغن کے ساتھ.....نئے روپ میں.....اس کا پرانا دوست بھی اسے دیکھتا تو پہچان نہیں پاتا.....پھر وہی کاروبار.....چار برس میں رقم دوگنی.....سات برس میں چوگنی.....دولت کا انبار..... مالدار بننے کے آسان راستے.....مختلف کمپنیاں.....شیئرز.....پیڑ اور جنگلات اگانے کا سلسلہ.....''

لیکن منان اپنی جگہ قائم و دائم تھا۔ وہ سرخ عمارت کو ہی اپنا ماڈل سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن سماج واد آئے گا اور پھر سارے نظام بدل جائیں گے لیکن ابھی تک کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ بیوی کا چڑچڑا پن بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بات بات پر تکرار کرتی تھی۔ بچوں کی بیماریاں جو عارضی طور پر ٹھیک تو ہو جاتی تھیں لیکن اندر ہی اندر جسم کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود منان کے حوصلے پست نہیں ہوئے تھے۔

افسانہ آگے بڑھتا ہے۔ چائے کے ڈھابے کا منظر ابھرتا ہے۔

''کچھ بڑی بڑی چٹانیں کرسی کا کام کرتی تھیں.....دو بینچ تھی.....لمبی لیکن شکستہ.....اینٹوں کے پائے کے سہارے ٹکی ہوئی.....آدمیوں کی تعداد بڑھنے لگی.....پتھر پر جس کو بیٹھنے کا موقع نہ ملا وہ بینچ پر آ گیا.....آج تک اتنی تعداد میں اس بینچ پر لوگ نہیں بیٹھے تھے۔ شکستہ حالت سے گزرتی اور اینٹوں کی مدد سے اپنی ایک ٹانگ کی تکمیل کرتی ہوئی بینچ اتنے آدمیوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکی۔ چرمرا کر نیچے آ رہی۔

انگلیوں سے پیالے اور گلاس چھوٹ گئے.....گرم گرم چائے سے ہاتھ جل گئے..... کپڑوں پر اپنا نہ مٹنے والا نشان چھوڑ گئے..... کپڑے زمین کی دھول چاٹنے لگے.....پتھروں پر بیٹھے ہوئے لوگ سلامتی کے ساتھ بیٹھے رہے.....پتھر تو پتھر ہوتے ہیں.....اپنی جگہ مستحکم رہتے ہیں۔ لکڑیاں لکڑیاں ٹھہریں.....زیادہ بوجھ کی تاب نہ لا سکیں۔

منان پتھر تھا اپنی جگہ سلامت رہا۔

عامر لکڑی تھا چرمرا کر ٹوٹ گیا۔''

اس افسانہ میں شوکت حیات نے منان کے کردار کو بہت خوبصورت انداز سے نکھارا ہے۔

عبدالمنان کا دوست عامر بار بار اسے اپنی روشنی کی طرف بلاتا ہے لیکن اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ عامر کہتا ہے کہ کب تک بھوکے مرو گے۔ ہول ٹائمری چھوڑو اور میرے نئے کارخانے میں منیجر کا عہدہ سنبھالو۔ اپنی بیوی بچوں کی حالت کبھی دیکھی ہے۔ یہ سب سن کر منان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ وہ عامر کو کیسے بتائے کہ فاقہ مستی کا بھی اپنا ایک سرور ہوتا ہے۔

جلوس نکلنے والا ہے۔ جلوس کے لئے لوگ اکٹھا ہو چکے ہیں۔ عبدالمنان نے لوگوں کو قطار میں کھڑا کر دیا ہے لیکن اس درمیان عبدالمنان کے پاؤں ڈگمگائے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ سامنے سڑک پر عامر اپنی کار میں بیٹھا تھا۔ اس نے کئی بار منان کی بیوی کو روپیہ دیا تھا کہ وہ بچوں کا علاج ٹھیک سے کرائے۔ یہ بات اس کی بیوی نے بتایا تھا اور منان نے یہ کہا کہ یہ روپیہ رکھ دو جب عامر آئے گا واپس کر دینا۔

جلوس دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ منان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد عبدالمنان گر گیا۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''سڑک پر مخالف سمت سے آتے ہوئے جلوس کے قائد عبدالمنان کو گرتے ہوئے دیکھ کر سابق کامریڈ عامر نے ڈرائیور سے کہہ کر اپنی گاڑی رکوالی۔

احتجاجی جلوس تعزیتی جلسے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

''کامریڈ منان کو لال سلام۔'' کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ ان کی بے وقت موت نے سب کو ملول کر رکھا تھا۔

عامر نے سرد آہ بھری۔

اے نامراد.....تو نے سرخ اپارٹمنٹ اور دل دونوں سے غچہ کھائے۔''

افسانہ ''سرخ اپارٹمنٹ'' ایک نظریاتی افسانہ ہے۔ ایک ہی نظریہ کے ماننے والے دو دوست میں سے ایک اس نظریے کا مخالف ہو جاتا ہے اور دوسرا اپنے نظریے پر قائم رہتا ہے۔ غریبی، مفلسی، بچوں کی بیماری، بیوی کی تکرار کچھ بھی اسے جھکنے پر مجبور نہیں کرتے۔ وہ سماج کو بدلنا چاہتا ہے اور اسے یقین ہے کہ ایک دن انقلاب ضرور آئے گا۔ جب کہ عامر اس نظریہ کا مخالف ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس دولت بھی آ جاتی ہے۔ وہ اپنے دوست کو بھی پارٹی چھوڑ کر اپنے راستے پر لانا چاہتا ہے لیکن منان کسی طرح بھی نہیں لوٹتا۔ وہ چٹان کی طرح اپنے نظریے پر قائم رہتا ہے۔

اس افسانے میں شوکت حیات نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ''سرخ اپارٹمنٹ'' کی

دیواروں پر ضرب بھی پڑتی ہے۔ بنیادیں بھی ہلتی ہیں۔ عمارت گرتی بھی ہے۔ لوگ زخمی بھی ہوتے ہیں لیکن نظریہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ شوکت حیات کا اشارہ روس میں کمیونسٹ پارٹی کے خاتمے کی طرف ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگ ''سرخ عمارت'' کے انہدام کا ماتم منا رہے تھے لیکن ان کی نظر میں ایک آئیڈیل عمارت تھی۔

شوکت حیات اس افسانے میں اپنے نظریے کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' میں دو افسانے فساد کے موضوع پر ہیں۔ ''کہ'' اور ''تفتیش''، ''گھونسلہ'' میں زمین سے جڑنے کی کہانی ہے کہ صرف نئی نسل اپنی زمین سے نہیں کٹ گیا ہے جبکہ اس سے قبل کی نسل بھی اس سے دوچار ہے۔ ''کوبڑ'' میں دو بھائیوں کی کہانی ہے ایک اپنے فرض سے اتنا دب جاتا ہے کہ دوسرے بھائی کو اس کی پیٹھ پر کوبڑ نظر آتا ہے جبکہ دوسرا بھائی بدیس میں آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

افسانہ ''بانگ'' مزاحمتی افسانہ ہے۔ پولیٹری فارم کا مالک سرمایہ دار ہے اور مرغ زرخرید غلام۔ مالک کا حکم نہ بجالانے کی پاداش میں جنہیں ذبح کر دیا جاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ مرغ ایک ہو کر احتجاج کا جھنڈا بلند کرتے ہیں اور پولیٹری فارم کے مالک کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

شوکت حیات نے مرغوں سے بڑا کام لیا ہے کہ وہ اپنی چونچوں کو رفتہ رفتہ لمبا کرتے ہیں دربے کے پنجے سرنگ بناتے ہیں اور مختلف رنگوں کی مرغیوں کے ساتھ مل کر ایسا چوزہ تیار کرتے ہیں جن کی چونچیں زیادہ لمبی تھیں اور جب چوزوں کی فوجیں تیار ہو جاتی ہیں تو پولیٹری فارم کے مالک پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ شوکت حیات نے اس افسانہ میں فنکاری دکھائی ہے۔

افسانہ ''مادھو'' بھی ظالم اور مظلوم کی کہانی ہے۔ پریم چند کے کردار مادھو کو آج کے حالات میں پیش کر کے اس کردار کو زندہ کر دیا ہے۔ شوکت حیات نے زمیندار کے کتے کا خاتمہ مادھو کے ذریعہ کر دیا ہے جو ظلم کے خاتمے کا اعلان ہے۔

شوکت حیات کا افسانہ سچویشن سیریز بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ مہدی جعفر لکھتے ہیں:

> ''افسانے میں شخصیت کے ٹوٹنے کے ساتھ عصری ماحول کی شدت ایک آہنگ کے ساتھ نظر آتی ہے۔ یہاں ایک بات اور دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں فنکار پورے طور پر عملی حیثیت سے عصری حسیت میں جکڑا ہوا ہے اور ناظر جیسی کیفیت نہیں رکھتا۔ یہ افسانہ اور اس کے تسلسل میں پچھلے کچھ افسانے جن میں ''بانگ'' شامل ہے۔ عصری حسیت کو فنی طور پر قبول کرتے ہیں اور اس سے ایک مکمل آہنگ رکھتے ہیں۔''

اس طرح میں یہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوکت حیات نے اپنے ہم عصروں سے الگ راہ

بنائی۔ انامیت کی تھیوری پیش کی اور اس کو سامنے رکھ کر افسانے لکھے۔ انامیت کی وجہ سے ان کا ٹریٹمنٹ دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ ہو گیا اور اسی ٹریٹمنٹ کی وجہ سے وہ پہچانے جانے لگے۔ حالانکہ وہ اپنے افسانے کو انامیت کا نام نہ دے کر بھی افسانہ لکھتے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ لیکن وہ ایک نئی تھیوری اردو افسانہ کو دینا چاہتے تھے جو کامیاب نہ ہو سکی۔ ان کے علاوہ کسی نے اس تھیوری کو نہیں اپنایا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شوکت حیات موضوع، مواد اور ٹریٹمنٹ کی وجہ سے ایک منفرد افسانہ نگار میں شمار ہوتے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

Hanif Manzil
Koyli Pokhar, Police Line
Gewal Bigha, Gaya-823001 (Bihar)
Mob. 8084808032

شوکت حیات

شوکت حیات! میرے دوست!! تمہاری شکایت بجا تھی کہ اردو والوں نے تمہاری قدر نہیں کی۔ لیکن شاید تم اردو کے ادیب ہونے کے باوجود ناقدان اردو کی فطرت سے واقف نہیں تھے۔ یہ کسی کے نہیں ہوتے۔ یہ خود سے کسی پر کچھ نہیں لکھتے بلکہ ان سے لکھوانا پڑتا ہے۔ اور تم سے یہ کام نہیں ہو سکا۔ تم نے خود سے خود پر مضمون لکھ کر بھی نہیں چھپوایا نہ ہی اپنا لکھا ہوا کوئی مضمون کسی دوسرے کے نام سے شائع کروایا۔ تم نے پیسے دے کر خود پر ایم فل اور پی ایچ ڈی نہیں کروائی نہ ہی کسی رسالے میں خود پر نمبر نکلوایا۔ تم بس کہانیاں لکھتے رہے اور کہانیاں لکھتے لکھتے خود بھی کہانی ہو گئے۔

خیر! جو ہو ہوا سو ہوا۔ ''ثالث'' کے اگلے شمارے میں تم پر ایک بھرپور گوشہ شامل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اُردو والے اس خاص شمارے کی پذیرائی کس انداز میں کرتے ہیں۔

اقبال حسن آزاد

● خاکہ

● مشتاق احمد نوری

افسانے کا سکندر: شوکت حیات

۱

شوکت حیات کا نام ذہن میں آتے ہی یادوں کے ستارے جھلملانے لگتے ہیں اس چکا چوند میں یادوں کا انتخاب بہت جان لیوا ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بھولوں کیا یاد کروں۔

یادوں کی ساری قبریں کھلی ہوئی ہیں اور ہر قبر پکار رہی ہے مجھے یاد کرو۔ جستہ جستہ ہر یاد کو گرفت میں لینے کی کوشش کرونگا تا کہ شوکت حیات کو مکمل طور پر پیش کر سکوں۔ یہ بتا دوں کہ شوکت کے حیات کو سمیٹنا ایک مشکل امر ہے اور یہ وہی کر سکتا ہے جس نے ہر رنگ میں اسے دیکھا ہو۔

چلئے میں آپ کو ۱۹۷۳ء میں لے چلتا ہوں۔ تب میں مدرسہ یتیم خانہ ارریہ میں میتھ کا استاد ہوا کرتا تھا۔ میرے پاس سبزی باغ پٹنہ سے شایع ہونے والا اردو ویکلی عظیم آباد ٹائمز آیا کرتا تھا جس کے ادبی صفحے کی ادارت شوکت حیات کرتے تھے۔ ادبی سکشن میں کسی کی جدید کہانی جنسی عمل پر شایع ہوئی جس میں کچھ اس قسم کے جملے شامل تھے۔

''سخت شے نرم وجود سے ٹکرائی دونوں کے ران میں کچھ لسلسہ مادہ چپکنے کا احساس ہوا.....''

ایسے واہیات جملے تھے میں نے ایک طویل خط لکھا اسے کہانی تسلیم کرنے سے انکار کیا اور واضع طور پر لکھا کہ یہ ادب کے نام پر ذہنی عیاشی ہے جسے ادب میں بڑھاوا نہیں دیا جا سکتا۔ شوکت نے میرے خط کا جواب خط کے ساتھ شایع کیا اور میری رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ذہنی عیاشی نہیں ہے بلکہ ذہنی عیاشی یہ ہے کہ کرشن چندر ایر کنڈیشن ہال میں بیٹھ کر بنگال کے قحط پر افسانہ لکھے۔ سوال جواب کا سلسلہ کئی ہفتے چلا اور یہ تب بند ہوا جب عابد سہیل نے لکھنؤ سے میرے حق میں دلائل دیے۔ میری تحریر اور مدرسہ میں میری موجودگی کو دیکھتے ہوئے شوکت حیات نے مجھے بڈھا کھوسٹ اور مولویانہ ذہن والا قرار دے کر اپنی تسلی کر لی۔

۱۹۷۴ء میں میری آمد پٹنہ ہو چکی تھی میرا داخلہ پٹنہ یونیورسیٹی کے بی ایڈ کالج میں ہو چکا تھا

ساتھ ہی میں بی پی ایس سی کی تیاری میں بھی مصروف تھا۔ ایک شام میرے دوست نعیم فاروقی بک امپوریم میں کچھ رسائل دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میری ایک مزاحیہ کہانی الحسنات میں دیکھی جو کھلونا سے ڈائجسٹ ہوئی تھی۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے دوست نوری کی کہانی الحسنات میں شایع ہوئی ہے۔ شوکت حیات بھی وہیں کھڑے تھے میرا نام سن کر چونکے اور کہا۔

''یہ بڈھا کھوسٹ مولوی آپ کا دوست کیسے ہو سکتا ہے''

تب نعیم نے جواب دیا نوری مجھ سے ایک سال جونیئر ہے اور افسانے پر اس کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ شوکت کے اندر تجسس جاگا اس نے کہا۔ مجھے نوری سے ملنا ہے۔ نعیم نے بتایا کہ وہ پٹنہ میں ہے اور وہ آپ سے بسکو مان کے دفتر میں مل لے گا۔ میں نے کئی بار بسکو مان کا چکر لگایا۔ لوگوں نے ایک داڑھی والے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان سے مل لیں وہی شوکت کے بارے میں بتائیں گے۔ اس نوجوان کا نام احسن شخصی تھا اور وہ شاعری بھی فرماتے تھے۔ بہر حال کئی چکروں کے بعد حضرت شوکت حیات مجھے مل گئے جیسے ہی میں نے اپنا نام نام بتایا کرسی سے اٹھے اور مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''ارے یار خوب ملاقات ہوئی۔ میں نے تو آپ کو بڈھا سمجھ رکھا تھا۔''

اس کی آواز میں رعب کے ساتھ خلوص کی گرمی بھی تھی۔ پھر مجھے لے کر نیچے آیا ہم لوگوں نے چائے پی اور گفتگو کا پٹارہ کھول کر بیٹھ گئے۔ اس نے بتایا کہ وہ ٹریڈ یونین کا لیڈر بھی ہے اس لیے کام کم نیتا گری زیادہ کرتا ہے۔ وہ ملاقات بہت خوشگوار رہی اور ہم دوست بن گئے۔ پھر آپ کی منزل سے اتر کر تم کے مسند پر براجمان ہو گئے۔

۲

شوکت حیات خود کو سن ستری (۱۹۷۰ء) کا افسانہ نگار سمجھتا تھا۔ بہار میں اس کے ہم عصروں میں عبدالصمد، حسین الحق، شفق، علی امام اور راقم الحروف کے علاوہ اور بھی کئی اہم افسانہ نگار شامل تھے۔ شوکت کو ان میں امتیاز حاصل تھا اس لیے اسے سن ستری کا سرخیل بھی سمجھا جاتا تھا۔

اس کی شخصیت کافی مرعوب کن تھی۔ بڑا سر کشادہ پیشانی چوڑا چہرہ دراز قد اور گرجدار اور مرعوب کن آواز جسے سنتے ہی مقابل خواہ مخواہ سحر میں مبتلا ہو جائے۔ وہ خود کو انانیت کا امام سمجھتا تھا اور جب بھی جدید فکشن پر گفتگو کرتا تو اپنے سامنے آینہ رکھ لیتا خود کے علاوہ اسے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ اپنے ہم عصروں کو پڑھتا ہی نہ تھا یہ بات اس نے خود مجھے بتائی اور یہ بھی کہا کہ سلطان بھائی نے تاکید کی کہ کسی ہم عصر کو نہ پڑھو تا کہ تمہاری تحریر کسی سے متاثر نہ ہو۔ وہ اپنے سحر میں مبتلا تھا اور حد درجہ نرگیسیت کا شکار تھا۔ ایسے لوگ سماج سے کٹ کر تنہا ہو جاتے ہیں اور بعد میں احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ شوکت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے یہ بات زندگی بھر سالتی رہی کہ

اس کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جو اس کا حصہ تھا۔ اس غم نے اندر تک اسے ہلا کر رکھ دیا۔ جب عبدالصمد کو ان کے پہلے ناول دوگز زمین پر ساہتیہ اکادمی انعام ملا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور اس نے یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ یہ غلط فیصلہ ہوا ہے۔ ۱۹۹۰ء کے دسمبر میں میں کابینہ منسٹر کا سیکریٹری بن کر پٹنہ آ چکا تھا تو اس سے تواتر سے ملاقات ہونے لگی۔ اس دوران اس نے مجھ سے بھی شکایت کی اس سلسلے میں میری کیا رائے ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میری خوشی کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی کہ ایوارڈ بہار کو ملا دوسری کہ فکشن کو ملا تیسری یہ کہ میرے ہم عصر کو ملا۔ وہ بہت چیں بجبیں ہوا۔ پھر بولا ''اس ناول کو ملنا چاہیے تھا؟'' میں نے جواب دیا کہ اگر تمہاری کوئی کتاب مقابل ہوتی تو اسے نہیں ملنا تھا۔ اسکی انا کی تھوڑی تسلی ہوئی تب میں نے کہا کہ دوگز زمین پر بحث کرو اس کی دھجی اڑاؤ اور دل کی تسلی کر لو۔ میں جانتا تھا کہ اس نے یہ ناول پڑھا ہی نہیں ہے۔ اس نے پوچھا تم نے ناول پڑھ لیا؟ میرے اثبات میں سر ہلاتے ہی اس نے پوچھا کہ اس میں کچھ خامی نہیں ہے۔ میں نے بتایا کہ سب سے بڑی خامی یہ ہے پورے ناول کا تانا بانا بہار شریف کی سرزمین کے اردگرد بنا گیا ہے لیکن اس میں ایک بھی جگہ مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر نہیں آیا۔ یہ سن کر وہ جوش میں آ گیا اور اپنا دایاں مکا بائیں ہتھیلی پر مارتے ہوئے بولا۔ '' یہی تو وو.....''

وہ ایک عرصہ تک صمد کی دشمنی میں مبتلا رہا۔ میں جب پہلی بار ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء تک بہار اردو کا سکریٹری تھا تو اس کے مجموعہ بانگ پر اشاعتی امداد منظور ہوئی تھی جو اسے دے دی گئی لیکن اس نے کتاب کی اشاعت نہ کی میں جب ۲۰۱۵ء سے ۲۰۱۸ء تک دوبارہ سکریٹری بنا تو شوکت کے گھر جا کر کہا کہ تم اکادمی کی پرانی گرانٹ واپس کر دو (جو ایک معمولی رقم تھی) اور پھر سے مسودہ جمع کر دو اس بار ضخامت زیادہ رکھو اچھی خاصی رقم مل جائے گی اور تمہارا مجموعہ آ جائے گا۔ وہ میری باتیں بہت دھیان سے سنتا لیکن کرتا وہی جو اس کے من میں آتا۔ چھ مہینہ بعد اس نے بڑی معصومیت سے کنفیس کیا کہ میں یہ سوچتا رہا کہ جو میرے دشمن (عبدالصمد) کا دوست ہے وہ میرا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟

شوکت حیات اردو فکشن کا مرد تھا لیکن اندر سے بہت ٹوٹا ہوا تھا ایک ہی غم تھا کہ اس کی وہ پذیرائی نہیں ہو سکی جو اس کا مقدر تھی۔ جب میں نے مجموعے کی اشاعت پر زور دے کر کہا کہ جب تک تمہارا مجموعہ نہیں آئے گا تب تک تمہارے فکشن کا مجموعی مطالعہ کیسے ہوگا تو بہت معصومیت سے بولا۔

''بھیوا! ایک بات بتاویں، مجھ سے اپنے افسانوں کا انتخاب ہی نہیں ہوتا۔''

یہ سن کر اس کی معصومیت پر ترس آیا اور میں نے کہا کہ کسی سنڈے میں خود تمہارے گھر آتا ہوں اور میں خود انتخاب کر دوں گا۔ یہ سن کر بہت خوش ہوا میرا ہاتھ دبایا لیکن وہ دن کبھی نہیں آیا کیونکہ اسے نہ خود پہ اعتماد تھا نہ دوسروں پہ بھروسہ۔

۳

ایک بار میں نے شوکت سے پوچھا کہ اسے بسکومان میں کتنی تنخواہ ملتی ہے اس نے بتایا تنخواہ مکمل نہیں ملتی بس اسٹائپنڈ کے نام پر دو چار ہزار مل جاتی ہے۔ مجھے ہر ماہ مل جاتی ہے کہ میں ٹریڈ یونین کا لیڈر ہوں۔ دوسروں کو وقت پر یہ بھی نہیں ملتی۔ میں نے کہا کہ تم کہیں اور ڈپی ٹیشن پر کیوں نہیں چلے جاتے۔ اس نے مجھے ایک سرکولر دکھایا جس میں سرکار کا فیصلہ تھا کہ ایسے گھاٹے میں چلنے والے اداروں کے کرمچاریوں کو دوسرے محکمے ضرورت کے مطابق اپنے یہاں ایبزرو کر سکتے ہیں۔ میں نے سرکولر کے ساتھ اسے اپنے فلیٹ پر بلایا۔ اسے بتایا تم میرے محکمہ میں آ جاؤ۔ میرے یہاں ''بہار کی خبریں'' کے ایڈیٹر کی پوسٹ خالی ہے۔ میں چونکہ چیف ایڈیٹر بھی ہوں اس لیے تمہیں وہاں ایڈجسٹ کروا دوں گا۔ پھر پہلا پروموشن اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر ہو جائے گا۔ گیزیٹڈ پوسٹ سے ریٹائر کرو گے۔ عزت بنی رہے گی۔ یہ سن کر وہ جذباتی ہو گیا میری دونوں ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر مجسم ممنونیت کا اظہار یوں کیا۔

''بھیوا! اگر یہ ہو جائے تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔''

میں نے کہا کہ اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو تمہارا حق ہے۔ میرے محکمہ کو تم جیسے شہرت یافتہ افسانہ نگار کی خدمات مل جائیں گی اور اردو رسالے کی قسمت چمک جائے گی۔

اسی وقت میں نے اس کی جانب سے وزیر کابینہ کو سرکاری سرکولر کے ساتھ ایک درخواست لکھی اور اردو کے ایڈیٹر کی پوسٹ پر شوکت حیات نے خود کو ایڈجسٹ کرنے کی گزارش کی۔ اس درخواست کے ایک گوشے پر میں نے وزیر کابینہ کی جانب سے سکریٹری کے نام ایک واضع حکم نامہ تحریر کیا اور نیچے وزیر کا نام لکھ دیا۔ شوکت حیات کو یقین نہیں آیا۔

''اس حکم نامے پر منسٹر دستخط کر دیں گے؟''

میں اسے لے کر سیدھے وزیر کے چیمبر میں گیا۔ شوکت حیات سے ملوا کر مختصر بریف کیا اور پہلے سے لکھے حکم نامے پر ان سے دستخط کروایا۔ دفتر کی مہر لگوا دی۔ پھر سیدھے سکریٹری کے چیمبر گیا۔ ان سے اس درخواست کو ڈائرکٹر کے نام انڈورس کروایا۔ ڈائرکٹر سے سیدھے جوانٹ ڈائرکٹر اسٹیبلشمنٹ شری بندیشوری بابو کو مارک کرا کر درخواست انہیں تھماتے ہوئے کہا۔

''میرے دوست کا معاملہ ہے اسے فیوریبل ڈیل کر دو۔''

وہ میرے بیچ میٹ تھے اور اس بیچ کا ٹاپر میں تھا اس لیے محکمہ میں عزت بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کا چیمبر ایک ہی کمرے میں تھا۔ اس دوران شوکت حیات بالکل بت بنا ہر لمحہ میرے ساتھ رہا۔ پھر میں نے

اسے اپنے سامنے کی کرسی پر بیٹھا کر آڈر لی کو تین کپ چائے لانے کہا اور ایک گلاس پانی شوکت حیات کو پیش کیا جسے وہ غٹا غٹ پی گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''بھیوا ! اتنا جلدی تم نے ہفتوں کا کام گھنٹوں میں کروالیا اب سب ہو جائے گا، نا؟''

چائے آ گئی۔ وہ کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی بندیشوری بابو کو پھر بندیشوری نے شوکت سے کہا۔

''شوکت جی! بابا کے کام کی رفتار دیکھ لی آپ نے۔ اب اطمینان رکھئے۔ سمجھئے آپ ایڈیٹر ہو گئے۔'' محکمہ کے لوگ مجھے بابا کہہ کر ہی بلاتے تھے۔

شوکت حیات مطمئن ہو کر واپس گیا۔ نیچے سے اسسٹنٹ اور سیکشن آفیسر نے اپنا نوٹ لکھا۔ بندیشوری نے مجھ سے کہا کہ یار یہ فائل کیسے بنے گی؟ مجھے بتاؤ۔ میں نے کہا چونکہ میں ہندی انگریزی اور اردو تینوں رسالے کا چیف ایڈیٹر ہوں اس لیے مکھ سمپادک اردو سے اس کی رائے مانگ لو۔ اس نے مجھے فائل انڈورس کر دیا۔ میں نے شوکت حیات کی قابلیت اس کی اہمیت اور محکمہ کی ضرورت کو پیش نگاہ رکھ کر شاندار نوٹ لکھا۔ اس کی فوٹو کاپی رکھ لی۔ کچھ دن بعد شوکت حیات سلطان اختر کے ساتھ میرے چیمبر میں آیا۔ سلطان بھائی جیل محکمہ میں سیکشن آفیسر تھے۔ انہوں نے جب میرا نوٹ دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ سلطان بھائی نے کہا اتنی باجواز ٹپنی میں بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ شوکت کے ایک ساڑھو بھی سکریٹریٹ میں سیکشن آفیسر تھے۔ انہوں نے بھی میرا نوٹ پڑھ کر کہا کہ ایسا فیوریبل نوٹ لکھنا بہت مشکل ہے۔

۴

اُس زمانے میں میرے محکمہ میں انجم عالم نام کا ایک اسسٹنٹ کام کرتا ہے اور وہ بہت ذہین بھی تھا۔ اردو رسالے میں نائب مدیر کی جگہ اس کا نام جاتا تھا۔ اردو سکشن میں بہت سا کام ہوتا جس میں وہ الجھا رہتا اور ادارتی ذمہ داری ٹھیک سے نبھا نہیں پاتا۔ جب شوکت حیات کا نام آگے بڑھا تو وہ بہت ایکٹو ہو گیا کیونکہ وہ پرموشن سے ایڈیٹر کے پوسٹ پر جانا چاہتا تھا جبکہ اصول کے مطابق سنگل پوسٹ کو پرموشن سے نہیں بھرا جا سکتا اسے سیدھی نیگتی سے ہی بھرنا تھا۔ فائل بڑھی تو انجم نے ڈپٹی سکریٹری کے یہاں آبجکشن لگوا دیا اور پھر بڑا بابو سے اپنے پرموشن کی بات بڑھا دی جوائنٹ ڈائرکٹر کے پاس فائل آئی تو اس نے پھر مجھ سے کہا

''بابا اس فائل کو دیکھ لو۔ گڑبڑا گئی ہے۔ اسے پھر سے پوزیٹو بناؤ۔''

میں نے پھر سرکاری سرکولیشن کو رکھتے ہوئے شوکت کی پوزیشن مضبوط بنائی اور انجم کی دعویداری کو رد کرتے ہوئے ایک بھرپور نوٹ لکھا۔ میرے ہی نوٹ کو جوائنٹ ڈائرکٹر نے ڈائرکٹر کو مارک کر دیا۔ اپنے نوٹ کی فوٹو کاپی رکھ لی۔ اب شوکت حیات سلطان بھائی کے ساتھ میرے یہاں اکثر آنے لگا۔ میں نے

اسے سب بتایا۔ اس نے میرا نوٹ پڑھا اور دونوں نے داد دی۔ کچھ دن بعد شوکت کا فون آیا۔

''یار نوری تمہارا شکریہ۔ میرے ساڑھو تمہارا نوٹ پڑھ کر کہہ رہے تھے ایسا نوٹ کوئی آفیسر بھاری رشوت لیکر بھی نہیں لکھ سکتا۔'' اس نے پھر کہا۔

''بھیوا ! لگے رہو۔ ان شاء اللہ تمہاری مدد سے میری بحالی ایڈیٹر کی پوسٹ پر ضرور ہو جائے گی۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا اور یہ بھی کہا کہ بڑا بابو کی مٹھی گرم کر دو تا کہ وہ تمہارے خلاف آئندہ سے نہ لکھے۔

سکریٹریٹ میں فائل کا موومنٹ بہت مشکل ہوتا ہے ہر جگہ پیپر ویٹ رکھنا پڑتا ہے تا کہ فائیل مخالف سمت میں اڑ نہ جائے۔ انجم نے ہار نہیں مانی اور اس بار منسٹر کے یہاں سے کوئیری کروا دی پھر فائل نیچے آ کر ڈمپ ہو گئی۔ میں نے اسٹیبلشمنٹ کلرک کو بلا کر فائل کو بہتر ڈھنگ سے لکھنے کی تاکید کی۔ فائل بڑھی لیکن رفتار قدرے سست رہی۔ ہر بار بندشوری بابو مجھ سے رائے لیتے اور میرے نوٹ کو آگے بڑھا دیتے۔ میں جو بھی لکھتا اس کی کاپی شوکت کو دے دیتا تا کہ اسے اطمینان ہو جائے۔

اس دوران دو باتیں ایک ساتھ ہو گئیں۔ میرا ٹرانسفر پٹنہ ڈویزن میں جوائنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر ہو گیا اور بندیشوری پرسادو گیا پن کے جوائنٹ ڈائرکٹر ہو گئے۔ ان کی جگہ میرا ہی ایک بیچ میٹ آ گیا جو بنا رشوت کے ایک بھی فائل نہیں لکھتا تھا۔ رشوت نہ ملنے پر ڈائرکٹر کو یہ لکھ کر فائل انڈورس کرتا۔

''اُچت نر نے لینا چاہیں گے۔''

اب شوکت حیات کی فائل قدرے ڈولنے لگی۔ میں شوکت کو لے کر اس کلیگ کے چیمبر میں گیا اور بتایا کہ یہ میرا دوست ہے۔ ادب کا بڑا نام ہے اس کے آنے سے اردو رسالہ بہت معیاری ہو جائے گا۔ پھر میں نے ایک گیم کھیلتے ہوئے شوکت سے کہا۔

''شوکت یہ صرف میرا بیچ میٹ ہی نہیں ہے بلکہ سب سے ایماندار آفیسر ہے..... بالکل سنت مہاتما جیسا۔ خبردار انہیں کبھی رشوت دینے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ ان کی آتما کو تکلیف پہونچے گی اور تمہارا کام بگڑ جائے گا۔''

پھر کلیگ سے کہا دیکھتے رہنا یار۔ میں اب ہوں نہیں تم ہی دیکھ لینا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اطمینان رکھو شوکت جی کا کام نہیں بگڑے گا۔ میں نے سکریٹری صاحب کو بھی بریف کر دیا اور مطمئن ہو گیا۔ اس دوران پھر دو باتیں ایک ساتھ ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بعد شوکت حیات میرے فلیٹ پر آیا اور بہت ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''یار نوری اب تم میری پیروی چھوڑ دو بلکہ اینٹی کر دو'' مجھے حیرت ہوئی۔ جب بہت کریدا تو اس نے معصومیت سے کہا۔

''مجھے انجم نے بتایا ہے کہ ایڈیٹر کی بحالی کے لیے ویکینسی بہار پبلک سروس کمیشن کو بھیج دی گئی ہے۔جلد ہی بحالی ہوگی۔اگر میں بحال بھی ہوگیا تو مجھے ہٹا دیا جائے گا پھر میں اپنے محکمہ کا بھی نہیں رہوں گا۔''

شوکت کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ اندر سے بہت معصوم تھا اور منفی بات بہت آسانی سے مان لیتا تھا۔میں نے صاف لفظوں میں کہا کہ میں اینٹی کرنا تو دور پیچھے بھی نہیں ہٹوں گا اور اپنی کوشش جاری رکھونگا۔ اس سے یہ بھی بتایا کہ کوئی ویکینسی کہیں نہیں بھیجی گئی ہے۔کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ پوری فائل انجم عالم کے فیور میں بڑھی اور شوکت کی دعویداری کو درکنار کر دیا گیا۔جب فائل سکریٹری کے پاس پہنچی تو انہیں میری بات یاد تھی۔انہوں نے فائل پر لکھا۔

''اس سمبندھ میں شری نوری سے رائے لی جائے۔''

فائل نیچے آئی اور بڑا بابو نے ایک ٹیکنیکل نکتہ اٹھا دیا۔انہوں نے واضح طور پر لکھا۔

''سچیوالے کی سنچیکا پر چھیتر یہ پدھادھیکاری کی ٹپنی نہیں لی جاسکتی۔''

اس نکتے میں جان تھی اور سب نے اسی پوائنٹ کو سکریٹری تک پہنچا دیا۔سکریٹری صاحب سے میرے اچھے تعلقات تھے۔انہوں نے فون کر کے پٹنہ ڈویزن سے مجھے بلوایا اور فائل میرے سامنے رکھ دی۔تھوڑی دیر کے لیے میں بھی چکرا گیا لیکن میں نے ایک جینوین نکتہ نکالا۔

''سر بڑا بابو نے اصولاً درست لکھا ہے لیکن میری پوسٹنگ پٹنہ ڈویزن کے علاوہ سکریٹریٹ کی بھی ایک پوسٹ پر ہے۔میں ابھی بھی اردو میگزین کے چیف ایڈیٹر کے عہدے پر قائم ہوں۔''

وہ بہت خوش ہوئے اور فائل سیدھے مجھے انڈورس کرتے ہوئے لکھا۔

''میں مکھ سمپادک اردو کی رائے سے انوگرہت ہونا چاہوں گا۔''

فائل سیدھے مجھے دی اور کہا کہ اسے بنا کر سیدھے مجھے دو۔

میں وہ فائل لے کر سیدھے اپنے دفتر آیا اور اپنے اسٹینو کو مکمل نوٹ لکھایا۔شوکت حیات کی امیدواری کو جائز ٹھرایا اور اسے درست کر کے سیدھے سکریٹری کو انڈورس کر دیا۔اس کی بھی کاپی رکھ لی۔یہ اس فائل پر میرا آخری نوٹ تھا۔اسے بھی شوکت کو بلا کر دے دیا وہ پڑھ کر مجھے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔بس اتنا ہی کہا۔

''تم جیسا دوست قسمت والوں کو ہی ملتا ہے۔''

اس دوران شوکت کے رویے میں ایک عجیب سی تبدیلی میں نے محسوس کی۔جب بھی کوئی بڑے ادیب پٹنہ آتے وہ ان کی دعوت کرتا۔مجھے ضرور بلاتا اور اس ادیب سے کہتا کہ نوری سے میری پیروی کر دیجئے کہ میری بحالی ایڈیٹر کی پوسٹ پر ہو جائے۔جوگیندر پال،مظہر امام سب سے اس نے مجھے پیروی

کرنے کہا۔مجھے حیرت ہوتی میں جواب دیتا کہ میں نے جتنی کاوش کی ہے اس کی کاپی شوکت کے پاس موجود ہے۔مزے کی بات یہ کہ وہ میرے نوٹ ان لوگوں کو دکھا بھی دیتا لیکن پھر گہار لگاتا کہ نوری چاہ لے گا تو میرا ہو ہی جائے گا۔سچ پوچھئے تو میں ایسی پیروی کو اپنے لئے گالی تصور کرنے لگا۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شوکت آخر ایسا کیوں کر رہا ہے۔اسی دوران خدا بخش اورینٹل اردو لائبریری میں بہت بڑا ادبی جلسہ تھا۔ہندوستان بھر کے ادیب تشریف لائے تھے۔صبح صبح عبدالصمد کا فون آیا۔

''علی گڑھ سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی تشریف لائے ہیں۔وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں شاید کوئی بے حد اہم گفتگو کرنی ہے۔میں نے آپکا نمبر انہیں دے دیا ہے۔فون کریں تو گفتگو کر لیجئے گا۔''

میرے پاس قاسمی کا نمبر تھا۔میں نے رنگ نہیں کیا۔پہلے دن کا پروگرام بہت کامیاب رہا۔ سارے ادیب رات کا کھانا کھا کر گارڈن میں گھوم رہے تھے۔اتنے میں بھائی قاسمی کی نظر مجھ پڑی۔وہ لپک کر میرے پاس آئے مجھے کھینچتے ہوئے ایک گوشے میں لے گئے اور کہا۔

''نوری بھائی بیچارہ شوکت حیات بہت گڑگڑا رہا تھا کہ نوری چاہیں گے تو اس کی آپ کے محکمہ میں ایڈیٹر کے عہدے پر بحالی ہو جائے گی۔''

میں نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا کہ میں ہی تو اس کے لیے سب کر رہا ہوں۔اب تک اس کی فائل میری وجہ سے ہی بنی ہوئی ہے پھر ہر کسی سے میرے یہاں پیروی کروا کر وہ میری تذلیل کیوں کروا رہا ہے یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

پھر میری کھوپڑی گھوم گئی۔میں دندناتا ہوا آیا اور شوکت حیات کو بے نقط سنانے لگا۔شدید غصے کی حالت میں اکثر میں الف ننگا ہو جاتا ہوں اور کیا کیا بک جاتا ہوں مجھے معلوم نہیں رہتا۔ایک جیوتش نے میری ہتھیلی دیکھ کر بتایا تھا کہ شدید غصے کے ایک منٹ کے اندر میں کسی کا قتل بھی کر سکتا ہوں۔بس میں نے شوکت کا قتل نہیں کیا باقی سب کچھ کر دیا۔قربان جایئے شوکت حیات پر کہ وہ سر جھکائے سب سنتا رہا ایک لفظ بھی جواب نہیں دیا۔جبکہ وہ اتنا اگریسو تھا محفلوں میں ادیبوں کے کالر پکڑ لیتا تھا۔پٹنہ کے قبرستانیہ چائے خانے میں کتنے ادیب شوکت سے مار کھا چکے تھے۔مہمانوں میں سارے ادیب شوکت کو جانتے تھے لیکن سب مجھ سے واقف نہیں تھے۔اس دوران سلطان اختر نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور شوکت حیات کے سامنے سے کھینچ کر الگ کرتے ہوئے کہا۔اب چلئے بھائی مجھے اسٹیشن تک چھوڑ دیجئے مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے۔میں راستے بھر بھناتا رہا اور سلطان بھائی سوچتے رہے کہ ساری پیروی جب خود نوری ہی کر رہا ہے تو اس سے پیروی کروانے کی کیا تک ہے۔دوسرے دن کے پروگرام میں طبیعت کی گھٹن کی وجہ سے میں نہیں گیا لیکن

یہ بات چرچا میں رہی کہ اتنا اگریسو شوکت حیاب بغیر ایک لفظ نکالے چپ چاپ کیسے رہ گیا۔

ہفتہ دس دن بعد شمس الرحمٰن فاروقی ایک ادبی پروگرام میں پٹنہ تشریف لائے۔ جس شام انہیں جانا تھا سہ پہر کی چائے پر میں نے انہیں مدعو کیا۔ ساتھ ہی پٹنہ سارے اہم ادیبوں کو بھی دعوت دی۔ شوکت حیات کو بھی فون کر آنے کی تاکید کی۔ سب آئے۔ شوکت حیات گم سم بیٹھا تھا۔ پھر اس نے میرے پاس آ کر سرگوشی کی۔

''اس دن تمہارا غصہ جائز تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی بھر کے لیے تم سے دوستی ختم ہوگئی لیکن مجھے بلا کر تم نے مجھے بونا کر دیا۔''

میں نے بھی اپنے غصے کے لیے اس سے معذرت کا اظہار کیا اور یہ وجہ پوچھی کہ جب تمہارا سارا کام میں خود کر رہا تھا تو تم سب سے مجھے پیروی کروا کر ذلیل کیوں کر رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہا اور بڑی معصومیت سے میرا دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''یار میرے ساڑھو نے کہا کہ جب نوری کی گرفت سکریٹری تک ہے تو تمہارے نہیں ہونے کی وجہ نوری ہی ہے۔ وہ اگر چاہ لیتے تو تمہارا ضرور ہوتا وہ اندر سے تمہارے خلاف ہے۔ میں ان کی باتوں میں آ گیا۔ اس لیے سب سے تمہیں پیروی کرانے لگا۔''

اس کی حماقت بھری معصومیت پر مجھے بہت غصہ آیا اس کے ساڑھو کو کچھ گالیاں دیں اور اسے کہا کہ بھولے راجہ دوستوں کو پہچاننا سیکھو ساڑھو کی گانڑ پر لات مارو۔

اس کے دل سے کدورت نکل گئی۔ اُدھر فائل پر میرے نوٹ پر سکریٹری نے اپنا نوٹ دیا۔ اس زمانے میں وزیر شکیل احمد خان تھے۔ شوکت نے کہا وہ منسٹر سے پیروی کر سکتا ہے کہ اس کے مراسم اچھے ہیں۔ اس نے پیروی کی لیکن وزیر نے ان سنی کر دی۔ فائل پر انہوں نے کچھ ایسا لکھ دیا کہ نہ شوکت کا ہوا نہ انجم کا وہ ایڈیٹر کی پوسٹ ہنوز خالی ہے۔

۵

شوکت حیات نے پاٹلی پترا کے اجیلا شا اپارٹمنٹ میں ایک فلیٹ خریدا۔ میں دس پندرہ دنوں بعد ہی جادھمکا اسے حیرت ہوئی کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔ اس زمانے میں نوٹر ڈیم گرلس ہائی اسکول میں ہم لوگوں کی فوٹو گرافی کی پندرہ دنوں کی تربیتی کورس چل رہی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مجھے ظہر کی نماز کی دقت ہوتی تھی میں لٹن آور میں شوکت کے یہاں آ جاتا اور اطمینان سے ظہر کی نماز ادا کرتا اور تھوڑی دیر آرام کر کے واپس تربیت گاہ پہنچ جاتا۔ میں جب بھی شوکت کے یہاں آتا اسے اور ماں بیٹے کو دین کی ترغیب دیتا۔ ایک دن شوکت نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

''بھیوا! ایک ویڈیو دیکھو۔''

پھر اس کے بیٹے نے ٹی وی میں ایک کیسیٹ لگایا۔ منظر قدرے دھندلا تھا لیکن فجر کی اذان کوئی پاٹدار آواز میں دے رہا تھا۔ شوکت نے بتایا کہ اس اذان کے لیے اس نے رات بھر انتظار کیا اور مسجد جا کر اس نے فجر کی اذان دی اور نماز بھی ادا کی۔ مجھے واقعی بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے اسے گلے لگا لیا۔ کچھ دنوں تک نماز کی پابندی ضرور ہوئی لیکن پھر وہی پرانی ڈگر پہ لوٹ آیا۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ اس نے ذہنی توازن کھو دیا ہے۔ میں ملنے پہنچا تو بہت پاٹ دار آواز میں کسی نامعلوم شخص کو گالیاں دیتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ایک صبح اس کے دروازے پر کبوتر کے اُجلے پر کے ساتھ خون کے تازہ چھینٹے نظر آئے۔ اس نے بتایا کہ کسی مادر..... نے اس کے گھر پہ سحر کر دیا ہے۔ میں اسے ایک روحانی مرکز پہ لے گیا جہاں کی ترکیب سے اس میں نارملسی نظر آنے لگی لیکن اس کا بے تحاشا بولنا کم نہ ہوا۔ میں جب اسے فون کرتا تو سکون سے کہیں بیٹھ جاتا کہ گھنٹہ بھر سے کم گفتگو نہ کرتا۔ میں سوچتا چلو اسی بہانے اس کے اندر کا فرسٹریشن باہر تو آ جاتا ہے۔ کچھ مہینوں بعد معلوم ہوا کہ اسے کانکے رانچی کے پاگل خانے میں بھرتی کر دیا گیا ہے۔ کئی ماہ کے علاج کے بعد اس کی واپسی ہوئی لیکن وہ گم سم رہنے لگا۔ گھر میں قید ہو کر رہ گیا۔ میں کبھی کبھار جاتا اور دلجوئی کر کے آ جاتا۔ بھابھی بہت پریشان تھیں۔ ساری کیفیت ان سے معلوم ہو جاتی۔

ایک بار ملنے گیا تو دیکھا اس کے گلے میں رودرا کچھ کی مالا ہے۔ دونوں کلائی میں ویسی ہی مالا پہنے ہوئے ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا تو بولا کہ میرے زیادہ تر دوست ہندو ہیں۔ انہوں نے قلبی سکون کے لیے پہنا دیا ہے۔ پھر بڑی دقتوں سے میں نے وہ مالا اپنے ہاتھ سے کر کاٹ کر نکالی اور اس کے گلے میں ایک ایسی تسبیح ڈال دی جس کے ہر دانے پر اللہ اور محمد لکھا ہوا تھا اور امام پر پورا کلمہ درج تھا۔ میں نے بتایا کہ یہ تسبیح اجمیر شریف سے خاص تمہارے لیے منگوائی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ تسبیح کو چوما اور میرا شکریہ ادا کیا۔

۲۰۰۲ء میں میرا ٹرانسفر سارن ڈویزن میں جوائنٹ ڈائیرکٹر کے عہدے پر ہو گیا۔ پھر میں ہر سنیچر کی شام پٹنہ پہنچتا اور سموار کی صبح بس سے سارن نکل جاتا۔ ۲۰۰۸ء یا ۲۰۰۹ء کے اواخر میں وہ علی نگر میرے ڈیرہ پر آیا اور کاغذ کا کچھ پلندہ مجھے تھماتے ہوئے بولا۔

''میری ایک کہانی ''ذائقہ'' دہلی کے ذہن جدید میں شایع ہوئی تھی۔ مونگیر کے اقبال حسن آزاد نے مونگیر کے ادیبوں کو جمع کر میری کہانی کو کنڈیم کیا اور وہاں سے آٹھ دس لیٹر میری مخالفت میں زبیر رضوی کو لکھے اور زبیر نے سارے خطوط اپنے رسالے میں شایع کر دیے۔ میری بہت کرکری ہو رہی ہے۔ تم ان خطوط کو پڑھو اور کسی طرح مجھے بچاؤ۔''

میں نے کہا خطوط قاری کی رائے ہوتی ہے اسے رد کرنا مناسب نہیں۔ میں نے تمہاری کہانی نہیں پڑھی ہے۔ وہ کہانی مجھے دو تب میں غور کرونگا کہ تمہارا بچاؤ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اسی دن شام کو اس نے ''ذائقہ'' کی فوٹو کاپی مجھے لاکر دے دی۔ میں نے کہانی پڑھی تو میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ سولہ سال کے بیٹے اور بتیس سال کی ماں کے ساتھ جنسی اختلاط تھا جسے وہ مجھے سنبھالنے کہہ رہا تھا۔ میں نے کہانی پٹنہ میں رکھ دی خطوط بالکل نہیں پڑھے اور دوسری صبح سارن چھپرا روانہ ہوگیا۔

اس زمانے میں کہانیوں پر میرے جارحانہ تبصرے کی دھوم تھی۔ عبدالصمد، شوکت حیات، شفق، شموئل احمد اور انیس رفیع کے افسانوں کا پوسٹمارٹم کر چکا تھا۔ وہاب اشرفی کے مباحثہ کے ہر شمارے میں میرا تجزیہ شایع ہوتا اور خطوط کے کالم تعریفی خطوط سے بھرے ہوتے۔ اسی کے پیش نظر شوکت نے مجھے ''ذائقہ'' تھما دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ۔

ایک سنیچر کو میں دوپہر میں پٹنہ آگیا بیگم نے بتایا کہ ان کی امی کی طبیعت بہت خراب ہے اس لیے وہ بیٹی کو لیکر مظفر پور چلی گئیں۔ رات میں نے شوکت کی کہانی نکالی اسے دوبارہ پڑھا طبیعت مزید مکدر ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہانی کو کس طرح بچاؤں؟ لیکن معاملہ دوستی کا تھا ذہن کے گھوڑے دوڑنے لگے اور لگنے لگا کہ اس کہانی کے رخ کو موڑا جاسکتا ہے۔ صبح کی چائے کے بعد ایک پرانے چاقو پر نظر پڑی۔ دھار میں زنگ لگا ہوا تھا۔ اسے تیز کرنے میں جٹ گیا۔ تیز چاقو رکھنا میرا پاگل پن ہے۔ ایک سے ایک چاقو میرے پاس ہے۔ AK47 رائفل کے کندہ پر لگنے والا خطرناک چاقو کے ساتھ بے شمار تیز دھار والے چائینیز چاقو میرے پاس ہیں اور ہر سفر میں ایک دو میرے پاس ہوتا ہے بلکہ ایک بے خطرناک چاقو میری جیب میں ہوتا ہے جو ایک ہی وار میں گردن کی ساری نسیں کاٹ سکتا ہے۔ لوگ وجہ پوچھتے ہیں تو سیب اور امرود کاٹنے کا جواز بتا دیتا ہوں یہ نہیں بتاتا کہ موب لنچنگ کے وقت یہ دو چار دس کو حلال کرسکتا ہے۔ تو میں پرانے چاقو کی دھار تیز کرتے ہوئے اس کی نوک پر توجہ دے رہا تھا۔ ذرا سی بد احتیاطی سے پوری نوک میرے دائیں انگوٹھے میں اندر تک کھب گئی۔ خون کی دھار نکل گئی۔ کسی طرح ڈیٹول کاٹن کی مدد سے پٹی کردی لیکن درد سے جان نکلی جارہی تھی۔ ساتھ ہی ذائقے کے ڈائمنشن پھیلتے جارہے تھے اور میں لکھنے سے مجبور تھا۔ بیگم ہوتیں تو انہیں ڈکٹیشن دے دیتا لیکن ان کی غیر موجودگی میں مجھے وہی احساس ہورہا تھا جو ڈیلیوری کے آخری وقت میں کوئی عورت محسوس کرتی ہے۔ اتنے میں خلاف توقع شوکت حیات آگیا اس کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا کہ کہانی کو سمیٹنے کی تھیوری ذہن میں کلبلا رہی ہے لیکن زخمی انگوٹھے کی وجہ سے لکھ نہیں پارہا ہوں۔ بیگم ہوتیں تو انہیں ڈکٹیشن دے دیتا لیکن ان کی عدم موجودگی سے پریشان ہوں اس نے دھیرے سے

کہا تم مجھے ڈکٹیشن دے دو لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''میں اتنے عظیم افسانہ نگار کو ڈکٹیشن نہیں دے سکتا۔ دوم یہ کہ تم بقراط اعظم ہو ہر جملہ پر ٹوک دوگے اور میری آمد کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔''

اس نے قسم کھائی کہ وہ لکھنے کے درمیان ایک لفظ بھی نہیں بولے گا۔ میں نے کہا جہاں تمہیں لگے میں غلط سمت جارہا ہوں تم نشان لگا لینا بعد میں مجھے بتا دینا۔ پھر میں نے سادے کاغذ کا پلندہ اسے دیا اور کہا کہ شروع میں ۸۶ لکھو اس کے نیچے لکیر ڈال کر ۹۲/۶۶ لکھو۔ اس نے تعمیل کی پھر میں نے بولنا شروع کیا۔ پوری کہانی ذہن میں تھی۔ کبھی کبھی کچھ حصے دیکھ لیتا لکھتے وقت تواتر سے میرے ذہن میں الفاظ اترتے ہیں۔ شوکت حیات ایک فرمانبردار بچے کی طرح سر جھکائے ڈکٹیشن لیتا رہا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آخری جملہ لکھا کر میں نے کہا الحمدُ للہ اب بس کرو۔ وہ لکھنے میں اتنا مگن تھا کہ ''الحمدللہ اب بس کرو'' بھی لکھ گیا۔ میں چپ ہوا تو وہ حیرت زدہ سا مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یار تم اس طرح مضمون لکھاتے ہو؟ لگاتار بولتے گئے کہیں رک کر بھی نہیں سوچا۔ اس میں تو صرف ونحو کی بھی غلطی نہیں ہے۔''

میں نے بتایا کہ مضمون ہو یا کہانی میں ہمیشہ ایک شفٹ میں تواتر سے لکھتا ہوں۔ مضمون تو ڈکٹیٹ کردیتا ہوں لیکن افسانے خود لکھتا ہوں۔ شوکت نے بتایا کہ وہ لکھتے وقت دسیوں بار جملے کاٹتا ہے تب تحریر مکمل ہوتی ہے۔ اس نے کہا اب کیا کروگے؟ میں نے بتایا کہ اس کی فوٹو کاپی رکھ کر مباحثہ کو بھیج دوں گا۔ اس نے ہڑبڑا کر کہا ارے نہیں یار یہ میری تحریر ہے اسے مت بھیجو تم اس کی نقل کرلینا۔

''ذائقے'' کا تجزیہ دیکھ کر وہ بھونچک رہ گیا اور میں حیران کہ اتنا بہتر تجزیہ کیسے لکھا گیا۔ تجزیہ مباحثہ میں شایع ہوا اور حسب توقع پذیرائی کے کافی خطوط شایع ہوئے۔ اس کے بعد تو شوکت میرا مرید ہوگیا اس نے آج تک مجھ سے کبھی بحث نہیں کی۔

۶

اس کا مجموعہ نہیں شایع ہونے سے بھی وہ بہت پریشان تھا۔ میں جب کبھی ٹوکتا تو کہتا کام ہورہا ہے جلد شایع ہوجائے گا۔ ۲۰۱۱ء کا زمانہ تھا۔ اپریل میں دل کا شدید دورہ جھیل چکا تھا۔ ایمس دہلی کے ایچ او ڈی ہارٹ نے سارے ٹسٹ دیکھنے کے بعد ایک بھی دوا لکھنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ کیسے زندہ ہیں یہ آپ جانیں یا اوپر والا جانے۔ میں کوئی دوا بھی نہیں لکھ سکتا۔'' پھر اس نے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا جائیے۔ (یہ لمبی کہانی ہے پھر سہی)۔

میں پٹنہ واپس آ چکا تھا بس کمزوری بہت تھی۔ اسی دوران جولائی میں اس کا فون آیا۔

''بھیوا ! گھر پہ ہو؟ میں آ رہا ہوں۔''

دوپہر میں شوکت کی آمد ہوئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنا بے حد خوبصورت افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' مجھے پیش کیا۔ اس کی مذکورہ کہانی آجکل'' میں شایع ہوئی تھی جس پر اسے ''کتھا ایوارڈ'' بھی مل چکا تھا۔ مجموعہ صوری اعتبار سے بے حد خوبصورت تھا لیکن شروع میں کم از کم سو لوگوں کے آرا شامل تھیں اور کچھ مضامین دسیوں سال قبل کے لکھے شامل تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار تم نے کبوتر کے نازک پاؤں میں اتنے سارے تعویذ باندھ دیے ہیں، وہ اتنا بوجھ لے کر اڑ سکے گا کیا؟''

وہ مسکرا کر رہ گیا، پھر پوچھا کتاب کیسی ہے؟ میں نے کہا فکشن کے سمراٹ کی کتاب ہے بہت اچھی چھپی ہے اور تمہارے افسانوں پر کون انگلی دھر سکتا ہے۔ اس نے تبصرہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے کہا دل نے مہلت دی تو ضرور لکھوں گا۔ پھر شوکت حیات اپنی بیگم اور کتاب کے کئی بنڈل کو لے کر لمبے سفر پہ روانہ ہو گیا۔ ہر ادیب و ناقد کو اپنی کتاب دی۔ دہلی کے علاوہ وہ کہاں کہاں گیا اس کا مجھے علم نہیں لیکن جب پٹنہ واپسی ہوئی تو وہ بہت خوش تھا اور اسے امید تھی کہ اس سال نہ سہی آئندہ سال اسے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ضرور ملے گا۔ اس کی امید پر اوس پڑ گئی۔ وہ اپنے رویّے اور بڑبولے پن سے سب کو ناراض کر چکا تھا۔ اس کے ۸۰ فی صد افسانے شب خون میں شایع ہوئے تھے لیکن جب شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون کے فکشن کا ضخیم ترین انتخاب شایع کیا تو انہوں نے شوکت حیات کے ایک بھی افسانہ کو شامل نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے مضمون اور گفتگو میں فاروقی کے خلاف بہت تلخ بیان دے چکا تھا اسی طرح اس کے بہتر چاہنے والے اس سے بیزار ہو چکے تھے اب اس کی حیثیت مس فائر جیسے کارتوس کی ہو کر رہ گئی تھی۔ عبدالصمد اس کے بہی خواہ تھے لیکن اسے صرف اس لیے دشمن سمجھتا تھا کہ انہیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کیوں مل گیا لیکن ادھر میرے سمجھانے سے اس نے صمد کو معاف کر دیا تھا اور اس سے رابطہ بحال ہو گیا تھا۔

مجھے جب دوسری بار بہار اردو اکادمی کا سکریٹری بنایا گیا تو میں نے برسوں سے منجمد پڑے ادبی ایوارڈ کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا اور رقم بھی تین گنی کر دی۔ پہلے پندرہ ہزار، بیس ہزار اور اکیاون ہزار کے انعامات دیے جاتے تھے میں نے کمیٹی میں رکھ کر ایوارڈ کی رقم بڑھوا دی

ایک لاکھ اکیاون ہزار کے دو ایوارڈ، ایک لاکھ دس ہزار کے تین ایوارڈ اور اکیاون ہزار کے بیس ایوارڈ۔ اور یہ بھی کیا کہ سال ۲۰۱۵ء کے ساتھ ۲۰۱۴ء کو بھی شامل کر دیا سوچا۔ دو سال میں پچاس ادیبوں کو شامل کر لوں گا۔ بقیہ دو سال میں مزید پچاس ادیب فیض یاب ہو جائیں گے۔ جب فائنل میٹنگ ہوئی تو ایک ممبر نے

یہ سوال اٹھا دیا کہ جنہیں گزشتہ برسوں میں معمولی رقم کا بھی ایوارڈ مل گیا ہو اُنہیں دوبارہ نہ دیا جائے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ پدم شری کے بعد پدم بھوشن پھر پدم وی بھوشن ملتا ہے اسی طرح پانچ سات سال کے معمولی رقم والے ایوارڈ کو نہ شامل کیا جائے لیکن وزیر نے فیصلہ سنا دیا کہ دونوں نائبین صدر جانچ کر فائل بڑھائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شوکت حیات، شفیع جاوید، بہت سے اہم صحافی کے ساتھ بزرگ شاعر متین عمادی کے ساتھ طلحہ رضوی برق کو بھی ایوارڈ سے محروم کر دیا گیا کیونکہ ان لوگوں کو پندرہ یا بیس ہزار کی رقم بہت پہلے مل چکی تھی۔ ایوراڈ کا اعلان ہوتے ہیں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا اور سارہ نزلہ مجھ پر ہی جا گرا۔ شوکت حیات نے بہت احتجاج کیا۔ میں نے اصول کی بات بتائی۔ اس نے اعتراض کرنے والے ممبر کا نام پوچھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ ان کی رہائش گاہ پر جا کر گالی گلوج کی اور میرے خلاف فیس بک پر ایک محاذ کھول کر بیٹھ گیا۔ روزانہ گالی گلوج کرتا مجھ پر طرح طرح کے الزام لگاتا اور مجھے پوسٹ سے ہٹانے کی مہم بھی چھیڑ دی۔ میں خاموش رہا مجھے حیرت تب ہوئی جبکہ ایک بھی انعام یافتہ نے میری مدد نہیں کی۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ دو سال کوئی ایوارڈ نہیں دوں گا۔ لوگ چھٹپٹا کر رہ گئے۔ میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ ایک مہینے کی اختلافی مہم کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ اس سے قبل بھی وہ سب سے کٹا ہوا تھا اور اب بالکل گھر میں بند ہو گیا۔ میں ہفتہ میں دو تین بار اس کی خیریت دریافت کرتا تو فون اس کی نواسی اٹھاتی اور بتاتی نانو ڈاکٹر کے یہاں گئے ہیں۔ مجھے حیرت ہونے لگی تو بغیر فون کیے دفتر سے سیدھے اس کے گھر گیا۔ نواسی نے دروازہ کھولا شوکت حیات سامنے صوفہ پر بیٹھا تھا۔ میں نے کہا تم نے نواسی کو بھی جھوٹ بولنا سکھا دیا۔ پھر پوچھا بھابھی کہاں ہیں؟ بولا بیمار ہیں ڈاکٹر کے یہاں گئی ہیں پھر پوچھا انعم بٹیا کہاں ہے؟ بولا وہ امی کے ساتھ گئی ہے۔ پھر میں نے اس کی دلجوئی کی۔ یہ بھی کہا کہ ہر فنکشن میں آیا کرو اس طرح لوگوں سے ملنا ملانا ہوتا رہے گا اور تم ادب کے مارکیٹ میں بنے رہو گے۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر میں پروگرام کی دعوت دوں تو وہ ضرور آئے گا۔ جانے سے قبل اس نے کہا میرے بیٹے اتم حیات کی شادی کے لیے لڑکی تلاش کرو۔ میں نے اپنے دونوں کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس پچڑے میں نہ پھنساؤ۔ ایک لڑکی سے ہوٹل میں دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ پھر کچھ دنوں بعد تم لوگوں نے منگنی ہی توڑ دی۔ پھر ایک پیاری سی لڑکی سے شادی ہوئی۔ وہ بہو بن کر تمہارے یہاں رہی لیکن تمہارے بیٹے نے اسے بھی طلاق دے دی۔ اب میں کس منہ سے تمہارے بیٹے کے لیے رشتہ مانگوں گا۔ وہ چپ رہا لیکن اس کی بیٹی دندناتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور میرے پاس بیٹھ کر طلاق کا جواز بتاتی رہی۔ میں سنّی مسلمان ہوں جو سنتا ہوں مان لیتا ہوں اس لیے میں نے انعم سے بحث نہیں کی۔ پھر اس نے چائے کے لیے روک لیا۔ میں چائے پی کر شوکت سے محفل میں شرکت کا وعدہ لے کر واپس آ گیا۔ بعد

میں سال بھر بعد اتم حیات کی گود میں ایک بچے کے ساتھ فیس بک پر ایک تصویر دیکھی تو علم ہوا کہ اس کی شادی ہوگئی اور وہ ایک بیٹے کا باپ بھی بن گیا ہے۔

۷

شوکت حیات بہت پیارا انسان تھا۔ اسے کچھ بھی کہیں وہ بہت معصومیت سے سنتا۔ یہ الگ بات کہ وہ کرتا وہی جو اس کے من میں آتا۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا یار میں تو سید ہوں تم کس ذات کے ہو۔ میں نے کہا دوسرے پائیدان پر ہوں اس نے پھر کہا بتاؤ نا یار۔ میں نے کہا میں شیخ ہوں۔ اس کا سوال تھا سید بڑا ہوتا ہے یا شیخ ؟ اب میری رگِ شرارت پھڑک گئی میں نے کہا۔ تم نے غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا ہے؟ اس نے کہا ہاں کیوں نہیں بہت بڑے بزرگ تھے۔ تب میں نے کہا کہ وہ نجیب الطرفین سید تھے۔ یعنی ماں باپ دونوں جانب سے۔ ایک طرف حسنی تو دوسری طرف حسینی۔ اسی طرح تم نے شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا ہے۔ ان کے اجداد مکہ سے تشرف لائے تھے وہ حضرت تاج فقیہہ رحمۃ اللہ علیہ کی آل میں تھے جنہوں نے منیر شریف فتح کیا تھا۔ وہ بھی سادات تھے۔ تیسری بات پوری اردو شاعری میں شعرا نے صرف شیخ سے پنگا لیا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
گیٹ پہ جنت کے یوں تو سخت چیکنگ تھی مگر　　شیخ جی کا داخلہ اسٹاف کہ کر ہو گیا

تو بھائی اتنے بڑے بزرگوں کا سادات ہو کر بھی شیخ لکھنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ سید جب علمی عملی شریعت طریقت معرفت اور حقیقت ساری منزلوں کی تکمیل کر لیتا ہے تب وہ شیخ کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس دن کے بعد اس کی سٹّی پٹّی گم ہوگئی۔

جدیدیت کے دور میں پورے ہندوستان میں شوکت حیات جدیدت کا امام سمجھا جاتا تھا وہ فکشن کا سکہ رائج الوقت تھا۔ اشتراکی ذہن کا مالک ٹریڈ یونین کا لیڈر شیر کے دہاڑ جیسی آواز۔ وہ جو بھی تحریر لکھ دے اس کی وقعت بڑھ جائے۔ جدیدیت کے زمانے میں رسین سرخ انقلاب پر مبنی اس کا افسانہ ''بانگ'' بے حد مقبول ہوا اور مہینوں تک اس کی چرچا ہوتی رہی۔ اس پر بحثیں ہوئیں۔ خوب خوب چرچے ہوئے۔ بانگ نے اسے بے حد مقبول بنا دیا۔ اپنی جانب سے کچھ کہنے سے بہتر ہے کہ میں بھائی غضنفر کی تازہ ترین رائے کا سہارا لوں۔ انہوں نے بہت پتے کی بات کہی ہے۔ آپ بھی دیکھیں۔

''بانگ کی بڑی اہمیت ہے خواہ وہ علاّمہ اقبال کی بانگ ہو یا شوکت حیات کی۔ خواہ کسی درندکی بانگ ہو یا پرندکی۔ بانگ نہ ہو تو صبح نہ ہو، دن نہ نکلے۔ حیات میں حرکت نہ ہو۔ معاملات میں برکت نہ

ہو۔ کائنات بیرار نہ ہو۔ انسان برسرِ پیکار نہ ہو۔ کارِ کاروبار نہ ہو، حالات سازگار نہ ہوں، شعور وادراک ہشیار نہ ہوں۔ بانگ وہ سُر ہے جس کے تال پر سیاہ افق سے سرخ شعاعیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ پو پھٹ جاتی ہے۔ سورج نکل آتا ہے۔ جس کے شور سے زورِ جرّار تھرّا اُٹھتا ہے۔ رعبِ زردار لرز اٹھتا ہے۔ کاخِ امرا کے در و دیوار ہل جاتے ہیں۔ اوقات اور حالات بدل جاتے ہیں۔

بانگ بند ہو جائے تو وقت کی رفتار رک جائے۔ کاروبارِ دنیا ٹھپ پڑ جائے۔ دماغ تشویش میں پڑ جائے۔ دل میں خدشات کا کانٹا گڑ جائے۔ ذہن کا توازن بگڑ جائے۔ پولٹری فارم کے مالک کی چھری اپنے ہی دربے کے مرغ کی گردن پر پہنچ جائے۔ اپنے ہم زاد کا خون ہوتا دیکھ کر دربوں کے باقی مرغوں کی آنکھوں میں لہو اتر آئے۔ ان کی چونچ دربوں کی جالیوں پر پہنچ جائے اور پھر ان سیاہ سفید اور چتکبرے مرغوں کے سینے میں ایک سرخ انقلاب برپا ہو جائے۔ یہی منظر شوکت حیات کی کہانی ''بانگ'' میں نظر آتا ہے۔ شوکت حیات اس منظر کو اتنے بڑے کینوس پر پھیلاتے ہیں کہ مرغ کے پروں کے رنگ طرح طرح کے رنگ دکھانے لگتے ہیں۔ ان رنگوں سے سیاہ، سفید، سرخ اور چتکبرے پیکر ابھرنے لگتے ہیں۔ ان رنگ برنگے پروں والے مرغوں کے پاس ان کی مرغیاں بھی سمٹ آتی ہیں اور اپنی باریک باریک خشک منقاروں سے اپنی زندگی کی لہو میں تر بتر کہانیاں سنانے لگتی ہیں۔ اپنے پیاروں سے الگ ہونے کا کرب، ان کی گھٹن، ان کی بھنچی بھنچی سی آواز سب کچھ ان کے سینے سے باہر آنے لگتا ہے۔ طرح طرح کی محرومیاں جھانکنے لگتی ہیں۔ ہم جنسوں کی گردنوں پر چلنے والی چھریاں، ان کے جسموں سے نچے جانے والے پر، ادھیڑی جانے والی کھال، جسم کی بننے والی بوٹیاں اور دہکتے ہوئے انگاروں پر ان کے گوشت اور گرم آگ پر سینکے جا رہے اس گوشت سے نکلنے والے عرق کو دربوں کے مرغ دیکھتے ہیں تو ان کے اندر جل رہی انتقام کی آگ اور سلگ اٹھتی ہے۔ ان کی چونچیں چاقوؤں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور وہ چاقو چیڑنے پھاڑنے کے جذبے سے مغلوب ہو کر قفس نما دربوں کی مضبوط جالیوں ں سے بھڑ جاتے ہیں۔ مرغوں کے سینے میں انتقام کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ احتجاج کے شعلے شرر فشاں ہونے کی تیاری کرتے رہتے ہیں۔ اپنی منقاروں میں طاقت بھرتے رہتے ہیں۔ اپنے ڈینے مضبوط کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پنجوں کی چھرّیوں کو تیز کرتے رہتے ہیں اور ایک دن دربوں کی جالیاں توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔

الگ الگ گوشوں، الگ الگ دربوں، الگ الگ خانوں میں بٹنے اور دور دور رہنے والے سارے مرغ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایک منظّم فوج تیار ہو جاتی ہے۔ سر پر سرخ کلغیوں کے خود پہنے سپاہی اپنے پنجوں کے خنجر اور منقاروں کے تیر و تبر سے لیس ہو کر اجتماعی بانگ کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ

پڑتے ہیں۔ دشمن کے جسموں پر چونچ کی مار پڑنے لگتی ہے۔ پنجوں کی چوٹ سے چمڑی ادھڑنے لگتی ہے۔ مرغ کے سوندھا سوندھا گوشت کھانے والے خود لہولہان ہونے لگتے ہیں اور مرغوں کے مسلسل یلغار ،پنجوں کی مار اور منقاروں کے وار سے زخمی ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ دربے میں بند مرغوں نے کیسے باہر نکل کر مورچہ سنبھالا، سوئی ہوئی مرغیاں کس طرح تن کر راہ میں کھڑی ہو گئیں اور کس طرح ان کو ذبح کرنے والے ان کے حملوں سے زخمی ہوئے اور کیسے وہ اس مقام کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے جہاں وہ ان کی گردنوں پر چھری پھیرا کرتے تھے، یہ منظر آپ خود شوکت حیات کے بنائے ہوئے پیکروں میں دیکھیے:

''یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور خوف کا ٹھکانہ نہ رہا کہ ابھی ابھی جو مرغیاں جو باہر سو رہی تھیں، وہ ان کے راستے میں تن کر کھڑی ہیں۔ سب کی سب اچھل کر دروازے تک آ گئیں۔ ابھی وہ مرغی خانے کا دروازہ بند کرنا ہی چاہ رہے تھے کہ چتکبرے چوزوں کی فوج ان پر حملہ اور ہو گئی اور وہ بے تحاشا بھاگے۔ چاروں طرف ہوا میں مرغوں کی کلغیاں۔ بجلیوں کی طرح کوند رہی تھیں اور زمین پر جوزوں کی فوج اپنے چھری نما پنجوں سے اچھل اچھل کر ان پر حملے کر رہی تھی۔''

''فضا کے چپّے چپّے میں جنگلی مرغوں کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ اور اچھلتے ہوئے ان کے بجلی نما پنجے اور چونچ دیکھتے دیکھتے ان کے سفید کپڑے تار تار ہو گئے۔ اندر سے سیاہ بنیائن اور لنگوٹ نظر آنے لگے۔ اندھا دھند وہ اس پولٹری فارم سے دور بھاگے جا رہے تھے جہاں آج تک ان گنت مرغوں کو بانگ اور ہتھیلی کی لکیروں کے غسلِ آفتاب کی آڑ میں وہ ذبح کر کے چٹخارے لے لے کے کھا چکے تھے اور رنگوں کی بنیاد پر ان کے جھنڈ کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکے تھے۔''

اس تجزیے سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بانگ کی افادیت کیا تھی۔ اس کے کچھ اور افسانے ''ڈھلان پر رکے قدم'' ''بکسوں سے دبا آدمی'' ''سانپ سے نہ ڈرنے والا بچہ'' ''پھسینڈا'' ''رانی باغ'' ''کوبڑ'' ''سرپٹ گھوڑا'' وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔ بعد میں بابری مسجد کی شہادت پر اس کا شاندار افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' شایع ہوا جو نہ صرف بے حد مقبول ہوا بلکہ دہلی کتھا کے ادارے نے اسے کتھا ایوارڈ سے بھی نوازا۔ اس افسانے پر جب میں اس سے بحث کر رہا تھا تو میں نے گنبد کے کبوتر کے لکھنے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہر معبد پر کبوتر ہوتے ہیں لیکن جب بابری مسجد شہید ہو گئی تو میں نے سوچا کہ جب کبوتر شام کو آئے ہونگے تو گنبد نہ ملنے پر انہوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ اسی سوچ کو سامنے رکھ کر میں نے گنبد کا کبوتر لکھا۔ بہر حال یہ افسانہ ماسٹر پیس ہے اور اس کی شہرت عالم گیر ہے۔

اکیسویں صدی میں شوکت نے بہت کم لکھا۔ محفلوں میں اپنی بے ربط گفتگو اور فلوٹنگ ریمارکس سے دوست کھوتا گیا اور اس کے بہی خواہوں فہرست کم ہونے لگی۔ میں جب بھی اسے کسی فنکشن میں بلاتا تو وہ

ضرور آتا اور پہلی صف میں بیٹھتا اور بس سوتا رہتا۔ آخری عمر میں وہ بے تحاشہ سوتا تھا او بے تحاشہ کھاتا تھا۔ ایک بار اس نے نیو پاٹلی پترا کے اپنے نئے فلیٹ میں بلایا۔ کیا شاندار فلیٹ تھا۔ شاندار صوفہ، لاکھ روپے کا فریج بہترین ایئر کنڈیشن۔ یہ سب چار ہزار کی سیلری میں ممکن نہیں تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ میں کچھ رشتے دار مدد کرتے تھے۔ کچھ رقم ہندوستان کے امیر قلمکار بھی دیتے تھے۔ میں نے اسے ندا فاضلی سے بڑے حق کے ساتھ رقم مانگتے دیکھا تھا۔

اس نے غربت میں کبھی بسر نہیں کی۔ بیٹا کو پٹنہ کے سب سے بڑے اسکول سینٹ مائیکل سے پڑھایا۔ بیٹی کو ناٹرو ڈیم اکادمی سے تعلیم دلوائی۔ اس کے نئے فلیٹ پر دوسری بار تب گیا جب عبدالصمد کو افسانہ پڑھنا تھا اور صرف مجھے بلایا گیا۔ دوپہر کو شاندار ضیافت کے بعد عبدالصمد نے افسانہ سنایا پھر شوکت نے تجزیہ کیا۔ میں شوکت سے کہا کہ تمہارے تجزیے میں ''شوکتیت'' نہیں ہے۔ تم اتنے دھیمے کیسے ہو گئے۔ پھر میں نے اپنا تبصرہ پیش کیا جسے دونوں نے پسند کیا۔ شوکت حیات دوستوں کی ضیافت خوب کرتا تھا اور بھابھی شاندار کھانا بناتی تھیں۔ اس کے دسترخوان کی وسعت مشہور تھی۔ اس دن شوکت کی خوش خوراکی دیکھ کر میں نے کہا۔

''تمہیں اپنی فکر تو نہیں ہے لیکن ان لوگوں کی فکر کرو جن کے کندھوں پر سوار ہو کر تمہیں قبرستان جانا ہے۔'' وہ مسکرا کر رہ گیا وہ شوکت حیات سے میری آخری ملاقات تھی۔

اس کے بعد بس کبھی کبھار فون سے گفتگو ہو جاتی۔ ایک دوسرے کی خیر خبر دریافت کر لیتے۔ میں جب پھلوری شریف اپنے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا تو میرا کہیں آنا جانا بھی کم ہو گیا۔ کرونا کے دور میں تو لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ ایک سے ایک موت نے دل مڑوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسی دوران شوکت حیات کے بیمار ہونے کی خبر ملی۔ بھابھی بے چاری اکیلی تھیں۔ بیٹا اتم حیات بیگم کے ساتھ دوبئی میں تھا۔ اسے کرونا ہونے کی خبر ہوئی تو بیٹی داماد دبئی نکل گئے اور ایئر پورٹ پر ہی دونوں کو کورنٹائن میں بھیج دیا گیا۔ اور یہ وہی نازک گھڑی تھی جب رات اچانک شوکت حیات کو دورہ پڑا وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ بھابھی دوڑی آئیں جب تک مددگار آتے افسانے کے سکندر پوری دنیا فتح کر کے آخرت کے سفر پہ روانہ ہو چکا تھا۔ انّا للہ وانّا الہِ راجعون

صبح اطلاع ملی کہ پیر موہانی قبرستان میں صبح نو بجے تدفین ہوگی۔ میں قبرستان پہنچا۔ ہائے میرا یار شوکت سفید لباس میں بے نیاز سویا تھا۔ نظر گھمائی تو مشکل سے آٹھ دس آدمی موجود تھے۔ تدفین کے بعد ایک دراز قد کے عمر دراز شخص نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ شوکت کے کیا لگتے ہیں؟ کوئی رشتے دار ہیں؟''

''نہیں میں شوکت کا کچھ نہیں لگتا لیکن وہ میرا بہت کچھ لگتا تھا۔'' میں آبدیدہ ہو گیا میری آواز بھرّا گئی۔

''تو پھر کون ہیں آپ؟''

میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔''میں اس کا دوست ہوں مشتاق احمد نوری۔'' میرا نام سنتے ہی وہ چونکا۔

''نوری صاحب آپ کو جانتا ہوں میں۔ میں سکندر حیات ہوں شوکت حیات کا چھوٹا بھائی۔''

میں حیرت زدہ تھا شوکت کی چھوٹے بھائی سے کبھی نہیں بنی۔ بس دن رات اپنے ساڑھو کا بکھان کرتا رہا۔''سرپٹ گھوڑا'' میں پوری کہانی اس کے ساڑھو کے گرد ہی گھومتی ہے۔ میں سکندر بھائی کو اپنی کار سے لے کر اس کے نیو پاٹلی پترا فلیٹ گیا۔ سکندر کا بیٹا اپنی بڑی امی کے پاس گیا وہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگیں۔ میں چپ تھا بس میرے آنسو جاری تھے بھابھی مجھے دیکھ کر مزید بلکنے لگیں۔

''نوری بھائی! شوکت کو کچھ بھی ہوتا کہتے سب سے پہلے نوری کو فون کرو اور دیکھئے اس بار فون کی نوبت ہی نہیں آئی۔''

میں انہیں دلاسا بھی نہیں دے سکتا تھا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آنسوؤں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔

سکندر حیات جسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ آخری سفر میں موجود تھا لیکن جو ساڑھو سب کچھ تھا کرونا کے ڈر سے غائب تھا اور سڑھوائین کا بھی پتہ نہیں تھا۔

نہ بیٹا نہ بہو، نہ بیٹی نہ داماد نہ ہی کوئی ادیب شاعر دوست دشمن کوئی نہیں۔ اتنی خاموشی اور تنہائی میں آخری سفر طے ہوگا یہ شوکت نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

اللہ اسے اپنی رضا سے نوازے اور اپنی مغفرت نصیب کرے۔ آمین ثم آمین!

◀◀ ● ▶▶

Nooristan
A/204-Hassan Plaza
Minhaj Nagar
Khalilpura Road
Phulwari Shareef-801505 (Patna)
Mob:9771276062

نئی کتابیں

نام کتاب : عکس در عکس (تنقیدی مضامین)	نام کتاب: کلیسا مرے آگے
مصنف : عرفان رشید	مصنف: شموئل احمد
سال اشاعت: ۲۰۲۲ء	سال اشاعت: ۲۰۲۲ء
قیمت : ۳۵۰ روپے	قیمت : ۱۰۰۰ روپے

● **عبد الصمد**

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی

اُس زمانے میں، میں نے چند دوستوں پر کچھ تاثراتی مضامین لکھے تھے جنہیں کچھ لوگوں نے خاکے کا نام دیا تھا۔ شوکت حیات نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں بھی اس پر تاثراتی مضمون لکھوں، میں نے فوراً جواب دیا، کیا چاہتے ہو، یہ جو برسوں کے بعد دوستی ہوئی ہے، یہ بھی ختم ہو جائے۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ اُس کا قہقہہ بہت مشہور تھا۔ مختلف لوگ اس کے اپنے اپنے طور پر معنی نکالتے تھے۔ کبھی لگتا کہ یہ قہقہہ اس کے دل سے نکلا ہے، اس میں کہیں کوئی 'دکھلاوا' کوئی کھوٹ، کوئی ریاکاری، کوئی مصلحت نہیں۔ کبھی یوں محسوس ہوتا کہ اس نے قہقہہ زبردستی لگایا ہے، اس میں کئی رنگوں کی آمیزش ہے۔ بہرکیف، کسی بھی اضطراری اور غیر اضطراری انسانی فعل کے معنی نکالنے کی پوری آزادی ہے۔ قاضی عبدالستار کہتے تھے، دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اردو دنیا ہے۔

ہم نے تقریباً ایک ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ہم لوگ مختلف جگہوں پر اپنے اپنے چراغ جلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بی اے کرنے تک اپنے آبائی شہر بہار شریف میں تھا اور میرے افسانے 'کتاب'، 'صبح نو' اور کئی رسالوں میں چھپ چکے تھے، پھر میں ایم اے اور اس کے آگے کی پڑھائی کے لئے گیا چلا گیا، گو میرا پتہ بہار شریف ہی کا رہا۔ شفق نے اپنے شہر سہسرام کو کبھی نہیں چھوڑا، علی امام کشن گنج کے انسان اسکول کے ویرانے کو روشن کئے بیٹھا رہا، حسین الحق ستر کے بعد پٹنہ آ گئے تھے جہاں شوکت حیات پہلے سے موجود تھا، شموئل احمد نے اوائل میں کچھ افسانے لکھے، پھر وہ اپنی سرکاری نوکری میں مصروف ہو گئے اور بہت برسوں بعد ان کی گھر واپسی ہوئی۔ اس پس منظر میں افسانہ نگاری کی دنیا میں جس کا ڈنکا اس وقت اونچی آواز میں بج رہا تھا، وہ شوکت حیات ہی تھا۔ بلاشبہ وہ ایک بہت ذہین اور فعال افسانہ نگار تھا جس نے اپنی ذہانت اور شعور کی بالیدگی کے سبب چند بہت اچھے افسانے لکھے جو دوسرے ہم عصروں کے لئے قابل رشک بن گئے اور لاشعوری طور پر ہمارے ذہنوں پر اس کا ایک نامعلوم رعب طاری ہو گیا تھا اور ہم اس سے مرعوب سا رہنے لگے تھے۔ شوکت حیات کو اگر طرح طرح کے بھرم نہ گھیر لیتے تو وہ یقیناً وہاں سے بہت آگے جاتا، جہاں وہ تقریباً ٹھہر سا گیا تھا۔ یوں وہ جگہ جہاں وہ ٹھہرا تھا، وہ بھی بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں قابل

رشک مقام تھا۔

شوکت حیات کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اگر اس کے گھریلو اور خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالی جائے تو ایک مختلف شوکت حیات اس گہری دھند سے برآمد ہوتا ہے۔ مستقبل کی بے حد روشن راہ پر ابھی اس نے قدم بھی نہیں رکھے تھے کہ اچانک جواں سال والد کا جو کہ پولیس انسپکٹر تھے، ایک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ بیوہ ماں، کئی بہنیں اور بھائی، یعنی ایک بھرے پرے خاندان کی عظیم ذمہ داری اس کے ناتواں کندھے پر آپڑی۔ جو صورت حال اچانک پیش آئی تھی اس کے مدنظر کوئی بھی باشعور انسان اپنے ہوش وحواس کھوسکتا تھا، آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، والد کی پنشن تھی جس سے خاندان کا گذارا مشکل ہی نہیں بہت مشکل تھا، مگر کم سن شوکت حیات تھوڑا دن گم صم رہ کے اٹھ کھڑا ہوا، اپنے مستقبل کی روشن راہ کا دروازہ اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا، اوائل میں تھوڑے بہت ٹیوشن سے کام چلایا، پھر بسکو مان میں ایک چھوٹی سی نوکری کرلی، یوں زندگی کی بیل گاڑی میں بیلوں کی جگہ وہ خود جُت گیا۔ بہنوں کی بہترین خاندانوں میں شادی کی، بھائی کی تعلیم وتربیت، پھر اس کی نوکری کا جگاڑ، ماں کی ہمہ وقت خدمت.....ان چیزوں کے بیان کے لئے ایک پورا دفتر درکار ہے جس کا فی الحال موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ شوکت حیات زندگی کے ہر امتحان میں سرخ روئی حاصل کرتا گیا، ویسے اس کے حصول میں اس کی اپنی شخصیت کی روشنی دھومل ہوتی چلی گئی اور وہ کچھ عجیب نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوگیا۔ وہ جس ذہانت اور صلاحیت کا مالک تھا، اس کے پیش نظر زندگی نے اسے وہ نہیں دیا جس کا وہ جائز طور پر مستحق تھا۔ لاشعوری طور پر اپنی پہچان بنانے کی اس پر ایک دھن سی سوار ہوگئی۔ فطری طور پر وہ ایک فن کار تھا اور یہی ایک راستہ اس کی پہچان کا بچا تھا، سو وہ مضبوطی سے اس راستے پر گامزن ہوگیا۔ بہت جلد اس نے اپنی پہچان بنالی۔ اس کے افسانے 'شب خون'، 'کتاب'، 'جواز'، 'آہنگ' جیسے معیاری رسالوں میں تواتر سے شائع ہونے لگے۔ ان رسالوں کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے مدیران خود بہت پڑھے لکھے، صاحب نظر اور اپنے میدانوں کے شہسوار تھے۔ شوکت حیات نے جلد ہی مقتدر تنقید نگاروں کی نگاہیں اپنی طرف مبذول کرالیں۔ اپنے ہم عصروں کے درمیان وہ ایک قابل رشک شخصیت بن گیا۔ رشک اور حسد میں بہت باریک فرق ہوتا ہے، چنانچہ شوکت حیات دوستوں اور دوست نما دشمنوں کی حسد کا شکار بھی ہوگیا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ایک نامعلوم سی بے چینی اور اضطرار اس کے اندر ہمیشہ پنپتی رہی۔ ایک عجیب قسم کی الجھن اسے گھیرے رہتی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ قناعت اور اطمینان تو اسے چھو کر بھی نہیں گئے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ ایک زبردست عدم اعتماد کا شکار ہوگیا۔ اسے کسی پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ بے

شک اسے چند قابل اعتماد دوستوں کے فریب کا سامنا کرنا پڑا تھا، مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ ساری دنیا بری ہوگئی، سارے لوگ برے ہوگئے۔ اچھے اور برے لوگوں سے مل کر ہی تو دنیا کی تشکیل ہوئی ہے، یہ تو اپنے اپنے صواب دید پر ہے کہ آپ کس کے ساتھ کیسا رشتہ رکھتے ہیں۔

وہ اپنے بسکو مان کی نوکری سے کبھی مطمئن نہیں رہا۔ وہاں بس اسے یہ تسلی تھی کہ وہ یونین کی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیتا تھا۔ جب کوئی نازک موقع آتا تو وہ ملازمین کی مانگوں کی جدوجہد میں سب سے آگے آجاتا، جس کا اسے نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ مگر شوکت حیات کسی نقصان کو کب خاطر میں لاتا تھا، وہ تو جان بوجھ کر آتش نمرود میں کود جانے والا بندہ تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی اسے احساس ہوتا تھا کہ بعض اوقات اس کے قدم صحیح نہیں اٹھے۔ کچھ معاملوں میں اس نے نقصان کی تلافی کی کوشش بھی کی، مگر تب بہت دیر ہوجاتی تھی۔

میں ۱۹۷۹ء کے نومبر میں اورینٹل کالج آگیا تھا۔ شوکت حیات سے اس وقت دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ وہ آگے پڑھنا چاہتا ہے، مگر اس کے لئے کوئی لائحہ عمل اس کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں جناب احمد یوسف اور عبید قمر نے ادیب فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ اس وقت یہ سہولت تھی کہ اس ڈگری کے بعد بندہ ایم اے کرنے کے لائق ہوجاتا تھا۔ چنانچہ دونوں حضرات نے پرائیوٹ طور پر ایم اے کے امتحانات دیئے اور پاس بھی کر گئے۔ احمد یوسف نے تو ٹاپ کیا تھا، پھر بعد میں ڈاکٹریٹ بھی کرلی۔ میں نے شوکت حیات کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ وہ بھی آگے کی پڑھائی کرلے، اس کے لئے آسان ہوگا اور کالج وغیرہ میں نوکری مل جائے گی۔ اس وقت تو اس نے بہت دھیان سے سنا، کچھ باتیں دریافت بھی کیں، پھر آگے کچھ نہیں ہوا۔ میں نے دو تین بار یاد بھی دلایا، ہر بار دلچسپی تو اس نے بہت دکھائی مگر کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ بیس پچیس برسوں کے بعد اڑتی پڑتی خبر ملی کہ اس نے ایم اے کرلیا ہے اور پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹرڈ بھی ہوگئے۔ اس وقت تک میں اس کے دشمنوں کی فہرست میں سرفہرست آگیا تھا، اس لئے بس ادھر ادھر سے سنی سنائی مجھ تک پہنچتی رہی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے یو جی سی کا NET بھی پاس کرلیا، اس کے امتحان سنٹر کامرس کالج میں تھا جہاں صفدر امام قادری اردو کے استاد ہیں اور سارے امتحانات کی تیاری میں انہوں نے ہی اس کی مدد کی تھی۔ انہیں NET کا امتحان دینے کا پتہ اسی وقت چلا جب انہوں نے امتحان کے کمرے میں شوکت حیات کو دیکھا۔ شوکت نے لائن تو بہت عمدہ چنی تھی مگر فیصلہ کرنے میں اتنی تاخیر کردی کہ وقت نکل گیا۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ NET وغیرہ کرنے کے بعد اس کی بے پناہ خواہش تھی لکچرر بننے کی، مگر اس کے مزاج کی اضطرابیت اور اپنے سمیت سبھی لوگوں پر عدم اعتماد نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔

ایک زمانہ تھا جب وہ بہت زور شور سے کمیونسٹ ہوا کرتا تھا۔ مارکس، ہیگل اور لینن وغیرہ کی سماجی تقسیم کا خوب پروپیگنڈہ کرتا تھا۔ اچھے، صاف ستھرے اور عمدہ مکانوں میں رہنے والوں کو برژوا طبقہ کہتا تھا۔ مگر اس نے اپنے اور بال بچوں کی رہائش کے لئے پاٹلی پترا کالونی کا انتخاب کیا جو اس کی تعریف کے مطابق برژوا لوگوں کا ہی علاقہ تھا۔ اپنے بچوں کو پٹنہ کے بہترین اسکولوں میں تعلیم دلائی۔ یہ سب کام تو اس نے قابل رشک کیا، مگر وہ اپنی زبان سے جو کچھ بولتا تھا، اس سے سچوئیشن مضحکہ خیز ہوتی چلی گئی۔

ایک زمانہ تھا جب وہ ناول کو دوسرے درجے کی صنف کہتا تھا، افسانہ کو پہلے درجے کی۔ مگر بہت بعد میں اس نے ایک طویل افسانہ لکھا 'سرپٹ گھوڑا'۔ اسے وہ بہت دنوں تک کبھی ناول کبھی ناولٹ کہتا رہا۔ اسے وہ الگ سے شائع کرنا بھی چاہتا تھا، شاید اس کا موقع اسے حاصل نہیں ہو سکا۔

۱۹۹۰ء میں مجھے میرے ناول 'دو گز زمین' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ اس ایوارڈ سے بہار کے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اس سے پہلے بہار کی سطح پر اس ایوارڈ کی کوئی چرچا نہیں ہوتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ بہار میں اردو میں تو کیا، ہندی میں بھی اس سے پہلے کسی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ نہیں ملا تھا، صرف میتھلی میں ہر سال ایوارڈ ملتے تھے۔ جب کہ اردو اور ہندی میں مقتدر افسانہ نگاروں، شاعروں، تنقید نگاروں، محقق وغیرہ کی کمی نہیں تھی بلکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ معتبر ادیب یہیں تھے، انہیں ایوارڈ نہیں دیا جانا ایک مستقل بحث ہے جس کا یہاں بیان کرنا میرا منصب نہیں ہے۔ بہر کیف، ایک نسبتاً غیر معروف بندے کو جو چند برسوں سے افسانے لکھنے کی مشق کر رہا تھا، اس کے پہلے ہی ناول پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کا مل جانا ایک ہلچل مچانے کا واقعہ تو تھا ہی۔ افسوس ناک یہ بات ہوئی کہ اس ایوارڈ نے خصوصاً بہار کے لکھنے والوں کی صف میں کئی دراڑیں ڈال دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ستر کے بعد لکھنے والوں میں شوکت حیات سب سے زیادہ فعال تھا اور ایک طرح سے اسے کم سے کم بہار کی سطح تک ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لیے کسی بھی بڑے ایوارڈ کا تصور آتے ہی اس کا خیال آ جانا فطری تھا۔ شوکت حیات سب سے پہلے مبارک باد دینے کے لئے پہنچا، اس وقت میں سلطان گنج میں اسی کے قریب رہتا تھا۔ مگر یار لوگوں نے جلد ہی اسے آ لیا۔ شوکت حیات کی ایک کمزوری یہ تھی کہ اسے بہکانا، ورغلانا بہت آسان تھا، خاص کر ذاتی معاملوں میں وہ کان کا خاصا کچا تھا۔ جو لوگ اس کے دوست نما دشمن تھے، میں بھی ان کا دوست نہیں تھا، انہیں ایک سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ شوکت حیات کو آگے رکھ کر ایک زبردست محاذ کی تشکیل کی گئی۔ ہر محفل میں یہی ایوارڈ گفتگو کا مرکز بن گیا۔ میرے مرحوم محترم دوست م ق خان کہتے تھے کہ اس ایوارڈ کی خبر سے بعض گھروں میں ایسا صف ماتم بچھ گیا تھا جیسے کسی کی موت وغیرہ پر ہوتا ہے۔ مگر شوکت حیات کو ورغلانے

والوں نے اسے کبھی یہ نہیں بتلایا کہ اس کا تو کوئی مجموعہ بھی سامنے نہیں آیا، اگر شائع ہو گیا ہوتا تو اس کی ناراضگی کا ایک جواز بھی رہتا۔ دلچسپ بات یہ کہ اس کا پہلا اور آخری مجموعہ تقریباً تیس برسوں کے بعد منظر عام پر آیا اور اس کا جیسا خیر مقدم ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا۔ اس کی جو وجوہات میری سمجھ میں آتی ہیں ان میں سرفہرست یہ ہے کہ شوکت حیات نے اپنے چالیس سالہ افسانہ نگاری کا انتخاب مرتب کیا تھا، جن میں اکثر افسانے وقت کے اعتبار سے اپنی چمک دمک کھو چکے تھے، کچھ افسانے ایسے بھی تھے جن پر پہلے ہی خاصی گفتگو ہو چکی تھی اور وہ پڑھنے والوں کے لئے نئے نہیں رہے تھے۔ شوکت حیات نے پتہ نہیں کس مصلحت کے تحت اس مجموعہ انتخاب میں دنیا بھر کے لوگوں کی رائیں شامل کر دی تھیں اور اس سلسلے میں اس نے حفظ مراتب کا بھی خیال نہیں رکھا۔ آخر میں سب سے اہم بات یہ کہ اس نے اپنی تحریر، تقریر اور زبان سے بھی کافی لوگوں کو ناراض کر رکھا تھا۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ پتہ نہیں اس نے شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں کیا لکھ دیا، کیا بول دیا کہ وہ اتنے ناراض ہوئے کہ انہوں نے 'شب خون' کے انتخاب میں اس کا ایک افسانہ بھی شامل نہیں کیا، جب کہ شوکت حیات کے سب سے زیادہ افسانے 'شب خون' ہی میں چھپے تھے، اور کچھ افسانوں پر اسی کے صفحات میں خاصی پسندیدگی کے خطوط بھی شامل کئے گئے تھے۔ 'شب خون' کے انتخاب میں شوکت حیات کے کسی افسانے کا شامل نہیں ہونا ایک نامناسب فعل تھا۔

ایک قابل ذکر بات یہ کہ ۱۹۷۹ء میں بہار اردو اکادمی نے مجھے اور شوکت حیات کو ایک ساتھ مالی امداد فراہم کی تھی۔ اسی سے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'بارہ رنگوں والا کمرہ' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ہم لوگوں کے پیہم اصرار کے باوجود شوکت حیات نے اپنا مجموعہ مرتب نہیں کیا۔ بہت بعد میں جب میں اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کا ممبر بنا تو میں نے شوکت سے کہا کہ تم ایک درخواست دے دو کہ آج کے حساب سے مجھے نئے سرے سے گرانٹ دے دی جائے اور پہلے والی گرانٹ کے پیسے اس سے منہا کر لئے جائیں۔ حسب معمول اس نے اپنے مخصوص انداز میں 'ہوں.....' کیا، پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے مزاج میں شک وشبہ کا جو مادہ تھا، وہ اسے فوراً تشکیک میں مبتلا کر دیتا تھا اور اسے وقتی طور پر ٹھپ کر دیتا تھا، اگرچہ بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا تھا، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی تھی۔ دوسروں پر اعتماد کھوتے کھوتے اس نے خود پر بھی اپنا اعتماد کھو دیا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک بے حد خوددار، عزت نفس کا پاس رکھنے والا بندہ تھا، مگر اس پر جب بھی اضطرار کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو اس سے کچھ ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی تھیں جو اس کے بالکل شایان شان نہیں ہوتی تھیں۔ مثلاً وہ کچھ سمیناروں اور جلسوں میں بن بلائے پہنچ جاتا اور متوقع رہتا کہ اس کی ادبی حیثیت کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کیا جائے، جب کہ کہیں بھی کوئی

اس کا غیر شناسا نہیں ہوتا تھا، مگر ایسے مواقع پر کچھ لوگوں کے ذریعہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی تو ہم جیسے 'دشمنوں' کو بھی اندرونی تکلیف ہوتی تھی۔ شوکت حیات اس گل دستے کا ایک چمک دار پھول تھا جس میں ہم سب بندھے ہوئے تھے۔ اس بے چینی اور اضطراری کیفیت میں پتہ نہیں اس نے کتنے لوگوں کو کتنے خطوط لکھے، بے شمار لوگوں سے فون پر لگاتار باتیں کیں، پتہ نہیں کن لوگوں نے ان باتوں کا کیا اثر لیا۔ میں کچھ کمیٹیوں کا ممبر تھا اور جب بھی فکشن پر کوئی پروگرام ہوتا تو میں ضرور کوشش کرتا کہ شوکت بھی اس میں شریک رہے، یوں شوکت میرے بارے میں ہمیشہ غلط فہمی میں مبتلا رہا اور آج بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں بہت سے لوگوں کو میری بات پر شاید یقین نہیں آئے گا، مگر تحریری طور پر اس کا اظہار کر کے کم سے کم میں ضرور اپنے طور پر تشفی محسوس کر رہا ہوں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ ایسے لوگوں نے اس کی مخالفت کی جو بظاہر اس کے قریبی مانے جاتے تھے۔ شوکت حیات جب اپنی اضطراری کیفیت سے نکل آتا تو وہ کوئی دوسرا ہی شوکت ہوتا تھا، بیحد سنجیدہ، متین، خوددار، عزت نفس کا پاس رکھنے والا..... دوستوں کا دوست، یاروں کا یار، اپنے بال بچوں، بیوی اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے بیحد شفیق اور مہربان..... پیسہ جیب میں ہو یا نہیں ہو، وہ دوستوں کی خاطر کرنے سے کبھی باز نہیں آتا تھا، اس سلسلے میں اسے قرض لینے میں بھی کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ بے سروسامانی کے عالم میں رہتا تھا، تب بھی اس کے دل اور دسترخوان کی وسعت کم نہیں ہوتی تھی اور جب وہ اپنے فلیٹ میں شفٹ کر گیا تو دعوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا، باہر سے آنے والا کوئی مہمان شاعر ادیب اس کے دسترخوان سے سیر ہوئے بغیر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے گھر میں کھانا بھی بہت لذیذ پکتا تھا، لوگ اس کے ہاں کھانے کی لذت کو عرصہ تک بھول نہیں پاتے تھے۔ اس سلسلے میں اس کی شریک حیات کا اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہوگی جو اپنے گیا کے گھر سے تربیت لے کر تو آئی ہی تھیں، اپنی ساس محترمہ یعنی شوکت حیات کی والدہ سے بھی انہوں نے بہت کچھ سیکھ رکھا تھا۔ شوکت حیات کے فلیٹ پر کئی یادگار پارٹیاں تاریخ کا حصہ ہیں۔

ایک زمانے میں جب وہ اپنی بسکو مان کی نوکری میں بہت فعال تھا، وہاں کی یونین بھی اسی کے دم سے فعال تھی، اکثر و بیشتر یا تو وہ بہت مصروف رہتا یا غائب رہتا۔ بسکو مان کے نکڑ پر چائے ناشتے کا ایک جھونپڑا تھا جہاں شوکت حیات کا کھاتہ کھلا ہوا تھا۔ وہ موجود رہتا تب تو وہاں دوستوں کی محفل جمتی ہی رہتی، موجود نہیں رہتا تب بھی یار لوگ اس کے کھاتے سے چائے ناشتہ کر کے ہی لوٹتے۔ اس بات کا برا ماننا تو دور، وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ اس سے اس کا بجٹ ضرور گڑبڑا جاتا تھا، مگر اس کو اس کی پروا کب تھی۔ فاضل اوقات میں کبھی کچھ اخباروں میں، کبھی ریڈیو وغیرہ میں کام کر کے وہ کچھ پیسے حاصل

کر لیتا تھا، پھر بھی اس کا خرچہ اتنا بڑا بڑھا ہوتا تھا کہ اس کی ساری کمائی ناکافی پڑ جاتی تھی۔

شوکت حیات نے اپنی پوری زندگی جس چیز پر بہت محنت کی، وہ اس کی فن افسانہ نگاری تھی۔ وہ اپنی افسانہ نگاری کو عبادت کا درجہ دیتا تھا بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کے۔ وہ افسانہ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر محنت کرتا تھا۔ ایک آدھ لفظ کی صحت پر اسے کچھ شک بھی ہوتا تو وہ اس کی درستگی کی جستجو میں لگ جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ کے لئے وہ ڈکشنریاں کھنگال دیتا تھا، اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو وہ دوستوں اور بزرگوں سے دریافت کرتا رہتا۔ جناب احمد یوسف اس کے لئے ایک منبع علم تھے۔ زبان پر انہیں غیر معمولی عبور حاصل تھا، شوکت ان سے برابر سیکھنے کی جستجو کرتا تھا۔ زبان پر اس قدر محنت کرتے ہوئے کم سے کم میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ زبان کے سلسلے میں اس کا شعور ہمیشہ بیدار رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں زبان کی غلطیاں تقریباً نہیں کے برابر ہوتی تھیں۔

شوکت حیات جدیدیت سے متاثر ضرور تھا، مگر اس نے اپنے افسانوں میں اس وقت کی فیشن زدگی کو کبھی راہ نہیں دی۔ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ اس نے جدیدیت کے مثبت پہلو کو اپنایا، اس کے افسانے جدید حسیت سے معمور ہوتے تھے۔ اس کے ہم عصروں میں زبان و بیان کے معاملے میں اس کی حیثیت مسلّم ہے۔ موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں وہ بہت محتاط تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر موضوع منتخب کرتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ نہ صرف اس کا موضوع سب سے الگ تھلگ ہو بلکہ پیش کش کا انداز بھی سب سے مختلف ہو۔ موضوع کے معاملے میں وہ کاتہ اور لے دوڑا کا قائل نہیں تھا، بلکہ اس کے ہر پہلو پر خوب غور کرنے کے بعد ہی وہ قلم اٹھاتا۔ اس کے لکھنے کی رفتار بہت تیز نہیں تھی، یوں اس کے افسانوں کی تعداد کوئی ایسی قلیل بھی نہیں ہے۔ اس کے افسانوں کے تین چار مجموعے آسانی سے مرتب کئے ہی جا سکتے تھے، اس کے لئے یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا، مگر وہ اپنے افسانوں کی فوٹو کاپیاں لوگوں کو بھیجتا رہتا تھا، مگر مجموعہ شائع کرنے میں شاید اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ دوسرے افسانہ نگاروں کی صف میں آ جائے گا اور اس کی انفرادیت قائم نہیں رہ سکے گی۔ اگرچہ آخری سالوں میں اس نے بالآخر مجموعہ شائع کیا جس میں شامل اکثر افسانوں پر وقت کی گرد پڑ چکی تھی۔

شوکت حیات کو بڑا شوق تھا کہ لوگ اس کی افسانہ نگاری پر مضامین لکھیں۔ وہ ہر کس و ناکس سے اس کی فرمائش کرتا تھا، مگر مشکل یہ تھی کہ دوسرے ہم عصروں کی طرح اس کے مزاج میں قوت برداشت بالکل نہیں تھی۔ تعریف اس کو اچھی لگتی اور تنقید بہت بری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگ اس پر کچھ لکھنے سے کتراتے تھے۔ میں کچھ لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اس پر لکھنا شروع ضرور کیا تھا، مگر مکمل کرنے کی ہمت نہیں

کر سکے۔شوکت کا ردعمل بہت جارحانہ ہوتا تھا، اس لیے لکھنے والوں نے بچ بچ کے چلنا شروع کر دیا تھا۔آج شوکت دنیا میں نہیں ہے تو مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کو وہ مقام نہیں ملا جس کا وہ جائز مستحق تھا۔انعام واکرام سے پرے وہ ایک جینوئن فن کار تھا اور محض اس کی چند ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے اسے نظر انداز کیا جانا اردو فکشن کا ایک المیہ ہے۔

شوکت حیات نے نسبتاً زیادہ افسانے نہیں لکھے،مگر اس کے تقریباً سبھی افسانے کسی نہ کسی صورت گفتگو کا موضوع بنے۔اس نے کم لکھا مگر اچھا لکھا۔آج اگر اس کے اور اس کے افسانوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو اس کے پاس یقیناً دوسروں کے مقابلے میں بہترین افسانے ملیں گے۔

اپنی عمر کے آخری بیس سال میں وہ عجیب وغریب نفسیات کا شکار ہو گیا تھا۔برسوں کی لگاتار بے چینی،اضطراب اور طرح طرح کے بھرم نے اسے پوری طرح اپنی جکڑ میں لے لیا تھا۔جو چیز واقع نہیں ہوتی تھی،جس کا حقیقت سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا،اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ چیز واقع ہو گئی ہے اور اس کے وقوع پر وہ نہ صرف پورا یقین کر لیتا بلکہ دوستوں سے توقع رکھتا کہ وہ بھی اس کی تائید کریں۔ایک زمانے میں اس نے اخباروں میں خبر چھپوائی کہ کسی بڑے انگریزی پبلشنگ کمپنی نے اسے انگریزی میں ناول لکھنے کے لئے کئی لاکھ روپیہ ایڈوانس دیا ہے۔چنانچہ وہ سبزی باغ کے ایک ہوٹل میں منتقل ہو گیا ہے اور ناول لکھنے میں مصروف ہے۔وہ ہر شام کو باہر سڑک پر ایک اسٹول پر بیٹھ جاتا اور سامنے گزرنے والے ہر شناسا کو پکار پکار کر یہ اطلاع دیتا۔اسے محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

کبھی وہ دوستوں کو اطلاع دیتا کہ وہ اپنی سوانح حیات لکھ رہا ہے جس میں وہ بہت سے لوگوں کو expose کرے گا،کبھی وہ اعلان کرتا کہ وہ ایک زبردست (دھانسو نہیں!) ناول لکھ رہا ہے اور سبھی ناول نگاروں کی بولتی بند کر دے گا۔وہ سمجھتا تھا کہ اس کے اعلانات اور انکشافات کا لوگوں پر بہت اثر ہوگا اور وہ اکھٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جائیں گے،جب کہ سننے والے اس کی ان باتوں کا مضحکہ اڑاتے تھے۔وہ نہیں جانتا تھا کہ ان باتوں سے وہ خود اپنا وزن کم کر رہا ہے۔ان تمام اعلانات کے درمیان شاید ہی اس نے ایک آدھ افسانہ لکھا ہو،اس کا ذہن بے حد منتشر ہو گیا تھا اور اس کے سچے ہمدردوں کا دل اس بات سے بہت دکھتا تھا کہ ایک بے حد ذہین دماغ اس طرح برباد ہو رہا ہے۔مگر کسی کے بس کی بات نہیں تھی کہ اسے پہلے والے ذہن پر لوٹا سکتا۔

ایک بار اس نے شوشہ چھوڑا کہ اس نے فکشن میں 'انامیت' کی تھیوری ایجاد کی ہے،نیز وہ اس کا موجد ہے۔اس سلسلے میں اس نے بے شمار لوگوں کو خطوط لکھے اور ان سے اس کو فروغ اور اسے اس

کا موجد تسلیم کرنے کو کہا۔ایک عرصہ تک اس کی گفتگو کا بس یہی موضوع رہا،اس درمیان اس نے جتنے انٹرویو دئے،سب میں بہت زور شور سے اس نے اپنی تھیوری کی وکالت کی،اب یہ اس کی وکالت میں کمی تھی یا لوگوں کی سمجھ میں کمی،کہ اس ایجاد کردہ تھیوری صرف اسی تک محدود رہی۔

ترقی پسند مصنفین کا تو وہ شروع ہی سے مخالف تھا اور اپنے لکھنے کی ابتدا ہی میں اس نے جدیدیت کو اپنا لیا تھا،اگرچہ اس کے زیر اثر اس نے اوٹ پٹانگ اور مبہم قسم کے افسانے نہیں لکھے،پھر وہ جدیدیت سے بھی تقریباً الگ ہو گیا اور اس نے جمہوریت پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی،کچھ قریبی دوستوں پر مشتمل اس نے ایک کل ہند انجمن کی تشکیل کی جس کا وہ صدر بن گیا۔اس انجمن کی نشستوں کی خبریں کبھی کبھار اخباروں میں پڑھنے کو ملتی تھیں۔شوکت حیات نے کوشش کی کہ اس انجمن کی کل ہند سطح پر تشکیل ہو،اس کا اس نے زور شور سے پرچار کیا،مگر بات بنی نہیں۔

شوکت حیات نچلا بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔جب وہ اپنے لکھنے کی عروج پر تھا تب بھی بہت فعال تھا،جب اس کا لکھنا پڑھنا دھیما پڑا تب بھی وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو ایکٹو بنائے رہا۔شاید یہ فعالیت یونین بازی کا نتیجہ تھی جو اس کے شعور میں رچ بس گئی تھی۔اگر اس نے اپنے مزاج،اپنی بعض تحریروں اور غیر ضروری طور پر بول پڑنے کی عادت پر قابو رکھا ہوتا تو وہ اس مقام تک ضرور جا پہنچتا جس کا وہ مستحق تھا۔وہ سب کچھ ہو سکتا تھا،مگر منافق ہرگز نہیں تھا،اس کی دوستی اور دشمنی دونوں اپنے عروج پر ہوتی تھی،جو اس کے دل میں ہوتا وہ کسی نہ کسی صورت زبان پر بھی آ ہی جاتا،اس نے زندگی میں جو بھی نقصان اٹھایا،وہ محض اپنے اسی مزاج کے سبب۔مگر اس کی وجہ سے اس نے دوسروں کا نقصان نہیں کیا،جانے انجانے طور پر وہ صرف اپنی ہی ذات کو نقصان پہنچاتا رہا۔اپنے اس مزاج کے کارن وہ کچھ دوستوں کی دلچسپی کا مرکز بھی بنتا رہا۔لوگوں نے جی بھر کے اس کو exploit کیا۔اس وقت تو اسے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا،مگر بعد میں اس نے ہمیشہ اپنی غلطیوں کو محسوس کیا،اس وقت اسے معافی مانگنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوتا تھا،لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی تھی۔دراصل اسے احساس نہیں ہوتا تھا کہ زبان سے نکلی ہوئی بات کبھی واپس نہیں ہوتی،ہزار اس کی واپسی اور کمشدگی کا اعلان کر کے تشفی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور لکھی ہوئی تحریر کبھی مٹ نہیں جاتی ہزار اس پر دوات کی شیشی گرا دی جائے۔

شوکت حیات عمر کے آخری چند سالوں میں بہت بیمار رہنے لگا تھا اور اس پر ایک خاموشی سی طاری ہو گئی تھی۔لکھنا تو اس کا تقریباً مفقود ہی ہو چکا تھا،البتہ پڑھنا اس نے ختم نہیں کیا تھا۔اس کے پاس بے شمار رسالے اور کتابیں آتی تھیں اور وہ سب کو پڑھ لینے کی کوشش کرتا تھا۔دراصل وہ اس طرح ادب کی

موجودہ رفتار سے اپنے آپ کو ہم آہنگ رکھنا چاہتا تھا۔وہ شوکت حیات بجھ گیا تھا جس سے دشمنوں کو ڈر لگتا تھا، اب وہی دشمن اس پر ترس کھانے لگے تھے۔انہیں اب اس سے دشمنی میں مزا نہیں آتا تھا۔

میرے ساتھ اس نے پندرہ بیس (برسوں میں) جو بھی سلوک کیا ہو، مگر آخری چند برسوں میں وہ مجھے اپنا دوست سمجھنے لگا تھا۔تقریباً ہر ہفتہ فون کرنا اس کا معمول بن گیا تھا۔اس کے گھر میں کوئی تقریب ایسی نہیں ہوئی جس میں، میں نے شرکت نہ کی ہو۔ پتہ نہیں اس کے دل کے اندر کون سی پھانس اٹکی تھی کہ وہ مجھے اپنے ہاں مدعو کر کے جی بھر کے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میری طبیعت بھی خراب چل رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاں آنے کی شرط رکھی کہ میں تمہارے ہاں کھچڑی کھاؤں گا، مرغن کھانا نہیں۔اس نے منظور تو کر لیا مگر جب میں اس کے ہاں گیا تو کھچڑی کے علاوہ اعلیٰ قسم کے مرغن کھانے میز پر موجود تھے۔دراصل اس نے مشتاق احمد نوری کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔اس کے ہاں بھابی کے ہاتھوں کے بنے ہوئے کھانوں کی خوشبو پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔اس دن ہم نے جی بھر کے دنیا جہان کی باتیں کیں۔ بہت سی باتوں کی وضاحت ہوئی ، بے شمار غلط فہمیاں دور ہوئیں، اس نے مجھ پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رکھا تھا، وہ اس نے سنایا، اگرچہ اس مضمون میں شوکت حیات کا پکا رنگ نہیں تھا، پھر بھی تھا تو وہ شوکت ہی کے قلم سے نکلا ہوا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ جلد سے جلد اس کو چھپوا لے تا کہ لوگوں کو بھی ہمارے رشتے کا پتہ چل جائے۔اس نے وعدہ تو کیا کہ دوسرے ہی دن اشاعت کے لئے بھیج دے گا، مگر تادم تحریر میری نگاہوں سے نہیں گذرا۔

شوکت حیات اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ اب اس سے کسی کو شکایت نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے تئیں ایک نامعلوم قسم کی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔

شوکت حیات بلاشبہ ایک بڑا افسانہ نگار تھا۔زندگی میں تو اس کی قدر نہیں ہوئی، مگر آنے والی نسلوں پر اس کا قرض ہمیشہ باقی رہے گا۔وہ ایک مکمل انسان تھا، جہاں اس کے اندر کچھ کمزوریاں تھیں وہاں اچھائیوں کا ایک بھرمار اس کے اندر موجود تھا۔اس کی کمزوریانہ ہوتیں تب تو وہ انسان میں فرشتہ بن جاتا، اور بہر حال فرشتے پر انسان کو فوقیت حاصل ہے۔

◀◀ ● ▶▶

A- 212,Rajnigandha
Sadaqat Ashram
Patna-800010

● ڈاکٹر ابرار رحمانی

شوکت حیات

سنہ ستری افسانہ نگار شوکت حیات بیسویں صدی کے آخر تک بہت فعال رہے لیکن پھر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ وہ مرجھا سے گئے اور کچھ ایسے مرجھائے کہ پھر پنپ نہ سکے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی یا شوکت بھائی کا خود کردہ عمل تھا۔خدا جانے۔ وہ جتنے قلم کے دھنی تھے اتنے ہی اپنے گفتار میں بھی ماہر تھے۔چنانچہ ہر شام جب ہم پٹنہ کے سبزی باغ کے رحمانیہ ہوٹل میں پہنچتے تو وہاں باہر سے ہی شوکت حیات کی آواز سنائی دیتی تھی۔اس وقت ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ چپکے سے اپنے دوستوں کے ساتھ چائے پی کر نکل جایا کرتے تھے۔وہ جب بحث کرتے تو مجال ہے کہ کوئی ان کے سامنے ٹک سکے۔لیکن پھر وہ بھی وقت آیا جب دھیرے دھیرے ان کا سورج غروب ہونے لگا، اور.....!

جب میں رسالہ 'آجکل' میں آیا تو وہاں ان سے باضابطہ ملنے ملانے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور نتیجہ بایں جا رسید کہ وہ مجھ کو اپنا چھوٹا بھائی کہنے لگے۔ان کے ہاتھ میں قلم تو رہا لیکن قلم کا استعمال کب کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے اور کتنا کرنا ہے، شاید اس کا اندازہ وہ نہیں کر سکے۔دراصل وہ ایک معصوم اور نرم دل انسان تھے۔

جب بھی ان کی طبیعت ٹھیک ہوتی وہ ہمیں فون ضرور کرتے اور لمبی لمبی باتیں کیا کرتے تھے۔اہلیہ یہ دیکھ کر اوب سی جاتیں۔کچھ ہی دن پہلے انہوں نے مجھ سے اپنے بیٹے کے لیے میری بڑی بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا۔لیکن میری بیٹی کی شادی کی تاریخ طے تھی۔کچھ دنوں بعد شوکت حیات سے جب میری ملاقات ہوئی تو شکایتی لہجے میں کہا کہ تم نے مجھے سمدھی کیوں نہیں بنایا۔اس کے بعد انہوں نے بیٹے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیا چگ گئی کھیت۔

جہاں تک ان کی فکر و فن کا سوال ہے تو بلاشبہ ان کا فن سن ستر سے ہی پنپنا شروع ہو گیا تھا جس کا نقطۂ عروج 'گنبد کے کبوتر' ہے۔ جو آجکل میں شائع ہوا اور 'کتھا ایوارڈ' سے نوازا گیا۔لیکن ایسا پھر کیا ہوا کہ انہوں نے قلم ہی بند کر دیا۔حالانکہ بابری مسجد کے بعد بھی کئی مسائل سامنے آئے جن پر ہمارے قلم کاروں نے اپنی فنکاری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔سچ ہے ہر عروج را زوال۔

شوکت حیات کی فکر و فن پر بہت سے ناقدین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ میں نے بھی ایک مقالہ

'دیباچہ ایک غیر مرتب افسانوی مجموعہ کا' لکھا۔ جسے پہلے ایک رسالہ نے شائع کیا پھر بھیونڈی کے رسالہ تکمیل میں گوشۂ 'شوکت حیات' میں شائع ہوا۔ لیکن یہاں عنوان بدل کر شوکت حیات کے افسانے کر دیا گیا۔ 'دیباچہ ایک غیر مرتب افسانوی مجموعہ کا' کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ ہوا یوں کہ بہت پہلے شوکت بھائی نے بہار اردو اکیڈمی سے اپنا افسانوی مجموعہ چھپوانے کے لیے مالی تعاون لیا تھا لیکن وہ پیسہ کھا پی کر بیٹھ گئے اور افسانوی مجموعہ ایک عرصہ تک منتظر اشاعت رہا، لیکن جب میں نے اپنا یہ مضمون شائع کرا دیا تو وہ بڑے فکرمند ہوئے۔ بالآخر ان کا مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ یہی مجموعہ/کہانی ان کا نقطۂ عروج تھا اور یہی ان کی فکر و فن کا نقطۂ انجماد بھی۔

یہیں ایک واقعہ کا ذکر کرتا چلوں کہ ان کی بہت ساری خوبیوں یا خرابیوں میں ایک بات یہ تھی کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے وہ بہ بانگ دہل اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ جب میرے اداریہ لکھنے پر پابندی لگا دی گئی تو قارئین آجکل نے دہلی سے لے کر پٹنہ تک اس کے خلاف احتجاج کیا۔ پٹنہ میں باضابطہ مشتاق احمد نوری نے ایک احتجاجی محفل آراستہ کی جس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی کر رہے تھے۔ اس محفل میں شوکت حیات نے اپنے روایتی انداز میں زور دیتے ہوئے اپنی بات کہی کہ اداریہ لکھنا ایک ایڈیٹر کا بنیادی حق ہوتا ہے اور اس سے اتفاق یا اختلاف قارئین کا حق ہے۔ شوکت حیات کی یہ باتیں یاد آتی رہیں گی۔ وہ ہمارے دلوں میں محفوظ رہیں گے۔

◀◀ ● ▶▶

Tazeen Aptt.
179/22, Zakir Nagar
New Delhi- 110025

نئے رسالے

نام رسالہ : سہ ماہی کاوش، شاہ جہاں پور	نام رسالہ: سہ ماہی ساغر ادب مظفر پور
ایڈیٹر :فہیم بسمل	مدیر اعزازی: پروفیسر سید آل ظفر
جنوری ۲۰۲۲ تا مارچ ۲۰۲۲	جنوری تا مارچ ۲۰۲۲ء
شمارے کی قیمت : ۸۰/روپے	شمارے کی قیمت :۳۰۰/ روپے

● غضنفر

سازِ بوالعجبی کا تارِ حیات

بوڑھاپا جب بچپن میں جانے لگے یا بچپن بوڑھاپے میں آنے لگے، یعنی حالتِ ضعیفی میں کودکی جب کود پھاند کرنے لگے تو اسے دیکھ کر کسی بھی آنکھ کا آئینہ حیرتی ہو سکتا ہے۔ میرا آئینہ بھی اس وقت حیرت سے تاک رہا ہے کہ سامنے ایک عجیب و غریب شخص آ کھڑا ہوا ہے۔ ایسا شخص جس نے اپنا عقیقہ اکسٹھ سال کی عمر میں کیا اور وہ بھی ایسے شور شرابے کے ساتھ جیسے ایک بار پھر سے گھوڑی چڑھ رہا ہو۔ پیری میں پوری کی گئی اس رسم کا سبب اس نے یہ بتایا کہ کثرتِ اولاد کی کفالت اور خراب معاشی حالت کے باعث والدین بروقت اس طرف توجہ نہ کر سکے اور اب اس کی ادائیگی کا فیصلہ بیوی نے اس لیے لیا تاکہ وہ اپنے شوہر کو بلاؤں سے بچا سکے۔ تاویل سن کر فون پر جب میں نے کہا کہ کیا بھابی کو یہ پتا نہیں تھا کہ اس عمر کے جسم و جان میں بچتا ہی کیا ہے جو بلائیں چمٹیں گی تو اس شخص کے ہونٹوں سے قہقہہ پھوٹ پڑا اور دیر تک زیر و بم کے ساتھ جاری رہا، جیسے سچ اُمڈ اُمڈ کر باہر آ رہا ہو۔ ہنسی کے فوّاروں کا زور تھما تو میں نے شرارتاً سوال کیا کہ اس صورتِ حال میں تو اس قبیل کی ایک دوسری رسم بھی رہ گئی ہوگی تو تھما ہوا فوّارہ اس بار اور زور و شور اور شدّ و مد کے ساتھ ابل پڑا۔ بڑی مشکل سے وہ ہنسی روک کر بولا۔

''میری جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس لیے اس رسم کو اسپتال میں ہی نمٹا دیا گیا۔ میرے جی میں آیا کہ ایک اور سوال کروں کہ خطرہ آپ کی جان کو تھا یا آگے چل کر آپ سے جڑنے والی جان کو مگر میری سماعت میں ایک اور فلک شگاف قہقہے کی جگہ نہیں بچی تھی، سو خاموش رہ گیا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ پروفیسری یعنی لیکچراری کے لیے دریائے تقرّری میں ڈالی گئی درخواست کی کشتی تنظیمی بہاؤ کی ٹھوس اور مضبوط روایت سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹتی اور سات آٹھ برس سے قبل کبھی کنارے نہیں لگتی، اس نے پچپن سال کی عمر میں ایم۔ اے کیا، ستاون سال میں نیٹ نکالا اور اس کے لیے حالتِ علالت میں بھی رات رات بھر جاگ کر ان کتابوں کا بھی رٹّا لگایا جن کے مصنّفوں کے علم و دانش کے پرزے آئے دن وہ محفلوں میں اڑاتا رہا اور اپنی بوڑھی آنکھوں میں اس نے بوسیدہ تحریروں کی زنگ آلود سوئیاں چبھوئیں جن کی کند نوکوں سے اس کی پتلیاں زخمی ہو ہو اٹھیں اور دیدے خون سے بھر گئے اور اس حقیقت کے

ادراک کے باوجود کہ کسی انقلاب کے چلتے اس کی عرضی دو تین سال پہلے یعنی چار پانچ برسوں میں ہی کنارے لگ جاتی ہے (جس کا امکان بہت کم ہے) اور رٹائرمینٹ کی عمر ساٹھ سے بڑھ کر باسٹھ تک پہنچ جاتی ہے، تب بھی اسے پروفیسری کا موقع ایک سوا سال سے زیادہ نہیں مل پائے گا، اس عمر میں یہ سب کچھ کرنا بوالعجبی نہیں تو کیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس بہانے سے آپ کو اپنے تعلیمی سسٹم کی بوالعجبی بھی دکھاتا چلوں کہ جس نے ایک طرف تو زبان وادب کے کسی شعبے میں ایک ایسے آدمی کو ایک سال کے لیے بھی نہیں رکھا جو ادب کے امتحان میں گولڈ مڈل حاصل کرنے کے علاوہ ایک سچا ادیب بھی تھا۔ جس نے ساری عمر ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ادب کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ معاشرے کے درد وکرب کو اپنے اندر جذب کیا۔ خونِ جگر صرف کر کے کہانیاں لکھیں تا کہ انسانوں کی چھٹپٹاہٹ دنیا کے سامنے آسکے اور ان کے درد کا مداوا ہو سکے اور دوسری جانب ایسے ایسے لوگوں کو تیس تیس برسوں تک کے لیے پروفیسری کے عہدے پر فائز کیا جنھوں نے زبان وادب کے لیے کچھ نہیں کیا۔ نہ دل کا خون کیا، نہ کوئی درد سہا، نہ آنکھیں جلائیں، سوائے دوسروں کی تحریروں کے تراشوں کو گوند سے چپکا کر مضمون بنانے کے۔ ہے نا یہ بھی بوالعجبی! اس بوالعجبی کے تو اور بھی کئی روپ ہیں مگر چوں کہ آج مجھے اس شخص کی بوالعجبیت دکھانی ہے جو میرے سامنے کھڑا ہے۔ اس لیے اس جانب پھر کبھی۔

اس شخص کی شخصیت کی حیرت انگیزی اور اس کی سرشت کی تعجب خیزی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے یہاں بیک وقت عجلت پسندی بھی نظر آتی ہے اور اطمینان قلبی بھی۔ اس کی عجلت پسندی کا یہ عالم ہے کہ اس کے کسی کام میں ذرا سی بھی تاخیر اسے غضب ناک کر دیتی ہے۔ ہتھّے سے اکھاڑ دیتی ہے، جامے سے باہر کر دیتی ہے۔ آن اور انا کے نام پر راجپوتی تلوار کی طرح آنِ واحد میں میان سے باہر کر دیتی ہے۔ مثلاً کسی محفل کے تعارفی جملوں میں اس کا نام لینے میں ذرا دیر ہوئی کہ اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اس کا سراپا شمشیرِ برہنہ کی طرح لہرا اٹھا اور مشتعل لہجے میں اس کی زبان سے مثلِ تیرِ زہر آلود سنسناتا ہوا یہ جملہ نکل گیا ''میرا نام ابھی تک نہیں آیا'' اور دوسری جانب اطمینانِ قلبی کا یہ حال ہے کہ اس کے بعد آنے والے ادیبوں کا بھی مجموعہ چھپ گیا۔ کم لکھنے والے بھی صاحبِ کتاب بن بیٹھے۔ ہمعصر تخلیق کار اپنی تصنیف کی بدولت ساہتیہ اکادمی جیسے بڑے ایوارڈ سے سرفراز ہو چکے مگر وہ ہے کہ سینئر ہونے اور زیادہ لکھنے کے باوجود اب تک کوئی کتاب نہ لا سکا۔ مجموعہ تیار ہے مگر اس کی شانِ بے نیازی کا شکار ہے۔ احباب مصر ہیں، بے قرار بھی اور ہر طرح کا صرفہ اٹھانے کو تیار بھی لیکن وہ ہے کہ دل میں قرار لے بیٹھا ہے۔

اس کی شخصیت میں شعلہ صفتی اور شبنم مزاجی کا امتزاج بھی اسے بوالعجب بناتا ہے اور اس کی بوالعجبی موقع بہ موقع عجب عجب تماشے دکھاتی رہتی ہے۔ ایک تماشہ آپ بھی دیکھیے:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں میں نے اپنے کچھ دوستوں جن میں وہ بھی شامل تھا کی ایک مخصوص محفل میں پروفیسر گوپی چند نارنگ پر اپنا خاکا ''نارنگ کے نورنگ'' پیش کیا۔ خاکا کے ختم ہوتے ہی وہ شخص نہایت مضطربانہ لہجے میں بول پڑا۔

''باپ رے باپ! اتنی مبالغہ آمیز تعریف! تم تو بدنام ہو جاؤ گے۔'' لیکن جواب میں جیسے ہی اس نے میرا یہ جملہ سنا'' میں نے سوچا تھا کہ نارنگ صاحب کے بعد اسی اسٹائل میں آپ کا بھی خاکا قلم بند کروں گا مگر اب جب کہ آپ کو میرا یہ انداز ہی پسند نہیں تو نہیں لکھوں گا۔'' تو اس کا اضطراب یکا یک پرسکون ہو گیا اور وہ جھٹ سے بول پڑا۔

'نہیں نہیں بابو! تمھارا یہ انداز بہت اچھا ہے۔ بہت ہی پیارا ہے، بہت ہی سچا ہے۔ پہلے والا جملہ تو میرے منہ سے حسد میں نکل گیا تھا مگر اب جو میں بول رہا ہوں یہ سب کچھ رشک میں باہر آ رہا ہے۔ خدا کی قسم کھا کے کہو کہ میرے خاکے تک تم اس انداز کو ترک نہیں کرو گے۔''

ایک تماشا اور ملاحظہ کر لیجیے: میرے سنٹر کی جانب سے پٹنہ میں منعقدہ فِکشن کے ایک فنکشن میں بہار کے افسانہ نگاروں کا میں تعارف کرا رہا تھا۔ ابھی چند ہی نام میری زبان پر آئے ہوں گے کہ وہ شخص اپنی عجلت پسندی کو روک نہ سکا۔ غصّے میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت ہی کرخت لہجے میں بولا کہ آپ نے میرا ذکر نہیں کیا مگر جواب میں جیسے ہی میں نے یہ کہا کہ میرے نزدیک آپ بڑے اور منفرد تخلیق کار ہیں، میں نہیں چاہتا کہ بھیڑ میں آپ کو شامل کروں۔ آپ کا تعارف تو مجھے آپ کے شایانِ شان الگ سے کرانا تھا، تو فوراً بول پڑا، ''اگر یہ بات ہے تو آپ اپنا بیان جاری رکھیے۔ فی الحال میں اپنے کان اور منہ دونوں بند کر لیتا ہوں۔'' ایک لمحے میں شعلے کی مانند بھڑکا ہوا شخص دوسرے لمحے میں راکھ کی طرح بجھ گیا۔ جیسے کسی درد سے چھٹپٹاتے ہوئے مریض کو بے ہوشی کا انجکشن دے دیا گیا ہو۔

اس کی بوالعجبی کا ایک منظر اس کے رشتہء ازدواج میں بھی نظر آتا ہے۔ غور سے دیکھیے تو اس رشتے میں دو ایسے قالب ایک جان بنے ہوئے ہیں جو دو مخالف قطبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں متضاد مزاجی اوصاف کے حامل ہیں۔ اک شعلہ خو، دوسرا شبنم صفت، ایک آشفتہ سر، دوسرا ہوش مند و باخبر، ایک پریشاں خاطر، دوسرا سنجیدہ طبع، ایک تنک مزاج اور دوسرا مستقل مزاج، ایک اوگھڑ، دوسرا سنگھڑ، ایک مضمحل و بیمار، دوسرا توانا و طرح دار، ایک سنگ، دوسرا موم، ایک خار، دوسرا گل۔

شمالی قطب کے اس گرم مزاج شوہر سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی بیوی کے ناز اٹھاتا ہوگا، پھول کو پھولوں میں رکھتا ہوگا۔ ہمہ وقت اس کے ساتھ حلیمی سے پیش آتا ہوگا۔ اس کے ارشاد پر عمل کرتا ہوگا۔

یقیناً گھر میں بھی وہ اپنی شررفشانی دکھاتا ہوگا، اپنی شعلگی برساتا ہوگا، اس کے باوجود بیوی کا اسے ٹوٹ کر چاہنا، اس کے ناز نخرے اٹھانا، اس کے علاج کے لیے ستی ساوتری کی طرح اسے یہاں وہاں لیے پھرنا، سیتا کی طرح ہردم اس کے نام کی مالا جپنا، اور مانندِ طرف دارِ غالب، حالی، مثلِ پرستارِ ذوق، آزاد اور مثالِ علم بردارِ سخنِ انیس، شبلی، اس کی تحریروں کی تعریف کرنا، اس کی پبلسٹی کرنا اور اس بات کی سعی کرنا کہ اس کی ایک ایک کہانی ایک ایک سماعت تک پہنچ جائے۔ ایک ایک دل سے داد نکل کر اس کی جھولی میں پڑ جائے، ایک ایک قلم اس کی ثنا خوانی اور رطب اللسانی میں مصروف ہو جائے، دنیا کے ایک ایک گوشے میں اس کے نام کا ڈنکا بج جائے، اس کے سینے پر بھی انعام و اکرام کے تمغے جڑ جائیں، اسے بھی ادبی شان و شوکت حاصل ہو جائے، اس کی حیات بھی جاویداں ہو جائے، بیوی کو تو عجوبہ بناتا ہی ہے، خود اس شخص کی حیرت انگیزی اور ہماری تعجب خیزی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ کسی ادیب کی بیوی کا اپنے ادیب شوہر کی، آگے اور پیچھے بھی، اس حد تک تعریف کرنا ایک ایسا عمل ہے جو ادیبوں کی بیویوں سے میل نہیں کھاتا۔ عموماً ادیبوں کی بیویوں کا رویّہ تو اپنے شوہروں کے ساتھ اس بزرگ کی بیوی کی طرح ہوتا ہے جس نے شوہر کے پوچھنے پر کہ رات آسمان پر جو آدمی اڑ رہا تھا، کیسا لگا؟ تو بیوی نے کافی تعریف کی مگر جیسے ہی بزرگ نے بتایا کہ وہ میں تھا تو بیوی جھٹ سے بول پڑی ''جبھی ٹیڑے ٹیڑھے اُڑ رہے تھے۔ پتا نہیں اس فکشن نگار نے اپنی بیوی کے کان میں کون سا فسوں پھونکا ہے یا اسے کس الّو کا 'گوشت' کھلایا ہے کہ شوہر سے محبت کرنے میں اس نے میدانِ عاشقی میں اترنے والے نوخیز عاشقوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور شوہر پریم اور پتی بھکتی میں ارشاد پروین سے میرا بائی بن گئی ہے۔

اس کی شخصیت کے انوکھے پن کا ایک منظر اس کے دسترخوان پر بھی نظر آتا ہے۔ اقتصادی بدحالی کے آنگن میں خوش حالی کا بچھنے والا دسترخوان اور اس پر آئے دن چنے جانے والے انواع و اقسام کے مرغّن پکوان اور درجنوں کی تعداد میں ماحضر تناول فرمانے والے معزّز مہمان اور اس بے ملازمت تہی دست انسان کو حاتم طائی بنانے والے منظرِ پُر فیضان بھی اسے حیرت انگیز ثابت کرتے ہیں اور علّت و معلول والے اذہان کو تعجب میں ڈالتے ہیں۔ ساتھ ہی ثروت مندانِ عظیم آباد اور منصبِ جاہ و حشمت پر براجمان افسران کو منہ بھی چڑھاتے ہیں۔ واقعی یہ حیران کر دینے والی بات ہے کہ ایک آدمی جس کے پاس برسوں سے کوئی وسیلۂ آز و قہ نہیں، اولاد بھی برسرِ روزگار نہیں، کوئی موروثی جائداد بھی نہیں، اس کے باوجود اس کی شاہ خرچی اور دریا دلی کا یہ عالم ہے کہ وہ عالم ایک عالم کو حاتم طائی اور بادشاہ نواب رضوی کی یاد دلاتا ہے۔ عقلِ دوستاں حیران ہے' اور تفتیشِ دشمناں پریشان کہ یہ کرشمہ کیسے ہوتا ہے کہ بن سواتی کی بوند پائے کوئی صدف موتی بناتا ہے؟ بنا آب و گِل کے کوئی گل کھلاتا ہے۔ قیاس آرائیاں اپنے گھوڑے دوڑانے میں مصروف ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے

کوئی ایسا 'مرشد' مل گیا ہو جس کے قبضے میں کوئی 'رانی باغ' ہو اور اس 'مرشد' کے حکم سے 'رانی باغ' کے نگہبان رحمت صاحب خاموشی سے اس کی جیب میں اشرفیاں ڈال جاتے ہوں یا اس کے 'شکنجے' میں کوئی ایسا گھڑیال آ گیا ہو جو مثلِ ناگ لعل اگلتا ہو اور اس کے بے رنگ گھر کو 'سرخ اپارٹمنٹ' میں بدل دیتا ہو، یا کوئی ایسا وظیفہ ہاتھ آ گیا ہو جس کے ورد سے کسی سعودی شیخ کی بوتل سے جن نکل کر بلّی کے بچّے کی طرح دبے پاؤں' گھر میں داخل ہوتا ہو اور ریال کی جھنکار سے تنگی کے سکوت کو توڑ کر اسے ایسی وسعتِ قلبی عطا کر دیتا ہو جس کا لمس پاتے ہی جنابِ ایس مسٹر گلیڈ بن جاتے ہوں، یا کسی شاہی یا خانقاہی گنبد کے کبوتر آ کر چپکے سے اس کے 'گھونسلے' میں سونے کے انڈے دے جاتے ہوں۔ ممکن ہے قیاس آرائیوں کے گھوڑے یقین کی کسی منزل تک نہ پہنچیں لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ ان کے پاؤں ہوا میں کم اور زمین پر زیادہ ہیں ورنہ اس شخص کے 'ڈھلان پر رکے ہوئے قدم' اتنی تیزی سے نہیں بھاگتے اور میرا بڑا 'بھائی' شوکت حیات اور میری بھابی ارشاد پروین کا 'مادھو' اس طرح 'پاؤں' نہیں پھیلاتا کہ ایک جست میں دہلی، ممبئی، کلکتہ، حیدرآباد، لکھنؤ اور علی گڑھ کی ادبی زمینیں اس کے قدموں کے نیچے آ جائیں اور ان زمینوں کے مکین ایک ساتھ اس کے دسترخوان پر چنی گئی خشک و تر نعمتوں کا لُطف لیں، اس کے سکوتِ دل کی 'چیخیں' سنیں، بانگِ جرسِ دلِ گداز بھی سماعت فرمائیں وار اپنی حیات کے رگ و پے میں سوزِ حیاتِ شوکت سمو کر واپس لوٹیں۔

کچھ اور پہلوؤں سے بھی شوکت حیات نرالے نظر آتے ہیں۔ عام طور پر ٹیلی فون اور موبائل استعمال کرنے والوں کے ذہن میں کچھ دیر بعد ہی میٹر گھومنے لگتا ہے۔ اعداد بظاہر نظر نہ آتے ہوں مگر ان کے خوف کے خدوخال ضرور روپ لینے لگتے ہیں اور آن کی آن میں نقوش اتنے گاڑھے ہو جاتے ہیں کہ بات کو مکمل کیے بنا ہی منہ بند کر لینا پڑتا ہے۔ یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ یہ عمل کنجوسی پر محمول کیا جائے گا یا بداخلاقی تصور کیا جائے گا مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں اپنی بات کے سامنے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ میٹر چاہے جتنا بھی گھوم جائے۔ گھومتا ہوا چاہے جس چھور پر پہنچ جائے، وہ اپنی بات کو لگام نہیں دیتے۔ سننے والے کے کان بھلے ہی ذُکھ جائیں، ان کا منہ نہیں دکھتا۔ شوکت حیات دوسرے قبیل کے آدمیوں میں سے ایک ہیں۔ وہ شروع ہوتے ہیں تو اختتام تک پہنچے بنا دم نہیں لیتے۔ جیسے فون پر بات نہ ہو رہی ہو بلکہ وہ کہانی سنا رہے ہوں اور وہ بھی طویل کہانی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کی قصہ گوئی سے پوز غالب ہوتا ہے۔ رموزِ اوقاف کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ کبھی کبھی تو یہ سوچ کر دکھ اور افسوس ہوتا ہے کہ بلاوجہ ان کا میٹر بڑھ رہا ہے مگر ان کی گفتگو کی رفتار کا میٹر کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کبھی کبھی تو ان کے نقصان کا سوچ کر میں فون کاٹ دیتا ہوں مگر اکثر انکا دوبارہ فون آ جاتا ہے، وہ بھی معذرت کے ساتھ جیسے اس میں بھی انھیں کی غلطی ہو۔ ان کا یہ رویّہ بھی انھیں انوکھا بناتا ہے

اوران کے معاشی صورتِ حال کے تناظر میں دیکھنے پر یہ انوکھا پن اور بھی گاڑھا جاتا ہے۔

جس شوکت حیات کے دل و دماغ میں لوہار کی بھٹی سے نکلے اسپات پر پڑی ہتھوڑے کی چوٹ سے چھٹکے شراروں کی مانند سرخ چنگاریاں اڑتی رہتی ہیں، اسی شوکت حیات کے لباس میں ہرے، نیلے پیلے رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کپڑوں کی زمینوں پر رنگوں کے گل بوٹے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اندر کی زمین پر غم و غصّے اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے کتنے انگارے بچھے ہوئے ہیں۔ اندر باہر کے متضاد رنگوں کا یہ انوکھا سنگم بھی شوکت حیات کی بوالعجبی میں چار چاند لگاتا ہے اور کچھ ستارے بھی ٹانکتا ہے۔

میڈیکل کی پڑھائی جس کے سوتے جاگتے سپنے دیکھے جاتے ہیں اور داخلے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے، ماں باپ اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں، اپنی جائدادیں بیچ دیتے ہیں، اپنے مکان تک رہن رکھ دیتے ہیں، اس کورس میں اپنی لیاقت کے بل بوتے پر داخلہ لے کر اور ایک سال تک پڑھائی کرنے کے بعد صرف اس سلوگن کو سن کر:

High Technical Education Makes A Man Slave Of Bourgeois Society

اسے چھوڑ دینا بھی شوکت حیات کو ایک منفرد شخصیت کا کردار بناتا ہے۔ ممکن ہے شوکت حیات کا یہ عمل بعض نگاہوں میں نادانی کا یا احمقانہ عمل لگتا ہو لیکن یہ بے مثال عمل اسی سے سرزد ہو سکتا ہے جس کی سرشت انسانی محبت کے خمیر سے گندھی ہو اور جس کا دل ایسا گداز ہو جو ایک مٹّی سے پیدا ہونے والے انسانوں کے درمیان تفریق کے تصور سے کانپ اٹھتا ہو۔

متضاد معانی سے مزیّن ذات، متلون مزاجی صفات، سرد و گرم کیفیات اور پیچیدگیوں سے پُر نفسیات والا یہ شوکت حیات اپنے لیے چاہے جو ثابت ہو، ہمارے لیے تو باعثِ لطف و انبساط ہے کہ اسے دیکھ کر، سن کر اور پڑھ کر ہمارے سازِ حیات اور تارِ احساسات جھنجھنا اور گنگنا اٹھتے ہیں۔

◄◄ ● ►►

"Bushra",A- 12 lane,Hamza colony,
New sir Syed nagar xtention,Aligarh,202002
7678436704

● ڈاکٹر منظر اعجاز

شوکت حیات.....کچھ یادیں.....کچھ باتیں

شوکت حیات کے نام سے تقریباً چالیس سال پہلے میرے کان آشنا ہوئے تھے۔ شروع ہی میں ان کی شہرت بحیثیت افسانہ نگار حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مختلف شہروں کے ادبی حلقوں میں پھیل رہی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ ''بیسویں صدی'' کے افسانوی مزاج سے ان کا مزاج مختلف تھا۔

مجھے افسانہ نگاری اور شاعری کا شوق نہایت ہی کم سنی سے تھا۔ لیکن یہ شوق اس وقت تک پروان نہ چڑھ سکا جب تک میں مظفر پور میں قیام کرنے کے قابل نہ ہوا۔ اس شوق کو پروان چڑھانے میں ماہنامہ ''بیسویں صدی'' نے اہم کردار ادا کیا۔ اس میں جن شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شامل اشاعت ہوتی تھیں، ان کی تعلیمی ڈگریاں بھی درج کر دی جاتی تھیں۔ مظفر پور اور چمپارن کے بھی کئی افسانہ نگار اس رسالے میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ چند نام ابھی بھی ذہن میں نقش ہیں۔ نعیم کوثر کا تو میں قریب ترین پڑوسی تھا۔ ابواللیث جاوید بھی آس پاس میں رہائش پذیر تھے۔ ایک محترمہ بھی ان دنوں بہت مشہور و مصروف تھیں۔ یہ ان کی دوشیزگی کا زمانہ تھا۔ اسی افسانہ نگاری کی وجہ سے ان کی شادی ایک مقیم انگلستان جوان سے ہوئی اور وہ انگلستان چلی گئیں۔ اس کے بعد ان کی افسانہ نگاری کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ چمپارن کے افسانہ نگاروں میں عظیم اقبال، شاکر کریمی اور فاروق راہب وغیرہ بھی رسالوں میں اور خاص طور سے بیسویں صدی میں چھپتے رہتے تھے اور میں چونکہ بیسویں صدی کا مستقل اور زود خواں قاری تھا، یعنی دو تین دنوں میں ہی سارے صفحات چٹ کر جاتا تھا اور جب تک اگلے ماہ کا شمارہ نہیں آتا تھا تب تک چٹ کیے ہوئے شمارے کی باض خوانی کرتا رہتا تھا۔ دوبارہ، سہ بارہ اور نہ جانے کتنی بار پڑھتا۔ اسی طرح شب و روز گزارتے گزارتے نیا شمارہ آ جاتا لیکن نئے شمارے کے انتظار کی لذت پرانے شمارے کی ورق گردانی میں کچھ کچھ کھو سی جاتی۔ مست قلندر کی کچھ پرانی فائلیں، نیاز فتح پوری کے کچھ افسانے اور کئی دوسرے افسانہ نگاروں کی تخلیقات بھی نظر سے گزری تھیں۔ بیسویں صدی کے افسانوں کا اثر زیادہ تھا۔ میں اسی مزاج کے افسانے لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کچھ افسانے اِدھر اُدھر شائع بھی ہوئے۔ لیکن مظفر پور میں کچھ اہم معاصرین ایسے تھے جو جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہو رہے تھے اور افسانے اور افسانچے بھی لکھ رہے تھے۔ اگر کسی کی کوئی مختصر سی افسانوی تحریر ''شب خون'' میں شایع ہو گئی تو اس کا دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ جاتا تھا اور وہ اپنے ہم وطن متقدمین و معاصرین کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اسی طبقے میں بطور خاص شوکت حیات نے شہرت پائی تھی۔ علامتی افسانہ نگاری

کے حوالے سے ان کے امتیازات قابلِ لحاظ سمجھے جاتے تھے۔ میں انہیں دیکھنے اور پڑھنے سے پہلے کچھ دنوں تک ان کے بارے میں ادبی حلقوں میں سنتا رہا۔ کبھی کبھار پٹنہ جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی گاندھی میدان میں لگنے والے کتاب میلے میں خاص طور سے چند ہم مذاق دوستوں کے ساتھ جاتا تھا۔ پٹنے میں سبزی باغ، رحمانیہ ہوٹل اور بک امپوریم کی طرف تو جانا ہوتا ہی تھا۔ اِدھر سے ہوتے ہوئے جب ہم دکھن کی طرف بڑھتے تو جامن گلی کی طرف جانے والی گلی کے نکڑ پر واقع چائے پتی کی دکان پر شوکت حیات اپنی اہلیہ کے ساتھ چائے پتی کی خریداری میں مصروف تھے۔ دوستوں میں سے کسی نے بتایا کہ یہ شوکت حیات ہیں۔ میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا اور پشت کی طرف سے دیکھا تھا۔ خیال آیا کہ یہ خوب رو جوڑا شادی کے وقت اور بھی خوب صورت اور مثالی رہا ہوگا۔

جب ۱۹۹۷ء کے نصف دوم میں بسلسلۂ ملازمت شاد کے عظیم آباد میں سکونت اختیار کرنی پڑی تو ادبی حلقوں اور جلسوں میں متعارف اور شریک ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ عبدالصمد، شموئل احمد، شوکت حیات، عبید قمر، احمد یوسف، مشتاق احمد نوری اور دوسرے اربابِ قلم سے متعارف ہوا اور ان سے قربتیں بڑھیں۔ شوکت حیات سے کچھ مختلف انداز میں قربتیں بڑھیں اور محسوس ہوا کہ وہ خود پسند طبیعت کے مالک تھے۔ لیکن کبھی کبھی انداز بالکل بدل جاتا تھا۔ انھوں نے اے۔این۔کالج کے شعبۂ اردو میں ایم۔اے میں داخلہ لیا۔ اور اپنی اہلیہ کو بھی داخلہ دلوایا۔ پھر امتحان کا فارم بھرا اور امتحان دیا۔ یونیورسٹی میں اول آئے۔ یہ ان کا حق بھی تھا۔ ان کی اہلیہ نے امتحان نہیں دیا۔ یہ دونوں غالباً ادیبِ کامل کی سند رکھتے تھے۔ اور اس بنیاد پر مگدھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو یا کسی کالج کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ میں داخلے کی اہلیت رکھتے تھے۔ کسی موقع پر بتایا کہ وہ سائنس کے طالب علم تھے، اور میڈیکل میں داخلے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے والد محکمہ پولیس میں تھے۔ ان کے انتقال سے وہ جھٹکا لگا کہ میڈیکل کا خواب ٹوٹ گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ افسانہ نگاری کی طرف لپک مزاحم ہوئی ہوگی۔ افسانہ نگاری میں غالباً ان کے واحد استاد سہیل عظیم آبادی تھے جو نظریاتی طور پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی صف میں شمار کیے جاتے تھے۔ اسی راہ پر شوکت حیات نے بھی چلنا شروع کیا۔ خود پسندی کے ساتھ ساتھ نظریاتی طور پر ان میں انتہا پسندی بھی پیدا ہوئی۔ ان کا افسانہ ''بانگ'' بہت مشہور ہوا تھا۔ جب میں نے اسے پڑھا تو لگا کہ وہ نکسلی تحریک سے بھی متاثر تھے۔ لیکن اس سے زیادہ وہ افسانے میں اپنے انفراد و امتیاز پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ علامت، استعارہ، اور تمثیل وغیرہ اردو افسانے کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن ''بانگ'' میں وہ مرغا، مرغی، ڈربہ، انڈا، چوزہ وغیرہ کو علامتی جہت دینے میں کامیاب ہوئے تھے اور یہ بات یقیناً بالکل نئی تھی۔ سن ستری افسانہ نگاروں کی صف میں وہ خود کو شمار کرتے تھے۔ ایم۔اے کی طالب علمی کے زمانے تک وہ شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچے تھے، لیکن ایم۔اے میں یونیورسٹی کی سطح پر اولیت کا سہرہ سر سے بندھا تو اِدھر اُدھر موقع بہ موقع کہتے پھرتے کہ میں ایم۔اے کا گولڈ میڈلسٹ ہوں۔ میں نے

ٹاپ کیا ہے۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال بڑے تھے۔ ٹاپ کر کے انہیں حاصل بھی کیا ہونا تھا۔ یہ زمانہ تو وہ تھا کہ نویں پیپر کی بدولت کتنے ہی ایرے غیرے ٹاپ کر جاتے تھے۔ لیکن شوکت حیات نے تو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ لگے ہاتھ انہوں نے نیٹ بھی کر لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ کہ پی۔ایچ۔ڈی میں داخلے کے لیے انہیں پی۔آر۔ٹی کے مرحلے سے نہیں گزرنا پڑا۔

شوکت حیات چونکہ افسانہ نگار تھے اور انھوں نے علامتی افسانوں کے حوالے سے مضامین بھی لکھے تھے اس لیے میں نے مشورہ دیا کہ وہ پی۔ایچ۔ڈی کے لیے اردو افسانوں کے ارتقائی سفر کو موضوع بنائیں۔ اس میں ایک اہم باب تو ان کے مطالعے اور ذوق سے متعلق تھا، جس کا آغاز خود ان کے خیال میں ستر کی دہائی میں ہوا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد افسانے کے سفر کو افسانہ نگاروں کے جس قافلے نے آگے بڑھایا ان کے خیال میں نہ تو وہ ترقی پسند تھا نہ جدید۔ حالانکہ اس دور کے لیے ''مابعد جدیدیت'' کی اصطلاح وضع کی گئی۔ لیکن شوکت حیات نے اس نسل کو ''انام'' نسل سے تعبیر کیا اور افسانے کی نامی حیثیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت کی کہ نامیاتی افسانے وہ ہوں گے جو بدلتے ہوئے زمانے میں اپنے معنوی حدود کی توسیع کر سکیں اور ہر زمانے میں ان کی افادیت و اہمیت برقرار رہ سکے۔

پی۔ایچ۔ڈی میں رجسٹریشن کرانے کے بعد انھوں نے لکھنا بھی شروع کیا۔ مجھے دکھایا تو احساس ہوا کہ وہ سینوپسس Synopsis کو سمجھ نہیں پائے۔ اور پھر جو سن ستری وہ بولتے اور لکھتے رہتے تھے، اسی کو اپنا مکمل کام سمجھ لیا تھا حالانکہ سینوپسس کی فریمنگ تو میں نے ہی کی تھی اور اس دوران انھیں بتایا بھی تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ بالآخر ہوا کہ ان کی خواہش کے مطابق ابتدائی کلمات مکمل کرا دینے کا وعدہ میں نے کر لیا۔ وہ غالباً تین چار روز آئے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ آئے۔ میں نے لکھوانا شروع کیا۔ وہ تو اگر کبھی کلاس کرنے بھی آتے تھے تو اسکولی طالب علم کے بستے جیسا جھولا لے کر آتے تھے۔ کتاب تو ہوتی نہیں تھی۔ کاپی اور رجسٹر وغیرہ ہوتا تھا۔ جب مقالہ نگاری کی بسم اللہ ہوئی تو انہوں نے اپنے بستے سے رجسٹر یا کاپی نہیں نکالی بلکہ شعبۂ اردو کا لیٹر ہیڈ جو میری میز پر ہوتا تھا اسی سے صفحات کھینچنے لگے میں نے اس سلسلے میں انہیں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ یہ اندیشہ تھا کہ یہ صفحات بکھر بھی سکتے ہیں۔ ظاہر ہے میں اپنے طلبہ کے نمٹارے کے بعد ہی انھیں تھوڑا وقت دے پاتا تھا اور اس دوران سمجھا تا بھی جاتا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ لیکن شاید وہ افسانے تو لکھ سکتے تھے، بعض مضامین بھی انھوں نے لکھے تھے لیکن پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ وہ اس لیے بھی نہیں لکھ سکتے تھے کہ اردو افسانے کی روایت اور تاریخ پر ان کی نظر نہیں تھی۔ وہ حوصلہ ہار گئے لیکن ایم۔اے کی طالب علمی کے زمانے میں ان کا ذوق و شوق حیرت انگیز تھا۔ وہ کبھی کبھار آ جاتے تھے اور آتے تھے تو چمو کن کی طرح چپک جاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔

شوکت حیات اگر کبھی کبھار آتے تھے تو وہی بستہ لے کر آتے تھے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ وہ ہر چند کہ طالب علم بھی تھے لیکن میں انھیں ایم۔اے کے طلبہ میں اس طرح متعارف کراتا تھا کہ بہار کے افسانہ نگاروں کی جو ایک کہکشاں ہے، اس کے یہ ایک تابندہ ستارے ہیں۔ ان کا ذکر ایم۔اے کے نصاب میں شامل ہے۔ وہاب اشرفی کی کتاب ''مابعد جدیدیت..... مضمرات و ممکنات'' اور ''تاریخ ادب اردو'' بھی دیکھی جا سکتی ہے اور یہ کتابیں ایم۔اے کے طلبہ کو ضرور دیکھنی چاہئیں۔ ان طلبہ و طالبات سے نمٹارے کے بعد میں شوکت حیات کو وقت دیتا تھا۔ وہ جب آتے تھے سوالوں کے دفتر لے کر آتے تھے۔ جو سوال کرتے میں اس کا جواب دینے لگتا تو کہتے ٹھہرئے، لکھ لیتے ہیں۔ اور پھر بستے میں سے رجسٹر نما کاپی نکالتے اور لکھنے لگتے۔ جواب مکمل ہو جاتا تو پھر کوئی نہ کوئی سوال کر دیتے۔ اور پھر میں جواب میں جو کچھ بولتا، وہ لکھنے لگتے۔ ظاہر ہے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت انھیں نہیں دے سکتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ گھڑی کا کانٹا دو سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے کہا کہ شوکت بھائی! اب چلنا چاہیے۔ اور چلتے چلتے ہم لوگ ایک پیالی چائے پی لیں۔ انھوں نے بستہ سمیٹا۔ لیکن مجھے شوکت حیات کو رخصت کر کے پھر شعبے میں آنا تھا۔

کالج کے گیٹ کے سامنے ایک چائے ناشتے کی دوکان تھی۔ ہم کئی لوگ ذیابیطس کے شکار چائے پینے جاتے تھے اور بغیر شکر کی چائے بنوا کر پیتے تھے۔ ظاہر ہے اس میں کچھ فاضل وقت لگ جاتا تھا۔ شوکت حیات کے ساتھ دو بجے کے بعد پہنچے تو ار بند جو فرسٹ شفٹ سنبھالتا تھا، وہ جا چکا تھا۔ اور سکنڈ شفٹ میں اس کی ماں دوکان دیکھا کرتی تھی۔ وہ موجود تھی۔ وہ دوپہر میں گھر سے اپنے اسٹاف کا کھانا لے کر آتی تھی۔

جب تک ہمارے لیے اسپیشل چائے بن رہی تھی شوکت حیات نے کوئی سوال کر دیا۔ میں جواب دینے لگا تو پھر ان کا وہی انداز ظاہر ہوا، ٹھہرئے، لکھ لیتے ہیں، اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ اس دوران چائے بھی چلتی رہی۔ جب بات پوری ہو گئی تو انھوں نے کہا کہ ایک بار اور چائے پی لی جائے۔ چنانچہ انھوں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ چائے بننے لگی تو انھوں نے فوراً ہی کوئی اور سوال کر دیا۔ میں نے جواب دینا شروع کیا تو پھر لکھنے لگے۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ لگ بھگ چار بجے تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اور اسی کے ساتھ چائے کا دور بھی جاری رہا۔ اس دوران کئی بار ار بند کی ماں کی طرف نظر اُٹھ گئی تو دیکھا کہ اس کے چہرے سے تناؤ اور ترشی مترشح تھی۔ بالآخر وہ بول ہی پڑی۔ ''سر! اسٹاف کھانا کھائے گا۔'' تب میں نے شوکت حیات سے بستہ سمیٹنے کو کہا۔ ہم باہر آ گئے۔ شوکت حیات سے رخصت چاہی تو انھوں نے پھر کوئی سوال داغ دیا۔ میں نے عجلت میں مختصر سا جواب دیا اور کالج کے گیٹ میں داخل ہونے کے لیے تیز رفتار ہو گیا۔ شوکت حیات کو گیٹ ہی پر رک کر آٹو کا انتظار کرنا تھا لیکن وہ میرے پیچھے لپکے ہوئے چلے آئے۔ بولے، اس کو بھی لکھ لیتے ہیں۔ لیڈی پیون راج رانی آفس کی چابی مجھے تھما کر پہلے ہی جا چکی تھی۔ میں آفس میں داخل ہوا تو شوکت

حیات پھر سے بیٹھ گئے اور بستہ کھول لیا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ میرا دن کا کھانا اور آرام بھی گیا۔

شوکت حیات اس سے پہلے بھی کبھی کبھار آتے تھے تو سوالوں کا دفتر کھول دیتے تھے لیکن اس دن تو انھوں نے انتہا کر دی تھی۔ اس دوران وہ اکثر میری تعریفیں بھی کرتے رہتے اور مجھے ان کا یہ انداز خوشامدانہ معلوم ہوتا۔ غالباً ۲۰۱۵ء کی بات ہے کہ پی۔ایچ۔ڈی کے سلسلے میں وہ کئی روز تک لگاتار آتے رہے۔ ان کی بیگم بھی ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ میں طلبہ کی کلاس لینے میں مصروف تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے سیل فون پر کسی سے بات کرنے لگے اور پھر اسی دوران مجھے فون تھماتے ہوئے بولے۔ ''لو، منظر اعجاز سے بات کرو۔ یہ میرے استاد ہیں۔ میں نے ایم۔اے یہیں سے کیا ہے اور گولڈ میڈلسٹ ہوا۔ اب میں منظر اعجاز کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہا ہوں۔'' مجھے فون تھمانے لگے تو میں نے اشارے سے پوچھا، کون ہیں؟ بولے، غزال ضیغم۔

غزال ضیغم کو میں نے کئی بار قریب سے ضرور دیکھا تھا لیکن کبھی علیک سلیک کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس موقع پر علیک سلیک کی سے زیادہ گفتگو نہ ہوئی۔

شوکت حیات کا جارحانہ انداز بھی دیکھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور وحشت بھی۔ غالباً دس سال سے زیادہ کی بات ہے۔ بہار اردو اکادمی میں بلراج کومل کا سہ روزہ توسیعی خطبہ چل رہا تھا۔ وہ اردو افسانے کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے۔ تیسرے روز میں بھی بلراج کومل کو سننے کے لیے پہنچ گیا۔ خطبہ جاری تھا۔ پروفیسر وہاب اشرفی مسند صدارت پر متمکن تھے۔ بلراج کومل نے اپنے خطبے میں شموئل احمد اور شوکت حیات وغیرہ کے افسانوں کا ذکر تعریفی انداز میں کیا۔ اس کے بعد صدارتی خطبے کی باری آئی تو وہاب اشرفی اپنا منحنی سا جسم لیے اُٹھے اور منمنی سی آواز میں خطبہ دینا شروع کیا۔ وہ آخری مرحلے میں تھے کہ شوکت حیات سامعین کے مجمعے سے اُٹھے اور بڑے ہی جارحانہ انداز میں بولے۔

''وہاب بھائی! میں آپ کو نقاد مانتا ہی نہیں ہوں۔'' اور پھر نقاد کا نام انھوں نے لیا، جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، وہ نام ممتاز شیریں کا تھا۔ وہاب صاحب نے کچھ جواب تو دیا اور اس کے ساتھ ہی مائک سے ہٹ کر اپنی راہ چل پڑے۔ اس کے ساتھ ہی پروگرام کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے بعد شوکت حیات نے لپک کر مائک تھام لیا اور بے وقت کی شہنائی بجانے لگے۔

اس خطبہ کے دوران مقامی سامعین بھی اکادمی کے ہال میں موجود تھے۔ بعد میں کسی دن میں گورنمنٹ اردو لائبریری میں لائبریرین حسن احمد کے پاس بیٹھا تھا۔ بلراج کومل کے خطبے کے حوالے سے بات نکل پڑی تو حسن احمد نے شوکت حیات کی حرکتوں کو نازیبا قرار دیتے ہوئے اپنی نکتہ رسی کا اظہار یوں کیا۔

''جانتے ہیں، شوکت حیات نے یہ حرکت کیوں کی؟ شوکت حیات دراصل وہاب صاحب کی توجہ اپنی

طرف مبذول کرانا چاہتے تھے۔'' حسن احمد کی یہ بات کسی حد تک سمجھ میں آئی لیکن میں کلیتاً متفق نہیں ہوسکتا تھا۔ بات آئی گئی ختم ہوگئی۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک دوسرا واقعہ رونما ہوا۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی ماہنامہ ''آجکل'' کی ادارت سے منسلک تھے۔ وہ تیکھے مزاج کے مالک ہیں اور دوٹوک گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے چند اداریے اپنے انداز کے لکھے۔ انھی اداریوں کے حوالے سے جنوبی بہار کے کسی ادیب نے ان کے خلاف ان کی منسٹری کو لکھ دیا اور اس کے نتیجے میں ابرار رحمانی کا تبادلہ پبلیکیشنز ڈیپارٹمنٹ ہی کے کسی اور شعبے میں ہوگیا۔ یہ بات ناگوار خاطر تو ہونی ہی تھی۔ پٹنے میں ان کی سسرال ہے۔ یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ اس دفعہ آئے تو ڈاکٹر عبید الرحمٰن نے مشتاق احمد نوری کی رہائش گاہ پر ایک نشست منعقد کرائی۔ عبید الرحمٰن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر تھے۔ ان کا دفتر اس زمانے میں بہار اردو اکادمی کے ایک کمرے میں تھا۔ بہر حال نشست منعقد ہوئی تو شہر کے کئی ادیب اس میں مدعو کیے گئے۔ پروفیسر وہاب اشرفی، شوکت حیات، اعجاز علی ارشد وغیرہ بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر ابرار رحمانی نے آجکل کے ان شماروں کے اداریے پڑھ کر سنائے جن کے حوالے سے ان کے خلاف شکایات درج کرائی گئی تھیں۔ پھر تبصرے کی دعوت دی گئی۔ دیکھنا یہ تھا کہ ان اداریوں میں حکومت کے خلاف کوئی بات تو نہیں لکھ دی گئی ہے۔ بغور اداریے سنے گئے۔ کہیں ایسی ویسی کوئی بات تو تھی نہیں پھر بھی وہاب صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں ابرار رحمانی کو مشورہ دیا کہ یہ سرکاری ادارہ ہے۔ کسی بھی طرح کے تنازع سے بچنا چاہئے۔ پس پردہ بات یہ تھی کہ شکایت کرنے والا افسانہ نگار تھا۔ اس نے کئی افسانے برائے اشاعت آجکل کو ارسال کیے تھے لیکن ابرار رحمانی کے ادارتی معیار پر کوئی افسانہ اُتر نہیں سکا تھا۔ چنانچہ ان افسانوں کی اشاعت ممکن نہیں ہوسکی تھی۔

بہر حال نشست برخاست ہوئی۔ وہاب اشرفی صاحب کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی نکلے۔ شوکت حیات پیچھے تھے اور میں شوکت حیات کے ساتھ تھا۔ شوکت حیات اچانک قدرے بلند آواز میں بول پڑے۔

''کیسے ہیں وہاب بھائی؟''

''کیا پوچھتے ہیں کیسے ہیں۔ ہر روز جیتے ہیں، ہر روز مرتے ہیں۔'' وہاب صاحب نے جواب دیا۔ لیکن دو چار لمحے کے توقف میں ہی ان کے تیور کچھ اور تھے۔ وہ رک گئے، پلٹے اور شوکت حیات کے روبرو ہوتے ہوئے بولے۔

''جب تک آپ پر مضمون نہ لکھ لیں تب تک نہیں مریں گے۔'' اور ہفتہ دس روز کے اندر اندر شوکت حیات کے حوالے سے وہاب صاحب کا ایک طویل مضمون 'قومی تنظیم' میں آگیا۔ اور واقعی حسن احمد کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ بلراج کومل والے پروگرام میں شوکت حیات کا جارحانہ رویہ وہاب اشرفی پر دباؤ بنانے کے لیے تھا۔ شوکت حیات جو چاہتے تھے وہ ہوگیا۔

شوکت حیات دعوتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ خاص طور سے پٹنہ میں منعقد ہونے والے سیمینار میں دوسرے شہروں اور صوبوں سے سے آنے والے احباب کی دعوت وہ ضرور کرتے تھے۔ اور اس موقع پر بعض مقامی حضرات کو بھی مدعو کر لیتے تھے۔ ایسی بعض دعوتوں میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔ مرض اور پرہیز کی وجہ سے کئی دعوتوں میں شریک ہونا میرے لیے ممکن نہ ہوسکا۔

شوکت حیات ایک ممتاز افسانہ نگار کی حیثیت سے حلقۂ یارانِ ادب میں اپنی پہچان رکھتے تھے۔ ان کے ماننے چاہنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اقبال حسن آزاد مونگیر سے پٹنہ آئے تو کبھی وہاب اشرفی اور کبھی شوکت حیات سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے اور مجھے ساتھ لے لیتے۔ کبھی کبھار کہیں اور بھی جانا ہوتا۔ خاطر تواضع تو ہر جگہ ہوتی لیکن شوکت حیات، میاں بیوی دونوں پیش پیش رہتے۔

شوکت حیات سے آمنے سامنے کے علاوہ لینڈ لائن اور موبائل فون پر بھی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ لمبی اور تفصیلی گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ میری اتنی تعریفیں کرنے لگتے کہ میں بوریت محسوس کرنے لگتا۔ یہ تعریفیں میری علمی اور معلمانہ استعداد کے حوالے سے ہوتی تھیں۔ گویا کسی اور پہلو سے ان کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ بھی الگ طرح سے وہی نسخہ تھا جو انھوں نے وہاب صاحب پر آزمایا تھا۔ مجھے بھی اک تدبیر سوجھی۔ ایک بار پھر ارے واہ، ارے واہ کہتے ہوئے انھوں نے میری معلّمی کے حوالے سے تعریفیں شروع کیں تو میرا انداز قدرے مختلف ہوگیا۔ میں نے کہا کہ اتنے سارے خوبصورت اور خوش الفاظ رائیگاں کیوں کرتے ہیں۔ آپ تو مضامین بھی لکھتے ہی ہیں۔ ''منظر اعجاز بحیثیت معلم'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ ماریئے۔ تب سے وہ محتاط ہو گئے۔ شوکت حیات سے متعلق کئی اور باتیں یاد آرہی ہیں۔ ایک دفعہ وہ میری رہائش گاہ کنکر باغ بلورنگ کی ماروتی آلٹو کار سے آئے۔ واپس ہوئے تو میں ان کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ انھوں نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک ناول کی رائلٹی میں پبلشر نے مجھے یہ چار لاکھ کی گاڑی دی ہے۔'' میں نے انھیں رسماً مبارکباد دی۔

شوکت حیات اکثر بے سر پیر کی اُڑانے لگتے تھے۔ آخری کچھ برسوں کے دوران وہ نفسیاتی مریض بھی بن گئے تھے۔ اور علاج کے لیے رانچی کے اسی اسپتال میں داخل کیے گئے تھے جس میں کبھی مجاز لکھنوی زیر علاج رہے تھے۔ شوکت حیات کو ڈاکٹر نے کیا کہا اور کیوں کہا، یہ ایک الگ بات ہے لیکن رانچی سے واپسی کے بعد وہ خود یہ کہتے پھرتے تھے کہ ''آئن اسٹائن کی اتفاقاً ایک رگ پھڑک اُٹھی تھی جس کے نتیجے میں وہ ایک عظیم الشان سائنسداں بنا۔ آپ کی بھی ایسی ہی کوئی رگ پھڑک اُٹھی ہے۔ آپ بہت بڑے رائٹر بن جائیں گے۔'' لیکن خود پسند شوکت حیات تو بہت پہلے ہی سے خود کو ایک عظیم الشان فکشن رائٹر سمجھتے تھے۔ اور اپنے ہم عصر، ہم مشربوں کو شاید ہی خاطر میں لاتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو کسی سے فون پر اُلجھ بھی جاتے تھے اور اکثر ان کا رویہ حاسدانہ بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن شاید یہ سب ذہنی اور نفسیاتی

کیفیات کی وجہ سے تھا۔ پٹنے کے معاصرین اکثر و بیشتر ان کی بعض نازیبا حرکتوں سے درگزر بھی کرتے تھے۔اوران کی دل جوئی کی کوشش بھی کرتے تھے۔اسی کوشش کے نتیجے میں انیس آباد علی نگر میں مشتاق احمد نوری کی رہائش گاہ پر شوکت حیات کے سلسلے میں ایک اعزازی نشست بھی ہوئی جس میں اور لوگوں کے علاوہ عبدالصمد بھی شامل ہوئے تھے۔میں بھی شامل تھا۔شرکاء نے مدح سرائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔حالانکہ مدح سرائی کا یہ سلسلہ ویسے بھی چلتا ہی رہتا تھا۔شاید اسی وجہ سے ان کی خود پسندی بھی انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں۔

شوکت حیات کے افسانوی مجموعے ''گنبد کے کبوتر'' کی اشاعت کے بعد ایک ناول ''سرپٹ گھوڑا'' بھی شایع ہوا۔''گنبد کے کبوتر'' پر میرا تبصرہ غالباً اردو بک ریویو میں شایع ہوا تھا۔''سرپٹ گھوڑا'' آیا تو اس کے دو نسخے لے کر وہ میری رہائش گاہ پر آئے اور فرمایا کہ اپنے تبصرے کے ساتھ اسے اردو بک ریویو کو بھیج دیجئے۔یہ ناگوار خاطر بات میرے لیے خوشگوار نہیں ہو سکتی تھی۔ان کے پاس تو وقت ہی وقت تھا اور پاٹلی پترا کالونی میں ان کے فلیٹ کے قریب ہی پوسٹ آفس بھی تھا۔میں ہمیشہ بے حد مصروف رہا۔اور رہائش ایسے علاقے میں رہی کہ کوئی طالب علم شاید ہی کبھی کسی خاص ضرورت سے مجھ سے ملنے آیا ہو۔میں نے انہی حوالوں سے معذرت چاہ لی۔اللہ جانے انھیں کیسا لگا۔

شوکت حیات سے جو آخری گفتگو ہوئی وہ بھی میرے لیے خوشگوار نہیں تھی۔میں اور اقبال حسن آزاد ایک ساتھ کووِڈ کے شکار ہوئے اور ایک دن آگے پیچھے ایمس پٹنہ میں داخل کرائے گئے۔گزشتہ سال ۱۳؍نومبر کو میں اور ۱۴؍نومبر کو اقبال حسن آزاد کو ایڈمٹ کرایا گیا۔ہم دونوں تھے تو ایک ہی ہسپتال میں لیکن وارڈ الگ الگ تھا۔میں نے اقبال حسن آزاد کو کئی بار فون کیا لیکن انھوں نے نوٹس ہی نہیں لیا۔اس دوران کسی دن شوکت حیات کا فون آ گیا۔کہنے لگے۔

''معلوم ہوا ہے کہ اقبال حسن آزاد کو کورونا ہو گیا ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔ان کو فون کرتے ہیں تو کوئی جواب نہیں ملتا۔''

''مجھے بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔''میں نے مختصر سا جواب دیا اور ڈسکنکٹ کر دیا۔انھوں نے جو مجھ سے جاننا چاہا تھا،ان کا یہ انداز بھی جارحانہ تھا۔وہ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ اقبال حسن آزاد کی خیریت نہیں مل پا رہی ہے۔مجھے اس موقع پر غالب یاد آئے جو کسی حریف یا رقیب کی گالیوں میں بھی دیکھتے تھے کہ کون سی گالی دی گئی ہے۔

بہر حال، مجھے شوکت حیات کی رحلت کی مختصر سی خبر اس وقت ملی جب میں خود شدید طور پر علیل تھا اور علاج کے سلسلے میں ریاست سے باہر تھا۔میں دعائے مغفرت کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

46B, P.C. Colony
Kankar Bagh Patna 800020
Mob: 9431840245

● اقبال حسن آزاد

بھول بھلیاں اور شوکت حیات

جن دنوں میں صغریٰ اسکول، بہار شریف میں زیر تعلیم تھا والد مرحوم سید محمد صالح نے میرے ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے بچوں کے کئی رسالے میرے نام جاری کروا دئے تھے جن میں کھلونا (نئی دہلی) نور (رام پور) ٹافی (مالگاؤں) اور مسرت (پٹنہ) وغیرہ شامل تھے۔ان رسائل میں کہانیوں اور نظموں کے علاوہ ''بھول بھلیاں'' کے کالم بھی ہوا کرتے تھے۔گرچہ یہ کالم مختلف ناموں سے آتے تھے لیکن میں انہیں سہولت کی خاطر ''بھول بھلیاں'' ہی لکھوں گا۔ان کالموں میں پہیلیاں ہوتی تھیں اور کچھ ایسے نقشے دیئے جاتے تھے کہ کوئی مسافر راستہ بھول گیا ہے اسے گھر پہنچایئے یا پھر اسی قسم کی چیزیں ہوتی تھیں۔یہ پہیلیاں اکثر و بیشتر ننھے قارئین ہی نقشے بنا کر رسالوں کو بھیجا کرتے تھے جو ان کے نام سے شایع کیے جاتے۔ان پہیلیوں اور نقشوں کے بھیجنے والوں جو نام تواتر کے ساتھ سامنے آتا تھا وہ تھا ''شوکت حیات، پٹنہ''.....

یہ میرا شوکت حیات سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔

وقت کا پنچھی آزاد فضاؤں میں اُڑتا رہا۔موسم بدلتے رہے۔بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے۔میں اسکول سے کالج میں پہنچا۔اور بچوں کے رسائل کی جگہ ''آجکل''، ''کتاب''، ''شب خون'' اور ''الفاظ'' جیسے رسالے پڑھنے لگا۔ان رسالوں میں شوکت حیات بھی نظر آنے لگے۔اب وہ افسانے لکھنے لگے تھے اور افسانوں میں پہیلیاں بجھوانے لگے تھے۔گو کہ ان کا بیانیہ صاف ستھرا ہوا کرتا تھا لیکن مفہوم تک رسائی آسان نہیں تھی۔شاید میں اس وقت ان کے افسانوں کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔لیکن ایک خاص کشش تھی ان کے افسانوں میں یا یوں کہیے کہ ایک ایسا دل پذیر اسلوب تھا ان کا کہ میں ان کا ہر افسانہ پڑھنے لگا۔اور میرے دل و ذہن پر وہ بحیثیت ایک عمدہ افسانہ نگار چھا گئے۔

کلکتہ سے بی اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے پٹنہ یونیورسیٹی میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا تو کچھ ادبی لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔سید محمد محسن (انوکھی مسکراہٹ والے) ابّا کے دوستوں میں تھے۔ایک بار ابا پٹنہ آئے تو وہ مجھے ان سے ملانے ان کے گھر بھنور پوکھر لے گئے۔شین۔مظفر پوری صاحب سے اکثر استاد محترم پروفیسر اسلم آزاد کے یہاں ملاقات ہو جاتی۔ایک دفعہ سہیل عظیم

آبادی سے بھی ان کے گنگا کنارے گھر پر ملنے کا اتفاق ہوا۔ عبدالصمد صاحب سے بہار شریف کی ملاقات تھی اور وہ میرے ماموں زاد بھائی لگتے ہیں۔ ہم عصروں میں فخرالدین عارفی سے بھی گاہے گاہے ملاقات ہو جاتی لیکن شوکت حیات سے ملنے کا موقع نہیں مل سکا۔

۱۹۸۱ء میں میری تقرری جے آر ایس کالج، جمالپور (مونگیر) میں ہوگئی اور میں پٹنہ سے مونگیر آ گیا۔ لیکن چونکہ میرے سبھی لوگ پٹنہ میں مقیم تھے لہذا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایک دفعہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں اردو افسانے پر ایک شاندار سیمینار منعقد ہوا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار لائبریری کے ڈائرکٹر ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک بیدار مغز اور ادب دوست انسان تھے۔ میں ان دنوں پٹنہ گیا ہوا تھا۔ میں اپنے دوست ڈاکٹر قیصر جمال کے ساتھ بحیثیت سامع اس سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے گیا۔ بہار کے کئی مشہور افسانہ نگار وہاں موجود تھے۔ سبھی کی نشست کے آگے ان کے نام کی تختی رکھی تھی۔ سید محمد محسن، کلام حیدری، قمر توحید، ذکیہ مشہدی، مناظر عاشق ہرگانوی کے علاوہ اور بھی کئی افسانہ نگار تھے جن کے نام سر دست یاد نہیں آ رہے ہیں۔ ایک نشست خالی تھی اور اس پر شوکت حیات کے نام کی تختی لگی تھی۔ پروگرام ختم ہو گیا لیکن شوکت حیات نہیں آئے۔ بعد میں ڈاکٹر قیصر جمال کی زبانی معلوم ہوا کہ شوکت حیات اس لیے نہیں آئے کہ وہاں وہ ''اکیلے'' پڑ جاتے۔

ایک روز شام کے وقت میں اشوک راج پتھ پر اخبار خریدنے گیا تو دیکھا کہ اخبار فروش کے پاس فٹ پاتھ پر داڑھی والا ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا۔ اس نے کرتا اور پینٹ پہن رکھا تھا۔ کندھے سے جھولا لٹک رہا تھا اور آنکھوں پر چشمہ تھا۔ اس کی پیشانی کشادہ تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ وہ کوئی رسالہ پڑھنے میں منہمک تھا۔ میرے دوست نے میرے کان میں چپکے سے کہا۔ ''یہی شوکت حیات ہیں۔''

ایک دفعہ میں رحمانیہ ہوٹل میں چائے پینے کے لیے پہنچا تو دیکھا کہ ایک میز کے گرد کچھ شاعر و ادیب قسم کے لوگ بیٹھے ہیں۔ میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور ان کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ چائے آئی تو میں خاموشی کے ساتھ چائے پینے لگا۔ پیچھے سے چند آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں دھیرے دھیرے بلند ہونے لگیں۔ اچانک کسی نے گرج کر کچھ کہا اور میز پر ایک زوردار مُکّا دے مارا۔ میز پر رکھی چائے کی پیالیاں الٹ گئیں اور لوگ چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ شوکت حیات اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ میں چپکے سے باہر نکل آیا۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ میرا پٹنہ آنا جانا لگا رہا لیکن شوکت حیات سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ رسالہ ''آجکل''، نئی دہلی نومبر ۲۰۰۱ء میں شوکت حیات کی کہانی ''مرشد'' شایع ہوئی۔ اس شمارے کے سرورق پر غالب کا ایک شعر درج تھا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ شوکت حیات کا مذکورہ افسانہ اس شعر کی تفسیر ہے۔ میں نے فوراً

اس سلسلے میں مدیر آجکل کو ایک مراسلہ بھیج دیا جو اگلے شمارے میں شایع ہو گیا۔ میں نے لکھا تھا کہ:''

شوکت حیات کی کہانی ''مرشد'' پڑھ کر دل پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ کہانی غالب کے شعر؛

میں چشم وا کشادہ و گلشن نظر فریب　　لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

کی تفسیر معلوم ہوئی۔ مگر کہانی کا آخری جملہ ''لیکن ان کے آبدیدہ ہونے کا سبب ذہن پر کافی زور دینے کے باوجود اس کے لیے ناقابل فہم تھا.....'' ع

''آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد''

کی تفسیر تو نہیں؟ بہر کیف اتنی عمدہ کہانی لکھنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''آجکل''، نئی دہلی، دسمبر ۲۰۰۱ء)

بس پھر کیا تھا۔ چند روز بعد ہی شوکت حیات کا نامہ میرے پاس پہنچ گیا۔ اس میں انہوں نے اس بات پر حیرت ظاہر کی تھی میں ان کے افسانے کو ''سمجھ'' کیسے گیا۔ پھر اگلے ہی روز ان کا فون آ گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو میرا پتا اور فون نمبر کہاں سے مل گیا؟ کہنے لگے کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔

پھر اکثر ان کے فون آنے لگے۔ وہ اتنی لمبی گفتگو کرتے تھے گویا انہیں اور کوئی کام نہیں ہے اور وہ ہر طرح سے فارغ ہیں۔ وہ بولتے تھے، میں سنتا تھا، وہ بولتے تھے میں سنتا تھا، وہ بولتے تھے میں سنتا تھا۔ اس طرح پھر کئی سال اور گذر گئے مگر کبھی ملنے کا موقع نہیں ملا۔

غالباً ۲۰۰۴ء یا ۲۰۰۵ء کی بات ہے۔ میں منظر اعجاز کے ساتھ سبزی باغ سے گذر رہا تھا کہ سامنے سے شوکت حیات آتے دکھائی دئے۔ اب ان کے چہرے پر داڑھی بچی تھی نہ جوانی۔ قریب آئے تو منظر اعجاز سے علیک سلیک ہوئی۔ منظر صاحب نے ان سے میرا تعارف کروایا۔ میرا نام سنتے ہی شوکت حیات اچھل پڑے۔ مجھے گلے لگایا اور نہایت محبت اور گرم جوشی کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ پھر ہم لوگ رحمانیہ گئے اور ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ مجھے یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ اتنے پیارے انسان سے پہلے کیوں نہیں ملا۔

جب میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''مردم گزیدہ'' شایع ہوا تو میں پہلی بار منظر اعجاز کے ساتھ پاٹلی پترا کالونی واقع ان کے گھر گیا۔ میں نے اپنا افسانوی مجموعہ انہیں پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے ایک مضمون میں تمہارا بھی ذکر کیا ہے۔ میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ باتوں باتوں میں جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے کون کون سے افسانے شایع ہونے جا رہے ہیں تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ تو میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ اسے نکلوا دیں گے۔''

''میں بھلا کیوں اور کیسے نکلواؤں گا۔''

''لوگ ایسا کرتے ہیں۔'' شوکت حیات نے جواب دیا اور میں نے ان کی بات پر فوراً یقین بھی کر لیا تھا کیونکہ خود میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا۔ ایک زمانے میں صلاح الدین پرویز مرحوم ''استعارہ'' نکالا کرتے تھے۔ حقانی القاسمی ان کے نائب ہوا کرتے تھے۔ ''استعارہ'' کا افسانہ نمبر نکلنے والا تھا تو مجھ سے افسانے کی فرمائش کی گئی۔ میں نے ایک افسانہ ''خدا سے مکالمہ'' انہیں روانہ کر دیا۔ انہوں نے اس کی رسید بھی دی اور یہ بھی لکھا کہ افسانے کا تجزیہ بھی لکھوا لیا گیا ہے اور افسانے کے ساتھ تجزیہ بھی شایع کیا جائے گا۔ لیکن جب وہ شمارہ آیا تو اس میں میرا افسانہ شامل نہیں تھا۔ میں نے انہیں خط لکھ کر وجہ پوچھی تو ان کا جواب آیا کہ افسانہ تو شامل ہونے والا تھا لیکن پتہ نہیں کیسے فائل سے گم ہو گیا۔ گم کیا ہوا ہوگا کسی نے نکلوا دیا ہوگا۔ میں بڑا دلبرداشتہ ہوا..... اور اب ایسے مدیروں اور اس قسم کی گھٹیا حرکت کرنے والے ادیبوں سے میں ہمیشہ دوری بنا کر رکھتا ہوں۔ بعد میں میں نے اپنا وہ افسانہ اپنے افسانوی مجموعے ''مردم گزیدہ'' میں پہلے نمبر پر لگا دیا۔

زبیر رضوی کا رسالہ ''ذہن جدید'' کئی اعتبار سے منفرد و ممتاز تھا۔ ان دنوں مونگیر میں اردو قارئین کی اچھی خاصی تعداد ہوا کرتی تھی۔ ہم لوگ اردو رسائل خرید کر پڑھا کرتے تھے۔ ۲۰۰۹ء میں ''ذہن جدید'' نئی دہلی کے شمارہ نمبر ۵۳ میں شوکت حیات کا افسانہ ''ذائقہ'' شایع ہوا۔ ''ذائقہ'' پڑھ کر جو پہلا تاثر قائم ہوا وہ کوئی اچھا تاثر نہیں تھا۔ سوئے اتفاق کہ ذہن جدید کے مدیر جناب زبیر رضوی نے مجھ سے کہا کہ میں اس شمارے پر مونگیر میں ایک مذاکرہ کرواؤں۔ لہذا میں نے اپنے گھر پر ادب دوستوں کی ایک میٹنگ بلائی تا کہ اس شمارے پر گفتگو کی جا سکے۔ میٹنگ میں میرے علاوہ ڈاکٹر آفتاب احمد (صدر شعبۂ اردو، بی۔ آر مہیلا کالج، مونگیر) جناب راشد طراز (صدر شعبۂ اردو، آر ڈی اینڈ ڈی کالج مونگیر) ڈاکٹر شبیر حسن (ریڈر شعبۂ نباتات، آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج، مونگیر) ڈاکٹر ایم اے او جوہر (ریڈر شعبۂ حیوانات، آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج، مونگیر) مشہور شاعر جناب طارق متین، ماسٹر ابو محمد، جناب پرویز اقبال اور نوجوان اسکالر ڈاکٹر محمد حسین شامل تھے۔ اس مذاکرے میں مذکورہ شمارے کے سبھی مشمولات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ لیکن میں یہاں پر صرف ''ذائقہ'' کے متعلق شرکاء کی آرا کو پیش کرنے جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد کا خیال تھا کہ شوکت حیات کا افسانہ ''ذائقہ'' ماں بیٹے کے مقدس رشتے پر ضرب لگاتا ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ اے۔ او جوہر کی نظر میں شوکت حیات کا افسانہ قابل مذمت تھا۔ ماسٹر ابو محمد نے کہا کہ شوکت حیات کا افسانہ علامتی بن کر رہ گیا ہے جو کسی طور پر متاثر نہ کر سکا۔ ڈاکٹر محمد حسین نے تمام شرکاء سے اختلاف کرتے ہوئے ''ذائقہ'' کو حاصل شمارہ قرار دیا۔ ان کے خیال میں شوکت حیات نے ایک نازک موضوع کو نہایت فنکاری اور حسن و خوبی کے ساتھ افسانے کے

قالب میں ڈھالا ہے جو ان کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر شبیر حسن کو بھی شوکت حیات کا افسانہ پسند آیا۔ انہوں نے کہا کہ گرچہ اس میں جنسی تلذذ پایا جاتا ہے لیکن اس افسانے کے سلسلے میں دیگر شرکاء کے اعتراضات کی روشنی میں وہ اسے دوبارہ پڑھنا پسند کریں گے۔ میں نے اس میٹنگ کی روداد زبیر رضوی کو بھیج دی اور انہوں نے ذہن جدید کے اگلے شمارے میں یہ رپورٹ من و عن شایع کر دی۔ اور اپنے نوٹ میں لکھا کہ:

''ہم نے سوچا ہے کہ ذہن جدید کے اگلے شماروں پر ذہن جدید کے قارئین کے ردعمل مذاکرے کی صورت میں شایع کریں۔ اس مقصد کے لیے ہم ہر بار کسی ایسے ادبی مرکز کا انتخاب کریں گے جہاں ذہن جدید کے قارئین کی قابل ذکر تعداد موجود ہو۔ اس شمارے میں اس خیال کو عملی شکل دیتے ہوئے ہم مونگیر میں شمارہ ۵۳ پر منعقد مذاکرہ شریک اشاعت کر رہے ہیں۔ اس کی رپورٹ ہماری درخواست پر ممتاز افسانہ نگار اقبال حسن آزاد نے ترتیب دی ہے۔ (ذہن جدید مشمارہ نمبر ۵۴ صفحہ نمبر ۲۲۱)

''ذہن جدید'' میں مذکورہ بالا رپورٹ چھپنے کے بعد شوکت حیات نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن معلوم ہوا کہ انہوں نے دوسروں لوگوں کے سامنے اپنی ناراضی ظاہر کی ہے۔ چند ماہ بعد مشتاق احمد نوری نے ''ذائقہ'' پر ایک پر مغز تجزیہ تحریر کیا جو وہاب صاحب کے رسالے ''مباحثہ'' میں شایع ہوا۔

ایک دفعہ میں پٹنہ گیا تو منظر صاحب نے فرمایا کہ وہ شوکت حیات کے یہاں جا رہے ہیں اور یہ کہ شوکت حیات نے مجھے بھی بلایا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پاٹلی پترا پہنچے۔ شوکت حیات اور ان کی بیگم نے ہمارا پُر تپاک استقبال کیا اور ہماری پُر تکلف ضیافت کی۔ ہم وہاں کافی دیر تک بیٹھے اور ہمارے درمیان بہت ساری گفتگو ہوئی۔ شوکت حیات نے مجھ سے پوچھا کہ آپ افسانے اور کہانی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں یا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں؟ میں نے کہا کہ افسانہ وہ ہے جو ایک ہی محور پر گھومتا ہے اور اس میں ایک ہی بات کی تکرار ہوتی ہے لیکن کہانی صراط مستقیم پر چلتی ہے۔ اس میں تین اسٹیج ہوتے ہیں..... ابتداء..... ارتقاء..... اور..... انتہا۔ میری بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور یوں ظاہر کیا جیسے افسانے اور کہانی کا فرق انہیں پہلی بار معلوم ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ انہوں نے محض میرا دل رکھنے کے لیے ایسا کہا ہے۔ اتنا بڑا افسانہ نگار اور افسانے اور کہانی کے فرق کو نہ جانے؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد بھی کئی دفعہ شوکت حیات کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا اور ہر بار دو میاں بیوی کو پُر جوش اور مہمان نواز پایا۔

نوشاد مومن کلکتہ سے ''مژگاں'' نکالتے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں دفعہ انہوں نے مژگاں کا افسانہ نمبر نکالا۔ وہ اس شمارے کا اجراء پٹنہ میں کروانا چاہ رہے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے منظر اعجاز سے رابطہ قائم کیا۔ منظر اعجاز نے کنکر باغ کی قیام گاہ کے اوپر والے ہال میں اپنی جانب سے پروگرام کا انتظام کیا۔ بینر چھپوایا

،مائک،کرسی اور چائے پانی کا انتظام کیا اور پٹنہ کے شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کیا۔نوشاد مومن صبح کی گاڑی سے پٹنہ پہنچ گئے اور سیدھے کنکر باغ چلے آئے۔وہ اپنے ساتھ مژگاں کی کئی کاپیاں لے کر آئے تھے۔شام کو رسالے کا اجراء ہوا۔اس پروگرام میں شوکت حیات بھی تھی۔اس وقت تک جوانی کا چڑھا ہوا دریا اُتر چکا تھا،غصے کی آگ بجھ چکی تھی۔وہ پورے وقت خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہے اور جب انہیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے بلایا گیا تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اس یادگار شمارے میں شامل نہ ہونے کا انہیں بہت افسوس ہے۔

اب شوکت حیات کے طویل سے طویل تر فون تواتر کے ساتھ آنے لگے تھے۔یہ فون ہمیشہ یک طرفہ ہوتے یعنی حسب معمول وہ بولتے رہتے اور میں سنتا رہتا۔وہ اپنے افسانوں کی بات کرتے،خاص طور پر ''پھسینڈا'' اور ''تھوڑی سی آگ'' کا بار بار تذکرہ کرتے۔اپنے ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' کی بات کرتے اور کبھی اپنے مضامین کا بھی تذکرہ کرتے۔

وہ ایک بات ہمیشہ کہتے کہ اردو والوں نے ان کی قدر نہیں کی۔پھر کہتے یار! کبھی مونگیر بلاؤ اور میری خدمت میں روپیوں کی تھیلی پیش کرو۔دیکھو فلاں جگہ مجھے اتنی رقم کی تھیلی ملی۔میں ہوں ہاں کرتا رہتا۔ایک بار کہنے لگے کہ میرے افسانوی مجموعے ''گنبد کے کبوتر'' پر پبلشر نے مجھے پانچ لاکھ روپے دئے۔میں نے ایک کار خرید لی ہے اور ڈرائیور بھی رکھ لیا ہے۔

ایک دفعہ میں اور منظر اعجاز پروفیسر وہاب اشرفی کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ان دنوں وہ اپنی معرکتہ الارا تصنیف ''تاریخ ادبِ اردو'' ترتیب دے رہے تھے۔دوران گفتگو شوکت حیات کا بھی تذکرہ آیا۔شوکت حیات کا نام سن کر وہاب صاحب مسکرائے اور ان کا نام نہایت محبت اور اپنائیت کے ساتھ لیا لیکن شوکت حیات کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے وہاب صاحب ان سے خوش نہیں تھے۔وہاب صاحب کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ:

''وہ'' بھی بہت عجیب ہے اتنا عجیب ہے کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

۲۰۱۳ء میں جب میں نے ''ثالث'' کا اجراء کیا تو اس کی ایک کاپی شوکت حیات کو بھی بھیجی۔ان کا فون آیا اور انہوں نے رسالے کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کیں،میری حوصلہ افزائی کی اور وعدہ کیا وہ جلد ہی میرے رسالے کے لیے ایک غیر مطبوعہ افسانہ،مہمان اداریہ اور سالانہ چندہ بھیجیں گے۔میں بندہ سیدھا سادا،کیا جانوں اس کا ارادہ،سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں کا انتظار کرتا رہا۔لیکن نہ افسانہ آیا،نہ مہمان اداریہ اور نہ ہی ثالث کا سالانہ چندہ۔پھر جب کبھی ان کا فون آتا تو میں انہیں ان کا وعدہ یاد دلاتا۔کہتے

''ارے یار! مہمان اداریہ تیار ہے۔میں اپنے ڈرائیور سے کہوں گا کہ وہ اسے پوسٹ کر دے اور سالانہ چندہ بھی بھجوا دوں گا۔'' اور پھر کہنے لگے کہ ''اب مجھے پیسوں کی کوئی کمی نہیں رہی۔میرا بیٹا ہر مہینے میرے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپیہ جمع کر دیتا ہے۔''

جب میں نے ''ثالث'' کے گوشہ ٔ شموئل احمد کا اعلان کیا تو ان کی بیگم کا فون آیا۔کہنے لگیں کہ اقبال بھائی! شموئل پر گوشہ مت نکالیے،شوکت حیات پر گوشہ نکالیے۔میں نے کہا کہ شوکت حیات وعدہ تو کرتے ہیں مگر وفا نہیں کرتے۔ان پر گوشہ نکالنا بہت مشکل ہے۔پھر بھی میں نے وعدہ کیا اور کہا کہ ان شاء اللہ ثالث میں شوکت حیات پر گوشہ ضرور نکلے گا۔لیجئے گوشہ کی جگہ پورا نمبر ہی نکل رہا ہے۔

ایک دفعہ میں پٹنہ گیا تو ان کا فون آیا۔کہنے لگے کہ ایک پبلشر نے ناول لکھنے کے لیے مجھے ایک لاکھ روپیہ ایڈوانس دیا ہے۔سبزی باغ کے فلاں ہوٹل میں ایک روم بُک کروا دیا ہے اور ایک ڈکٹیشن کروانے کے لیے ایک خوبصورت اور جوان سکریٹری بھی مہیا کرا دی ہے۔اور جب میں نے انہیں بتایا کہ آجکل میں پٹنہ ہی میں ہوں تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آج شام مجھ سے ہوٹل میں آ کر ملو۔میں تمہیں اپنی سکریٹری سے بھی ملواؤں گا۔میں وقت مقررہ پر ان کے بتائے ہوئے ہوٹل پہنچ گیا اور انہیں رِنگ کیا۔ایک بار.....دو بار.....تین بار.....بار بار.....لیکن انہوں نے فون نہیں اُٹھایا۔میں ناکام و نامراد واپس چلا آیا۔

میں نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ شوکت حیات کی اپنے بیشتر ہم عصروں سے نہیں بنتی۔کبھی عبدالصمد سے بگاڑ بیٹھے اور کبھی شموئل احمد سے۔میں نے شموئل احمد کا لکھا ایک خاکہ دیکھا جس میں انہوں نے شوکت حیات کا خاکہ اڑایا تھا اور خوب خوب اڑایا تھا۔شوکت حیات سے بھی جب ملاقات ہوئی تو انہیں شموئل احمد سے نالاں پایا۔منظر اعجاز کی بیٹی کی شادی کے موقع پر شوکت حیات اور عبدالصمد دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور مزے مزے کی گفتگو کر رہے تھے۔بہار اردو اکادمی (پٹنہ) کے ایک سیمینار میں شوکت حیات اور شموئل احمد اغل بغل بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔میں سمجھ گیا کہ شوکت حیات دل کے صاف ہیں۔دوستوں کے ساتھ خفگی تو ہوتی ہے مگر پھر وہ ساری باتوں کو بھلا کر مل بیٹھتے ہیں۔واقعی بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔خیر! تو اس وقت مشتاق احمد نوری بہار اردو اکادمی کے سکریٹری ہوا کرتے تھے اور انہوں نے اپنے دور حکومت میں کئی کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔لیکن جلد ہی ان کی معیاد پوری ہونے والی تھی اور لوگوں میں یہ تجسس تھا کہ دیکھئے اگلا سکریٹری کسے بنایا جاتا ہے۔شوکت حیات بھی اس عہدے کے متمنی تھے اور وہ ہر کسی سے کہتے پھر رہے تھے کہ اس بار انہیں سکریٹری بنوا دیا جائے۔میں تو اس قسم کی پالیٹکس سے کوسوں میل دور رہتا ہوں لہذا ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

شوکت حیات سے میری آخری ملاقات پروفیسر صفدر امام قادری کی بیٹی کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی۔ میں نے آج تک کسی کی شادی میں ادیبوں اور شاعروں کا اتنا بڑا جماوڑا نہیں دیکھا تھا۔شوکت حیات اپنی بیگم کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ان کا بدن بہت بھاری ہو گیا تھا اور وہ خود سے اُٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہو چکے تھے۔ان کی بیگم ان کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔ میں اور مشتاق احمد نوری بھی وہیں پر بیٹھ رہے۔ہم دونوں کے ساتھ ہماری بیگمات بھی تھیں۔ وہاں بھی شوکت حیات یہی کہتے رہے کہ وہ بہار اردو اکادمی کا سیکریٹری بننا چاہتے ہیں۔ہم لوگ اس سلسلے میں ان کی مدد کریں۔لیکن بقول غالب: ع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

وہ اپنی ناکام حسرتوں اور تمناؤں کو دل میں لیے ہوئے شہر خموشاں میں جا بسے اور لوگ ان کی بھول بھلیوں جیسی اُلجھی ہوئی شخصیت کی تہیں کھولنے میں لگ گئے۔

حق مغفرت کرے!

◀◀ ● ▶▶

Shah Colony
Shah Zubair Road,
Munger 811201
Mob: 8210498674

نئے رسالے

نام رسالہ : پنج آب مدیران : سالک جمیل براڑ، غلام نبی کمار جنوری ۲۰۲۲ء قیمت : ۳۰۰ روپے	نام رسالہ: دربھنگہ ٹائمز (نظم نمبر) مدیر : ڈاکٹر منصور خوشتر اپریل تا جون ۲۰۲۲ء قیمت : ۴۰۰/روپے

بھاشا سنگم، پٹنہ

مدیر : احمد محمود

جولائی تا دسمبر ۲۰۲۱ء

● **نشاط پروین**

شوکت حیات سے دو ملاقاتیں

شوکت حیات.....شاید یہ نام میں نے پہلے کبھی سنا ہوگا۔لیکن میں جب اقبال حسن آزاد صاحب کی زندگی میں آئی تو اکثر انہیں فون پر شوکت حیات صاحب سے باتیں کرتے دیکھتی۔اقبال صاحب کو فون پر لمبی لمبی باتیں کرنے کا شوق نہیں ہے۔وہ چند جملوں میں اپنی پوری گفتگو کو سمیٹنے کا فن جانتے ہیں۔انہوں نے بہت سارے کام اپنے سر پر لے رکھے ہیں لہٰذا انہیں فون پر باتیں کرنا کارِ زیاں لگتا ہے جبکہ شوکت حیات گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے قبل فون رکھتے ہی نہیں تھے۔اکثر انہوں نے جھنجھلا کر فون کاٹ دیا مگر شوکت صاحب کب ماننے والے تھے،فوراً دوبارہ فون لگا دیتے اور اپنے دل کی ساری باتیں سنا کر ہی دم لیتے۔ایسا لگتا کہ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا اور وہ اپنے دل کی باتوں کو اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ شیئر کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔شوکت حیات صاحب سے بہت دیر تک باتیں کرتے۔طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ان کے لمبے لمبے پلان ہوتے تھے۔اکثر کہتے کہ میں مونگیر آنا چاہتا ہوں۔یار! میرے اعزاز میں ایک پروگرام کرو۔دیکھو ابھی فلاں جگہ پروگرام تھا۔

ایک بار میں بہار اردو اکادمی میں کسی پروگرام میں اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھی۔اس وقت مشتاق احمد نوری بہار اردو اکادمی کے سیکریٹری ہوا کرتے تھے۔انہوں نے ہی بلایا تھا۔پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔صفدر امام قادری نظامت کر رہے تھے۔ جب پروگرام اختتام پذیر ہوا تو سبھی لوگ اکادمی کے آفس میں آ گئے۔وہاں مشتاق احمد نوری صاحب کی اہلیہ بھی موجود تھیں۔وہ یادگار دن میں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔مشتاق صاحب کو فوٹوگرافی کا شوق ہے۔انہوں نے کئی تصویریں کھینچیں۔ایک تصویر میں صوفے پر تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ایک طرف شموئل احمد، دوسری جانب اقبال حسن آزاد اور درمیان میں شوکت حیات.....وہ سبھی کو دبائے ہوئے تھے۔ان کی پرسنالٹی بہت اچھی لیکن انکی صحت ٹھیک نہیں تھی۔وہ بولتے تو سانسیں تیز ہو جاتیں۔وزن اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔لیکن ان کے جذبے کو سلام کہ دل میں تمنا پال چکے تھے کہ بہار اردو اکادمی کے اگلے سیکریٹری وہی بنیں گے۔ وہ سب سے کہ رہے تھے آپ لوگ دعا کیجیے۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔انشاء اللہ یہ کرسی میری ہوگی۔سبھی نے انہیں انشاء اللہ کہ کر ایڈوانس میں

مبارکباد بھی دے ڈالی۔ پروگرام ختم ہوا اور ہم لوگوں نے اپنے گھر کی راہ لی۔

شوکت حیات سے دوسری اور آخری ملاقات پروفیسر صفدر امام قادری صاحب کی بیٹی کی شادی کے موقع پر ہوئی۔ اس مبارک موقع پر ملک اور بیرونِ ملک سے کئی بڑے شاعر اور ادیب جمع تھے۔ میں نے قلم کاروں کا اتنا بڑا جمگھٹا زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ نکاح خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں حضرت محمد ولی رحمانی (مرحوم) نے پڑھایا تھا۔ اس دن شوکت حیات صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ آئے تھے۔ اتنے دنوں میں وہ اور کمزور ہو چکے تھے۔ اب تو وہ خود سے چل بھی نہیں پا رہے تھے۔ چلتے تو قدم لڑکھڑا جاتے لیکن جوش وہی تھا، جذبہ وہی تھا، باتیں وہی تھیں۔ کسے پتا تھا ان سے پھر ملاقات نہ ہوگی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ عظیم ہستی عنقریب ہم سے بچھڑنے والی ہے۔

کب کس سے آخری ملاقات ہو یہ کوئی نہیں جانتا۔ سامان سے سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ رات گہری ہو چلی تھی۔ سارے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ شوکت حیات صاحب بھی جانے کو تیار ہوئے مگر وہ خود سے کھڑے نہیں ہو پا رہے تھے۔ تبھی ان کی اہلیہ نے ان ہاتھ تھام لیا اور انہیں لے کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کار تک پہنچیں۔ وہ چلتے چلتے کہہ رہے تھے اقبال صاحب میں آؤں گا مونگیر اور سیمینار بھی ہوگا۔

ان کی اہلیہ نے کہا۔

''ایک قدم تو چل نہیں پاتے ہیں اور جائیں گے مونگیر..... پہلے گھر تو چلئے۔''

وہ اپنی کار میں سوار ہو کر جا چکے تھے۔ ہم لوگ بھی اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔ پھر چند ہی مہینوں بعد یہ روح فرسا خبر ملی کہ شوکت حیات صاحب اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

◀◀ ● ▶▶

Shah Colony
Shah Zubair Road,
Munger 811201
Mob: 82104 89478

● **تجزیہ**

● **مشتاق احمد نوری**

''ذائقہ'' میں نئے ذائقے کی دریافت

'ذائقہ' شوکت حیات کی تازہ ترین کہانی ہے جو 'ذہن جدید' کے شمارہ ۵۳ر میں شائع کی گئی ہے۔ عام قاری کا تاثر یہ ہے کہ 'ذائقہ' منہ کا ذائقہ بگاڑ دیتی ہے اور ہمارے تہذیب وتمدن کے ایوان میں زلزہ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ بھی اِس خیال سے متفق ہوں یا پھر ایسا سوچنے کے لیے آپ کے پاس اپنا جواز بھی ہوگا۔ لیکن میں نے اِس کہانی کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر قاری مجھ سے اتفاق کرے وجہ یہ ہے کہ ادب میں کہا کا بھی 'فرمایا' ہوا حرف آخر نہیں ہوتا۔

اگر اِس کہانی کو جنس پر مبنی کہانی سمجھا جائے تو کہانی دوسرے باب میں ختم ہو جاتی ہے، لیکن شوکت حیات اس فن کار کا نام ہے جس کی بادشاہت کہانی کی سلطنت میں دہائیوں تک قائم رہی ہے۔ اِس سے ایسی لچر کہانی کی امّید کیسے کی جا سکتی ہے؟ شوکت حیات لومڑی کی طرح چالاک ہے اور اس کی نگاہیں عقاب جیسی تیز ہیں۔ وہ اگر چیتے کا جگر رکھتا ہے تو اس میں ہاتھی جیسی بردباری بھی موجود ہے۔ وہ تخلیقیت کے لمحے میں ہرن کی طرح چوکنا رہتا ہے تو پھر سے غلطی کے امکان کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ دراصل وہ اپنی زیادہ تر باتیں بین السطور میں کرتا ہے۔ اب قاری کا کام ہے کہ وہ ان باتوں کو بھی سمجھے جو بالواسطہ تحریر میں لائی گئی ہیں۔

میں اپنی بات کو یوں واضح کروں کہ رسائل یا اخبار میں بچوں کے لیے اکثر لفظوں کی بنیاد پر ایک پہیلی شائع کی جاتی ہے جس میں پورے صفحے پر مختلف مقامات پر نقطے بنائے جاتے ہیں اور نقطوں کی نمبر ایک سے پچیس، بچاس، اسّی یا نوے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان نقطوں سے کوئی امکانی شکل نہیں جھانکتی اور پہیلی بنانے والا یہ ہدایت دیتا ہے کہ بچوں اپنی پنسل سے ایک نمبر سے لے کر سلسلے وار نمبروں تک لکیریں کھینچتے جاؤ پھر دیکھو کون سی شکل اُبھرتی ہے۔ بچے جب اِس ہدایت پر عمل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ یہ چچا نہرو کی تصویر ہے یا گاندھی جی کی یا پھر بچوں کے کسی پسندیدہ جانور کی۔ لیکن اگر بچے نمبروں کی ترتیب بدل لیں تو پھر اصل چہرے کی شناخت نہیں رہتی۔

دراصل شوکت حیات وہ چالاک فن کار ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُسے سیدھے نہیں کہہ کر

پوری کہانی میں نقطوں کی شکل میں بکھیر دیتا ہے اور نمبروں کی کوئی ترتیب بھی نہیں بتاتا۔ اب قاری پر منحصر کرتا ہے کہ وہ نقطوں کو صحیح ترتیب سے ملا لے تاکہ وہ امکانی شکل نظر آجائے جو لفظوں کے درمیان مخفی ہے۔ اگر قاری نقطوں کی ترتیب غلط کر دے تو پھر صحیح شکل سے آشنائی ممکن نہیں۔

سنہ ستّری کے افسانہ نگار جس کی امامت کا سہرا شوکت حیات کے سر رہا اور اس قافلے میں عبد الصمد، حسین الحق، شفق، سلام بن رزّاق، ساجد رشید، علی امام، شموئل احمد، حمید سہروردی، طارق چھتاری اور بہت سے ایسے فن کار شامل تھے۔ وہ لوگ اس زمانے میں بہت ہی مبہم اور علامتی کہانیاں لکھا کرتے تھے، کبھی کبھی تو کہانی کو سمجھنے کے لیے Key کی بھی اشاعت کی جاتی ہے۔ آپ اسے یوں سمجھیں کہ وہ سادہ کاغذ پر جہاں امکانی شکل کے لیے پچاس نقطے درکار ہوتے تھے، وہ صرف پانچ نقطے یاد کرتے تھے اور قاری سے توقع کرتے تھے کہ بقیہ نقطے بھی وہ خود ڈالیں اور نمبروں کی ترتیب بھی خود ہی طے کریں۔ اس طرح الگ الگ قاری اپنی پسند کی تصویر بنانے کے لیے اپنی طور سے آزاد تھا اور ایک ہی کہانی کی کئی امکانی شکلیں سامنے آتی تھیں۔ بعد میں جب روشن بیانیے کا دور آیا تو وہی سنہ ستّری افسانہ نگار یوٹرن لیتے ہوئے بیانیہ کی جانب پلٹ آئے اور ایسی کہانیاں لکھنی شروع کیں جو بہ ظاہر ایک سمتی نظر آتی ہیں لیکن جب آپ تھوڑی سی کاوش کرتے ہیں تو سمتوں کا پھیلاؤ اس طرح ہوتا ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

کہانی 'ذائقہ' کو میں نے الگ انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اس نکتے پر بحث کی جاتی ہے کہ ایسا ہوا، ویسا ہوا جو ظاہری طور پر اچھا یا خراب، قابلِ مذمّت یا قابلِ ستائش ہو سکتا ہے۔ میں 'کہا ہوا' پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں کہ ہوا اس سے تو آپ واقف ہو ہی چکے ہیں۔ میرے ذہن میں نکتہ صرف یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کن حالات میں ہوا؟ اور ایسا ہونے کے لیے بنیادی وجوہات کیا کیا ہیں؟

کہانی مختصراً یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک پُر فضا پہاڑی مقام پر ایک جدید ترین انجینئرنگ کالج ہے جہاں جدّت کی ساری سہولتیں موجود ہیں۔ وہ کسی ترقی یافتہ مغربی ملک کے انتہائی اونچے درجے کے عالیشان تعلیمی ادارے کی یاد دلاتا ہے۔ طالب علم جدید تہذیب کے پروردہ ہیں۔ اُن کی اپنی تہذیب، اپنا تمدن ہے جو پرکھوں کی تہذیب سے الگ ہے۔ رومانس ان کے لیے ویسا ہی جیسا پیاس بجھانے کے لیے ہم بلا جھجک ایک گلاس پانی اُٹھا کر پی لیتے ہیں۔ وہ ویک اینڈ پر جسمانی مکالمے کو زندگی کا عام حصّہ سمجھتے ہیں۔ سولہ سترہ سال کا سراج جب مایا کے ساتھ ویک اینڈ پر جسمانی مکالمے سے گزرتا ہو تو اسے کچھ نہ کچھ کمی اور ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسے گھر کی یاد آتی ہے اور اس کی ماں شدت سے اس کے ذہن میں نمودار ہوتی ہے۔

اگر یہ کہانی جنس پر مبنی ہوتی تو اس کہانی کو اسی جگہ بھی ختم کیا جا سکتا تھا لیکن فن کار بہت چالاک ہے

اس لیے اس سے اس چھچھلے پن کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بعد سراج کی ماں رانی کا ذکر ہے جس کی شادی پندرہویں سال میں ہوئی اور سولہویں سال میں سراج پیدا ہو گیا۔ اب سراج سولہ سترہ سال کا ہے تو ظاہری بات ہے کہ بیٹے کی شکل میں کہیں نہ کہیں باپ کی شبیہ ابھرتی ہوگی۔ اسی لیے تو ''اس کا بیٹا سولہ سترہ سال کے سجیلے نوجوان کا روپ اختیار کر کے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا ہے۔'' اب یہاں کہانی میں ایک اور بات در آتی ہے۔ رانی تیس بتیس سال کی دہلیز پر پہنچ کر جب جوانی کا صحیح ڈھنگ سمجھنے لگی تو اس کی چنگاری کی آبیاری کرنے والا اس کا شوہر پردیس میں بچے کی اعلا تعلیم اور کشادہ گھر بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے اور ادھر سراج جب گانو میں دوسری عورتوں کو کمر پر گاگر رکھ کر پنگھٹ پر جاتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک عجیب سی خواہش کلبلانے لگتی ہے اور پنگھٹ کی گوری کی شکل میں اپنی ماں کو تصوراتی طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ بہ قول شوکت حیات ''یہ تصوّر اس کے معصوم ذہن میں اچانک کونپل کی طرح پھوٹ کر دیکھتے دیکھتے تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔''

فن کار تو یہ بات صرف اطلاع کے لیے فراہم کرتا ہے لیکن ایسی خواہش کیوں اور کن حالات میں کلبلانے لگتی ہیں ان باتوں کی قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ایسا کیوں ہوا؟ دراصل کہانی کا بنیادی نکتہ یہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فرائڈ کی مشہور تھیوری ہے کہ ماں کا بیٹے کی طرف جھکاؤ اور باپ کا بیٹی سے لگاؤ بھی بنیادی طور پر جنس سے متحرک ہوتا ہے۔ اس معاملے میں آڈیپس کمپلکس کی تھیوری بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ چلیے مان لیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ان محرکات کو دو آتشہ بنانے کے لیے کالج کی جدید تہذیب نے کتنا رول ادا کیا ہے۔ فن کار کہانی کے شروع میں بتاتا ہے کہ انجینئرنگ کے طالب علموں نے اپنے طور پر اپنی تہذیب بنائی ہے۔ ان کی زندگی میں پرانے اقدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے نزدیک نہ رشتوں کی کوئی پاکیزگی کوئی معنی رکھتی ہے اور ان کی تقدیس کا احترام ان پر واجب ہے۔ وہ تو خود اپنے آدم و حوا بنے ہوتے ہیں۔ پرانی تہذیب کی مقفل پر ان لوگوں نے اپنی جدید تہذیب کی عمارت کھڑی کی ہے اور ہر شے کو دیکھنے کا ان کا اپنا اخذ کردہ نظریہ ہے۔

اب کہانی کے اس پیراگراف کو ایک بار پھر سے دیکھیے:

> ''اس رات رانی نقطۂ ابال کو پار کر رہی تھی، شوہر ایک مدّت سے نہیں آیا تھا، ہر سال نہ آ کر اپنے آنے جانے کا خرچ بچاتے ہوئے وہ بچے کی اعلا تعلیم اور ایک کشادہ گھر بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔
>
> سراج کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں..... وہ رانی کے اضطراب کو دیکھ رہا تھا..... محسوس کر رہا تھا..... پنگھٹ پر پہنچی ہوئی عورت نے گھڑا ابھرنے کے بعد پانی ڈھالنا شروع کیا۔ سراج نے ہتھیلیوں کے کٹورے سے نکھرتے یوئے صاف و

شفاف پانی کی دھار کو غٹا غٹ پینا شروع کر دیا۔ حلق تک اس کی پوری آنت جل تھل ہوگئی اسے ایک گونہ سکون حاصل ہوا۔''

یہ معاملہ جو اچانک ہوگیا کوئی ایک دن کا نہیں، فن کار کی اصطلاح کے مطابق:

''شعلے اٹھتے رہے اور موسلا دھار بارش میں بجھتے بھی رہے۔ عجیب و غریب دل فریب منظر، جیسے دھوپ اور بارش نے بہ یک وقت مصافحہ اور معانقہ کرنا شروع کر دیا ہو۔ دھوپ اور چھانو برسنے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔''

دراصل یہ عبارت عام طور پر قاری ہضم نہیں کر پا رہا ہے اور اس کی بنیاد پر کہانی مذموم ثابت کرنے کی کوشش ہوسکتی ہے۔

کہانی یہاں پر بھی ختم ہوسکتی تھی کیوں کہ اس میں ذہن کا جھٹکا دینے والا کلائمکس موجود ہے۔ لیکن شوکت حیات یہاں پھنس جاتے ہیں اور اپنا بچاؤ نہیں کر پاتے۔ لیکن کہانی تو کچھ اور ہے۔

کہانی سراج کے گھر سے ہوسٹل کا رُخ کرتی ہے۔ ہوسٹل میں بھی سراج ماں کی تشویش بھری آنکھوں کی گہری اداسی محسوس کرتا ہے۔ ادھر رانی کا پریشان ہونا، ڈاکٹر کے یہاں چکر لگانا، ڈاکٹری نسخہ ڈکشنری میں اس جگہ رکھنا جہاں لفظ 'ایم' کے معنی کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ اس بات کو بتاتا ہے کہ رانی اپنے حادثاتی عمل پر شرمندہ ہے، اس کا مینسس بھی رکا ہوا ہے۔ اس کی بوکھلاہٹ اور ڈکشنری میں نسخے کو رکھنا اس بات کا اعلامیہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح ڈکشنری میں ہزاروں الفاظ ہیں اسی طرح سماج کے ہزاروں لوگوں کے سامنے اسے شرمندہ ہونا پڑسکتا ہے۔ یا پھر یہ لفظ 'ایم' مین بھی ہوسکتا ہے جو اس بات کو بتاتا ہے کہ اس کا مرد اس سے کوسوں دور ہے اور اس کی کمی، اس کی خواہش کا ابال ہزاروں لوگوں کے سامنے اس کی رسوائی کا سبب بن گیا ہے۔

اب یہاں سے کہانی کار اس کہانی کو الگ سمت میں موڑ دیتا ہے اور ہوسٹل کے کھانے میں ذائقے کے کمی ہے اور سارے بچّوں کی زبان پر ماں کے کھانے کا ذائقہ ہے جو ہوسٹل کے کھانے میں مفقود ہے۔ پھر بچّے ڈائرکٹر کے پاس شکایت لے کر جاتے ہیں اور ہوسٹل کے کھانے کی بدمزگی کی شکایت کرتے ہوئے اس مسئلہ کا حل نکالنے کی گزارش کرتے ہیں لیکن ڈائرکٹر کا جواب سنیے:

''آج سے چالیس سال پہلے گاؤں چھوٹا، گھر چھوٹا، ماں چھوٹی، تب سے در بہ در بھٹکتا رہا ہوں۔ کہاں کہاں نہیں گیا۔ بیرونی ملکوں تک کا ایک سے ایک کھانا کھایا لیکن ماں کے ہاتھ کے ذائقے کے لیے ترستا رہ گیا۔''

پھر ڈائرکٹر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور گہری سانسوں کے درمیان یہ کہتا ہے:

''خدا کرے تم سب اونچے عہدے اور مرتبے حاصل کرو، اگر زندگی میں کسی مقام پر ماں کے کھانے کا ذائقہ تمھیں مل جائے تو مجھے مطّلع کرنا۔ زندہ رہا تو اس مقام کی مٹی چومنے ضرور آؤں گا۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈائرکٹر بھی ماں کے ہاتھ کے کھانے کے ذائقے سے محروم ہو چا ہے اور سارے زمانے میں اسے وہ شئے نہیں مل سکی۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو نئی نسل کالج میں ہے اور ماں کے ہاتھ کا ذائقہ ہوسٹل کے بدمزہ کھانے میں تلاش کرنے میں ناکام ہے، اس سے پہلے کی نسل بھی ڈائرکٹر کی شکل میں اس ذائقے سے محروم رہی ہے۔ اس طرح یہ ایک نہیں دو نسلوں کی محرومی بن گئی ہے۔

کیا شوکت حیات جیسا فن کار ہوسٹل کے بدمزہ کھانے کے ذائقے پر کہانی لکھ کر قاری کا وقت برباد کرنا چاہتا ہے جو کہ ہر کالج کے ہوسٹل کی ایک تہذیب بن گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر شوکت حیات کو کہانی لکھنا بند کر دینا چاہیے کیوں کہ اب اردو کہانی پر اتنا بُرا وقت نہیں آیا کہ ہوسٹل کے کھانے کے بدمزہ ذائقے کو کہانی کا موضوع بنایا جا سکے تو پھر شوکت حیات کی مراد اس ذائقے سے کیا ہے؟ وہ بار بار ماں کے ہاتھ کا ذائقہ کیوں یاد دلانا چاہتا ہے۔ دراصل کہانی کا نقطۂ عروج بھی ذائقہ ہے۔

اب میں آپ کو پھر کہانی کے پہلے باب کی طرف لے چلنا چاہتا ہوں جب وہ لڑکوں کی اپنی تہذیب کی بات کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ وہ سب ایک نئی تہذیب کی پرورش، پرداخت کے آدم وحوّا بنے ہوتے تھے۔ دراصل فن کار کی چھٹپٹاہٹ یہی تہذیب ہے۔ کوئی بھی انسان اپنی پہلی تہذیب ماں کی گود میں سیکھتا ہے اور تہذیب کا وہ ذائقہ جو وہ پہلی بار ماں کے دودھ کے ساتھ محسوس کرتا ہے، اسے زندگی کے ہر موڑ پر لاشعوری طور پر تلاش کرتا پھرتا ہے۔ یہاں فن کار تہذیب کے اسی ذائقے کی بات کرتا ہے جس سے آج کی نئی نسل مکمل طور سے بے بہرہ ہو چکی ہے اور اپنے لیے ایک نئی تہذیب کی عبارت لکھنے پر کمر بستہ ہے۔ اگر لاشعوری طور پر تہذیب کا وہ ذائقہ جو انھوں نے ماں کے زیرِ سایہ حاصل کیا تھا، اس کی محرومیت کا سایہ بھی انھیں جدید تہذیب کے درمیان ادھورے پن کا احساس دلاتا ہے۔

اب آپ اسے یوں دیکھیں کہ جب کالج کا لڑکا اور لڑکی جسمانی مکالمے سے دوچار ہوتے ہیں تو انھیں کہیں نہ کہیں ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن جب یہی مکالمہ سراج اور رانی کے درمیان ہوتا ہے تو ''حلق تک اس کی پوری آنت جل تھل ہوگئی، اسے یک گونہ سکون حاصل ہوا'' آخر ان دونوں جسمانی مکالمے کے ذریعہ فن کار کس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے اور صحیح پوچھیے تو کہانی کا یہ ایک بہت ہی اہم نکتہ ہے۔ پہلا جسمانی مکالمہ ان دو نئی نسلوں کے درمیان ہے جو بالکل نئی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ وہ تہذیب کے پرانے ذائقے سے محروم ہیں۔ دونوں طرف ناتجربہ کاری ہے اسی لیے انھیں اس کھُلے پن میں بھی ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے جب

کہ دوسرے جسمانی مکالمے میں ایک طرف سولہ سال کی ناتجربہ کاری ہے تو دوسری طرف سولہ سال کا تجربہ ہے۔ سولہ سال کا تہذیبی تجربہ، ناتجربہ کاری کو سنبھال لیتا ہے۔ اسی لیے آسودگی کا احساس حلق تک ہوتا ہے۔ اس ذائقے کو جسے ماں کے دودھ کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے، اسی ذائقے کی محرومی کا نوحہ ہے۔ شوکت حیات کی کہانی 'ذائقہ'۔

یہاں یہ سوال پیدا ہونا لازمی ہے کہ رانی اور سراج کے بجائے کسی اور سے سراج کا جسمانی مکالمہ دکھایا جا سکتا تھا۔ لیکن سچّائی تو یہ ہے کہ کہانی کار تہذیبی زوال کی انتہائی شدّت کے لیے ایسے حادثے کراتا ہے کیوں کہ تہذیبی زوال کی اس سے بدترین پستی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا جہاں آدمی جانوروں کی طرح سارے رشتوں کا احترام بھول جاتا ہے۔ (ویسے آج کے دور میں رِشتوں کی پاکیزگی اور اس کا احترام بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔)

اب آیئے کہانی کو ایک الگ نظریے سے دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ رانی جسمانی طور پر کافی جل تھل ہے، اس کے حسن کا یہ عالم ہے کہ مرد تو مرد، عورتیں بھی اسے دیکھنے کی خواہش نہیں دبا پاتیں۔ جوانی جب انگارے کی دہلیز پر آئی تو شرارے دو آتشہ ہو جاتے ہیں اور دریا پایاب۔ اس کا شوہر بچّوں اور گھر کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے بیوی بچّوں سے دور ہے اور برابر نہ آ کر اپنے آنے جانے کا کرایا بھی بھیج دیتا ہے تا کہ مستقبل مزید روشن ہو۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ آسائشوں کی فراوانی جسم کی بھوک مٹاتی نہیں، بڑھا دیتی ہے۔ جب یہ بھوک شدّت اختیار کرتی ہے تو اس کا رُخ کس سمت ہوگا، اس کا فیصلہ فرد کے بجائے بھوک کرنے لگتی ہے۔ اسے یوں سمجھا جائے کہ پانی کے فطری بہاو کو اگر نہ روکا جائے تو وہ اپنا راستا آپ اختیار کرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے لیکن جب جب باندھ باندھ کر اس کے فطری بہاو کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ تلملانے لگتا ہے اور اس کے غیض وغضب کی انتہا مضبوط سے مضبوط باندھ کے پشتے کو بھی توڑ کر سیلاب کی صورت تباہی کی وجہ بنتی ہے۔ اس وقت سیلاب کا شکار کچّا مکان ہو رہا ہے یا پختہ، مویشی مر رہے ہیں یا انسانی جانوں کا نقصان ہو رہا ہے یہ سیلاب کا پانی نہیں دیکھتا۔ غیض وغضب کے عالم میں نہ تو تہذیب نظر آتی ہے اور نہ ہی اس میں تمدّن کی تلاش ممکن رہ پاتی ہے۔ وہ تو اپنے غیض وغضب کے سامنے ہر شے کو خس وخاشاک میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے اور بالواسطہ یہی پیغام دیتا ہے جب جب کسی کے فطری بہاو کو غیر فطری طریقے سے روکنے کی کوشش ہوگی، اس کا انجام ہر حال میں بُرا ہی ہوگا۔

یہاں بھی وہی معاملہ ہے، سماج کے اندر پیسے کی ہوڑ، آسائشوں کی فراوانی، سب سے آگے نکلنے کی للک، انسان کو اپنے تہذیبی اثاثے سے غیر فطری طور پر محروم کرتی جا رہی ہے۔ اسے بدیش کی دولت اور گھر کا تاب ناک مستقبل نظر آتا ہے۔ بیوی کی رنگین ساڑی اور کلائی کے سونے کے کنگن کی چمک بھی نظر آتی ہے لیکن اس چمک دمک کے اندر وہ اس بھوک سے بے خبر رہتا ہے جو جسم کی اس رنگینی کے اندر بے قابو

سیلاب کی طرح مضبوط سے مضبوط پشتہ توڑنے کے لیے بے قرار رہتی ہے۔

شوکت حیات کی ذہنی تربیت بائیں بازو کی تحریک نے کی ہے۔ اس کا اشترا کی ذہن ہر طرح کے ظلم اور بھوک کے خلاف 'بانگ' دینے پر آمادہ ہے۔ وہ 'سانپ سے نہ ڈرنے والا بچّہ' بھی خلق کرتا ہے۔ ناانصافی کے خلاف وہ اپنے قلم کو تلوار بنا لیتا ہے۔ اس کے ذہن میں بائیں بازو کی تحریک کا جو ذائقہ ہے اسے وہ ہر نا آسودگی میں تلاش کرتا ہے اور در پردہ آسودہ حال لوگوں کو یہ انتباہ بھی کرتا ہے کہ نا آسودگی اور محرومی کا سیلاب جب جب آتا ہے تو اچھّے اچھّوں کی ہوا اکھڑ جاتی ہے اور ایک نئے مکمل واد کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ پیاس کی شدّت نہ منزل واٹر دیکھتی ہے اور نہ ہی نہر کا پانی، کیوں کہ شدّت سارے تمیز مٹا دیتی ہے۔

کہانی میں اس نے تیسہ ندی کا بھی ذکر کیا ہے جو پہاڑی ندی ہے۔ عام طور سے پہاڑی ندی کا پانی بہت صاف اور میٹھا ہوتا ہے لیکن تیسہ ندی کا پانی پہاڑوں میں بل کھاتے گھاٹ گھاٹ سے لپیٹتے ہوئے کھارا ہو گیا ہے اور کھارا پانی زندگی کی علامت نہیں بن سکتا۔ دراصل کہانی کار اس ندی کے کھارے پن سے بھی ہماری تہذیب کے دیوالیہ پن کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ میٹھی تہذیب ماں کے دودھ کے ساتھ جسم کے شِریانوں میں اُترتی تھی وہ آج کی جدید ترین تہذیب سے آلودہ ہو کر کھارا ہو گئی ہے۔

شوکت حیات ایک عرصے تک علامتی کہانیاں لکھتا رہا ہے اس لیے وہ علامتوں سے اپنے آپ کو دور نہیں کر سکا ہے۔ اب اس نے علامتوں کی دریافت اپنے طور پر کی ہے جس کا استعمال اپنی تخلیق میں کرنے لگا ہے۔ اس کا بائیں بازو کی تحریک سے متاثّر ہونا بھی اس کی کہانیوں کے بین السّطور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ کہانی ہمارے تہذیبی زوال کی کہانی ہے جہاں نہ تو شرافت ہے اور نہ اقدار کی پاس داری۔ رشتوں کی پاکیزگی اور ان کے تقدّس کا احترام بھی ملتا ہے۔ یہ کہانی یہ بھی بتاتی ہے کہ آج کے ہپوکریٹ دور میں ہم ہر طرح کی آلودگی سے متاثّر ہو کر اپنے تہذیبی تشخص سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے اقدار کی پاس داری جسے ہم پُرکھوں کی امانت سمجھ کر نئی نسل کو سونپنا چاہتے ہیں، اسے آج نسل نے سنبھالنے سے انکار کر دیا ہے کیوں کہ وہ اس تہذیبی ذائقے سے قطعی طور پر محروم ہو چکی ہے جو ماں کے دودھ کے ساتھ ہی انھوں نے حاصل کیا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Nooristan A/204-Hassan Plaza
Minhaj Nagar Khalilpura Road
Phulwari Shareef-801505 (Patna)
Mob:9771276062

● تجزیہ

● غضنفر

شوکت حیات کا افسانہ ''بانگ''

بانگ کی بڑی اہمیت ہے خواہ وہ علاّمہ اقبال کی بانگ ہو یا شوکت حیات کی۔ خواہ کسی درند کی بانگ ہو یا پرند کی۔ بانگ نہ ہو تو صبح نہ ہو، دن نہ نکلے۔ حیات میں حرکت نہ ہو۔ معاملات میں برکت نہ ہو۔ کائنات بیدار نہ ہو۔ انسان برسرِ پیکار نہ ہو۔ کارِ کاروبار نہ ہو، حالات سازگار نہ ہوں، شعور وادراک ہشیار نہ ہوں۔ بانگ وہ سُر ہے جس کے تال پر سیاہ افق سے سرخ شعاعیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ پو پھٹ جاتی ہے۔ سورج نکل آتا ہے۔ جس کے شور سے زورِ جرّار تھرّا اٹھتا ہے۔ رعبِ زردار لرز اٹھتا ہے۔ کاخِ امرا کے در و دیوار ہل جاتے ہیں۔ اوقات اور حالات بدل جاتے ہیں۔

بانگ بند ہو جائے تو وقت کی رفتار رک جائے۔ کاروبارِ دنیا ٹھپ پڑ جائے۔ دماغ تشویش میں پڑ جائے۔ دل میں خدشات کا کانٹا گڑ جائے۔ ذہن کا توازن بگڑ جائے۔ پولٹری فارم کے مالک کی چھری اپنے ہی دربے کے مرغ کی گردن پر پہنچ جائے۔ اپنے ہم زاد کا خون ہوتا دیکھ کر دربوں کے باقی مرغوں کی آنکھوں میں لہو اتر آئے۔ ان کی چونچ دربوں کی جالیوں پر پہنچ جائے اور پھر ان سیاہ سفید اور چتکبرے مرغوں کے سینے میں ایک سرخ انقلاب برپا ہو جائے۔

یہی منظر شوکت حیات کی کہانی ''بانگ'' میں نظر آتا ہے۔ شوکت حیات اس منظر کو اتنے بڑے کینوس پر پھیلاتے ہیں کہ مرغ کے پروں کے رنگ طرح طرح کے رنگ دکھانے لگتے ہیں۔ ان رنگوں سے سیاہ، سفید، سرخ اور چتکبرے پیکر ابھرنے لگتے ہیں۔ ان رنگ برنگے پروں والے مرغوں کے پاس ان کی مرغیاں بھی سمٹ آتی ہیں اور اپنی باریک باریک خشک منقاروں سے اپنی زندگی کی لہو میں تر بتر کہانیاں سنانے لگتی ہیں۔ اپنے پیاروں سے الگ ہونے کا کرب، ان کی گھٹن، ان کی بھنچی بھنچی سی آواز سب کچھ ان کے سینے سے باہر آنے لگتا ہے۔ طرح طرح کی محرومیاں جھانکنے لگتی ہیں۔

ہم جنسوں کی گردنوں پر چلنے والی چھریاں، ان کے جسموں سے نچے جانے والے پر، ادھیڑی جانے والی کھال، جسم کی بننے والی بوٹیاں اور دہکتے ہوئے انگاروں پر ان کے گوشت اور گرم آگ پر سینکے جا رہے اس گوشت

سے نکلنے والے عرق کو دربوں کے مرغ دیکھتے ہیں تو ان کے اندر جل رہی انتقام کی آگ اور سلگ اٹھتی ہے۔ ان کی چونچیں چاقوؤں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور وہ چاقو چیڑنے پھاڑنے کے جذبے سے مغلوب ہو کر قفس نما دربوں کی مضبوط جالیوں ں سے بھڑ جاتے ہیں۔ مرغوں کے سینے میں انتقام کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ احتجاج کے شعلے شرر فشاں ہونے کی تیاری کرتے رہتے ہیں۔ اپنی منقاروں میں طاقت بھرتے رہتے ہیں۔ اپنے ڈینے مضبوط کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پنجوں کی چھرّیوں کو تیز کرتے رہتے ہیں اور ایک دن دربوں کی جالیاں توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔

الگ الگ گوشوں، الگ الگ دربوں، الگ الگ خانوں میں بنٹے اور دور دور رہنے والے سارے مرغ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایک منظّم فوج تیار ہو جاتی ہے۔ سر پر سرخ کلغیوں کے خود پہنے سپاہی اپنے پنجوں کے خنجر اور منقاروں کے تیر و تبر سے لیس ہو کر اجتماعی بانگ کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دشمن کے جسموں پر چونچ کی مار پڑنے لگتی ہیں۔ پنجوں کی چوٹ سے چمڑی ادھڑ نکلتی ہے۔ مرغ کے سوندھا سوندھا گوشت کھانے والے خود لہولہان ہونے لگتے ہیں اور مرغوں کے مسلسل یلغار، پنجوں کی مار اور منقاروں کے وار سے زخمی ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

دربے میں بند مرغوں نے کیسے باہر نکل کر مورچہ سنبھالا، سوئی ہوئی مرغیاں کس طرح تن کر راہ میں کھڑی ہو گئیں اور کس طرح ان کو ذبح کرنے والے ان کے حملوں سے زخمی ہوئے اور کیسے وہ اس مقام کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے جہاں وہ ان کی گردنوں پر چھری پھیرا کرتے تھے، یہ منظر آپ خود شوکت حیات کے بنائے ہوئے پیکروں میں دیکھئے:

''یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور خوف کا ٹھکانہ نہ رہا کہ ابھی ابھی جو مرغیاں جو باہر سو رہی تھیں، وہ ان کے راستے میں تن کر کھڑی ہیں۔ سب کے سب اچھل کر دروازے تک آ گئی۔ ابھی وہ مرغی خانے کا دروازہ بند کرنا ہی چاہ رہے تھے کہ چتکبرے چوزوں کی فوج ان پر حملہ اور ہو گئی اور وہ بے تحاشا بھاگے۔ چاروں طرف ہوا میں مرغوں کی کلغیاں۔ بجلیوں کی طرح کوند رہی تھیں اور زمین پر جوزوں کی فوج اپنے چھری نما پنجوں سے اچھل اچھل کر ان پر حملے کر رہی تھی۔''

''فضا کے چپّے چپّے میں جنگلی مرغوں کی پھڑ پھڑاہٹ تھی۔ اور اچھلتے ہوئے ان کے بجلی نما پنجے اور چونچ دیکھتے دیکھتے ان کے سفید کپڑے تار تار ہو گئے۔ اندر سے سیاہ بنیان اور لنگوٹ نظر آنے لگے۔ اندھا دھند وہ اس پولٹری فارم سے دور بھاگے جا رہے تھے جہاں آج تک ان گنت مرغوں کو بانگ اور ہتھیلی کی لکیروں کے غسلِ آفتاب کی آڑ میں وہ ذبح کر کے چٹخارے لے لے کے کھا چکے تھے اور رنگوں کی بنیاد پر ان کے جھنڈ کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکے تھے۔''

◄◄ ● ►►

"Bushra",A- 12 lane,Hamza colony,
New sir Syed nagar xtention,Aligarh,202002
7678436704

● **تجزیہ**

● **پروفیسر اسلم جمشیدپوری**

شوکت حیات کے افسانے ''میت'' کا تجزیہ

بوجھل قدموں سے مولانا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آمر درّانی کے پاس آئے:

''جنازے کو رخصت کی اجازت دیجئے حضور.....ابھی کئی مراحل طے کرنے ہیں.....تاخیر ہوتی چلی جا رہی ہے.....! آمر نے عجب بے چارگی سے ایک نظر مولانا اور ایک نظر اندر دالان میں رکھی ہوئی اپنی بیوی کی میّت کی طرف دیکھا۔ایک لمبی ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

''مولانا صاحب کچھ انتظام کرتا ہوں.....تھوڑا صبر سے کام لیں!''

میت تربت کی منتظر تھی۔

آمر کو جانے کن خاص لوگوں کا انتظار تھا۔''

جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔اس اقتباس کے حوالے سے کہانی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہانی میاں، بیوی کی ہے۔زیادہ سے زیادہ شوہر کے مظالم کی کہانی ہو سکتی ہے کیونکہ میّت بیوی کی ہے۔مرنے کا سبب کچھ بھی رہا ہو، مولانا کی شکل میں سماج موجود ہے، جو ایسے وقت میں بہت جلدی میں ہوتا ہے۔اُسے صرف میّت کو قبر تک لے جانے کی جلدی نہیں ہوتی بلکہ وہ رشتے ناطوں کو بھی دفنا دینا چاہتا ہے۔جس کے پاس روز کسی نہ کسی کو دفنانے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو یہ تعداد بڑھ بھی جاتی ہے اور سماج جلدی جلدی اپنا کام پورا کرتا ہے۔اس پورے اقتباس میں ایک خاص بات ہے اور وہ ہے انتظار۔یہ کن لوگوں کا انتظار ہو رہا ہے؟ کون ہے جس کا انتظار، میّت کا شوہر، مسجد کے امام، سماج کے افراد.....سب کر رہے ہیں۔یہ انتظار ہی ہے جو کہانی کی کلید ہے۔

بہت کم ہوتا ہے کہ شوکت حیات کی کہانی کی کلید آپ کے ہاتھ آ جائے۔شوکت حیات گذشتہ پینتیس چالیس برسوں سے مستقل افسانے لکھ رہے ہیں۔اب تک ایک بھی مجموعہ شائع نہ ہو سکنے کے باوجود،

اردو افسانے کی تنقیدی کتب، ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔شوکت حیات کے افسانے تقریباً ہر انتخاب میں شامل ہوتے ہیں۔ان کے افسانے ہماری روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات کا تخلیقی اظہار ہوتے ہیں۔تخلیقیت، تحلیل نفسی سے گذر کر واقعات کے رَگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور جزئیات رَگ و ریشے کی طرح گتھم گتھا ہو کر کہانی کی بلند و بانگ عمارت کی تعمیر سازی کرتی ہیں اور ایک ایسی کہانی ہمارے سامنے ہوتی ہے جو مسائل کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے اور انسانی دَرد و کرب کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوتی ہے۔''میّت'' کے قاری اور سامع خوش نصیب ہیں کہ انھوں نے ''میّت'' کی شکل میں زندگی کا تعارف حاصل کیا ہے، زندگی کو قریب سے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ محسوس کیا ہے، نہیں یہ بھی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے زندگی کو میّت کی شکل میں اپنے اندر اُتارا ہے اور جب کوئی کہانی، کہانی کار سے نکل کر قاری کے اندر اُتر جاتی ہے تو اپنے انجام کو حاصل کر لیتی ہے، معراج پا لیتی ہے۔

شوکت حیات نے ''میّت'' کی شکل میں جدید عہد کے آدمی کو پیش کیا ہے۔جدید عہد کا آدمی کون ہے؟ کیسا ہے؟...وہ مادّہ پرست ہے۔اس کا جسم ضرور گوشت پوست کا ہیلیکن جسم کے اندر کے اعضاء سنگ و آہن کے ہیں۔اس کے ہر طرف شور ہے، دھکا مُکّی ہے، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ریس ہے، خود آگے بڑھنے کے لیے، دوسروں کو کچلنا ہے۔ایسا کرنا اب اس کی مجبوری بن گیا ہے۔ورنہ وہ خود پیروں تلے روندا جائے گا۔میّت کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''یہ الگ بات ہے کہ مصروفیت کی مار جھیلتا آدمی چند لمحے ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی سڑک کی ریل پیل میں آگے بڑھ جانے پر مجبور ہوتا ہے۔نہ بڑھے تو گر پڑے اور کوئی ٹھیک نہیں کہ بھیڑ کے پیروں کے نیچے کچلتا چلا جائے۔''

کہانی میں شوہر کے دوست کی شکل میں مصنف خود موجود ہے۔جو کبھی کیمرہ بن جاتا ہے اور کبھی کہانی میں نمودار ہو جاتا ہے۔آمر دُرّانی اس کا جگری دوست ہے، جس کی بیوی، ذیابیطس کی شکار ہے اور ہارٹ اٹیک میں دنیا کو خیر باد کہہ چکی ہے۔آمر کی خبر پر مصنف اس کے گھر پہنچتا ہے۔راستے اور گھر پر جتنے منھ اتنی باتوں کے مصداق، کہیں سرگوشیاں، کہیں چہ مے گوئیاں جاری ہیں۔مصنف کہانی کے اندر آ جاتا ہے۔مرنے والی کو بھابھی کہتا ہے۔اُسے بھابھی کی شرافت کے ساتھ ساتھ ماحول، مجبوری اور شوہر کی رضامندی کا خیال ہے:

''حد درجہ میک اپ اور شانوں پر کھلے لمبے گیسو سے دلی نفرت تھی، لیکن شوہر کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔خاص خاص موقعوں پر اس کے کھلے ہوئے بالوں پر از حد اصرار کرتا۔''

اُسے احساس ہے کہ آمر درّانی، جو کہ سیاسی پارٹی کا مضبوط و مستحکم رکن ہے، بلندیوں کے لیے کسی بھی قسم کی سیڑھی کا استعمال کرسکتا ہے۔ اپنی قیمتی سے قیمتی چیز کو سیڑھی کا پائیدان بنا سکتا ہے۔ کیوں کہ ایسے لوگوں کی نظر میں شہرت، دولت، اقتدار اور اس کے بعد کے عیش و عشرت ہیں۔ اُن کی نظر میں سب کچھ دے کر بھی ان کا حصول، سستہ سودا ہے:

''جیسے جیسے وہ بولتا جا رہا تھا، خوبصورت بھا بھی کہیں کھوتی جا رہی تھی.....اُس نے محسوس کیا کہ پگھلتی جا رہی تھیں.....کسی کھائی میں گرتی جا رہی تھیں.....سلیولیس بلاؤز میں چمکتے ہوئے بازو، دمکتا ہوا پورا جسم پسینے میں شرابور.....حواس باختہ.....ہانپتی ہوئی، بچنے کی کوشش میں ہراساں.....چاروں طرف سے جیسے کرگسوں نے گھیرے میں لے رکھا ہو.....اور وہ تنہا اپنے صندلی جسم کی حفاظت کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہو.....''

کہانی یہاں ایک موڑ پر آجاتی ہے۔ قاری خود کو عقل مند سمجھتے ہوئے اعلان کر دیتا ہے کہ یہ کہانی ایک شوہر کے ذریعہ بیوی کو زینہ بنائے جانے کی المناک کہانی ہے۔ المناک اس لیے کہ بیوی کی مجبوری میں بھی صدائے احتجاج بُلند کرنے کی خواہش بالآخر تکمیل کو پہنچتی ہے۔ بیماری میں اچانک دل کا تیز دھڑک کر بند ہو جانا دراصل بیوی کا احتجاج ہی ہے۔ کہانی کو یہاں پورا ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن کیا یہ کسی عام افسانہ نگار کے قلم سے نکلا ہوا افسانہ ہے؟ نہیں، شوکت حیات اپنی کہانی کی ابتدا، وہاں سے کرتے ہیں جہاں بظاہر کہانی ختم ہو جاتی ہے، یا قاری کی نظر میں کہانی کو ختم ہو جانا چاہیے۔ میّت کا غسل اور تجہیز و تکفین کا عمل بند ہو گیا ہے، لوگوں کا آنا جاری ہے۔ آمر کا ایک جملہ دیکھیں کہانی کا سرا شاید آپ کے ہاتھ آجائے:

''شہر کی تمام معزز ہستیاں یہاں موجود ہیں۔ اتنی بھیڑ دیکھ کر میں تو محو حیرت ہوں کہ مجھے لوگ.....میرے غم میں اتنے سارے لوگ شامل ہیں۔ پچاس گاڑیاں آچکی ہیں۔ گن لو تم.....میں تو کئی بار.....فوٹو گرافروں کی تو ریل پیل ہے.....مختلف چینل والے.....اخبار کے رپورٹر.....کیا بتاؤں کیا اژدہام ہے.....!''

جی ہاں! بالکل ایسا ہی دھکا مصنف کو بھی لگا تھا۔ وہ بھی حیران رہ گیا تھا کہ کیا ہمارے عہد نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں ہم کسی بھی بات کا سودا کر سکتے ہیں، جہاں ہم اپنی زندگی کے کسی بھی لمحے کو کیش کر سکتے ہیں، جہاں ہم فلمی دنیا کی طرح، ہر کام کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ کچھ بھی حقیقی نہیں۔ کوئی رشتہ سچا نہیں۔ کوئی جذبہ صحیح نہیں۔ بات صرف ایک فرد کی ہو تو وہ خراب ترین ہونے کے باوجود کنارہ کش کرنے لائق تو

ہوتی ہے لیکن جب کسی بات کا تعلق ایک فرد نہیں، افراد، بلکہ پورے سماج سے اور عالم انسانیت سے ہو تو پھر کیا ہو.....کہانی ایک گھر کی ہی نہیں ہے، کہانی میاں، بیوی اور اس کے دوست کی بھی نہیں ہے۔ کہانی وقت کی بھی ہے جو کبھی نہیں رُکتا.....کہانی پورے سماج کی ہے جو کبھی جمود پذیر نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کا خاصی مدت تک انتظار نہیں کرتا لیکن وقت اور سماج، دونوں رُکے ہوئے ہیں۔ انتظار ہو رہا ہے.....ایک قافلے کا، ایک طویل قافلے کا جس کا ایک سرا، دوسرے کو نہ پا سکے۔ کیونکہ دِلاسہ، پُرسہ اور تعزیت والوں کی قطار لگی ہے۔

''آنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔
بیشتر لوگ گاڑیوں سے آرہے تھے۔
آمر آگے لپکتا۔
آنے والا اُسے گلے لگا لیتا۔
''میں لٹ گیا.....میری ہنستی ہوئی زندگی کو منحوسوں کی نظر لگ گئی!''
لوگ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے، زندگی کی بے ثباتی کی دہائی دیتے ہوئے صبر کی تلقین کرتے اور.....آگے بڑھ جاتے.....عقب سے لائن میں دیگر لوگوں کا دباؤ ہوتا.....سب کو موقع ملنا چاہیے۔''

صُبح سے شام کا وقت ہونے کو ہے۔ تعداد بڑھتے بڑھتے ہجوم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چمچماتی کاروں، موٹر سائیکلوں وغیرہ کی بھیڑ بھی بڑھ رہی ہے۔ سارے رشتہ دار آچکے ہیں۔ لڑکی والے رشتہ دار بھی اور لڑکے والے بھی۔ عزیز و اقارب، پاس پڑوس.....انتظار پہلے ظہر کی نماز کے بعد کا.....پھر انتظار طویل ہو جاتا ہے۔ افسوس اور غم، اُکتاہٹ اور جھلاّہٹ میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ نئے لوگوں کے آنے کا سلسلہ جاری ہے لیکن اب کچھ لوگ انتظار کا کرب نہیں جھیل پا رہے ہیں اور اس سے نجات کا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہجوم کی بے چینی اور تعداد میں بتدریج آنے والی کمی کو دیکھتے ہوئے سکریٹری نے آمر درّانی کو حالات سے باخبر کیا تو آمر نے سکریٹری کو جھکنے کا اشارہ کیا:

''سکریٹری جھکا۔ اس نے منہ اس کے کان کے قریب کیا۔
''آرہے ہیں وہ لوگ.....؟''
''چانس نہیں سر!''
''ٹرائی کر کے دیکھو.....ریکویسٹ کرو.....
فون کیا ہے تم نے.....انہیں بتاؤ کہ ان کا انتظار ہو رہا ہے۔''

آمر درّانی کو آخر، کس کا انتظار ہے۔ سیاسی اور غیر سیاسی، زیادہ تر اہم شخصیات آچکی ہیں۔ اب قافلہ

اتنا لمبا ہو جائے گا جو دور دراز کے قبرستان تک نکلے گا تو اس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دے گا۔ سگے اور خونی رشتہ دار سبھی آ چکے ہیں۔ میّت کے ساتھ رہنے اور انتظار کرنے کی قوت بھی دم توڑ رہی ہے لیکن انتظار باقی ہے..... کس کا انتظار ہے، جس کے بغیر ''میّت'' کا آخری سفر، شروع نہیں ہو سکتا۔ کون ہے وہ؟ کیا کوئی سیاسی اہم ترین شخصیت؟ کیا کاروبار کا بہت بڑا حصہ دار؟ کیا گاڑیوں کی چمک یا تعداد ابھی کم ہے؟ گتھی الجھتی ہی جاتی ہے۔ سرے ایک دوسرے میں ایسے پیوست ہیں کہ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ ایسے میں آمر درّانی پھر آ دھمکتے ہیں:

''آمر کی آنکھوں میں عجیب و غریب چمک عود کر آئی۔

''نام بتا دوں گا تو تم بگڑو گے..... اتنا اہم آدمی ہے

کہ اس کی موجودگی سب کے لیے ایک بڑی سرپرائز ثابت ہو گی

اور میرے لیے.....!''

آمر درّانی کے جملے نے کہانی کو بجائے سلجھانے اور حل کرنے کے مزید الجھا دیا ہے۔ سوال اب بھی برقرار ہے کہ آخر انتظار کیوں اور کس کا؟ پھر یہ کہ اس کی موجودگی سب کے لیے ایک سرپرائز ہو گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنا ہی انتظار کر رہا ہو؟ وہ اچانک مودار ہو کر دنیا کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہو کہ وہ اب ایسا نہیں ہے۔؟ مگر ایسا کیسے ممکن ہے؟ جب تک وہ اِدھر ہے، اُدھر کیسے نظر آ سکتا ہے۔ انسان بیک وقت ایک جگہ ہی ہو سکتا ہے.... تو پھر یہ کیا ہے؟ شوہر کے انتظار اور آنے والے کا معمہ حل کرنے کے لیے ''میت'' کو بھی کروٹ لے کر بولنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اُسے لگا کہ بھابھی نے کفن ہٹاتے ہوئے اپنا چہرہ باہر نکالا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''میں نہ کہتی تھی.....!''

''میّت'' کی قوت گویائی نے بھی آپ کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ مزید الجھنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنے والے کے بارے میں جہاں شوہر کو پتہ ہے وہیں بیوی کو بھی پتہ ہے لیکن وہ بھی لفظوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکا کر چلی گئی۔

''میں نہ کہتی تھی'' کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح پوری زندگی، بیوی کی مجبوری کا فائدہ اُٹھایا، اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو بن سنور کے دوسروں کے سامنے پیش ہونا پڑا، ٹھیک اسی طرح، موت کے بعد بھی شوہر منتظر ہے کہ دیکھنے والے آ چکے ہیں، سماج اور زمانہ موجود ہے اور اب صرف تمہارا انتظار ہے ،تم ذرا اچھی طرح سج دھج کے آؤ تا کہ تمہاری زندگی کی طرح تمہاری موت بھی میرے کام آ سکے۔

''میں نہ کہتی تھی'' کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شکایتاً اپنے دیور یعنی مصنف سے کہہ رہی ہے

کہ میں نہ کہتی تھی کہ یہ میری موت کا بھی تماشا بنائیں گے اور اسے بھی اپنے مفاد کے لیے استعمال کریں گے۔

کہانی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پوری کہانی مصنف کے نہ چاہتے ہوئے بھی، بھابھی کے اِرد گرد گھومتی ہے۔ شروع سے آخر تک بھابھی کہانی کا مرکزی کردار بن جاتی ہیں۔ بظاہر وہ ''میّت'' میں تبدیل ہو چکی ہیں، لیکن پوری کہانی میں وہ زندوں سے زیادہ زندہ ہیں۔ وہ ظلم و زیادتی کے خلاف ہر لمحے اپنی آواز کسی نہ کسی طور بُلند کرتی رہتی ہیں اور جب اُسے نظر انداز کرنے کی بھی حد ہو جاتی ہے تو وہ کفن سے باہر آنے کی بھی ہمت کر لیتی ہیں کیوں کہ انہیں لگتا ہے سب کے سب میت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ سب کو آمر درّانی نامی جادوگر نے پتھر کا بُت بنا دیا ہے اور سب کچھ رُک گیا ہے..... انتظار ہے کسی نامعلوم شخص کا..... انتظار جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ یہ انتظار تو میت کے لیے قبر کے انتظار پر بھی بھاری پڑ رہا ہے۔ ایسے میں وہ مصنف کو جھنجھوڑنے کے لیے کفن سے منہ نکال کر مخاطب ہوتی ہے۔

''میں نہ کہتی تھی۔''

لیکن آپ، میں اور ہم سب کچھ بھی سوچیں..... میت، قبر کے لیے ترس رہی ہے۔ انتظار جاری ہے۔ وقت، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ سفر میں رہتا ہے، آیئے، دیکھ لیجئے، وقت رُک گیا ہے۔ کیوں کہ زندگی رُک گئی ہے۔ کائنات رُک گئی ہے۔ کیوں کہ رُکتا وہ ہے جو جمود کا حصہ بن جاتا ہے۔ میت جمود کی نشانی ہے لیکن اب وہ ایک جسم، ایک فرد، ایک جنازہ نہیں ہے بلکہ اس کا جسم پھیل چکا ہے۔ انتظار کرنے والے، اُکتانے والے، سوال کرنے والے۔ حتیٰ کہ کہانی لکھنے والا..... سب جمود کا شکار ہو چکے ہیں..... سب میّت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ میت میں بظاہر وقت رکا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن مصنف کا اشارہ کہ بیسویں صدی اپنی کینچلی بدل چکی تھی، سے صاف ہو جاتا ہے کہ قارئین کو بظاہر رکا اور ٹھہرا ہوا نظر آنے والا وقت، دراصل وقت نہیں ہے بلکہ اس کی کینچلی ہے، جو ہو بہو وقت ہے اور حقیقتاً وقت نما سانپ وہاں نہیں ہے۔ وہ تو اکیسویں صدی میں داخل ہو کر ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ کہانی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن اپنے تمام سوالوں کے ساتھ خصوصاً استعجاب کے ساتھ، انتظار کی حیرت کے ساتھ کہانی کا سفر قاری کے اندر شروع ہو جاتا ہے۔

شوکت حیات کی کہانی ''میّت'' عہدِ حاضر کی تلخ حقیقتوں کا تخلیقی اظہار ہے۔ انہوں نے کہانی کے تانے بانے، زبان و بیان، واقعات کی تفصیل، قصے کی مرکزیت وغیرہ سے ایک ایسا افسانوی ماحول تیار کیا ہے جسے black Satire کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ ایسے واقعات کا بیان ہوتا ہے جن میں انتہائی معیوب اور طنز و معنی بھری بات سے بھی استفادہ حاصل کرنے کی کوشش ہو۔ پریم چند کے ''کفن'' میں مادھو اور گھیسو کا عمل معیوب ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا احساس ہمیں دے جاتا ہے کہ ہم اس میں بھی زندگی تلاش کرتے ہیں اور بالآخر ہم ان افراد سے نفرت کے بجائے ہمدردی کرتے ہیں۔ آمر درّانی کی کیفیت دیکھیں:

''اس کے دوست نے محسوس کیا کہ آمر کی نظروں میں بیوی کی میت
نہیں، کوئی بیش قیمت سامان، سفید کپڑے کے نیچے ڈھک کر رکھ دیا گیا تھا..... چیز
چلی گئی تو چانس ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

جو آمر درّانی گوشت پوست کی اپنی بیوی کی میت کو، سفید کپڑے کے نیچے ڈھکا رکھا بیش قیمت سامان تصور کر رہا ہے کیا وہ نفرت کے لائق ہے۔ وہ قصوروار نہیں..... یہ تو زمانے کا چلن ہے، یہ تو عروج و بلندی کا سرور ہے۔ گھیسو اور مادھو، بھوکے تھے، ازل کے بھوکے اس لیے جب وہ کفن بیچ کر حلوا، پوری، جلیبی کھاتے ہیں تو ہمیں ان کی بھوک سے اور ان سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ آمر درّانی بھی تو بھوکا ہے۔ پھر ہم اس کی بھوک کو نفرت کی نظر سے کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

کہانی موجودہ سماج کے مصنوعی جذبات کی بھی قلعی کھولتی ہے۔ آمر کا دوست کہتا ہے:

''تم خود راجدھانی کی ایک بہت اہم اور ناگزیر شخصیت ہو..... ایسے موقعوں پر
لوگ تمہارے جیسوں کی نظروں کے رجسٹر میں اپنا اندراج ضروری سمجھتے ہیں.....!''

شوکت حیات کی کہانی میں زبان بھی معیاری ہوتی ہے لیکن شوکت حیات اپنے کسی نہ کسی کردار کی زبان میں خود آموجود ہوتے ہیں۔ یہ ان کا کہانی میں تحلیل ہو جانا ثابت کرتا ہے۔ کئی جملے اس کہانی میں بھی ایسے ہیں، جن کو سن کر لگتا ہے کہ ہم کچھ نہیں سن رہے ہیں بلکہ شوکت حیات سامنے ہیں۔ اور دوسروں سے والہانہ قربت کا جو احساس ان کی ذاتی زندگی سے لفظوں اور جملوں کی شکل پھوٹتا ہے، وہ کہانی میں بھی در آیا ہے۔

''یاروں نے اونچی اونچی عمارتیں تعمیر کر لی تھیں۔''

''بچپن کی کسی گلی کا بدصورت کتّا بھی پیارا لگتا ہے۔''

''ارے رے آمرے..... ارے مری جانڑ..... میرے لائق (لائک)
بھی کوئی کام ہو تو بول..... چٹکی میں انجام دوں اور سالے تیری آنکھوں
کا تارہ بنوں.....''

''میّت'' عصری حسیّت سے لبریز ایک عمدہ کہانی ہے جو اپنے سوالوں سمیت قاری کے اندر اتر جاتی ہے اور قاری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی اچھی کہانی کی پہچان ہے۔ شوکت حیات کو اس اچھی کہانی کے لیے مبارک باد۔۔

◀◀ ● ▶▶

Head, Dept: of Urdu
Chaudhry Charan Singh University
Meerut(U.P)
Mob:9456259850

● **تجزیہ**

● **ڈاکٹر توصیف احمد ڈار**

افسانہ ''کوبڑ'' اخلاقی و تہذیبی اقدار کی زوال پذیری کا اشاریہ

شوکت حیات معاصر اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک ناقابلِ فراموش نام ہیں۔ گزشتہ کئی ایک دہائیوں سے وہ اپنی معیاری تخلیقات سے اُردو فکشن کی زرخیز مٹی کو مزید زرخیزیت مہیا کرنے میں تن و من سے منہمک ہیں۔ ان کی فکشن تخلیقات کے بغور مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زندگی اور زمانے کی تلخ و شیریں کیفیتوں کا وہ بھرپور ادراک رکھتے ہیں۔ ان کیفیات کو انہوں نے فنی سانچے میں پرو کر جس اسلوب میں پیش کیا ہے وہ انہیں اپنے معاصر فکشن تخلیق کاروں میں اپنا الگ مقام متعین کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اپنے تخلیقی سفر کے دوران ان کا سابقہ مختلف تحریکات و رجحانات سے رہا ہے۔ ان تحریکات و رجحانات کے ابلتے لاوے کو انہوں نے راکھ میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ ان کے غالب فکری و فنی رجحانات و کمالات پر وہ بھرپور نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ ان سے متاثر ضرور ہوئے لیکن محض اُس حد تک جب تک ان میں باقاعدہ اعتدال و توازن قائم رہا۔ وہ ادب میں وابستگی کے عنصر کے قائل یقیناً ہیں لیکن اسے کسی مخصوص ازم کی، کسی محدود فلسفے کی اور کسی ایک مقصد کی تشہیر و تبلیغ کا آلہ تصور کرنے سے گریز بھی کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر تخلیقات اس نکتے پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ اپنے تہذیبی و ثقافتی روایات کی تعمیر و تشکیل اور ان کی سالمیت کے حوالے سے سنجیدہ ہیں۔ انہیں زمانے کی تبدیل ہوتی ہوئی پٹری اس حقیقت کا مشاہدہ بہم پہنچاتی ہے کہ عالمِ انسانیت جس اخلاقی و روحانی تنزلی اور عدمِ تحفظ کا شکار ہوتی جا رہی ہے وہ انتہائی سنگین اور مایوس کن نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے اسی سیاسی و سماجی، معاشی و مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی تعمیر و تخریب کا فن کارانہ اظہار ہیں۔

شوکت حیات کے اب تک کئی افسانے شائع ہو کر سنجیدہ ادبی حلقوں میں بحث و مباحثہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ''گنبد کے کبوتر'' ان کا مقبول عام افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کا شمار نہ صرف شوکت حیات بلکہ اردو ادب کے معروف ترین افسانوی مجموعوں میں بھی ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل اوّلین افسانہ ''کوبڑ'' فن

کارانہ اسلوب کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔افسانہ نگار نے فنِ افسانہ نگاری کے تخلیقی رموز کا بھرپور لحاظ کرتے ہوئے اختصاراً ہی سہی لیکن کئی ایک غور طلب سماجی و اخلاقی تغیرات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ایک ہی ملک بلکہ ایک ہی خاندان اور ایک ہی والدین کی کوکھ سے جنمے دو افراد کس صورت متضاد اور مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ بڑا بھائی گھریلو ذمہ داریوں کے بوجھ تلے یوں دبا ہوا ہے کہ نوجوانی کی رنگین بہاریں تو کجا مستقبلِ قریب و بعید کے لیے بھی اسے دور دور تک کسی راحت و اطمینان کا اندیشہ نظر نہیں آتا ہے۔زمانے کی ناچاقی کو بھانپ کر ہر وقت اور ہر لمحہ اپنے وجود کی نفی اور گھٹنے ٹیکنے کو وہ اپنا وتیرہ بناتا ہے:

''کوئی جواب دیئے بغیر امنڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان اس نے خود کو گٹھر میں تبدیل کرلیا۔ یہ ہنر اسے معلوم تھا کہ بچپن سے اب تک اکثر اوقات سنگین حالت کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے خود کو بے جان اشیاء میں تبدیل کر دینا پڑتا تھا۔ ورنہ اس کے جیسے آدمی کے لیے جینا آسان نہ تھا۔ اس کے کمزور جسم میں مزاحمت کرنے، حالات پر قابو پانے، اور رخ موڑ دینے کی طاقت نہیں رہی تھی۔''[1]

(شوکت حیات۔افسانہ ''کوبڑ'' مشمول ''گنبد کے کبوتر'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء۔ص ۴۰)

مزاحمت کرنے، حالات پر قابو پانے اور رخ موڑ دینے کی طاقت نہ رہنے سے یہ عندیہ فراہم ہوتا ہے کہ ناسازگار اور نازیبا حالات کے خلاف آواز بلند کرنے اور ان کے سنگین نتائج سے سوسائٹی کو آگاہ کرنے کی صلاحیت اس میں یقیناً موجود تھی جو اب کئی سارے وجوہات کی بنا پر باقی نہیں رہی، یا اگر باقی ہے بھی تو اس کا برملا مظاہرہ کرنے کو اپنی فلاح کے لیے کسی بھی صورت سودمند تصور نہیں کرتا ہے۔گویا وہ اس بات کا بھرپور تجربہ رکھتا ہے کہ اس نوع کی سوچ و فکر اور طرزِ عمل اس سماج میں کارِ فضول ہے جس میں نیک نیتی اور صداقت پروری کو بے اعتنائی اور بے اسبابی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور لوٹ کھسوٹ و ظلم و استحصال کو قانونی روپ دے کر اخلاقی و روحانی اقدار کی پسپائی کی جاتی ہے۔معاشرے کا کم و بیش ہر ایک طبقہ اس بے راہ روی کو مزید ہوا دے کر کس طرح ہماری قابلِ رشک تہذیب و تمدن کو حیوانی اور وحشی روپ عطا کرتا ہے اس کے نمایاں تخلیقی اشارے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

''ریزرویشن کے سات روپے لگتے ہیں پھر یہ پچاس کیوں؟''

اس نے ڈرتے ڈرتے کنڈیکٹر سے سوال کر دیا۔کنڈیکٹر کے تیوریوں پر بل آئے۔اس نے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اتنے سارے لوگ بیوقوف ہیں کیا.....نہیں دے سکتے تو اگلے اسٹیشن پر اتر جانا۔ یہ تھری ٹائر ہے۔آپ کو جنرل بوگی میں جانا ہوگا.....!

.....تو لاؤ بیس ہی دے دو.....تمہارے لیے مروّت کر رہا ہوں.....!

ہنسوڑ قسم کا کنڈیکٹر اس کی خستہ حیثیت بھانپتے ہوئے ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔

''بھیا سب میری جیب میں نہیں جائے گا.....!''

سردار جی نے یہ بھی کہا۔

''لیکن سرداروں کی ٹیکسی کے میٹر کے چکر میں نہ پڑنا۔ بھاڑا طے کر لینا۔ دس سے پندرہ روپے کے بیچ تیار ہو جائے تو ٹھیک ہے۔میٹر کا حساب کرو گے تو ایسا بھی ہوگا کہ وہ ادھر اُدھر گھما کر تم سے پچیس تیس اینٹھ لیں گے اور تم پالم سے اتنی ہی دور ہو گے جتنا کناٹ پیلس کے پاس تھے.....!

اس نے سوچا ڈرائیور شریف آدمی ہے۔ڈھائی سو کی گھڑی کا سو روپے دے ہی سکتا ہے۔اس میں اس کی واپسی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔اتنی دیر میں ڈرائیور نے تھری ویلر اسٹارٹ کر دیا تھا۔اس نے گھڑی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''بھائی ایسا ہے کہ میری جیب کٹ گئی .....تم یہ میری گھڑی رکھ لو اور جتنے پیسے مناسب سمجھو مجھے دے دو۔''

شریف اور غیر سردار ڈرائیور نے گھڑی اپنی نحیف ہاتھوں میں لے لی۔ ایک نظر اسے گھور کر دیکھا اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ جا وہ جا۔ [2]

(شوکت حیات: افسانہ ''کوبڑ''، مشمولہ ''گنبد کے کبوتر''۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء۔ص ۴۴۔۴۵)

یہ تینوں اقتباسات موضوع کی مناسب سے اہم اور غور طلب تناظرات کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔کنڈیکٹر کا بے رحمانہ برتاؤ اور تلخ لہجہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ طاقت کے نشے میں چور افراد ہمدردانہ اور مخلصانہ جذبات سے عاری حیوانیت کا روپ دھار چکے ہیں۔غریب و نادار لوگوں کی قدم قدم پر تذلیل کی جاتی ہے، ان کے جذبات و احساسات کو پاؤں تلے روندھا جاتا ہے، ان کی مجبوری و محکومی کا فائدہ اٹھا کر ان کے بچے کچے مال و متاع کو ہڑپ لینے کی چالبازیاں اپنے عروج پر ہیں اور تو اور اس نازیبا صورت حال سے بھرپور شناسائی کے باوجود بھی مقتدر طبقہ اس کا کوئی سدباب نہیں کرتا ہے بلکہ (اتنے سارے لوگ بیوقوف

ہیں کیا) تمام خودغرض لوگ اپنے مفادات کے تئیں اس اخلاقی وروحانی گراوٹ میں بخوشی شامل ہوجاتے ہیں۔ یوں وہ تہذیب وثقافت اپنی اثر پذیری اور اصل شناخت سے کوسوں دور ہوجاتی ہے جو کبھی عدل و انصاف اور ہمدردی و بھائی چارے کی اعلیٰ مثال تصور کی جاتی تھی۔

ہمارے ثقافتی انسلاکات کا ایک اہم اور ہر دلعزیز عنصر حق گوئی رہا ہے۔ اس حق گوئی اور امانت داری کا ہی نتیجہ ہے کہ ان گنت طبقات و مذاہب اور ذات وتشخص کے افراد ہزار ہا سالوں سے یہاں اپنی زندگی کی دھوپ چھاؤں کا لطف لیتے آئے ہیں۔ اپنے تو اپنے، غیروں کو بھی ہمارے اس تہذیبی وصف کا اعتراف رہا ہے۔ لیکن زندگی اور زمانے کی بدلتی ترجیحات کے تحت انسان نے جہاں خارجی دنیا کی رونقی کو قدرے دوبالا کیا ہے وہیں داخلی کائنات کی راست بازیوں کی تمام تر کیفیات سے دن بہ دن دور ہوتا جاتا ہے۔ سردار کا سکھ ڈرائیور کی چالاکیوں سے باخبر رہنے اور غیر سکھ ڈرائیور کا چکما دے کر گھڑی ہڑپ کرنے کے بظاہر معمولی واقعات اس تہذیبی و اخلاقی پستی کے غیر معمولی اشاریے ہیں۔ یہ افسانہ نگار کی تخلیقی بصیرت کا قابلِ داد پہلو ہے کہ اس قدر لوٹ کھسوٹ اور ظلم و جبر کا سامنا کرنے کے باوجود بھی مرکزی کردار کسی فوری تشدد یا ردِّعمل کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔ وہ چیختے چلاتے اپنی مظلومیت کی ڈونڈی نہیں پیٹتا ہے بلکہ انتہائی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض قارئین کو سوسائٹی اور سوسائٹی کے ذمہ داران کی حقیقی سوچ و فہم کا آئینہ دکھاتا ہے۔ جب معاشرے کے ادنیٰ طبقات سے وابستہ افراد ا(ڈرائیور، کنڈیکٹر، وغیرہ) س قدر دن دھاڑے اپنی وحشت وہوس نا کی کا کھیل کھیلتے ہوں، وہ کسی خوف و ہراس کی پروا کیے بغیر اپنی من مانی پہ اتر آتے ہوں اور اجنبی اور مجبور لوگوں کی بگڑی کو مزید بگاڑ دیتے ہوں تو اُس معاشرے کی اخلاقیات، عقائد اور اقدار کی اہندامی کوئی امرِ تعجب نہیں ہے۔

افسانے کا دوسرا اہم کردار (چھوٹا بھائی) گھر بار اور رشتے ناطے پس پشت چھوڑ کر بیرون ممالک عیش وعشرت کی زندگی گزارنے میں محو ہے۔ کبھی اتفاقاً اپنے کسی نجی کام کی غرض سے دیس آنا بھی ہوتا ہے تو وہ چند لمحات بھی موج مستی اور سیر وشاپنگ کے نذر ہوتے ہیں:

> ''دونوں تمام دن کناٹ پیلس، قرول باغ، پالیکا بازار اور مینا بازار میں گھومتے رہے۔ لگ بھگ تین ہزار روپے کی خریداری کی گئی۔ کسی دوست کے لیے کولہاپوری چپل، کسی کے لیے پینٹ، کچھ ایمی ٹیشن.....وغیرہ وغیرہ، ہینڈلوم کے سوتی کپڑوں کا وہاں ایک خاص کریز تھا۔ جامع مسجد کے پاس فلورا ہوٹل میں کھانا کھایا گیا۔ پھر شاپنگ۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔''

(شوکت حیات: افسانہ ''کوبڑ''، مشمولہ ''گنبد کے کبوتر''۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء۔ ص ۴۸)

موجودہ وقت کے معاشرے میں والدین، بھائی بہن اور دوسرے خونی رشتوں کی معنویت رفتہ رفتہ مفقود ہوتی جاتی ہے۔ ان بندھنوں کی دیکھ بال اور عزت وحفاظت کو آج کی نئی نسل وقتی ضیاع گردانتی ہے۔ برعکس اس کے دوستی کے نام پر نئے نئے رشتے استوار کیے جاتے ہیں جن کی خوشی اور مضبوطی و مستحکمی کی خاطر دل و جان اور پوری مال ومتاع صرف کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا ہے۔ اس وبا کا شکار کوئی مخصوص خطہ یا علاقہ نہیں بلکہ کم وبیش پوری کائنات اس شکنجے میں آگئی ہے اور جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دور دور تک کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ یہ افسانہ اگرچہ بظاہر ہمارے یہاں تہذیبی وثقافتی اور سماجی و معاشرتی سطح پر پھیلی ہوئی بداعتقادی اور بے راہ روی کا بیانیہ ہے لیکن بین السطور میں ان تمام منفی تصورات سے اپنی سوسائٹی کو پاک وصاف کرنے کا پیغام بھی اس میں بلاشبہ موجود ہے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اپنی فہم وفراست اور مطالعے ومشاہدے کو محدود دائرے سے نکال کر وسیع کرنے کی سعی کریں۔ شوکت حیات زندگی اور زمانے کی بدلتی ترجیحات اور ان کے انسانی تہذیب، ثقافت، اخلاقیات، تفکرات، تصورات اور عقائد وغیرہ پر مرتب ہو رہے منفی ومثبت اثرات کا فنی خاکہ پیش کرنے کو اپنا مطمحِ نظر گردانتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار ہمارے درمیان زندگی گزارتے لوگ ہیں جن میں ظالم اور مظلوم اور حاکم و محکوم، مرد اور عورت وغیرہ سب مل جل کر زندگی کی اصل حقیقت سے ہمیں مزید روشناس کراتے ہیں۔ ان کا اسلوب اور طرزِ بیان ان کے افسانوں کی فنی وقعت کو ملا جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات سادہ اسلوب لیے ہوئی ہیں لیکن بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن میں علامتی، استعاراتی اور تمثیلی طرزِ اسلوب کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ لیکن ایسا ہونے کے باوجود ان کے یہاں ترسیل وابلاغ کی ناکامی یا مشکل پسندی کا کوئی معاملہ درپیش نہیں رہتا ہے جس کی عمدہ مثال زیرِ تجزیہ افسانہ ''کوبڑ'' ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Lecturer Urdu
DDE, University of Kashmir
Naseembagh, Hazratbal, Srinagar
Ph No: 9622543998

● **مکالمہ**

● **نثار احمد صدیقی**

شوکت حیات سے گفتگو

س: اپنی زندگی کے ذاتی وادبی کوائف بتائیے۔

ج: ذاتی طور پر فری لانسنگ اور ترجمہ نگاری کے ذریعہ اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھا رہا ہوں۔ ایسی ہی رائٹنگس کے بیچ وقت نکال کر ادبی تخلیقات کی عرق ریزیوں، استغراق اور جانفشانی سے بھی گزرتا رہتا ہوں۔ والد نے بچپن میں ایک ڈائری اس وقت دی تھی جب وہ مجھے سیاحت کے لیے دلی لے جا رہے تھے۔ ان کی ڈائری لکھنے کی ہدایت نے مجھے ان کے انتقال کے بعد دنیا کی بدحالی اور سناٹے وقت کی اداسی دیکھ کر بعد ازاں افسانہ نگار بنا دیا۔ والد پڑھنے کے بڑے شوقین تھے ان کی لائبریری میں انواع اقسام کی کتابیں تھیں۔ اس چیز نے مجھے بھی مطالعہ کرنے کی طرف ملتفت کیا۔ دوران ملازمت (نیم سرکاری) میں نے ایم اے میں باضابطہ ڈیپارٹمنٹ سے اجازت لیتے ہوئے ایڈمیشن لے کر امتحان دیا اور گولڈ میڈلسٹ ہوا۔ ابھی حال ہی میں یونیورسیٹی گرانٹس کمیشن کا امتحان 'نیٹ' بھی دیا اور اللہ کے فضل سے اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کرنے کا بھی ارادہ ہے۔

س: آپ نے اپنی کہانی کا سفر جب شروع کیا تو اس وقت کئی نظریوں کا بول بالا تھا۔ اس زمانے میں 'جدیدیت' نے آپ کو متاثر کیا؟ اس رجحان کے زیر اثر جو کہانیاں لکھیں، ان کہانیوں کی کیا اہمیت ہے، تفصیل سے جواب دیں۔

ج: سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے شروع سے میں جدلیاتی احتجاجی اور اجتہادی رویوں کا عادی رہا ہوں۔ جس زمانے میں میں نے لکھنا شروع کیا، اس وقت بیک وقت ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں تحریک ورجحان اپنے اپنے وجود کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ لوگ آسانی سے کسی ایک حلقے کے ماتحت اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے میں اپنی عافیت سمجھ رہے تھے۔ لیکن میرے innovative ذہن کو یہ قبول نہیں تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں میں نے مضامین اور سمیناروں میں بیانات کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ ہم ان دونوں سے

مختلف ہیں اس لیے ہمیں ترقی پسندی یا جدیدیت کے ساتھ برانڈ نہیں کیا جائے۔ چونکہ میں اپنے تخلیقی لمحوں میں اعتراف، اجتہاد، انحراف، اور تسلسل کی چومکھی لہروں پر گامزن رہا کرتا تھا، اس لئے اپنے رجحان کے انفراد اور شناخت کے لئے 'انامیت' کی آواز بلند کی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے اپنی طرح کے تمام افسانہ نگاروں کو 'انام نسل' اور ان کی کہانیوں کو 'انام کہانیاں' اور مجموعی تخلیقی رویوں کو 'انامیت پسندی' سے تعبیر کیا۔ میری باتیں متعدد ساتھیوں نے بہت پسند کیں اس لئے ۱۹۷۰ء کے زمانے سے نام نہاد جدید اور ترقی پسند کہانیوں کے ہنگاموں میں 'انام کہانیوں' نے اپنے وجود کو قائم کیا۔

س: آپ جدید فنکاروں میں ایک اہم فنکار ہیں۔ آپ جدید نسل کے جدید افسانوں اور اپنے جدید ترین افسانوں کے درمیان مختصر الفاظ میں امتیازی اوصاف کی نشان دہی کریں؟

ج: جدید نسل کے جدید افسانوں میں کہانی کے صنفی ڈھانچے کو مسمار کر دیا گیا تھا اور کہانی سے کہانی پن غائب ہو گیا تھی۔ جدید ترین افسانوں نے جنہیں میں انام افسانوں سے تعبیر کرتا ہوں، یعنی ۱۹۷۰ء کے بعد کے اہم افسانہ نگاروں نے کہانی کے بنیادی خدوخال کو بحال کیا۔ اس طرح افسانے کا بنیادی طور پر افسانہ ہونا ضروری قرار پایا۔ ہم ۱۹۷۰ء کے بعد کے جینون لوگوں نے کہانی کی مسمار شدہ عمارت کے ملبے کو صاف کر کے اینٹ سے اینٹ جوڑ کر کہانی کی عمارت کو کھڑا کیا۔ جدید افسانوں میں مجرد علامت، علامت وتجریدیت اور انفعالیت پر پورا زور صرف کیا جاتا تھا۔ علامت اور ابہام کے نام پر کہانی کو گنجلک اور معمہ بنایا جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے افسانے کا قاری افسانے سے الگ ہو گیا۔ ہم لوگوں کی انام نسل یا جدید ترین نسل نے افسانے میں علامت وابلاغ کے مصافحے پر زور دیا۔ براہ راست بیانیہ کہانیوں کو بھی ہم نے لائق اعتنا ٹھہرایا۔ ہم لوگوں نے اس بات پر زور دیا کہ کہانی کو معنوی لغویت کی اندھی سرنگ سے نکال کر آزاد تخلیقی فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔ اس لئے آپ پائیں گے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد افسانے میں مثبت عناصر بتدریج بحال ہوتے چلے گئے۔ افسانوں میں تنوع اور نگارنگی پیدا ہو گئی۔ ۱۹۷۰ کے بعد ۱۹۹۰ء اور نئی صدی میں امتداد وقت کے ساتھ انامیت نے نامیاتیت کی صورت اختیار کی اور بعد ازاں امکانیت پسندی کے رجحان کا فروغ ہوا، جو ہنوز جاری ہے اور جسے بعض لوگ مابعد جدید افسانوں کا نام دیتے ہیں۔ میں چونکہ شروع سے innovative رہا ہوں اس لئے ناقدوں کی لادی ہوئی اصطلاحوں سے گریز کرتا رہا ہوں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانوں کو سن ستری افسانوں کی اصطلاح کا نام میں نے ہی دیا ہے۔

س: اردو فکشن کی موجودہ صورت حال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: اردو فکشن کی موجودہ صورت حال اطمینان بخش ہے۔ فنکار کو ہر طرح کی آزادی ہے۔ کہانی پن کی بنیادی صنفی شناخت کی بحالی ہو چکی ہے۔ کسی طرح کی کوئی سکہ بندی اور ادعائیت نہیں رہی۔ آج افسانے کی تخلیقی آزادی کی فضا بحال ہو چکی ہے۔ افسانے کی دنیا میں متنوع اور رنگا رنگ افسانے عالم وجود میں آ چکے ہیں اور ان کا سلسلہ جاری ہے۔ کچھ لوگ ابھی ابھی شعوری طور پر کہانی کو گنجلک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ایسے لوگ افسانے کی سمت و رفتار پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ راست بیانیہ کہانیوں کی بھی اہمیت ہے۔ افسانہ اور افسانے کا قاری اتنا mature ہو چکا ہے کہ وہ غلط اور صحیح افسانوں میں آسانی سے امتیاز کر لیتا ہے۔

س: اردو ادب میں گروپ بندی کا رجحان کب پیدا ہوا۔ ادب پر اس کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں۔ آپ کی نظر میں یہ گروپ بازی؟

ج: اردو ادب میں گروپ بندی کا رجحان تو ابتدائی زمانے سے ہی رہا ہے۔ غالب اور ذوق کے الگ الگ قدر داں تھے جو گروپ بندی کو ہوا دے رہے تھے۔ پھر ترقی پسندی اور جدیدیت پسندی کے زمانے میں بھی گروپ بندی کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن گروپ بندی وقتی طور پر ہی کسی کو اہم بنا سکتی ہے۔ اگر تخلیق میں دم ہے تو بغیر کسی گروپ بندی کے وہ اپنا وجود منوا لیتی ہے۔ مجھے دیکھئے میرا کوئی تعلق گروپ بندی سے نہیں ہے، اس کے باوجود ناقدین و قارئین نے 'بانگ'، 'گنبد کے کبوتر'، 'رانی باغ'، 'گھونسلا'، 'ڈھلان پر رکے ہوئے قدم'، 'میت'، 'مرشد'، 'پھسنڈا'، 'مسٹر گلیڈ ماد ھو'، 'سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'، 'بلی کا بچہ' کا نوٹس لیا۔ حتی کہ وارث علوی جیسے سخت ناقد کو بھی ان افسانوں کی اہمیت اور دوامیت کو تسلیم کرنا پڑا۔ میرے خیال میں گروپ عمومی طور پر ایک منفی رجحان ہے اور اس سے فنکار کا وقت خواہ مخواہ برباد ہوتا ہے۔ صحیح باتوں اور اقدار کی بحالی کے لئے گروپ بندی ہو تو یہ ٹھیک ہے ویسے اپنے آپ میں گم ہو کر چپ چاپ بہتر لکھنے کی طرف کوشاں ہونا منفی گروپ بندی کی سازش کا حقیر پرزہ بننے سے زیادہ بہتر ہے۔

س: ابھی اردو ادب میں دو گروپ کام کر رہے ہیں۔ ایک شمس الرحمٰن فاروقی کا اور دوسرا گوپی چند نارنگ کا۔ آپ ان دونوں کے متعلق یہ بتائیں کہ ان دو گروپ سے اردو ادب کو کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے یا نقصان؟ بے باکی و بے خوفی سے جواب دیں۔

س: شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ دونوں ہی اہمیت کے حامل ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نارنگ اور فاروقی ہی محض اردو ادب نہیں ہیں، اردو ادب بحر بیکراں ہے۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان دونوں میں تو اختلافات غالباً ہیں ہی نہیں۔ ان دونوں سے زیادہ ان کے نام نہاد مداحین اور

حوارین نے گروپ بندی کی فضا قائم کر رکھی ہے۔ دونوں کی دوستی کے زمانے میں بڑے بڑے کام ہوئے۔ اردو افسانے کا پانچ روزہ تاریخ ساز افسانہ ورکشاپ رسمینار ۱۹۸۵ء دونوں کی دوستی کے زمانے میں ہی منعقد ہوا تھا۔ دونوں ایک منچ پر تھے۔ کیا سنہری دور تھا۔ ویسا افسانہ ورک شاپ رسمینار اب شاید کبھی منعقد نہ ہو سکے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ دونوں جب ایک پلیٹ فارم پر تھے تو اردو ادب کو فائدہ پہنچا۔ ان کے آپس میں گتھم گتھا ہونے سے نقصان ہی نقصان ہے۔ لوگ فروعی مسائل میں الجھ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر ناقدین جو جنیوین ہیں مثلاً شکیل الرحمٰن عرف بابا سائیں، وارث علوی، وہاب اشرفی، مہدی جعفر، حامدی کاشمیری، شمیم حنفی، نظام صدیقی، فضیل جعفری، الیاس شوقی، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، ارتضٰی کریم، ابرار رحمانی، مناظر عاشق ہرگانوی، صغیر افراہیم، مشتاق احمد نوری، سکندر احمد، نسیم احمد نسیم، سرور ساجد، اسلم جمشید پوری، شہاب ظفر اعظمی، صفدر امام قادری، ہمایوں اشرف، شہزاد انجم وغیرہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا ہے۔ جو سنجیدگی سے لکھنے پڑھنے اور چھپنے میں مصروف ہیں۔ علمی اور نظریاتی اختلاف تو ہو سکتے ہیں لیکن ذاتیات پر اترنا صحیح نہیں۔

س: 'شب خونی' (ماہنامہ شب خون) افسانوں سے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے۔ کیا ان افسانوں کا ادب میں کوئی مقام ہے؟۔

ج: 'شب خون' میں چھپنے والے تمام افسانے 'شب خونی' نہیں تھے۔ کچھ افسانے سنجیدہ اور کہانی کے صنفی اوصاف سے متصف تھے۔ دیکھئے نا کہا جاتا ہے کہ 'شب خون' سی آئی اے کا ایجنٹ اور ترجمان رہا ہے، لیکن میری اس میں اینٹی امریکی پروٹسٹ کہانی 'موم بتی پر رکھی ہتھیلی' چھپی۔ پھر میری 'وبا'، 'سیاہ چادریں اور انسانی ڈھانچہ'، 'سراغ'، 'لیٹر بکس کی تلاش'، 'کاغذ کا درخت'، 'ستون' جیسی کہانیاں بھی 'شب خون' میں چھپیں، جو سماجی سروکار مرتکز تھیں۔ جب کہ کہا جاتا ہے کہ 'شب خون' کی کہانیاں سماجی سروکاروں سے دور کا علاقہ بھی نہیں رکھتی تھیں۔ 'شب خون' میں چھپنے والے بعض افسانوں کی ادبی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو 'شب خون' میں سب سے زیادہ چھپنے والا افسانہ نگار رہا ہوں۔ اس میں چھپی ہوئی میری کہانیاں 'لا کے نام ایک خط' ڈاکٹر مہیپ سنگھ کی 'اردو کا آدھونک ساہتیہ' جیسی اہم ہندی کی تاریخی کتاب میں شامل کی تھی۔ ہر پرچے میں اچھی بری چیزیں چھپتی رہی ہیں۔ 'شب خون' افسانوں کی منفی اصطلاح کے پیچھے دراصل لوگوں کا پروپگنڈائی ذہن کارفرما ہے۔ جن کی کہانیاں 'شب خون' سے لوٹائی گئیں، انہوں نے 'شب خون' کے بارے میں طرح طرح کی افواہوں سے ادبی بازار گرم کر دیا۔ وہ لوگ دراصل انگور کھٹے ہیں کے مترادف عمل کر رہے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ 'شب خون' میں چھپنا ایک زمانے تک اسی طرح سند کی حیثیت

رکھتا تھا جیسے ایک زمانے میں نیا رفتح پوری کے رسالے ''نگار'' میں چھپنے کی اہمیت تھی۔

س: مابعد جدید فکری رویوں کی تفہیم کیوں کر ہو سکتی ہے؟

ج: مابعد جدید فکر کو سارک رائٹرس کانفرنس ۲۰۰۵ء میں اپنے پیش کردہ مقالے میں دی گئی تھیوری 'امکانیت پسندی' اور 'امکانی حقیقت نگاری' کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لیے کہ ناقد کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ تخلیق کار اور تخلیق کا تجزیہ کرنے کے بجائے اس پر اپنی تھیوری کا اطلاق کرے۔ زمانی اعتبار سے مابعد جدید فکر کی اہمیت ہو سکتی ہے۔ لیکن فکری اعتبار سے یہ امکانیت پسندی کے مختلف shades پر مشتمل ہے۔ حرف حقیقت کی فوٹو گرافی افسانہ نگاری نہیں بلکہ حقیقت کے عوامل و محرکات کے اندر مداخلت کر کے اس کا سینہ چیر کر اندر سے crux کو برآمد کر کے گہری حقیقت نگاری کرنے کا وقت ہے۔ یہی گہری حقیقت نگاری امکانی حقیقت نگاری ہے جس میں مسائل کے حل کی نشاندہی کے تعلق سے کچھ اشارے ملنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ صاف صاف مسائلے کا حل فنکار نہیں پیش کرتا یہ میں بھی جانتا ہوں۔

س: آپ اپنے سے پہلے والی نسل میں کس افسانہ نگار کو اہم سمجھتے ہیں؟

ج: ویسے تو سینئر نسل میں جوگندر پال، اقبال مجید،، قاضی عبدالستار، عابد سہیل، کلام حیدری، شرون کمار، دیویندر اسر، غیاث احمد گدی، احمد یوسف، الیاس احمد گدی، رتن سنگھ، سریندر پرکاش وغیرہ سب کسی نہ کسی وجہ سے اہم ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم سے پہلے والے یعنی ۱۹۷۰ء سے پہلے والے کال کھنڈ میں (۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان) سب سے منفرد افسانہ نگار بلراج مین را ہیں۔ میں ان کی افسانہ نگاری کی ہمہ جہت خوبیوں کی وجہ سے اس خاص عہد میں انہیں ممتاز افسانہ نگار سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ خود بھوکنے اور جھیلنے کے بعد ان کے دیگر بعض ہمعصروں کی بہت ساری کہانیاں فرانس، برطانیہ اور جرمن سے مستعار ہیں۔ بلراج مین را کا جو کچھ ہے وہ ان کا اپنا تجربہ، مشاہدہ اور insight ہے۔ دوسرے یہ کہ داستان کی روایت سے ان کے ہاں مکمل برأت ملتا ہے، جب کہ ان کے ہم عصر بعض دیگر افسانہ نگار داستانوں سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر اور مرعوب دکھائی دیتے ہیں۔ بلراج مین را نے جو کچھ لکھا وہ اپنے مشاہدات اور احساسات کی بنیاد پر اپنے اسلوب میں لکھا۔ ان کے کمپوزیشن سیریز کو میں نے اہمیت دیتے ہوئے اپنے عہد کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات کی بنا پر اپنے افسانوں Traits کو اجاگر کرنے کیلئے میں نے 'سچویشن سیریز' کے افسانے لکھے۔ یعنی ۱۹۷۰ء کے بعد کا عہد ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا 'کمپوزیشن سیریز' سے آگے بڑھ چکا ہے اور جانکاہ تجربوں اور ان کے اظہار سے

عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کو 'کمپوزیشن سیریز' کے حوالے سے دریافت کیا اور میں نے اپنے عہد کو 'سچویشن سیریز' کے حوالے سے پہچان عطا کرنے کی کوشش کی۔ اگر انہوں نے 'کمپوزیشن سیریز' نہ لکھا ہوتا تو شاید 'سچویشن سیریز' کا بھی وجود نہ ہوتا۔

س: اپنی چند تازہ اور تازہ ترین کہانیوں سے متعلق بتائیں؟

ج: ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' یہ اس نئی نسل کی کہانی ہے جو فرقہ پرست اور فسطائی طاقتوں سے پرانی نسل کی طرح ڈرے گی نہیں بلکہ ان سے لوہا لے گی اور انہیں شکست دے گی۔ اس کہانی کے ہیرو عبدالمنان اور دیگر کئی مسلم افراد کو فساد زدہ علاقوں میں دنگائیوں کے ذریعہ مار کر زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر پھول گوبھی اگا دی جاتی ہے۔ راوی جو امن پسند شہری ہے اور عبدالمنان کا دست، وہ برابر خواب میں ایک بچے کو دیکھتا ہے جو RDX اور AK47 استعمال کرنا جانتا ہے اور راوی سے کہتا ہے 'انکل وی مسٹ بی ہیپی ان انڈیا' راوی امن پسند شہری وہ گھبراتا ہے، بچے کی شکل ہو بہو عبدالمنان سے ملتی ہے یعنی اس کا بیٹا ہے اور باپ کی موت کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ کہانی اس حقیقت کو بالواسطہ اجاگر کرتی ہے کہ ہندوستان میں دہشت گردی ہندو فرقہ پرست اور فسطائی طاقتوں کے ردعمل میں پیدا ہوئی ہے۔ 'گنبد کے کبوتر'' کو بہترین فکشن ہونے کی بنا پر 'قومی کتھا ایوارڈ' ۱۹۹۹ء میں پیش کیا گیا۔ 'گنبد کے کبوتر' کے بارے میں جید ناقد مہدی جعفر کی رائے ہے کہ بابری مسجد Demolition پر ہزاروں تخلیقات لکھی گئیں۔ اگر کچھ بھی نہ لکھا جاتا اور صرف یہی ایک کہانی ہوتی تو یہ ایک اکیلی کہانی ہی بابری مسجد Demolition کے Pathos کو محسوس کرنے اور سمجھنے کے لئے کافی تھی۔ اس کہانی کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ اس میں کہیں مندر مسجد کی بات نہیں کی گئی ہے۔ کہانی کی بنیادی تھیم یہ ہے کہ ہر پرانی عمارت میں کبوتر کا بسیرا ہوتا ہے۔ صبح وہ سب دانا دنکا چگنے کے لیے نکلتے ہیں اور شام میں لوٹنے پر گنبد اور عمارت کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر ہراساں اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس افراتفری میں ان پر کیا کچھ گزرتی ہے، کن مصیبتوں اور پریشانیوں سے دوچار کرتی ہے، انہیں کے دردانگیز بیان سے کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ سین دادا، ریزہ، تھامس جیسے کردار ابھی سے اردو افسانے کے نہ بھلائے جانے والے کرداروں کی عظمت حاصل کر چکے ہیں۔

''میت' satire political socio ہے جو degeneration political socio کی مضحکہ خیز صورت حال کا احاطہ کرتی ہے۔ آج کا ریاکار خودغرض انسان خاص طور سے سیاست داں اتنا گر چکا ہے کہ اپنی ترقی کے لئے بیوی تک کو زینہ بناتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ ایسی کرب آمیز زندگی سے اوب کر جان دے دیتی ہے تو اس کی لاش کو اسے بھی سیاسی ترقی و کامرانی اور شہرت کا وسیلہ بناتا ہے۔ لاش

تربت کے لئے ترس رہی ہے اور اس کا خودغرض سیاست داں شوہر لاش کو نمائش میں رکھے ہوئے ہے۔ اور اس سیاسی VIP کا انتظار کر رہا ہے، جو اسے دیکھ کر ہمدردی میں اسے مزید ترقیوں سے ہمکنار کرے گا۔

''رانی باغ'' امریکہ میں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہنے والے رحمت (جن کی بیوی بہت پہلے مر چکی ہے) جب موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ضد کر کے اپنے وطن ہندوستان لوٹ آتے ہیں۔ زندگی کے دن متعین ہیں اور وہ اپنی مٹی میں مرنا چاہتے ہیں۔ فلش بیک میں ان کے بچپن کا ایک واقعہ انہیں یاد آتا ہے اور وہ ہندو لڑکی رانی بھی انہیں یاد آتی ہے جو ان کا پہلا پیار تھا۔ گاؤں میں بھٹکتے ہوئے ایک دن رانی سے ملاقات ہو جاتی ہے، جس کا شوہر شک کی بنیاد پر اسے چھوڑ چکا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اداس اور دکھ بھری زندگی گزار رہی ہے۔ اس ملاقات سے دونوں بیحد خوش ہوتے ہیں اور دونوں کی مایوس زندگی کو ایک مفہوم مل جاتا ہے۔ دونوں اس باغ میں گھوما کرتے ہیں جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ وہ باغ رحمت صاحب کے اجداد کی جائیداد کا حصہ ہے جہاں اب نکسلی نئے انقلاب کی تیاری میں لگے ہیں۔ ایک طرح سے وہ باغ ان کا ہیڈکوارٹر ہے۔ انقلابی ان دونوں ادھیڑ عمر جوڑے کا بے احترام کرتے ہیں اور انہیں سیلوٹ کرتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر خوشی ملنے کے بعد رحمت صاحب کا موذی مرض اچھا ہو جاتا ہے اور ان کی اداس اور خزاں رسیدہ زندگی میں بہار لوٹ آتی ہے۔ بیٹوں کے لاکھ بلانے پر بھی رحمت امریکہ نہیں لوٹے۔ اپنے باغ کو ان انقلابیوں کے نام کر دیتے ہیں جس کا نام انہوں نے بچپن میں 'رانی باغ' دکھا تھا۔ جہاں زندگی میں پہلی بار وہ لذتوں سے سرشار ہوئے تھے۔ رانی بھی پرانے رشتے کی بازیافت سے پھولے نہیں سما رہی ہے۔ رانی کے ماں باپ بھی خوش ہیں کہ کسی طور پر ان کی گم صم بیٹی نے مسکرانا تو شروع کیا۔

''تفتیش'' فرقہ واریت اور فسطائیت کی جڑ میں جا کر اس کے اصل اسباب کو افسانوں انداز میں Explore کرنے کی تخلیقی دانشمندی کا مظہر ہے۔ انتہائی دلچسپ انداز میں دھیرے دھیرے کہانی کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور ہمارا ذہن روشن ہو جاتا ہے۔

''بھائی'' ایک شریف مسلمان اور ہندو دنگے کے ماحول میں پھنس جاتے ہیں اور اپنے اپنے بچنے کی صورت اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن دونوں کی مجبوری ہے کہ دونوں کو ساتھ ہی رہنا ہے اور ایک ٹمپو میں بیٹھ کر محفوظ علاقے تک پہنچنا ہے۔ دونوں تذبذب میں ہیں اور ایک دوسرے پر شک کر رہے ہیں۔ راستے میں انہیں دنگائی گھیر لیتے ہیں۔ ہندو کردار اپنی بولڈنیس کا مظاہرہ کرتا ہے اور ریوالور سے ہوائی فائرنگ کر کے مسلمان ہمسفر کو بچا لیتا ہے۔ اب تک دونوں ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ دنگائی جب بھاگ کھڑے ہوئے تو مسلمان متشکر اور ممنون آنکھوں سے ہندو ہمسفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا

ہے کہ آپ نے میری جان بچا کر بڑے بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔ ہندو کردار کہتا ہے کہ بڑے بھائی کا نہیں بلکہ بھائی کا کردار ادا کیا ہے، جو اس کا انسانی فرض تھا۔ کہانی بین السطور یہ پیغام دیتی ہے کہ ہندو مسلمان کے درمیان تعلق کی بنیاد بڑا اور چھوٹا بھائی کا نہیں بلکہ برابری کی سطح پر یگانگت، اتحاد اور انسانی دوستی کا اظہار ہونا چاہئے، جو ٹکاؤ ہوگا۔ برابری سے برادری ہوتی ہے۔

''بیکنٹھ اسحاق نگر'' میں بیکنٹھ جی ایک مندر کے پجاری تھے۔ اور اسحاق صاحب اسی قصبے کی مسجد کے امام۔ دونوں کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ لہٰذا ایک دوسرے کو سگے بھائیوں کی طرح چاہتے تھے۔ دونوں رات بھر لالٹین لیے مسجد کی سیڑھی پر گپ کرتے اور پھر پجاری کے مندر جانے پر اسحاق صاحب انہیں لالٹین لے کر مندر تک چھوڑنے آتے، اور پھر یہاں بھی بیٹھ کر دونوں دوست گپ کرنے لگتے۔ دونوں میں اتنی دوستی تھی کہ رات بھر ایک دوسرے کو سی آف کرنے کے لیے مندر اور مسجد کے درمیان چکر کاٹتے رہ جاتے۔ فجر کی اذان سے پہلے وہ مجبوری کی حالت میں الگ ہوتے۔ ایک کی موت ہونے پر دوسرا اتنے صدمے سے دوچار ہوا کہ وہ بھی جاں بحق ہو گیا۔ قصبے والوں نے دونوں کی مثالی دوستی دیکھتے ہوئے اس قصبے میں ایک بیکنٹھ اسحاق چبوترا بنوایا، اور پھر لکھا پڑھی کر کے اور تحریک اور آندولن چلا کر وہاں کے اسٹیشن کا نام 'بیکنٹھ نگر' رکھوا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس علاقے میں آج تک کبھی دنگا نہیں ہوا۔ اور جب کبھی وہاں کوئی پریشانی ہوتی، کوئی اندیشہ سر ابھارتا تو وہاں کے لوگ ''بیکنٹھ اسحاق چبوترہ'' پر اکٹھا ہوتے اور وہاں گویا بیکنٹھ اور اسحاق کی روح ان کی ایسی رہنمائی کر دیتی کہ دلوں کے کدورت دور ہو جاتے۔ سب کے مسائل اور پریشانیاں دور ہو جاتیں۔ سب کے دل پاک وصاف روانی سے منور ہو جاتے۔ زعفرانی اور سبز روشنی کی آمیزش سے عجب دل آویز اجالا پھیل جاتا۔

◀◀ ● ▶▶

Muslim Abad
Near Gowardhan Maidan
Haspura Aurangabad
Bihar 824120
Mob: 9546308801

● **مکالمہ**

● **ڈاکٹر محمد غالب نشتر**

شوکت حیات سے مکالمہ

ستّر کی دہائی میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی اور افسانے میں بیش بہا اضافے کیے اُن میں شوکت حیات کا نام نمایاں ہے۔آپ نے کئی لازوال افسانے تخلیق کیے جن میں بکسوں سے دبا آدمی،گھونسلا،گنبد کے کبوتر،سرخ اپارٹمنٹ،رانی باغ،پاؤں،ڈھلان پر رُکے ہوئے قدم،چیخیں وغیرہ کے نام خصوصی طور پر لیے جاسکتے ہیں۔افسانوں کے علاوہ آپ نے ہم عصر افسانہ نگاروں کے حوالے سے کئی اچھے مضامین بھی تحریر کیے۔مثلاً سَن ستری اور نامیاتی افسانے:انحراف وتسلسل ، نامیاتیت اور نامیاتی افسانے ، امکانیت پسندی وغیرہ اسی ضمن کے مضامین ہیں۔ان مضامین میں انہوں نے ہم عصر افسانہ نگاروں کے حوالے سے اس بات پر اصرار کیا کہ ''میں اور میرے ہم عصر افسانہ نگار نامیت پسند ہیں اور وہی افسانہ عصری وآفاقی ہے جو عصریت وآفاقیت کے امتزاج،انجذاب اور وفاق سے سرشار ہو کر افسانے کی توانائی میں افسانے کا سبب بنتے ہیں''۔

۲۰۱۰ء کے اوائل میں آپ کا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' کے نام سے ایجوکیشنل بک ہاؤس ،نئی دہلی نے شائع کیا۔یہ انٹرویو بھی مارچ ۲۰۱۰ء میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔

محمد غالب نشتر: آپ نے کس طرح کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اس ماحول کا کتنا اثر قبول کیا؟

شوکت حیات: میری پیدائش یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو صدر گلی، پٹنہ سٹی میں ہوئی۔میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں،اُس گھر کا ماحول مذہبی تھا۔میرے دادا مناظر احسن گیلانی پڑھے لکھے اور قابل آدمی تھے۔اُن کی علمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کے Constitution بناتے ہوئے اُن کو بھی مدعو کیا تھا۔دادا کے علاوہ والد صاحب کو بھی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔اُن کی ایک ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں کتابوں کی بھرمار تھی۔والد صاحب اپنے ساتھ بچوں کے ذوق کا بھی خیال رکھتے اور اُن کے لیے کہانیوں کی کتابیں اور ماہ نامے پابندی سے منگواتے۔نیرنگِ

خیال، عالم گیر، کھلونا، شمع، بیس ویں صدی، ماہِ نو اور آج کل وغیرہ وہ رسائل ہیں جو والد صاحب کی لائبریری کی زینت تھیں۔والد صاحب کی اُس منی لائبریری سے مجھے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا۔ پڑھائی کی جانب اور بہ طورِ خاص اردو ادب سے رغبت پیدا ہوئی اور لکھنے کی طرف میرا رجحان یوں ہوا کہ پٹنہ سے دلی کے سفر کے دوران والد صاحب نے ایک ڈائری دی اور پورے سفر کی روداد لکھنے کو کہا جسے لکھنے کے بعد میرے اندر کہانیاں لکھنے کا شوق جاگا،سو میں نے افسانہ نگاری کی ابتدا کر دی۔ایک خاص بات اور یہ ہے کہ جب والد صاحب کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہوا تو ایک پریشانی یہ آن پڑی کہ لائبریری کو کس طرح منتقل کیا جائے۔آخر یہ طے ہوا کہ والدہ کے نام ایک لائبریری قایم کی جائے لہٰذا والد صاحب نے ''قمر النسا لائبریری'' کے نام سے ایک کتب خانہ قایم کیا اور تمام کتابیں وہیں منتقل کر دیں تا کہ اردو ادب کا فروغ ہو سکے اور نوجوان، بچے اور عورتیں اُن کتابوں سے مستفید ہو سکیں۔

محمد غالب نشتر: وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر آپ افسانہ نویسی کا طرف راغب ہوئے؟

شوکت حیات: میرے والد ''سید محفوظ الحق'' کا انتقال میرے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔جس کی وجہ سے مجھے ایک خلا کا احساس ہوتا تھا اور ایک عجیب سی اداسی میرے اردگرد چھائی رہتی تھی۔دِن میں تو اِس طرح کی بے چینی کم ہوتی لیکن جوں ہی آفتاب غروب ہونے کو ہوتا مَیں ڈپریشن کا شکار ہونے لگتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ میری زندگی کا تانا بانا بس یوں ہی چلتا رہے گا۔ان تمام وجوہات کی بنا پر میں نے آپ بیتی لکھنا شروع کیا جس سے افسانہ نگاری کی جانب راغب ہو۔میں نے ابتدا میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں لیکن کچھ بزرگ افسانہ نگاروں نے یہ مشورہ دیا کہ ''تمہارے اندر وہ خوبی موجود ہے جو ایک افسانہ نگار میں ہوتی ہے''۔اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''تمہاری کہانیاں بچوں کے معیار سے بالاتر ہیں''۔اُن بزرگ ادیبوں میں ظفر اوگانوی، سلطان اختر، ظہیر صدیقی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

محمد غالب نشتر: آپ نے افسانہ نویسی کی ابتدا کب سے کی اور پہلا افسانہ کب شائع ہوا؟

شوکت حیات: میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ڈائری لکھنے سے میرے اندر حرکت پیدا ہوئی اور مجھے طمانیت کا احساس ہونے لگا۔پھر میں نے سوچا کہ اگر انہی اوراق میں کچھ ترمیم کی گئی تو اس کی شکل افسانے کی سی ہو جائے گی،سو میں نے محنت ولگن سے افسانے لکھنے لگا۔میرا پہلا افسانہ 'بکسوں سے دبا آدمی'، 'کتاب' (لکھنؤ) سے ۱۹۷۰ء میں شایع ہوا تو اگلے تین شمارے تک اس کی تعریف ہوتی رہی۔کسی معیاری رسالے میں پہلی کہانی کا شائع ہونا میرے لیے مسرت کی بات تھی اور اسی تحریک نے مجھے آگے لکھنے پر آمادہ بھی کیا۔میرے عہد کے جن مقتدر ناقدین نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا،ان میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی

چندنارنگ، وہاب اشرفی، فضیل جعفری، مہدی جعفراور نظام صدیقی وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں۔

محمد غالب نشتر: عالمی ادب اور اردو ادب کے کن فن کاروں نے آپ کو متاثّر کیا؟

شوکت حیات: عالمی ادب میں کافکا، کامیو، چیخوف، موپاساں، ٹالسٹائی، دوستوفسکی اور خلیل جبران وغیرہ ایسے فن کار ہیں جن کی کہانیاں مَیں نے پڑھیں تو کچھ کے تراجم سے استفادہ کیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ عالمی ادب کے رجحانات سے واقفیت ہوئی۔ اس کے علاوہ تکنیک سے بھی آگہی ہوئی۔ اردو ادب میں منٹو اور بلراج مین را سے متاثّر ہوا۔ بلراج مین را نے تو ہماری حوصلہ افزائی بھی کی۔ اِن دونوں سے متاثّر ہونے کے باوجود مَیں نے اپنے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی۔ کیوں کہ انسان کی اپنی شناخت خود سے ہوتی ہے۔ اِن فن کاروں سے لکھنے کی ترغیب تو ملی البتہ مرعوب کبھی نہیں ہوا۔

محمد غالب نشتر: وہ کون سی پہلی کہانی تھی جو ناقدین اور قارئین کے توجہ کا مرکز بنی؟

شوکت حیات: ۱۹۷۵ء میں ایک کہانی ''بانگ'' کے عنوان سے لکھی تھی جو ایمرجنسی اور فاشزم کے خلاف احتجاجی کہانی تھی۔ چوں کہ میری کہانیاں ''شب خون'' میں چھپتی تھیں لیکن جب میں نے یہ کہانی فاروقی صاحب کو بھیجی تو انہوں نے مصلحت کی بنا پر کہانی معذرت کے ساتھ واپس کر دی۔ اس کے بعد یہ کہانی ''تناظر'' دہلی میں شائع ہوئی۔ کہانی شائع ہونے کے بعد مخالفت کی بھی شروعات ہوئی۔ اسی مخالفت نے شہرت کی بھی کھڑکی بھی وا کر دی۔ اس کہانی کو کافی پسند کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں کہانی پن بھرپور موجود تھی جو کہ ستّر کی دہائی میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس کہانی کے متعلق مہدی جعفر نے اس بات کا اظہار کیا کہ ''بانگ'' کہانی پن کی واپسی کا پیش خیمہ ہے۔

محمد غالب نشتر: آپ نے جس عہد میں لکھنے کی ابتدا کی وہ تجریدی افسانے کا دور تھا۔ اس کے قبل ترقی پسندی کا چرچا تھا۔ آپ نے دونوں تحریکوں سے انحراف کیا۔ اس کی کوئی وجہ؟

شوکت حیات: میرے عہد میں ''شب خون'' اور ''آہنگ'' دو ایسے رسالے تھے جنہوں نے جدیدیت کے فروغ کے لیے اور خاص طور سے تجریدی افسانوں کے لیے اپنے آپ کو مختص کر لیا تھا۔ میرے افسانے اِن دونوں رسالوں میں چھپتے تھے۔ شب خون میں میرے تجریدی افسانے چھپے جن میں سیاہ چادریں اور انسانی ڈھانچہ، وبا، لیٹر بکس کی تلاش، لا کے نام ایک خط، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس ضمن میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر مہیپ سنگھ نے جب ہندی میں ''اردو کا آدھونک ساہتیہ'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تو اس میں ''لا کے نام خط'' کا ہندی میں ترجمہ کر کے شامل کیا۔

میں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی ملی جلی تھیوری کو اختیار کیا۔ کسی ایک تھیوری کے افسانے

نہیں لکھے۔ ایک فن کار کو ان تمام چیزوں سے ماورا ہو کر لکھنا چاہیے۔ سو میں نے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر نئے انداز کی کہانیاں لکھیں تو تھیوری کی سطح پر اس بات کا اعلان کیا کہ مَیں اور میری نسل جینیس افسانہ نگار نہ تو ترقی پسند ہیں اور نہ جدید۔ وہ مابعد اور ہیئت وفکر کی سطح پر اِن دونوں سے الگ ہیں۔ لہذا اُن کی الگ شناخت ہونی چاہیے۔ اس شناخت کو میں نے ''انام نسل'' اور ''انامیت'' کا نام دیا۔ ناقدوں اور دیگر حضرات سے مضمون لکھ کر گزارش کی کہ ہمیں ترقی پسند یا جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے برانڈ نہ کریں بل کہ ہمیں نئی نسل کا فرد سمجھتے ہوئے نئی شناخت کو تسلیم کریں۔

محمد غالب نشتر: بہار میں افسانہ نگاری کی موجودہ صورت حال پر آپ کس حد تک متفق ہیں؟

شوکت حیات: بہار میں افسانہ نگاری نے ابتدا ہی سے اردو ادب میں اپنی جڑیں جما رکھیں ہیں۔ کرشن چندر اور منٹو کے زمانے میں سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، شکیلہ اختر جیسے جیّد افسانہ نگار تھے جو اُن کے ہم پلّہ تھے۔ جوگندر پال اور اقبال مجید کے زمانے میں غیاث احمد گدی، ظفر اوگانوی، احمد یوسف اور کلام حیدری جیسے افسانہ نگار تھے۔ میرے زمانے میں یعنی ۱۹۷۰ء کے بعد شفق، حسین الحق وغیرہ نے جس قومی سطح پر اپنی پہچان کرائی کہ نورالحسن نقوی کو اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' میں ہم لوگوں کا تذکرہ شامل کرنا پڑا۔ ابھی تو بہار کو نہ صرف یہ کہ فکشن کا سب سے بڑا گڑھ مانتا ہوں بل کہ فکشن کی راج دھانی سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہمارے عہد کے بعد غضنفر، پیغام آفاقی، عبدالصمد، احمد صغیر، قاسم خورشید، صغیر رحمانی وغیرہ جس تیز رفتاری سے لکھ رہے ہیں اُس سے میرے اِس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ بہار اردو فکشن کی راج دھانی ہے۔

◄◄ ● ►►

Lane No. 3
Sallar Colony
Bariatu,
Ranchi 834009 (Jharkhand)

نئی کتابیں

نام کتاب : اللہ میاں کا کارخانہ (ناول)	نام کتاب: بنگال میں اردو افسانہ ایک جائزہ
مصنف : محسن خان	مصنفہ: ڈاکٹر فاطمہ خاتون
سال اشاعت: ۲۰۲۲ء	سال اشاعت: ۲۰۲۱ء
قیمت : ۴۵۰/روپے	قیمت : ۳۰۰/روپے

● ادارہ

شوکت حیات کے خطوط

قرۃ العین حیدر کے نام

عینی آپا!

آج کل میں ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی نئی قسطیں پڑھ رہا ہوں اور لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ دہلی سے لوٹنے کے بعد آپ کو خط لکھا تھا۔ یقین ہے ملا ہوگا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات میں آپ جس طور پر شفقت سے پیش آئی تھیں، اس کے لیے شکریہ ادا کیا تھا۔ آپ نے تحفے میں جو کتابیں دی تھیں انہیں پڑھ کر ذہنی سیرابی ہوئی۔ خاص طور پر ممتاز شیریں کے تعلق سے۔ ممتاز شیریں کا میں پہلے سے مداح ہوں اور انہیں افسانوں کی اب تک سب سے بڑی ناقد مانتا ہوں۔ کاش وہ ہم لوگوں کے عہد تک زندہ رہتیں۔ ابھی آج کل کے جولائی ۱۹۹۷ء کے شمارے میں میرا ایک افسانہ ''پھسینڈا'' اور ایوان اردو کے جون ۱۹۹۷ء کے شمارے میں ''بلی کا بچہ'' شائع ہوئے ہیں۔ اگر آپ پڑھ کر ان پر رائے دیتیں تو میرے لیے وہ قیمتی انعام کی حیثیت رکھتے۔ میں کتھا ایوارڈ سے زیادہ انہیں اہمیت دیتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ آپ کو میرے جیسے نئے لوگوں کے سلسلے میں حوصلہ افزا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ دہلی آیا تو پھر ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔ بیگم آپ کو سلام لکھواتی ہیں۔

آپ کا شوکت حیات

کتاب: دامانِ باغباں (مجموعہ خطوط)
مرتبہ: قرۃ العین حیدر
سنہ اشاعت: ۲۰۰۷ء صفحہ ۴۸۶

☆☆☆

۹/۷/۱۹۹۷

بھائی ابرار رحمانی!

بے حد افسوس ہے کہ اس بار کتھا ایوارڈ فکشن اور دہلی اردو اکیڈمی کے سیمینار ''ادب کا بدلتا ہوا منظر نامہ'' کے تعلق سے دہلی کے قیام کے دوران وعدے کے باجود آپ کی قیام گاہ پر آ کر آپ سے ملاقات نہ کر سکا۔ بہر حال آئندہ جب کبھی دہلی آیا تو ضرور ملوں گا۔ بلکہ خاص طور پر ملوں گا۔ امید ہے خیال نہیں کریں گے۔ یہاں کے جو ناگفتہ حالات ہیں، بہت ممکن ہے میں دہلی شفٹ کر جاؤں پھر تو ملاقاتوں کا سلسلہ اکثر و بیشتر رہے گا۔

تاخیر سے سہی، ''پھسینڈا'' کی اشاعت کا شکریہ۔ یہ دیکھ حیرت اور خوشی ہوئی کہ آپ لوگوں نے حالیہ فوٹو چھاپا ہے۔ فوٹو کہاں سے حاصل کیا۔ جہاں تک صحیح یاد آتا ہے میں نے یہ فوٹو ارسال نہیں کیا تھا۔ جلد ہی کچھ اور بھیجوں گا۔ ادھر ایوان اردو کے جون ۹۷ء کے شمارے میں ایک افسانہ ''بلی کا بچہ'' شائع ہوا تھا، شاید پڑھنے کا موقع ملا ہو۔ آپ کا مقالہ ''پادشاہ نامہ'' اچھا لگا تھا۔ اختصار میں بڑی خوبصورتی سے آپ نے بہت کچھ سمیٹ لیا ہے۔ تازہ شمارے میں ترقی پسند تحریک اور اردو غزل سے متعلق دونوں کتابوں پر تبصرہ پسند آیا۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا اپنا شوکت حیات

☆☆☆

ڈاکٹر ابرار رحمانی کے نام

۱۲/۱۰/۲۰۰۱

میرے بھائی!

''گنبد کے کبوتر'' کے لیے کتھا ایوارڈ کے موقع پر (۱۹۹۷ء) آپ سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کے خلوص نے گہرا تاثر قائم کیا تھا۔ ادھر دو ڈھائی سال سے میرے حالات خراب چل رہے ہیں۔ جگر اور آنت کی سوجن اور پیٹ کی اینٹھن کے مرض میں مبتلا ہوں۔ سیمی گورمنٹ دفتر میں پے منٹ بھی تقریباً بند ہے۔ دعائیں کریں کہ میرے حالات بہتر ہوں۔ تکلیف کم ہوتی ہے کہ کسی حد تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔ PF سے پیسہ نکالنے کے علاوہ ریڈیو، دوردرشن اور معاوضہ دینے والے رسالوں کے لیے لکھنے کا کام کرنے میں مصروف رہتا ہوں۔ ادھر ایوان اردو میں آپ کا مضمون ''۱۹۴۰ء کے بعد اردو کہانی'' پڑھا۔ آپ کی ایک دو باتوں سے اختلاف کے باوجود مضمون بے حد پسند آیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دو صفحے کے مختصر مضمون میں آپ نے افسانے کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے۔ آپ کی وہ بات اچھی ہے کہ اس نئی نسل کو گذشتہ صدی نے جاتے جاتے ایک موضوع فراہم کر دیا جس نے کہانی کو ایک نیا غازہ فراہم کیا تو دوسری طرف کہانی کاروں کی افزائش کے لیے کھاد ثابت ہوا۔ یہ موضوع تھا ''بابری مسجد کی شہادت اور اس بعد رونما ہونے والے فسادات۔'' یہ حقیقت ہے کہ چھوٹے بڑے واقعے کے باوجود اس سے پہلے ۷۰ء کے بعد والے نئے کہانی کار عمومی طور پر Non-event کی کیفیت سے گذر رہے تھے۔ میرے ہندی کے مارکسٹ دوستوں کا خیال ہے کہ تقسیم ہند کے بعد اردو افسانہ نگاروں کو پھر ایک بار بڑا موضوع ہاتھ لگا ہے اور برسوں لوگ اس کے اثر سے نکل نہیں پائیں گے۔ یہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید ''گنبد کے کبوتر'' اس صورت میں تخلیق نہ ہو پاتا۔ ویسے میں نے تخلیقی سطح پر یہ کوشش کی ہے کہ ممتاز شیریں کے اصولوں کے تحت یہ کہانی اسی واقعے تک نہ

محدود رہ جائے بلکہ گہرائی میں پہنچ کر انسان کے بنیادی المیے کی کہانی بن جائے۔ اس طرح گویا میں نے انہدام کے ان لمحوں کا رشتہ ازلی وقت سے جوڑنے کی تخلیقی کوشش کی۔ ایمرجنسی کے زمانے میں بھی ایسا ہوا تھا۔ میری مشہور طویل کہانی ''بانگ'' جو ۷۰ء کے بعد کی پہلی مرصع، مربوط، بیانیہ اور کہانی پن کی بازیافت کرتی ہوئی کہانی ہے اور جسے میرے بعض سنجیدہ دوست نئے افسانے (۱۹۷۰ء کے بعد) کا Turning Point قرار دیتے ہیں۔ وہ کہانی بیک وقت ایمرجنسی، نکسلزم اور فاشزم کے مشترکہ موضوعات کا تخلیقی سطح پر احاطہ کرتی ہے اور انسان کی بنیادی جبلت سے بحث کرتی ہے.....اس کے پہلے عام طور پر افسانے بیانیہ اور کہانی پن کے بحران سے گذر رہے تھے۔ میرا خیال ہے آپ نے یہ کہانی پڑھی ہوگی۔ آپ نے دیکھا کہ ہم لوگوں کی نسل کے پاس ایسا کوئی ناقد نہیں۔ میں سنجیدگی سے یہ سوچتا ہوں کہ آپ لگ بھگ ہم لوگوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم لوگوں کی افسانوی حیات اور عصری عہد سے آپ کا براہ راست سروکار ہے۔ آپ کے اس مضمون سے جو صلاحیت اجاگر ہوتی ہے اس سے تو مجھے لگتا کہ دیر سے ہی سہی، ہم لوگوں کی نسل کو ایک ناقد مل گیا ہے۔ آپ افسانوں پر جم کر لکھیں۔ آپ کے اندر اس کی بدرجۂ اتم صلاحیت ہے۔ آپ کی صورت میں مجھے اپنی نسل کا ایک اہم نقاد دکھائی دے رہا ہے۔ میرے جانب سے اس مضمون کے لیے مبارک باد قبول کریں۔ ممنون ہوں کہ آپ نے اس مضمون میں میرے ساتھ ناانصافی نہیں کی اور میرا اور میرے افسانوں کا تذکرہ کیا۔ حالیہ عرصے میں میری چار کہانیاں شائع ہوئیں: ''مسٹر گلیڈ'' (آج کل اپریل ۲۰۰۰ء)، ''تفتیش'' (ذہن جدید شمارہ ۳۰)، 'کوبڑ' (شاعر نومبر ۲۰۰۰ء) اور ''تھوڑی سی آگ'' (ایوان اردو مارچ ۲۰۰۱ء) امید ہے آپ نے پڑھے ہوں گے۔ ایوان اردو نے جون ۲۰۰۱ء کے شمارے میں اندرونی سرورق پر ''نوائے امروز'' کے تحت میرا بائیوڈاٹا شائع کیا تھا۔ اگر مذکورہ کہانیاں پڑھنے کا موقع ملا تو آپ کی رائے جان کر خوشی ہوگی جواب کا انتظار رہے گا۔ بڑے بھائی محبوب الرحمٰن فاروقی اور دیگر کرم فرماؤں کو میرا اسلام کہیں۔

آپ کا شوکت حیات

☆☆☆

۲۰۰۴/۱۱/۱۲

پیارے عین تابش

تمہاری کتاب 'اشک عصا نے نہر نکالی' موصول ہوئی۔ تم نے اپنے اس بڑے بھائی کو اس تعلق سے یاد رکھا۔ مزید شکریہ.....تم نے کتاب کا نام بہت ہی معنی خیز اور چونکانے والا رکھا ہے۔ اس کی ہمہ جہتی اور گہرائی نے مجھے بہت دیر تک غور و فکر پر مجبور کر دیا۔ تمہارا دیباچہ ''تخلیقی عمل'' بہت پسند آیا۔ زندگی کی بے ثباتی کے سناٹے میں اس طرح مقید ہوا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تم تو مجھے اپنے بچپن کے زمانے

سے جانتے ہو جب کہ میں نوجوان تھا۔ یہ بھی جانتے ہو کہ میرا بچپن سہسرام میں گذرا۔ میرے والد وہیں تھانے میں پوسٹیڈ تھے۔ اس کے بعد یتیمی کا جو پہاڑ میرے اوپر گرا تو اب تک س کے نیچے دبا ہوا کراہ رہا ہوں.....گاڑی کے نیچے دب کر ICU میں چار دن زندگی اور موت کے درمیان جھولنا تو بچپن کے اس سانحے کے مقابلے میں بہت چھوٹا واقعہ ہے۔

تمہارا تخلیقی عمل ہمارا ہی نہیں، میرا ہی نہیں دنیا کے ہر شریف، سنجیدہ اور نیک انسانوں کا مقدر ہے۔

خوشی ہوتی ہے کہ میرے بعد کی نسل میں تم نے اپنی نامیاتی شاعری سے اپنا ایک مخصوص اور منفرد مقام بنایا ہے۔ میری جانب سے اس خوبصورت کتاب کی اشاعت پر مبارک باد قبول کرو۔ کبھی پٹنہ آؤ تو ملنے کی کوشش کرو۔ میں گذشتہ کئی مہینوں سے بیمار رہا۔ سڑک کے حادثے نے پچھلے سال تین چار مہینے ذی فراش رکھا۔ اس کے بعد پیٹ کی مروڑ اور اینٹھن میں مبتلا ہوا۔ خدا سے اپنے اس بدنصیب بڑے بھائی کی صحت یابی کے لیے دعا کرو۔

حسین الحق کو میرا اسلام کہو۔ انہیں سمجھاؤ کہ ادھیڑ عمر میں مطلب پرست دوست تو بہت ملتے ہیں لیکن نوجوانی کے زمانے کے دوست کی ناسٹلجائی اہمیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے ساتھ لڑنا اور پیار کرنا دونوں ہی اچھا لگتا ہے۔ ویسے یار اب اس ادھیڑ عمر میں کیا لڑائی اور جھگڑا! سچ مچ میں حسین کو مانتا ہوں۔ لیکن ادھیڑ عمر کے میرے کچھ دوست ہم لوگوں کے درمیان دوری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں میری اہمیت کا احساس دلاؤ۔ بیگم اور بچوں کو دعائیں کہو۔ اب گیا آیا تو تمہارے یہاں ضرور آؤں گا۔

تمہارا بھائی شوکت حیات

☆☆☆

ڈاکٹر سید احمد قادری کے نام

۱۹۸۸/۱۰/۲۴

مرے بھائی!

ایک زمانے کے بعد بودھ دھرتی کا ایک شمارہ موصول ہوا۔ ''معین شاہد'' کے تعلق سے شکریہ!

آپ نے ''حمید سہروردی نمبر'' اب تک نہیں بھیجا۔ براہ کرم وہ شمارہ بھی جلد بھیجیں۔ مجھے حمید سہروردی کو اپنی رائے بھیجنی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بودھ دھرتی کا ہر شمارہ بھیجنے کی زحمت کریں۔ اس دن (اردو اکادمی کی بلڈنگ میں) آپ کو دیکھ کر دل چاہا کہ تفصیلی بات چیت ہو۔ لیکن آپ وہاں بیٹھنے کے موڈ میں تھے اور میں جلدی میں تھا۔ جی چاہا کہ آپ کو اپنے ساتھ وہاں سے اٹھا لوں۔

غیاث بھائی کی کتاب کب تک آئے گی؟ امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ وہ شمارہ بھی بھجوائیں

جس میں شہر یار کا خط چھپا ہے۔ چچا کو میرا سلام کہہ دیں۔

آپ کا شوکت حیات

☆☆☆

ڈاکٹر سید احمد قادری کے نام

پیارے بھائی!

حسب ارشاد دونوں کی نقل بھیج رہا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو اور باتوں کے علاوہ اداریے میں میرے افسانوں کے فکری، سیاسی اور سماجی شعور نیز نئی حقیقت پسندی کی بابت اشارہ ضرور کیجئے گا۔

مجھے لگتا ہے کہ اس سلسلے میں میں نے جدیدیت کے ہنگامی اور بحرانی دور میں بھی زندگی کی شدتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں ہیئتی اور فنّی تجربہ کرنے کے باوجود سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک طرح کی نئی حقیقت پسندی پر زور دیا اور اب تو اس ضمن میں خاصی صفائی آ گئی ہے اور ایک مثبت نتیجے تک پہنچ چکا ہوں۔

''بانگ''، ''پاؤں''، ''تین مینڈک''، ''صدیوں کے لمحے''، ''ڈھلان پر رکے ہوئے قدم'' اور سچویشن سریز وغرہ جیسی شروع کی کہانیوں اور ادھر ''خواب''، ''وبا''، ''گھونسلہ''، ''اتلاف''، ''ریگزار''، ''ستون'' وغیرہ جیسی کہانیوں میں یہ باتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے ادبیت اور سماجی احساس وشعور دونوں کو اپنے افسانوی اظہار کے لیے لازم جانا ہے۔ نئی سماجی حقیقتوں پر اصرار کرتا ہوں اور اس طرح نئی حقیقت پسندی کا ثبوت دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

کل آپ سے دلچسپ ملاقات رہی۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد اسے میری خاطر چھوڑ دینے کی ادا بہت اچھی معصوم اور پیاری لگی۔ شکریہ۔ خدا کرے یہ خلوص قائم رہے۔ امید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔

آپ کا شوکت حیات

نوٹ: مہدی جعفر والے مضمون میں جن حصوں کو میں نے کاٹ دیا ہے ان کی کتابت نہیں کرائیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید احمد قادری کے نام

پیارے بھائی!

حسب وعدہ زیر اشاعت کتاب کے لیے بائیوڈاٹا اور تصویر بھیج رہا ہوں۔ وصولیابی سے مطلع کریں گے۔ میں آپ کی قدر کرتا ہوں اور جہاں موقع ملتا ہے آپ کا بحیثیت اہم افسانہ نگار تذکرہ کرنا نہیں بھولتا۔ میری صحت کچھ دنوں پہلے تک بے حد خراب تھی۔ دلی کے پنتھ اسپتال کے علاج سے کچھ بہتر ہوا ہوں.....

دوائیں بے حد مہنگی ہیں اور بسکو مان میں پے منٹ کا وہی حال ہے۔ ابھی میری تنخواہ چالیس ہزار ہوتی لیکن صرف دس بارہ ہزار ملتے ہیں وہ بھی پابندئی وقت سے نہیں۔

میں نے ڈپارٹمنٹ سے باضابطہ پرمیشن لے کر اور اے این کالج کے پی جی ڈپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لے کر ایم۔اے کر لیا ہے اور گولڈ میڈلسٹ ہوں۔ علاوہ ازیں UGC کا NET بھی پہلے ہی چانس میں نکال لیا ہے۔ لہذا اس طور پر لکچرشپ یا فیلوشپ وغیرہ کے کام کے لیے مجھے جوائن کرانے کی بات ذہن میں رکھیں گے۔ آپ کو اپنا سمجھتا ہوں اس لیے لکھ رہا ہوں۔ قمر رئیس مرحوم مجھے فیلوشپ دینے والے تھے۔ دلی اردو اکادمی کا لیکن افسوس ان کی رحلت سے یہ شاندار چانس ختم ہو گیا۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

نوٹ: میں نے لگ بھگ دس بارہ سال تک چار اخباروں میں کام کر کے اپنے گھر کا خرچہ چلایا ہے۔ اس لیے میں خود کو صحافی بھی مانتا ہوں۔

آپ کا بھائی شوکت حیات

☆☆☆

ڈاکٹر سید احمد قادری کے نام

۲۰۲۰/۵/۷

برادرم!

کتاب کی دکان میں غیاث احمد گدی پر آپ کی کتاب دیکھی۔ حیرت ہوئی کہ جہاں آپ نے ایک سے ایک لوگوں کو اس میں شامل کیا، غیاث احمد گدی پر لکھے گئے میرے دو اہم مضامین میں سے کسی کو اس لائق نہ سمجھا۔ ''غیاث احمد گدی سے آخری ملاقات'' اور غیاث احمد گدی کے افسانے'' یہ دونوں مضامین ایوان اردو میں شائع ہوئے تھے۔

کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟

بھائی! میں تو گذشتہ ایک سال سے بے حد بیمار ہوں۔ جگر اور آنت کی سوجن اور پیٹ کے مروڑ اور اینٹھن سے گذر رہا ہوں۔ زندگی، دنیاداری اور کیریئر سے بے نیازی اور لاپروائیاں رنگ لا رہی ہیں۔

ان لمحوں میں آپ جیسے دوستوں کی بہت یاد آتی ہے۔ اور ایسے لمحوں میں غیاث احمد گدی کی کتاب والی جیسی بے اعتنائی دیکھتا ہوں تو سمجھ نہیں آتا کہ میرے پرانے رفیق مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔

جب میری صحت ٹھیک تھی تو میں نے کتاب نما کے طویل مہمان اداریہ ''سن ستری اور نامیاتی افسانے: انحراف اور تسلسل'' میں آپ کا نام لیا تھا۔ یہ اگست ۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔

میرے مرنے بعد تو آپ لوگ کلمۂ خیر سے مجھے نوازیں گے ہی۔ جب تک زندہ ہوں اس وقت تک بھی تو مری ادبی زندگی کی گواہی دیجیے۔

ادھر آج کل (اپریل ۲۰۰۰) میں ایک افسانہ ''مسٹر گلیڈ'' شائع ہوا ہے۔

اپنا اخبار اس پتے پر بھیجا کیجیے:

Shaukat Hyat 104/Abhilasha Aptt176,Patliputra Colony Patna-800013

آپ کا بھائی شوکت حیات

رفیع حیدر انجم کے نام

۳۰/اپریل ۱۹۸۳ء

میرے بھائی!

آپ کا بہت پیارا خط ملا۔ شکریہ!

آپ نے میری کہانی کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ جی خوش ہو گیا۔ آج کی صحیح کتابوں میں تخلیقی اوصاف اور علامتی طرز اظہار پر جس قدر اصرار ہوتا ہے کہ کسی کہانی کو معنویت کے کسی ایک دائرے میں نہیں باندھا جا سکتا.....اور آج کی ایسی کہانیوں ہی کیوں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ سیدھی سے سیدھی، براہ راست اور سپاٹ کہانی کے بارے میں بھی کوئی بات بہت حتمی اور قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی.....اور کہانیاں ہی کیوں، ادب اور آرٹ کو یہی خوبی تو امتیازی شناخت مہیا کرتی ہے۔ ان باتوں کے باوجود آپ نے میری کہانی کو تجزیے سے دوچار کرتے ہوئے جن رخوں کی نشاندہی کی ہے، ان سے میں متفق، مطمئن اور مسرور ہوں۔

ایک بار پھر شکریہ!

امید ہے آئندہ بھی آپ میری کتابوں پر اپنے تاثرات سے نوازا کریں گے۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ جیسا اچھا افسانہ نگار اور بھائی میرا اتنا سیریئس قاری ہے۔

جواب دینے میں اپنی چند الجھنوں کے سبب تاخیر ہو رہی ہے۔ امید ہے خیال نہیں کریں گے۔

آپ کا اپنا شوکت حیات

☆☆☆

رفیع حیدر انجم کے نام

۲۵/۱۲/۱۹۸۴ء

میرے بھائی!

میں بے حد شرمندہ ہو کہ آپ کی شادی میں شریک نہ ہو سکا۔ دکھ تو یہ ہے کہ مبارک باد کا خط تک نہ لکھ سکا۔ عدم شرکت کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میں پٹنہ میں نہیں تھا۔ مبارک باد کا خط اس لیے نہ لکھ سکا کہ آپ کا کارڈ اور آپ کا پتا دونوں ہی گم تھے۔ بہت مشکلوں کے بعد پتا حاصل کر کے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ یہ بھی اتنا مختصر ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ خط آپ تک پہنچ سکے گا۔ حالات کے جبر اور میری کانٹے دار پریشانیوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس بات کے لیے مجھے معاف کر دیجیے گا۔ تاخیر سے ہی سہی آپ اور آپ کی بیگم کو میری جانب سے مبارک باد اور نیک تمنائیں قبول کریں۔ نیا سال آپ دنوں کے لیے مزید خوشگوار ہو۔

شب خون کے تازہ شمارے میں میری کہانی ''ستون'' سے دوچار ہونے کا موقع ملا ہو تو اپنی رائے دیجیے گا۔ افسانوں کا تجزیہ کرنے کا آپ کا انداز پیارا ہے۔ اگر جواب دینے میں تاخیر ہو جایا کرے تو خیال مت کیجیے گا۔ دراصل مصروفیتوں کے سبب میں خط و کتابت پابندی سے کر نہیں پاتا ویسے آپ کو برابر یاد کرتا ہوں۔

برادرم اقبال واجد سے ملاقات ہو تو سلام کہہ دیجیے گا۔

آپ کا اپنا شوکت حیات

☆☆☆

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے نام

۲۰۰۲/۱۱/۱۷

پیارے بھائی! اسلم جمشید پوری!!

شاعر کے تازہ شمارے میں آپ کا مضمون ''اردو افسانہ کا صد سالہ سفر: ایک مختصر جائزہ'' پڑھا۔ کئی لحاظ سے پسند آیا۔ اتنے اختصار میں آپ نے جتنی کامیابی سے اردو کے مختلف رجحانات اور اہم موڑ کی احاطہ بندی کی ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میری جانب سے مبارک باد قبول کریں۔

آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانوں کے تعلق سے میری کارکردگیوں کو یاد رکھا اور میری دو کہانیوں ''گنبد کے کبوتر'' اور ''گھڑیال'' کا تذکرہ شامل کیا۔ ''گنبد کے کبوتر'' پر مجھے ۱۹۹۷ء کا نیشنل کتھا ایوارڈ تفویض کیا گیا تھا۔ ''گھڑیال'' کو قمر رئیس صاحب نے اپنی اہم کتاب ''اردو کے نمائندہ افسانے'' میں شامل کیا تھا۔

ہم دونوں میں ملاقات نہیں رہی ہے لیکن ایک سریس افسانہ نگار اور افسانوں کے تعلق سے اکثر تنقیدی سطح پر بھی کچھ لکھنے کے سبب میں نے تجسس کی بنا پر آپ کے بارے میں غائبانہ جانکاری حاصل کرتے رہنے کی کوشش کی ہے۔ ایک عجیب سا تعلق اور اپنائیت بھی محسوس کرتا رہا ہوں.....اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے اہم اور طویل مضمون ''۱۹۷۰ کے بعد والے'' (مطبوعہ تنقید نمبر ۱۔ استعارہ) کے صفحہ ۱۱۸ پر ۱۹۷۰ کے بعد

کے اہم افسانہ نگاروں میں آپ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں افسانے کے اہم رجحانات ''انامیت'' اور پھر مابعد جدید عہد میں اس کے ''نامیائیت'' کے مرحلے میں داخل ہوکر ''نامیاتی افسانوں'' کی صورت میں متشکل ہونے کے تغیر کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ نہ معلوم آپ کو وہ مضمون پڑھنے کا موقع ملا یا نہیں۔ اگر پڑھ سکے ہوں تو اپنی رائے دیجیے گا۔ علاوہ ازیں ادھر ایک ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' شب خون ۲۵۲ میں اور ایک افسانہ ''مادھو'' آج کل کے مئی ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ افسانہ کا آپ جیسا اہم مفکر میری ان تخلیقات کو ضرور پڑھے۔ ''مادھو'' میں پریم چند کے ''کفن'' کے ''مادھو'' کی عصری حالات کے تناظر میں توسیع کی گئی ہے۔ آج کل کے دسمبر ۲۰۰۱ء میں ایک افسانہ ''مرشد'' بھی شائع ہوا تھا۔

یہ میں آپ کو تیسرا خط لکھ رہا ہوں۔ وقفے وقفے سے آپ کو پہلے دو خطوط لکھ چکا ہوں۔ پہلا خط کتاب نما سے حاصل کردہ پتہ بٹلہ ہاؤس پر لکھا تھا۔ دوسرا خط کسی اور رسالے سے لے کر مجیدیہ ماڈل اسکول کے پتے پر۔ لیکن آپ کا کوئی جواب نہیں آیا۔ میں دراصل آپ کی کتاب ''جدیدیت اور اردو افسانہ'' پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک ایماندار قاری بھی ہوں۔ افسانے کے تعلق سے شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہوتی ہے جو مجھ سے بچتی ہو۔ پہلا خط لکھنے کے بعد جب آپ کا جواب نہیں آیا تو دوسرے خط میں میں نے یہاں تک لکھا تھا کہ اگر ''تحفتاً'' بھیجنے میں دشواری ہو تو براہ کرم ''قیمتاً'' ہی وہ کتاب ارسال کریں۔ بہت ممکن ہے میرا طویل تحقیقی مقالہ ''۱۹۷۰ء کے بعد والے'' کتابی صورت میں شائع ہو۔ میں اس میں ایک باب کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اس ایماندارانہ کتاب کا تذکرہ میرے اس مضمون میں مثبت طریقے سے شامل ہو۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

ادھر سڑک کے ایک جان لیوا حادثے کے تحت میں ذی فراشی سے گذر رہا ہوں۔ چار دنوں تک ICU میں آکسیجن پر رہا، مسافروں سے لدے ہوئے ایک ٹمپو کے نیچے میں بہت دیر تک دبا رہ گیا تھا جس سے ہی شدید طور مجروح ہو گیا۔ Pel vic Girdle ہی دو جگہ فریکچر بھی ہوا۔ اب پہلے سے کچھ بہتر ہوں۔ میری صحتیابی کے لیے دعائے خیر کریں۔ اپنی کتاب جتنی جلد ممکن ہو بھیج دیں۔ تفصیلی طور پر بھی لکھیں کہ آپ نے میرے پچھلے دونوں خطوط کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا۔

یہ پتہ میں نے شاعر سے حاصل کیا ہے۔ خدا کرے یہ خط آپ کو مل جائے اور آپ کے دل میں میرے لیے اپنائیت کا ویسا ہی جذبہ پیدا کرے جیسا میرے دل میں آپ کے لیے ہے۔

جواب اور کتاب کا منتظر۔ بشیر بدر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہیں۔

آپ کا اپنا شوکت حیات

۲۰۰۱/۱۲/۲۸

بنام اقبال حسن آزاد

مرشد پر آپ کی انتہائی خوبصورت اور گہری رائے پڑھ کر جی خوش ہوا۔ میری کہانیوں پر عام طور پر میری ریاست کے لوگ سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ کی پسندیدگی کا خط پڑھ کر میں چونک پڑا۔ آپ دیگر بہاریوں سے یکسر مختلف ہیں۔ اس کرم فرمائی کے لیے ممنون ہوں آپ کہانی کی روح تک پہنچ گئے۔ محسوس کر کے حیرت ہوئی۔ تصوف اور مسلم معاشرے کی زبوں حالی نیز دنیا داری (اشاروں اشاروں میں) کے امتزاج سے میں جس نوعیت سے کہانی کو معنی خیز بنانا چاہتا تھا، آپ اس کی وسعت اور بیکرانی کو سمجھ گئے۔ تصوف میں سماجی اور روحانی معنویت پیدا کیے بغیر عصری اور آفاقی حسّیت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مرشد کی پسندیدگی کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔

آپ کا بھائی شوکت حیات

☆☆☆

بنام ڈاکٹر ارشد رضا

۲۵/۱۱/۲۰۰۷

پیارے ارشد!

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے ''مرشد'' کو اپنے رسالے کے مشہور گوشے ''اس شمارے کی منتخب کہانی'' کے لیے منتخب کیا ہے۔ کہنے میں شاید تعلّی معلوم ہو لیکن یہ ایک سچائی ہے کہ اس کہانی کو منتخب کر کے تم نے اچھا کام کیا ہے۔ جس زمانے میں یہ کہانی آج کل میں شائع ہوئی تھی، اس زمانے میں بھی اس کی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ اچھی کہانی کبھی پرانی نہیں پڑتی۔ اس کے اندر کی ''نامیاتیت'' یعنی نمو کرنے کی قوت اس کی تازہ کاری اور ریلی ونس کو ہمیشہ قائم رکھتی ہے۔

''مرشد'' یقیناً میری چند ایسی کہانیوں میں شامل ہے جو یاد رکھی جائیں گی۔ ''بانگ''، ''گنبد کے کبوتر''، ''میت''، ''کوبڑ''، ''رانی باغ''، ''گھڑیال''، ''قرارداد''، ''ڈھلان پر رکے ہوئے قدم''، ''مسٹر گلیڈ''، ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ'' وغیرہ ایسی ہی چند کہانیاں ہیں جن میں لوگ اپنے اپنے حساب سے نئے معنوی ابعاد ڈھونڈتے رہیں گے۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے ایک صحیح کہانی کو منتخب کیا۔ اس حسن انتخاب کے لیے مبارکباد!

تمہارا اپنا شوکت حیات

◀◀ ● ▶▶

● **شوکت حیات**

معاصر اردو افسانہ: تغیر و تبدل اور امکانی حقیقت نگاری

کائنات میں تغیر و تبدل کا عمل ابتدائے آفرینش سے جاری و ساری ہے۔ کبھی یہ عمل مرئی ہوتا ہے اور کبھی غیر مرئی۔ ہمارا سیاسی و سماجی اور معاشرتی نظام بھی تغیر و تبدل سے عبارت ہے۔ صرف بصارت ہو تو ہم محض مرئی عمل کے تانے بانے کو گرفت میں لے سکتے ہیں، لیکن بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہو تو ہم مرئی عمل کے ساتھ ساتھ غیر مرئی عمل تک بھی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

لیکن اس بھرپور گہری بصیرت کا حصول گہرے استغراق اور عرق ریزی کے بغیر ممکن نہیں۔

افسانہ نگار چونکہ براہ رست زندگی سے مخاطب ہوتا ہے اس لئے لامحالہ اسے زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے اندر رونما ہو رہے تغیر و تبدل اور پھر امکانی زندگی سے بھی نپٹنا پڑتا ہے۔ یہ اس کے تخلیقی منصب کا لازمی اور بنیادی بلکہ ناگزیر حصہ ہے جس سے گزرے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

معاشرتی اور سیاسی و سماجی حالات سے عدم اطمینان ہی افسانہ نگار کے تخلیقی وصف کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کے اظہار و ابلاغ کو تہہ دار اور ہمہ جہت بناتا ہے، تاکہ وہ زندگی اور اپنے عندیے کی پیش کش میں (جسے دوسرے لفظوں میں نقطۂ نظر بھی کہتے ہیں) محض ایک ترجمان بن کر فوٹو گرافر، جرنلسٹ اور ہمدرد مشاہد کا رویہ اختیار نہ کرے بلکہ زندگی کے اندرون سے پھوٹتی ہوئی ٹیڑھی میڑھی، گڈمڈ، شفاف اور دھندلی شعاعوں کو اپنے افسانوی قلم کی گرفت میں لے سکے۔ ہمہ جہت زندگی اپنے تخلیقی Process سے گزر کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور غالباً اسی لئے پریم چند نے کہا تھا کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے سے بڑا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔

لکھتے وقت افسانہ نگار خود وہ انسان نہیں رہتا جو عام لمحوں میں ہوا کرتا ہے۔ اس کا تخلیقی ذہن تغیر و تبدل کے مراحل سے گزرتا ہوا تحت الشعور اور لاشعوری طور پر ان لمحوں کے رقیق اور دھواں دھواں عناصر کو بھی اپنے تخلیقی انہماک میں شامل کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی تخلیق اپنے پڑھنے والے کے ذہن میں بھی چاہے ان چاہے طور پر تبدیلی برپا کرتی چلتی ہے۔ پڑھنے والا تخلیق سے گزرنے کے بعد وہ انسان نہیں رہ جاتا جو وہ تخلیق کو پڑھنے سے پہلے تھا، یعنی ہر جینوئن پڑھنے والے کا تقلب کر دیتی ہے۔ اس طرح زندگی کا تغیر و تبدل نہ صرف افسانہ پڑھنے والے تک کے تغیر و تبدل کو منتج ہوتا ہے اور امکانیت کی بشارت دیتا ہے۔

اکثر سوچتا ہوں کہ آخر ابھی بھی ''کفن'' ہم نئی نسل کے فن کاروں کو اتنا عزیز کیوں ہے؟ کیوں وہ ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالباً اس لئے بھی کہ افسانے کے ارتقا کی تاریخ میں وہ پہلے تغیر و تبدل اور ''امکانیت'' کا مظہر ہے۔

یہ افسانہ دراصل ساخت و بافت اور فنی التزام کے لحاظ سے داستانی روایت اور آئیڈیلزم سے مکمل انقطاع اور افسانے کے فنی و فکری لوازم اور وجود کے استحکام کا افسانہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ پریم چند اس افسانے میں حقیقتوں کو مبالغے کی حد تک پیش کرتے ہوئے حقیقت کی ظاہری سطح سے کیوں تجاوز کرتے ہیں۔ کس وجہ سے چیزوں کو Exaggerate کرتے ہیں۔ دراصل وہ ایک کریہہ سماجی اور سیاسی حقیقت کے تئیں ہمارے احساس تنفر کو بڑھا کر، ہمیں Shock پہنچا کر اس کی تبدیلی اور تقلیب کی طرف ہمارے ذہن کو مرتکز کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ کوئی نعرہ نہیں لگاتے، نہ کوئی واضح ڈائرکشن دیتے ہیں، بہت لطیف طریقے سے طنز کے حربے کو استعمال کرتے ہوئے حقیقت کی خارجی سطح کو کثافت سے ہم آمیز کرتے ہوئے Situation کی مضحکہ خیزی کو دوچند کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ امکانی حقیقت نگاری کے ابتدائی نقوش ''کفن'' سے اجاگر ہوتے ہیں۔

پریم چند کفن میں محض سماجی حقیقت نگاری کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے من و عن عکاسی تک خود کو محدود نہیں رکھتے، بلکہ اپنے پرانے آزمودہ خارجی اور اکہری حقیقت نگاری کے حربوں سے انحراف کرتے ہوئے حقیقت میں مائنس پلس کرتے ہوئے گہری حقیقت نگاری یا امکانی حقیقت نگاری، یا داخلی حقیقت نگاری یا بیک وقت داخلی اور خارجی حقیقت نگاری کے آمیزے سے کام لیتے ہیں۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ مادھو اور گھیسو کی مبالغہ آمیز بے حسی کیا اس لیے ہے کہ پریم چند معاشرے میں پھیلی ہوئی بے حسی میں اضافے کے خواہاں تھے۔ از حد مفلسی بلکہ قلاشی دکھانے کا پریم چند کا عندیہ کیا یہ ہے کہ اس وقت کے جاگیردارانہ نظام کے اس بدنما داغ کے وہ مزید سیاہ ہونے کے طلبگار تھے۔

ویسے غور کیا جائے تو مافوق الفطری کرداروں کے ذریعہ داستانیں بھی اس امکانی حقیقت نگاری کی تخم ریزی کر رہی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے ان کا فارم داستانوں کا تھا، افسانوں کا نہیں۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تغیر و تبدل (ہیئتی اور فکری دونوں اعتبار سے) کے بیج تو ہماری پوری داستانی روایت اور انسانی روایت میں موجود ہیں۔

بائیں بازو کے میرے ایک انقلابی دوست نے مجھ سے ایک بار کہا کہ تاڑی خانے میں کفن کے گھیسو اور مادھو بدمست ہو کر ناچنے گانے کے بجائے (یا ناچنے گانے کے بعد) اے کے ۴۷ نہیں تو کم از کم درانتی تو ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ اس کہانی کا جو پس منظر اور زمانہ ہے اس میں ہمارے بائیں بازو کے دوست کا مشورہ غالباً کہانی میں نقص پیدا کر دیتا اور اسے فارمولا کہانی بنا دیتا۔ اس کی Authenticity خطرے میں پڑ جاتی۔ شاید اس وقت

جاگیردارانہ تہذیب کے تناظر میں افسانے میں اتنی لمبی چھلانگ قابل قبول نہیں ہوتی۔ پھر سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ ایک آدمی جس کا ذہن تمام عمر ایک خاص (گاندھیائی) فکری سانچے میں ڈھلتے ہوئے گزرا ہو، اس سے یہ توقع کرنا کہ اچانک بڑھاپے میں اس کے اندر کوئی بنیادی مارکسی اور ریڈی کل تبدیلی وقوع پذیر ہوگی، ایک غلط توقع ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر کہانی کے تھیم، ویژن، شعور، نظام حیات اور اسلوب کے لحاظ سے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں جو اس کی ساخت وبافت، سیمیٹری، مکمل ہیئت، تکنیک، طرز اظہار، طرز ادائیگی، وحدت تاثر، کلائمکس اور اختتام وغیرہ کو طے کرتے ہیں۔ یعنی افسانے کا مرکزی خیال (یا نقطہ نظر) ہی دراصل فن کار اور افسانہ نگار ہوتا ہے اور سارتھی۔ افسانہ نگار تو محض رتھ کا گھوڑا ہے جو سارتھی کے اشاروں پر اپنے فاصلے کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ ''کفن'' کہانی کا سارتھی (مرکزی خیال) پریم چند (رتھ کا گھوڑا) تو اس ڈائیورشن کی طرف موڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے دائرے میں اس کی گنجائش اس وقت تک کے افسانوی ارتقا کے تناظر میں ممکن نہیں دکھائی دیتی۔

بعد کے افسانوں اور خاص کر ۷۰ء کے بعد کے (ہندوستان کے) اردو افسانوں نے اس قابل قبول امکانی حقیقت نگاری کے تعلق سے کئی کارنامے انجام دیے ہیں۔ لیکن اتنے مختصر وقت میں حقیقت نگاری کے اطلاقی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں۔ اسے مضمون کی دوسری قسط پر اٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال چند اشاروں اور اظہار خیال پر اکتفا کرتا ہوں۔

اب منٹو کی وہ بات پیش کرتا چلوں جس سے امکانی حقیقت نگاری کے میرے اس مضمون کے مرکزی خیال کی توثیق ہوتی ہے۔ منٹو کی بعض کہانیوں مثلاً ''کھول دو''، ''ہتک''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''نیا قانون'' وغیرہ کے غیر معمولی ہونے کا سبب بھی یہی ''امکانی حقیقت نگاری'' ہے، جو تحت الشعوری طور پر ان کہانیوں میں عود کر آئی ہے۔

منٹو کی یہ بات نقوش کے افسانہ نمبر (مطبوعہ ستمبر ۱۹۵۵) میں شائع ہوئی ہے۔ اس وقت کے تاریخی مذاکرے میں حصہ لینے والوں میں منٹو کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، وقار عظیم، عبادت بریلوی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شوکت تھانوی، انتظار حسین اور حمید اختر شامل ہیں۔ اردو کے سرتاج افسانہ نگار منٹو نے کہا تھا:

> ''لیکن میں زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں..... اور یہی آرٹسٹ کا نقطہ نظر ہونا چاہئے۔'' (افسانہ نمبر: نقوش، ص ۱۰۳۲)

غیاث احمد گدی کی ایک شاہ کار کہانی ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' کا ڈنکا بھی غالباً اسی وجہ سے ہنوز بج رہا ہے اور افسانے کی صنف کے زندہ رہنے تک شاید بجتا رہے گا کہ اس میں غیاث احمد گدی نے امکانی حقیقت نگاری کے حربے سے کام لیتے ہوئے ایک طرف علامتی اور رمزیاتی طرز اظہار کو اپنایا ہے اور دوسری طرف چیزوں میں

مائنس پلس سے کام لیتے ہوئے حقیقت میں مداخلت کی ہے۔ کئی جگہوں پر اسے التوا میں ڈالا ہے۔ اس کہانی کے بارے میں راقم الحروف کئی قومی سیمیناروں میں یہ اظہار کر چکا ہے کہ عالمی سطح پر علامتی افسانہ کافکا کے ''میٹا مارفیس'' سے آگے نہیں بڑھا اور اردو کا علامتی افسانہ ہنوز ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' پر آ کر ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تخلیقی آزادی کی بحالی، ذہنی کشادگی اور وسیع القلبی کا عہد ہے۔ اس لئے کسی کو میرے اس مفروضے سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ جمہوریت میں سب کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ یہ تخلیقی آزادی کا دور ہے۔

''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' میں گاڑی بذات خود ایک فنتاسیائی کردار کی صورت اختیار کرتا ہوا جبر واستبداد کے استعارے میں ڈھل گیا ہے جو اپنی بالائی سطح پر رائج حقیقت نگاری کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن اس گاڑی کا پیچھا کرتا ہوا وہ بچہ جس کی بہن لقوہ کا شکار ہے، اس کہانی میں امکانی حقیقت، کا رمزیاتی سمبل ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ وہ گاڑی کو تہس نہس کر دے گا۔ افسانے کے آخر میں پرندوں کا پتھر میں تبدیل ہو جانا اور ایک اونچی عمارت پر نصب ہونا پوری انسانی سوچ پر تاثراتی طور پر سکتہ طاری کرنے کے مترادف ہے اور امکانی حقیقت نگاری کا خوبصورت اور معنی خیز اشاریہ ہے۔ اسی سکتہ اور شاک کے بطن سے نئی حقیقتوں کی کونپل پھوٹنے کے امکانات ہیں۔ یہی امکانی حقیقت نگاری افسانے کا نامیاتی تنوع ہے۔

۷۰ء سے پہلے والوں میں غیاث احمد گدی کی 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کے علاوہ قاضی عبدالستار کا 'رضو باجی'، بلراج منیرا کا 'وہ' سریندر پرکاش کا 'رونے کی آواز' احمد یوسف کا 'عبدالرحیم ٹی اسٹال' جیلانی بانو کا 'اسکوٹر والا' اقبال مجید کا 'پوشاک' اقبال متین کا 'گریویارڈ' دیویندر اسر کا 'جنگل'، عابد سہیل کا 'سب سے چھوٹا غم' کلام حیدری کا 'سخی' رتن سنگھ کا 'ہزاروں سال لمبی رات' شرون کمار کا 'ایک تھا تارا چند' وغیرہ جیسے افسانوں میں بھی تغیر وتبدل اور امکانیت کے عناصر جا بجا کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں انتظار حسین، اکرام اللہ، اسد محمد خاں، محمد منشا یاد، احمد ہمیش، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، احمد داؤد، زاہدہ حنا، اعجاز راہی، آصف فرخی کے بھی ایسے افسانوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں جو امکانی حقیقت نگاری کے خصائص سے مملو ہیں اور جن کے اندر سے مستقبل کے تابناک اور دھندلے لمحوں کی جھلکیاں برآمد ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت فی الحال پاکستان کے افسانہ نگار میرے مطالعہ کے دائرے سے باہر ہیں۔ ہر چند کے سارک ممالک رائٹرز کانفرنس کے موقع پر اس طرح کی تخصیص غیر مناسب معلوم ہوتی ہے، لیکن وقت کی کمی ہمیں دیگر ملکوں کے افسانوی حالات کا جائزہ لینے میں مانع ہے۔

تغیر وتبدل اور امکانی حقیقت نگاری کے تعلق سے ۷۰ء کئی معنوں میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی پشت پر ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء کے اہم سیاسی واقعات ہیں۔ اس کے کاندھے پر ۱۹۷۱ء کا سانحہ عظیم

ہے جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ جس نے آزادی کے زمانے میں مروج دوقومی نظریئے پر سوالیہ نشان قائم کر دیا۔ اس کی گود میں ۱۹۷۵ء ہے۔ اتنے سارے سیاسی، تہذیبی اور سماجی سانحات نے ۱۹۷۰ء کے بعد افسانے کو بتدریج تغیر و تبدل کے سفر پر گامزن رکھا۔

۱۹۶۲ء میں چینی حملہ ہوا جس نے اچانک بین الاقوامی سطح پر اشتراکیت کے تئیں ہمیں اپنے موقف پر نظر ثانی کے لئے مجبور کیا اور لامحالہ ہندوستان کو سوویت روس کی طرف کچھ غیر ضروری طور پر زیادہ راغب ہونے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۶۷ء دو وجہوں سے تغیر و تبدل کا سبب بنا۔ اول یہ کہ ہندوستان میں پہلی بار کولیشن حکومت کی تشکیل کے ذریعہ ہندوستانی جمہوریت کی قومی پہچان، سکہ بندی اور کسی ایک سیاسی جماعت کی اکثریت کی روایت کو پہلی بار بریک لگا۔ چوتھے عام انتخاب میں ملک کی آٹھ ریاستوں میں کانگریس کی شکست ہوئی اور حزب مخالف کے ہاتھوں میں اقتدار آیا۔ یہ سلسلہ اس قدر دراز ہوا کہ قومیت کی جگہ علاقائیت اور علاقائیت کی جگہ ذاتیات اور مختلف قسم کی تکثیری خانہ بندیوں اور رجحانات کے ابھار کے ذریعہ اس مقام پر آ پہنچا جو آج ہندوستان کے ہونے والے انتخابات میں عموماً Fractured people mandate کی شکل کو منتج اور جمہوریت کے تعلق سے نئے سوالوں، نئے مسائل اور نئے اندیشوں کو مرتکز ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں ہی نکسل تحریک اور انقلاب کا ابھار ہوا جس نے ہندوستان کے غریب اور نچلے متوسط طبقے کی مایوس زندگی میں امید کی نئی مشعل روشن کی۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط پاکستان اور بنگلہ دیش کے عالم وجود میں آنے کے بعد دوقومی نظریے کی تکذیب ہوتی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں اور افسانہ نگاروں کے ہاں ہجرت کے نام پر ''فراری رویہ'' کے بجائے ''سروکاری رویہ'' کی بنیاد پڑتی ہے۔

۱۹۷۵ء کی ایمرجنسی اور پریس سنسرشپ میں پہلی بار ہندوستان کے نام نہاد آزاد عوام کے آزادی اظہار پر منظّم اور آمرانہ ڈھنگ سے حملہ ہوا جس نے مکمل طور سے نہرو عہد سے موہ بھنگ dis illusionment کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

یہ تو ہوئے اردو افسانے میں تغیر و تبدل اور امکانی حقیقت نگاری کے چند خارجی (سیاسی و سماجی) اسباب و محرکات جس کے زیر اثر ۷۰ء کے بعد کے صورت پذیر ہونے والے افسانے کو ماضی کے مقابلے میں نئی شکل و صورت اور نیا اختصاص و امتیاز اختیار کرنے کا راستہ ہموار ہوا۔

۷۰ء کی نسل ترقی پسندی اور جدیدیوں کی از حد داخلیت پسندی سے اوبی ہوئی تھی۔ دونوں عہد کی انتہا پسندیوں اور شدتوں نے چیزوں کو Totality میں سمجھنے کے زرخیز رویوں کو زائل کر دیا تھا۔ اردو افسانہ عدم توازن کا شکار ہو گیا تھا۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں عہد کے افسانہ نگار، غلام اور متحدہ ہندوستان کے زائیدہ تھے۔ وہ نسل جو آزادی کے بعد پیدا ہوئی وہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس جوان ہوئی۔ یعنی آزادی کے بعد پہلا شعور، دانش، ادراک اور فہم جو افسانے، زندگی، ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کے ساتھ Interaction کی طرف نئے حوصلوں کے ساتھ آگے بڑھا۔

اس نسل نے اس وقت تک کے تمام افسانوی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی افسانہ نگاری کے رخت سفر ڈھونڈنے اور اکٹھا کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہیں سے تغیر و تبدل اور امکانیت کے Exploration اور افعال و تفاعل کے نئے مکالمے قائم کرنے کا ایک نیا سلسلہ عمل شروع ہوا جو ''نامیاتی نوتعمیریت'' کی صورت میں آگے بڑھا۔

مہدی جعفری رقم طراز ہیں:

> ''اب اینٹی اسٹوری اور بے ربط افسانوں کا رواج زائل ہو رہا ہے۔ تجریدی افسانے تجسیمی افسانے بنتے جا رہے ہیں اور فرد کی داخلی بازیافت اور ذات کی از سر نو دریافت کی کوششوں کے بعد ایک نامیاتی نوتعمیری سلسلہ (جس میں تجسیم کا عمل نظر آتا ہے) شروع ہو چکا ہے۔ حالیہ افسانے کہانی پن اور ڈرامائی سطح بحال کرتے نظر آتے ہیں۔'' (عصری افسانے کا فن، صفحہ ۴۰، مہدی جعفر)

بقول گوپی چند نارنگ جس شدت سے ترقی پسندوں نے روایتی افسانوں سے اور جدیدیوں نے ترقی پسند افسانے سے بغاوت کی اس کے نتیجے میں ۱۹۷۰ء والوں کا انحراف ایک اعتدال کی صورت میں رونما ہونا ایک فطری عمل تھا۔ ۱۹۷۰ء والوں نے اپنی شناخت کے لئے انحراف اور بغاوت سے گریز کرتے ہوئے انجذاب و اکتساب کی راہ اختیار کی۔ انہوں نے اپنے سے پہلے والوں کے تمام منفی پہلوؤں کو ترک کیا اور مثبت پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلنے کے ادغامی، انجذابی، انطباقی اور امتزاجی رویے کو اختیار کیا۔ تغیر و تبدل کے امتزاجی اور انجذابی رویے کے تعلق سے طارق چھتاری لکھتے ہیں:

> ''دراصل ادب میں مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے گلدستہ بنانے کا رویہ اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ ایک قسم کے پودے کی قلم دوسرے قسم کے پودے پر چڑھائی جاتی ہے، جس سے ایک نئے قسم کا پودا تیار ہوتا ہے۔ اس پر کھلے پھول کی اپنی الگ شناخت ہوتی ہے مگر اس کے حسن میں کئی اقسام کے پھولوں کا حسن پوشیدہ ہوتا ہے۔'' (۷۰ کے بعد اردو افسانے کا غالب رجحان، طارق چھتاری، مباحثہ، شمارہ ۱۸، ص ۵۲)

۱۹۷۰ء والوں کے تغیر و تبدل پسند تخلیقی ذہن کے نزدیک کوئی بھی فارم، تکنیک، تھیم، موضوع اور اسلوب از کار رفتہ نہیں ہوتے۔ ضرورت ان کے ساتھ نئے سماجی اور انفرادی سروکاروں کے ساتھ روبہ عمل ہونے کی ہے۔

Exploration کے ساتھ ساتھ اس عہد میں دراصل افسانے کی تخلیقی آزادی اور ذہنی کشادگی کی بحالی کا عمل شروع ہوا۔ یعنی اب کوئی تحدید نہ تھی۔ نہ کوئی مینی فسٹو، نہ کوئی سی آئی اے، نہ کوئی کے جی بی۔ کسی طرح کا کوئی Obsession اور Hang over نہیں رہا۔ صرف ایک ہی پابندی کا لحاظ رکھا گیا کہ افسانے کی اقلی صنفی ضرورت Minimum structural requirement کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں۔ اور انسانی ضمیر کے ساتھ ہر حال میں Commitment اور وابستگی۔ کیونکہ Commitment کے بغیر موجودہ پیچیدہ سیاسی اور سماجی Situation میں ہم دو قدم بھی نہیں چل سکتے۔

۱۹۷۰ء میں انجمن تہذیب نو کے دو روزہ سمینار ''نئی کہانی نئے مسائل'' جامعہ کے ۱۹۸۰ء کے سہ روزہ ہند و پاک اردو افسانہ سمینار، دہلی اردو اکادمی کے پانچ روزہ سمینار، اردو افسانہ سمینار ورک شاپ۔ ۱۹۸۵ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جس نے تغیر و تبدل اور ۷۰ء کے بعد کے بدلے ہوئے افسانے کے تیور، لہجے، مزاج اور خصائص کو انڈر لائن کیا۔ سن ستّری افسانہ نگاروں کے تعلق سے نئے افسانہ نگاروں کا پہلا انتخاب ''بیس نئی کہانیاں'' شائع ہوا، جسے علی احمد فاطمی نے مرتب کیا۔ اس انتخاب نے ہنگامہ خیز رول ادا کیا، جس نے نئی نسل کی شناخت متعین کرنے کے تعلق سے نئی معنی خیز بحثوں کا آغاز کیا۔

ابوالکلام قاسمی نے بھی تغیر و تبدل اور امکانیت کے تعلق سے الفاظ کے اداریے لکھ کر نئے مکالمے قائم کئے جن کے اقتباسات راقم الحروف اپنے کئی مضامین میں دے چکا ہے۔ معاصر اردو افسانے جسے نامیاتی، مابعد جدیدیت، ریڈی کل یا کوئی بھی نام دیں ترقی پسند، جدید، لایعنی، تجریدی اور علامتی حقیقت نگاری سے ہوتا ہوا اور تغیر و تبدل کے تاریخی دور سے گزرتا ہوا ''امکانی حقیقت نگاری'' کی طرف بڑھ رہا ہے، جس نے اسے ماضی کے افسانوں کے مقابلے میں کئی لحاظ سے زیادہ تہہ دار، گوناگوں اور اثر انگیز بنا دیا ہے۔ آج کا معاصر اردو افسانہ حقیقت کا سینہ چیر کر اس کی تہہ میں کارفرما تہہ نشیں زیادہ گہری اور اصل (بنیادی) حقیقتوں کے مخفی اجزاء اور Crux کو اکسپلور کرتا ہے جس سے زندگی کی جامعیت اور ''امکانی حقیقت'' کے نئے روشن پہلو منکشف ہوتے ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد کے کئی افسانہ نگاروں کی کہانیاں تغیر و تبدل اور ''امکانیت'' کے اوصاف سے مملو ہیں۔ سلام بن رزاق کی ''کالے ناگ کے پجاری''، حسین الحق کی ''مور کا پاؤں'' اور دیگر افسانہ نگاروں کی بعض کہانیاں امکانی حقیقت نگاری کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بابری مسجد کے انہدام، فرقہ وارانہ فسادات، انسانی نسل کشی، بھاجپا

کا کلچرل نیشنلزم، آر ایس ایس کا ہندوتو واد، کسانوں کی اجتماعی خودکشی، زراعت کے پورے نظام کی بے بضاعتی، بائیں بازو کا انتشار، جمہوری اقدار کی پسپائی، ہیروشیما سے لے کر عراق اور افغانستان میں ایک قطبی طاقت امریکہ کی دہشت گردی، تیل کی معدنی دولت پر غاصبانہ قبضہ، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹوئن ٹاورس کی تاراجی، امریکی عفریت کے سفاکانہ عمل کے ردعمل کے طور پر بڑھتی ہوئی اسلامی بنیاد پرستی اور احیا پرستی، گلوبلائیزیشن، کنزیومرزم اور بازار واد، ادب کے کمرشیلائزیشن، پاپولرائیزیشن، نن کری ایٹو رائٹنگ کی ترویج و فروغ وغیرہ جیسی معاصر صورت حال نے نئے نئے پیچیدہ، پراسرار اور بھیانک Paradox پیدا کئے جو گزشتہ دنوں افغانستان کی تاراجی کے موقع پر دیکھنے میں آئے۔ ریلیف کے نام پر بھوکے افغانیوں کے لئے طیاروں سے روٹیاں گرائی جا رہی ہیں اور روٹیوں کی طرف بڑھتے ہوئے افغانیوں پر بم برسائے جا رہے ہیں۔

یک قطبی دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام، امپیریلزم، ملٹی نیشنل اور گلوبلائزیشن نے جاگیردارانہ نظام کی باقیات سے مصالحت اور گٹھ جوڑ کر رکھا ہے جو حقیقی انسان، ازلی، ابدی اور جمہوری اقدار کی افزائش، ابھار اور فروغ میں مزاحمتی رجعت پسندانہ کردار ادا کر رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ترقی پسندی کے تاریخی رول کے منصب سے روگردانی کر رہا ہے۔ اس نے زندگی کی شاہراہ پر کانٹے بچھا دیے ہیں۔ امکان و اجتہاد کی کونپل کو جبر و استبداد کی بھاری چٹان کے نیچے دبا دیا ہے۔ ان کانٹوں اور چٹان کو ہٹانا معاصر اردو افسانے کا بنیادی Paragmatic seminal جدلیاتی، حرکی، عملیاتی، تاریخی اور فکری و فنی منصب ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ تغیر و تبدل کے عمل سے گزرنے پر مجبور ہے۔ میں سائنس بیک گراؤنڈ کا افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے اپنے افسانوں میں ۷۰ء کے بعد کے اپنے ہم عصروں سے مختلف رہا ہوں۔ رجحان سازی اور اصطلاحوں کے اختراع کے لئے بدنام بھی ہوں۔ ۷۰ء کے بعد کے تمام اہم اور قابل ذکر افسانہ نگار غالب رجحانات کی مماثلت کے باوجود اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔

ستری افسانہ، انام کہانی، انامیت، نامیاتی کہانی، نامیاتیت کے بعد آج سارک ممالک کے مندوب مصنفین کے درمیان جو جنوبی ایشیا کے عوام میں امن و یک جہتی کو فروغ دینے کے لئے سرسید کی اس نگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اکٹھا ہوئے ہیں۔ یہ مقالہ پڑھتے ہوئے ''امکانی حقیقت نگاری''، ''امکانیت'' اور ''امکانیت پسندی'' کی اصطلاحیں وضع کرنے کا جرم کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ لوگ اس تخلیقی جرم کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ (سارک ممالک میں معاصر افسانہ: نگراں قاضی افضال حسین: مرتب صغیر افراہیم: شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نومبر ۲۰۰۵ء)

◀◀ ● ▶▶

● شوکت حیات

مابعد جدید افسانہ

اگر اسے خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو اس حقیقت کا اظہار غیر مناسب نہ ہوگا کہ مابعد جدید افسانے کے ابتدائی نقوش کا سراغ راقم الحروف کے ۱۹۷۰ کے زمانے میں پیش کردہ انامیت، انام نسل اور انام افسانوں کے تصورات اور رویوں میں ملتا ہے۔

اس زمانے کے ''میں کا تعارف''، ''سچوئیشن سیریز کیوں''، ''قصہ جدید وقدیم'' اور دیگر مضامین میں ان کے بیج جابجا بکھرے پڑے ملتے ہیں۔

پریم چند کے روایتی افسانہ، ترقی پسند افسانہ، جدید افسانہ، انام افسانہ یا مابعد جدید افسانہ وغیرہ اصطلاحیں ہیں، لیکن ہر عہد، زمانہ اور نسل اپنے تخلیقی اظہار کے لئے بعض امتیازی نشانات کو اجاگر کرنے پر اصرار کرتی رہی ہے۔

بنیادی اوصاف کا لحاظ کرتے ہوئے رویے، اسلوب، لہجے اور پیش کش میں تبدیلی کی بات ہو تو اسے مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے۔ جدیدیت کے احترام اور ہم سفری کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جدیدیت اور جدید افسانوں کے زعم میں یہ سانحہ اردو افسانے کی تاریخ میں ضرور گزرا ہے کہ بعض ناموں، مثالوں اور کہانیوں کو چھوڑ کر عموماً یہ اپنی شدتوں کے زیر اثر افسانوں کے derailment کا سبب بن گیا ہے۔

ہر عہد اپنی انتہا پسندیوں کے چلتے یکسانیت، جمود، صف آرائی اور حلقہ بگوشی میں سکڑ سمٹ کر نئی تبدیلیوں کے لئے جواز فراہم کرتا گیا ہے اور وقت کے بہاؤ پر بندھ باندھنے کی کوششوں نے ہر زمانے میں نئے رویوں کے دباؤ اور سیلاب کو بڑھاوا دیا ہے۔ روایت و بغاوت کے یہ نامیاتی ارتقائی مراحل اپنے آپ میں بیحد دلچسپ، پیچیدہ اور تہہ دار رہے ہیں۔

راقم الحروف نے سانحے کی بات کی۔ ترقی پسند افسانہ اپنی شدتوں میں سماجی بھلائی اور انقلاب کے نام پر اس قدر انتہا پسندی کا شکار ہوا کہ اس نے فرد اس کی انفرادیت، داخلیت، دروں بینی، ذات کے مسائل کو افسانے کے دارۂ عمل سے خارج کر دیا اور نام نہاد سماجی اصلاح اور انقلاب پر اس قدر زور دیا کہ

افسانہ خطابت، پروپیگنڈا اور اشتہاریت کا ملغوبہ ہو کر رہ گیا۔

بعض جینوئین تخلیقات سے قطع نظر جدید نسل جس نے ترقی پسند افسانوں سے انحراف کیا تھا، اس نے عام طور پر اپنی پہچان پر بیجا اصرار کے لئے کچھ اس قدر شدومد اور جبر سے کام لیا کہ خارجیت، سماج، ثقافت، دانائی، دردمندی اور انسانیت وغیرہ افسانے کے دائرے سے ٹاٹ باہر کر دیے گئے۔

حتیٰ کہ افسانے کے بیشتر بنیادی صنفی اوصاف کے ڈھانچے کو منہدم کر دیا گیا۔ افسانے کی تخریب اور ملبوں کے ڈھیر کو ہی افسانے کے قائم مقام کے طور پر پیش کیا گیا۔ کہانی پن، تاثر، ارتکاز، نقطہ عروج، وحدت زماں، وحدت مکاں، کردار، ریڈیبلیٹی، بیانیہ اور پلاٹ وغیرہ سب کچھ کالعدم قرار دے دئے گئے۔ جیسے تیسے اظہار ذات ہی مقدم ٹھہرا۔ افسانے کا معروضیت سے کوئی علاقہ ہی نہ رہا۔ چند اچھی کہانیوں کو چھوڑ دیجئے (ہر زمانے میں جینوئن حضرات عام طور پر جینوئن فن کاری کرتے رہے ہیں) تو ایک عجیب ہولناک میکانکیت اور منفی داخلیت کا بول بالا ہو گیا۔ ابہام تک تو بات ٹھیک تھی۔ آگے آتے آتے اہمال ہی سب سے مقدم ٹھہرا۔

غرض بعض شدت پسندوں کے ذریعہ وہ انداز اختیار کیا گیا کہ افسانہ، افسانہ ہونے کے بجائے رینڈم رپسوڈی ہو کر رہ گیا۔ یہ ایک ایسی صوت حال تھی جو ایک طرح کی Nihilism کی پیداوار تھی اور انارکی پر منتج تھی۔ افسانہ نگار کسی کی کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھا اور نہ کسی کی شمولیت اور شرکت داری پسند کرتا تھا۔ یہ ایک طرح سے فرار کی راہ تھی۔ زندگی نے اس افسانہ نگار کو بہت جھٹکے دیے تھے اور افسانہ نگار زندگی سے گھبرا کر الٹی سمت بے تحاشہ بس بھاگا چلا جا رہا تھا۔

اسی لیے راقم الحروف نے عرض کیا کہ انامیت اور انام افسانے کے توسط سے دراصل کہانی میں اس کے بنیادی صنفی اوصاف کی بازآفرینی خصوصاً ''کہانی پن'' کی مراجعت پر اصرار کر کے ایک اجتہادی کارنامہ انجام دیا گیا۔ افسانے کو معروضیت، بیانیہ اور سماجی سروکار کے وصف سے لیس کرتے ہوئے اسے اس کے بنیادی خدوخال واپس کئے گئے۔

سب کچھ فنا ہو چکا ہو تو چیزوں کو نئے سرے سے قائم کرنے کا کام کتنا مشکل اور جان جوکھم کا ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سب کچھ اینٹ سے اینٹ جوڑ کر مسمار شدہ عمارت کی جگہ نئی عمارت کھڑی کرنے کے جانکاہ مراحل اور مساعی سے عبارت تھا۔ ۱۹۷۰ء والوں نے اس تخلیقی فریضے کو بحسن وخوبی سرانجام دیا اور افسانے کو افسانویت عطا کر کے اسے اپنے منصب کے حوالے سرخرو ہونے کی کامرانی سے دوچار کیا۔

یہی وجہ تھی کہ جامعہ اسلامیہ کے تاریخی ہندو پاک اردو افسانہ سیمینار ۱۹۸۰ء کے موقع پر گوپی

چند نارنگ کے زیر اہتمام جو دستاویز شائع کی گئی اس میں جدید، علامتی اور تجریدی افسانوں کے ساتھ ساتھ ''انام افسانے'' کا تذکرہ شامل کر کے اس کی نامیاتی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ بیشتر ناقدین نے جزوی اختلافات کے باوجود اس کے فن کاروں کو قابل اعتناء قرار دیا۔ اور ۱۹۷۰ء کے بعد کا افسانہ، انامیت، انام نسل اور انام افسانے جیسی تراکیب نے باضابطہ اصطلاحی اور معنوی حیثیت اختیار کر لی۔

چنانچہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ وقت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کہانی پن، ترسیل کی اہمیت، بیانیہ، معنوی اور تاثراتی ارتکاز جیسے صنفی نشانات اور دیگر اوصاف بتدریج روشن تر ہوتے گئے اور ۱۹۹۷ء میں تقریباً تمام چیزیں کافی حد تک Crystallize ہو گئیں۔ ابھی مزید ارتقا کے امکانات اختتام پذیر نہیں ہوئے۔ زندگی اور ادب کا کارواں کبھی ایک مقام پر رک نہیں سکتا۔ نئی نئی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ زندگی کبھی جامد و ساکت نہیں ہوتی۔ آنے والا زمانہ، نئی نسلیں اور وقت اپنی ضرورتوں کے مطابق اس میں مزید تبدیلیاں پیدا کرے گا۔ مستقبل کے نئے چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے نئے حربے اختیار کئے جاتے رہیں گے۔

خاطر نشان رہے کہ کہانی پن کی واپسی، معنوی ارتکاز، پلاٹ اور ترسیل کا التزام وغیرہ جیسی بنیادی صنفی خصوصیات کو بحال کرنے کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ قبل از جدید افسانے کی چیزوں کو من و عن قبول کر لیا گیا۔ یا روایتی چیزیں ہو بہو پہلے کی طرح واپس آ گئیں۔ بقول کیر کے گارڈ انسان ایک استثناء ہے۔ ایک ندی میں کوئی دوبارہ تیر نہیں سکتا تو بھاری وقت کے بڑھتے ہوئے جدلیاتی تاریخی پہیے کو واپس لے جانا کہاں تک ممکن ہو سکتا ہے۔ چیزیں وقت کے تمام دھاروں کے دریاؤں کو پار کرتے ہوئے اپنی نئی صورتوں میں قائم ہوتی ہیں۔ یہ التباس ضرور ہوتا ہے کہ پرانی خصوصیتیں از سر نو بحال اور رونما ہو رہی ہیں۔

تخلیقی اصناف میں فروعی تبدیلیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ارتقا کے تقاضے کے تحت ہونی بھی چاہئیں۔ رویے، اسلوب اور لہجے تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن صرف اپنی شناخت کی خاطر ردعمل میں اگر اس ڈال کو کاٹنے کی کوشش کی جائے جس پر افسانہ نگار کا مسکن ہو تو انجام کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

سچ پوچھئے تو مابعد جدید افسانہ، جدید افسانے کے نام نہاد منفی عناصر کی ادعائیت سے انکار اور زندگی اور ثقافت کے مثبت عناصر کی بحالی کی تخلیقی کوششوں پر دال ہے۔ اور اس کی بغاوت کے جینوئن عناصر کی صحیح صورتوں میں زندگی کے تنوع کے ساتھ توسیع سے عبارت ہے۔ زندگی کی تغیر پذیر قوتوں اور جدلیاتی پہلوؤں کی توثیق ہے۔

۱۹۷۰ء کے آس پاس کا زمانہ دو گھڑی کے لئے یاد کیجئے۔ نام نہاد جدید افسانے کے انحطاط کا ابتدائی زمانہ۔ افسانے کی بے سر و سامانی ملاحظہ کیجئے۔ علامتیت، تجریدیت، غیر کہانی پن، ذات کا

نوحہ..... یہ سب چیزیں Terror کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ ایک حلقہ ایسا بھی تھا جو اپنی منصوبہ بندیوں اور فامولہ سازیوں کے زیر اثر ہاری ہوئی جنگ مسلسل لڑ رہا تھا۔ اس زمانے کے بیشتر نئے لوگ خاص طور سے راقم الحروف عجیب و غریب dilemma اور تذبذب سے دوچار تھے۔

نئے افسانے کے تخلیقی اور سماجی سروکار نیز اس کا زندگی کے تعلق سے دردمندی کا رویہ بہر حال انہیں اپیل کرتا تھا۔ بے معنویت اور ترسیل کی گم شدگی اور خواہ مخواہ افسانے کو اپنی ذات کے کنوئیں تک محدود کرنے کا عمل انہیں سوٹ نہیں کرتا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ انہیں فوراً برانڈ کر دیا جاتا تھا۔ ایک اور مشکل تھی۔ نام نہاد جدید افسانے، علامت نگاری اور تجریدیت کے نام پر جو چیزیں آ رہی تھیں، ان میں سے بیشتر نہ صرف اوڑھی ہوئی بلکہ مغرب کے حالات کی زائیدہ معلوم ہوتی تھیں اور روایت و ثقافت اور ہندوستانی زندگی کے آلام کے تناظر میں مصنوعی نظر آتی تھیں۔

ایسا نہیں کہ ۷۰ء کے بعد والوں نے جدید افسانے سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس نسل نے بڑے بھائیوں سے پروپیگنڈہ، نعرے بازی، اشتہاریت سے گریز کا سبق مبتدی کی طرح سیکھا۔ مخصوص عہد کے تناظر میں ''کمپوزیشن سیریز'' کی اہمیت سمجھی اور برأت کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ کر ''سچویشن سیریز'' کے افسانے لکھ کر زندگی کے بدلے ہوئے سنگین منظر ناموں کو گرفت میں لیتے ہوئے سماجی سروکار، مسائل اور سیاسی بصیرتوں سے اپنے فن کو ہم آمیز کیا۔ ان کی بغاوتوں کو اپنے افسانوی ٹولس کا حصہ بناتے ہوئے اسے روایت کا درجہ دیا۔ دیگر امور مثلاً منفی داخلیت، کہانی پن کے انہدام اور مربوط بیانیہ کی غارت گری کے خلاف انہوں نے ضروری بغاوت کی اور انہیں مابعد جدید افسانے کی روایت کا حصہ بنایا۔ یعنی ۷۰ء کے بعد کے جینوئن افسانہ نگاروں نے بیک وقت انحراف اور تسلسل دونوں رویوں سے کام لیا۔

دہلی اردو اکادمی کے پانچ روزہ افسانہ سیمینار اور ورک شاپ میں راقم الحروف نے آخری سیشن میں ایک بات کہی تھی کہ ترقی پسند افسانہ عصری حقیقتوں کا علم بردار تھا، جدید افسانہ صرف آفاقی حقیقتوں تک مرتکز تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کا افسانہ عصری و آفاقی حقیقتوں کی آمیزش سے زندگی کو نئی سطحوں پر دریافت کرنے اور معنوی ابعاد پیدا کرنے سے دوچار ہے۔ اس طرح وہ افسانہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے بعد بڑے رینج، ویژن اور بڑے کینوس کا متحمل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اختتامیے میں زندگی کی ہر نوع کی حقیقتوں سے معاملہ کرنے کو انڈر لائن کرتے ہوئے نئی حقیقت پسندی کی شناخت کی ایک اہم کڑی قرار دیا تھا۔

آج مابعد جدید افسانہ توسیعی صورت اختیار کرتے ہوئے آج کی عام زندگی کے زندگی پن، اس کے کھردرے پن اور ٹھوس پن سے آنکھیں چار کر رہا ہے۔ آج کی انسانی صورت حال کا سامنا کر کے

افسانے کی معروضیت اور اثر پذیری کو دو چند کر رہا ہے۔ وسیع تناظر میں اپنے متنوع اسلوب، تازہ لہجے اور رویوں سے زندگی کے آلام، جدوجہد، حرارت، تمام منفی قوتوں کو نیست و نابود کرنے کی چھٹپٹاہٹ کو پیش کرتا ہوا افسانوی ذخیرے میں رنگا رنگ تجربات کا اضافہ کر رہا ہے۔

اس طرح اس نے Alienation سے Alienation اختیار کیا اور کھلے سماجی سروکار، سیاسی آگہی اور ثقافتی اسکورس پر زور دیا۔

مابعد جدید افسانے نے زندگی اور فرد کو پوری Totality میں پیش کیا۔ فرد اور سماج کو لازم و ملزوم گردانا۔ انہیں جزو لاینفک قرار دیا۔ ان کے Interact پر خصوصی استغراق کے بعد زندگی پن اور اس کی سچائی کو اپنے فن کا محور و مرکز بنایا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی افسانے کی بدلی ہوئی صورت حال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''آج کا فن کار بعض چیزوں پر جدیدیوں کے مقابلے میں زیادہ زور دیتا ہے، بعض چیزوں پر کم.....جن چیزوں میں آج کا فنکار جدیدیوں سے ذرا مختلف معلوم ہوتا ہے ان میں ایک تو یہ ہے کہ جدیدیوں کو تجربے کا شوق زیادہ تھا اور اسی اعتبار سے ابہام کو وہ لوگ بالارادہ بھی اختیار کر لیتے تھے۔ آج کا فن کار تجربے کی طرف اتنا راغب نہیں ہے اور ابہام کو وہ ارادی طور پر اختیار نہیں کرتا۔ اگر چہ ترقی پسندوں جیسی وضاحت اور دو اور دو چار والی منطق کو بھی مسترد کرتا ہے۔'' (جدیدیت آج کے تناظر میں'' شمس الرحمٰن فاروقی شب خون ۱۷۶)

گوپی چند نارنگ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''کسی بھی زندہ زبان کا ادب ایک مقام پر رک نہیں سکتا۔ ادب میں تبدیلی ناگزیر ہے اور اتفاق و انحراف کے جزر و مد سے نئی نئی صورتیں اور نئے رجحانات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ کبھی تبدیلیوں کا بخوبی احساس کراتے ہیں اور بدلے ہوئے افسانوی رویوں کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہیں۔''

آج کے افسانے زیادہ مثبت، جیتے جاگتے اور زندگی کی حقیقتوں سے سرشار ہیں۔ وہ پوری زندگی سے نہ صرف وابستہ بلکہ اس میں پیوستہ ہیں اور اپنی فکری و ثقافتی نکتہ رسی اور عقل و شعور کے حربوں سے آج کی مکروہ، سفاک، ریاکار، منفی اور فسطائی قوتوں سے پنجہ آزمائی کر رہے ہیں۔ آج کا افسانہ نگار زندگی کی صلیب کاندھوں پر اٹھانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ زندگی کی صلیب کو جو اس کے ہاتھوں میں قلم کی صورت میں

موجود ہے، بطور ہتھیار استعمال کرنے کی تخلیقی فعالیت سے مابعد جدید افسانوں کو نئی زرخیزی، ہوش مندی اور جہاں بینی عطا کر رہا ہے۔

آج کے افسانوں میں سرخرو وہی ہیں جنہوں نے اپنے تمام اجتہادی رویوں کے باوجود افسانے کی تاریخی روایت اور تسلسل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی ہے اور اب تک کے تمام سرمایے کا ایماندارانہ احتساب کیا ہے۔ Hostility کے رویے سے گریز کیا ہے۔ ہر نسل کے تجربوں سے مستفیض ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے کہ چیزیں ہوا میں معلق نہیں ہوتیں اور نہ آسمان سے ٹپکتی ہیں۔ ہم تمام روایات کو جذب کئے بغیر اپنی بات کو پر اثر طریقے سے پیش نہیں کر سکتے۔

اس کے لئے فن کاروں کو Obsession سے نکلنا ہی پڑتا ہے۔ ہر طرح کے Regimentation سے انکار کرتے ہوئے تخلیقی آزادی کی فضا کے مستقل قیام کے لئے اپنا دباؤ بنانے رکھنا ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انتہا پسندیوں سے گریز کرتے ہوئے ماڈریٹ اور پختہ رویوں سے کام لینا ہوتا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ وقتی اشتعال اور اضطرار کی کیفیتیں ٹکاؤ نہیں ہوتیں۔

خواہ مخواہ غیر ضروری نکتوں پر صرف اپنی مختلف شناخت پر اصرار اور مخالفت برائے مخالفت جیسے کچے رویوں سے بچنا ہوتا ہے۔ آج کے افسانہ نگاروں نے ماضی کی ان کوششوں سے انحراف کیا ہے جن میں محض دو یا تین افسانہ نگاروں کو بت بنانے کا رواج عام رہا ہے۔ افسانہ نگاروں کے پورے کے پورے جتھے کی کارگزاریوں کو جمہوری طریقوں سے افسانے کے ناگزیر حصوں میں شمار کرنے کا چلن عام ہوا ہے۔ آج کا دور گنے چنے اور اچھالے گئے چند نام نہاد افسانہ نگاروں کا عہد نہیں بلکہ بیک وقت بے شمار اہم اور اچھے جینوئن افسانہ نگاروں کی بھرپور جماعت کا عہد ہے۔

آج کا افسانہ محض چرب زبانی، کرتب بازی اور لفظوں کا گورکھ دھندا نہیں۔ فکری نقطہ نظر اور سماجی موقف سے احتراز بھی اس کا شیوہ نہیں۔ آج افسانہ نگار زندگی کی سنگین حقیقتوں کا جلتا ہوا فن پارہ ہے جس میں پوری زندگی اپنے تیز دھاروں اور جوار بھاٹا کے ساتھ زندگی کی ناگزیریت کو مترشح کرتی ہے۔ آج کا افسانہ نگار اپنی ثقافت، تشخص اور سماجی سروکاروں نیز سیاسی بصیرت کے ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو اکٹھا کر رہا ہے۔ ان کے رشتوں کی اہمیت کو تسلیم کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسے ان امور کی تخلیقی آگہی کے ذریعہ افسانے کو زندگی کرنے کا نہ صرف التباس پیدا کرنے کا وسیلہ بنانا ہے بلکہ سچ مچ زندگی کرتے ہوئے اس کی توسیع، ارتقا اور اس کے تغیر میں اپنا تخلیقی رول ادا کرنے کا فریضہ پورا کرنا ہے۔ تخلیقی کردار کی ادائیگی کے ان

پہلوؤں سے روگردانی خود افسانے کی توسیع کے نامیاتی عنصر پر قدغن لگانے کے مترادف ہے۔

آج کا افسانہ کلیشے کے استعمال سے گریز کر رہا ہے۔ علامت وابلاغ آمنے سامنے مصافحہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ فارم کا کوئی Regimentation نہیں رہا۔ تجریدی، لایعنی، استعاراتی کسی طرح کا کوئی جبر نہیں۔ سیدھے سادے انداز کی بھی حیثیت مسلم ہے۔ شرط یہ ہے کہ راست انداز سپاٹ بیانیہ کی طرح سکڑا اور سمٹا ہوا نہ ہو۔ فن پارہ میں تہہ داری اور تخلیقی تجزیاتی انداز کی طغیانی اور زندگی کا ارتعاش اور جنبش موجود ہو۔

مابعد جدید افسانے میں حقیقت کی تصویر کشی اور حقیقت کی از سر نو تشکیل ہی نہیں بلکہ کہیں کہیں حقیقت کو نابود کرنے کے عمل سے گزرتے ہوئے حقیقت کی نوعیت کو بدلنے اور تخلیقی سطح پر تجرباتی اور بقول حامدی کاشمیری اکتشافی مراحل کا پہ صراط پار کرنے کی جان کاہ سعی ملتی ہے۔ فن کار حقیقت کو محض آئینہ دکھانے کے بجائے حقیقت میں داخل ہو کر اس کے اندر نئے معنوی افق دریافت کرتا ہے۔

آج کا افسانہ از خود اپنا جواز بھی فراہم کرتا ہے اور Critical cultural discourse کے ذیل میں آتا ہے۔ آج فکشن کی جدید ترین شکلوں میں بیک وقت افسانہ نگار اپنے فن اور زندگی کی حقیقتوں میں ناقدانہ حیثیت سے بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اپنے تجربوں کے نتائج کی روشنی میں بصیرت افروز مفکر کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ جدلیاتی قوتوں کو سمیٹنے کی تخلیقی کوشش ہی افسانے کو قبل کے افسانوں سے آگے بڑھاتی ہے اور اسے زندگی کے نئے تقاضوں کے روبرو ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

آج افسانے میں صرف سچویشن اور کرداروں کا بیان، تاثراتی ارتکاز اور نقطہ عروج جیسے امور کا التزام ہی کافی نہیں۔ آج افسانے کو کہیں کہیں Decisive اور Analytical بھی ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر وہ صرف فوٹو گرافی یا اکسرے ہے۔ تجزیاتی اور تہہ دار رویے کے بغیر زندگی کی پیچیدگی کا حق ادا ہونا آسان نہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کہانی پن کو اسی نسل نے بعد ازاں اپنایا جس نے کہانی پن کے بنیادی ڈھانچے کو مسمار کیا تھا۔ اسی نسل کے بعض حضرات نے ۷۰ء کے بعد کے مابعد جدید افسانہ نگاروں کو معتوب کرنا شروع کیا کہ ان لوگوں نے ابھی لکھا ہی کیا ہے۔ شاعر جلد ۶۵ شمارہ ایک میں احمد ہمیش اور شب خون شمارہ ۱۷۴ میں سریندر پرکاش کی تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ لوگ ۷۰ء کے بعد والوں کو کہانی پن اور صنفی تقاضوں کے احترام اور بحالی کے لئے کریڈٹ دیتے، انہیں اپنے جانتے رد کر کے ان کے کارناموں کا سہرا بھی اپنے سر باندھنا چاہتے ہیں۔

یوں تو مابعد جدید افسانے کے لئے، فکر، تخیل، استعارہ، تجریدیت، علامت سب کے سب یا ان میں سے چند یا محض کوئی ایک سروکار وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جینوئن افسانے کو سب سے پہلے زندگی سے آنکھیں چار کرنی پڑتی ہیں۔ عملی سطح پر خود کو کھپاتے ہوئے ارتکاب اور واردات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد فکر، تخیل اور دوسرے سروکاروں کی باری آتی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے علاوہ تمام چیزوں کی فروعی حیثیتیں ہیں۔ زندگی کی بنیادی ماہیت ہی کہانی کے بنیادی جوہر اور تخلیقی بیج کی حیثیت رکھتی ہے جس کی آبیاری کے لئے فروعی سروکاروں کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح افسانے کے شجر کی تخلیق ونمود جلوہ گر ہوتی ہے۔

مابعد جدید افسانہ وہ تخلیقی صنف ہے جس میں بیک وقت فکر، استدلال، لاشعور، تحت الشعور، شعور، Delibration، واردات، تکنیک، ہیئت، اسلوب، ادراک، ویژن رچے بسے اور گھلے ملے ہوتے ہیں۔ غالباً اسی لئے تمام تخلیقی اصناف میں اس صنف کا آج کی زندگی اور لازوال زندگی کے تناظر میں بیش قیمت رول اور اہمیت تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

شاید زندگی اور انسانی سائکی کی تصویر گری کے لئے اس سے بہتر کوئی اور تخلیقی صنف نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اسے کہیں کہیں، کبھی کبھی نیم تخلیقی سطح پر آنے کی کثافت سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

مابعد جدید افسانے نے کرداروں کو ان کے چہرے واپس کئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو توڑا ہے۔ انہیں زندگی کی آزاد فضا میں از خود نقل وحرکت کا موقع فراہم کیا ہے۔ ان کے چہروں کے طبقاتی اور ثقافتی بیک وقت دونوں تشخص کے نشانات کو فوکس کیا ہے۔ مابعد جدید افسانے کے دائرے سے کہیں کچھ چھوٹتا نہیں اور جو کچھ چھوٹتا ہے وہ از کار رفتہ اور تخلیقی طور پر غیر کارآمد ہوتا ہے۔

آج افسانے کو Radical افسانہ، مابعد جدید افسانہ، اکیسویں صدی کا افسانہ خواہ کوئی بھی نام دیا جائے اس کا اولاً فلسفہ ہونا اور زندگی اور قاری سے جڑا ہوا ہونا ہی اس کی معراج ٹھہرتا ہے۔

(اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ: مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ۱۹۹۸)

◀◀ ● ▶▶

● **شوکت حیات**

میری تھیوری سازی اور میرے افسانے

۱۹۷۰ء کے آس پاس میں نے باشعور طریقے سے افسانے کی تاریخ کے تسلسل میں رہتے ہوئے تخلیقی سطح پر لکھنا شروع کیا تو وہ زمانہ اتفاق سے بیک وقت ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے عروج وزوال کا تھا۔فکری رجحانات اور فنی میلانات تو چلتے رہتے ہیں لیکن حقیقتاً دونوں مذکورہ رجحان اس وقت اپنے اپنے وجود کے اثبات کی لڑائی لڑ رہے تھے اور اس کا انہیں بے حد آسان طریقہ یہ دکھائی دیا کہ ۱۹۷۰ء سے ابھرنے والی نئے ذہین افسانہ نگاروں کی بھیڑ کو انہوں نے اپنے اپنے ازم اور رجحان سے برانڈ کرنا شروع کر دیا۔

میں چونکہ سائنس کا آدمی تھا اور اپنے ڈھنگ سے افسانے لکھ رہا تھا۔سوچنے، سمجھے برتنے کا تمام میرا افسانوی نظام،فکر، لہجہ، تیور رویہ، تکنیک، ٹریٹ منٹ اور عندیہ اپنا تھا۔ہمیں کیا نہیں لکھنا ہے۔یہ اجداد اور بزرگوں سے سیکھا تھا (ان کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے) لیکن ہمیں کیا لکھنا ہے، یہ اپنے آپ سے، اپنے عہد، اپنے مشاہدے اور تجربے سے سیکھا، میں نے خود کو اور اپنے دوستوں کو ترقی پسندی اور جدیدیت سے مختلف اور نیا سمجھتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ ہمیں برانڈ نہ کیا جائے اور ہم نے خود کو (چونکہ اس وقت کوئی نام ذہن میں نہیں آ رہا تھا) انام، انامیت پسند اور بے نام نسل کے افسانہ نگار کہنا شروع کر دیا تا کہ ہماری اپنی علیٰحدہ شناخت قائم ہو۔

ہم اس میں کامیاب ہوئے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد جتنے بھی بڑے سمینار (انجمن تہذیب نو، الہ آباد نئی کہانی نئے مسائل ۱۹۷۹ء جامعہ ملیہ دہلی سہ روزہ ہندو پاک سمینار اردو افسانہ روایت اور مسائل ۱۹۸۰ء دہلی اردو اکادمی کا پانچ روزہ اردو افسانہ ورکشاپ ۱۹۸۵ء، نیا افسانہ، انتخاب، تجزیے اور مباحث، دہلی اردو اردو اکادمی کا اردو ادب کا بدلتا ہوا منظر نامہ، مابعد جدیدیت کے حوالے سے ۱۹۹۷ء منعقد ہوئے ان سب میں ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگار حاوی رہے۔سچ پوچھئے تو ہم ہی لوگوں نے (۱۹۷۰ء کے بعد والوں نے) اردو افسانے میں تخلیقی آزادی کی فضا بحال کی۔

اس تھیوری کے تعلق سے میں نے متعدد مضامین اور کتاب نما کا مہمان اداریہ ''سن ستّری اور

نامیاتی افسانے: انحراف اور تسلسل اگست ۱۹۹۷ء'' لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔

جب ہماری شناخت مستحکم ہو گئی تو میں نے افسانے کے ایسے فکری و فنی عناصر پر زور دینا شروع کیا جو اسے ایک عہد میں محدود نہ رہ کر ہر عہد میں زندہ رہنے والے افسانے بنا سکیں۔اس کے لیے میں نے ''قوت نامیہ'' پر زور دیا اور اس طرح امتداد وقت کے ساتھ اپنے عصری افسانوں کی آفاقیت کے لئے ''نامیاتیت'' کی تھیوری پیش کی اور باضابطہ کتاب نما کا مہمان اداریہ بعنوان ''نامیاتیت اور نامیاتی افسانہ مئی ۲۰۰۳ء'' لکھا جو کافی مقبول ہوا۔اور نامیاتی افسانوں کی داغ بیل ڈالی۔

نامیاتی افسانے وہ ہیں جو کسی بھی عہد کے ہوں لیکن ہر عہد میں ان میں فکری و فنی سطح پر Grow کرنے کی صلاحیتیں اور نئے عہد کے تقاضوں کے تحت متن کے نئے معیناتی نظام قائم رکھنے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں۔پھر میں نے نامیاتی افسانے لکھے۔ہر عہد کے ہر جینوئن فن کار کی اعلیٰ تخلیق دراصل نامیاتی ہے اور نامیاتیت کے crux کے عنصر سے مملو ہے۔

پھر سارک رائٹرس کانفرنس ۲۰۰۵ء میں میں نے (مقالہ کے عنوان کی آزادی کی وجہ سے) ''امکانیت پسندی'' پر مبنی تھیوری کی بنیاد گزاری کی اور اس کے تحت افسانوں کے فنی، فکری، حرکی، ہیتی جدلیاتی، ریڈیکل اور امکانی اختصاص پر زور دیا۔میرا مضمون ''معاصر اردو افسانہ، تغیر و تبدل اور امکانی حقیقت نگاری'' سارک رائٹرس کانفرنس کی کتاب ''سارک ممالک میں معاصر افسانہ'' نگراں قاضی افضال حسین، مرتبصغیر افراہیم شعبہ اردو علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں شامل ہے۔میرے اس موقف کو مرزا حامد بیگ، رشید امجد، بیگ احساس وغیرہ نے کافی پسند بھی کیا۔

چنانچہ آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہی افسانہ عصری و آفاقی ہے جو عصریت و آفاقیت کے امتزاج، انجذاب اور وفاق سے سرشار ہو کر افسانے کی توانائی میں اضافے کا سبب بنتے ہوں۔

میں نے جوگندر پال، بلراج مین را، احمد یوسف، غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، کلام حیدری، اقبال مجید، سریندر پرکاش، رتن سنگھ، شرون کمار ورما، اقبال متین، شفیع جاوید، عابد سہیل محمود ایوبی، شفیع مشہدی، نند کشور وکرم وغیرہ کی پیڑھی کے میلانات سے فکری، ہیتی، ٹریٹ منٹ، رویے، لہجے، تیور اور عندیے کی سطح پر خود کو ممیّز کرنے، اپنے انفراد و امتیاز کو نمایاں کرنے اور بڑے بھائیوں سے حد فاصل قائم کرنے کے لئے بلراج منیرا کی ''کمپوزیشن سیریز کے برخلاف ''سچویشن سیریز'' کے متعدد افسانے لکھے جو متعدد رسائل (شب خون، اظہار، جواز، نشانات، الفاظ وغیرہ) میں شائع ہوئے اور از حد پسند کئے گئے۔بلیغ ابہام تو تھا اور کہانی پن بھی لیکن ترسیل کی ناکامی کے المیے سے گریز کیا گیا تھا۔مضمون بھی

لکھا ''سچویشن سریز کیوں؟'' جو جواز کے خاص نمبر میں سچویشن ۶ ''آ گے'' افسانے کے ساتھ شائع ہوا۔اس کے علاوہ کیفیت سیریز کے بھی کئی افسانے لکھے جو زندگی کے Subtle عناصر پر مشتمل تھے۔یعنی میں برابر مختلف النوع تجربے کرتا رہا۔اگر زندہ رہا تو افسانے کے دوسرے مجموعے میں انہیں شائع کروں گا۔

میرے افسانے اس تناظر میں دیکھے جائیں کہ یہ وہ نئے جدید اور مابعد جدید افسانے ہیں جو دراصل نامیاتی اورامکانی ہیں اور انامیت ، نامیاتیت اورامکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں۔ان افسانوں میں آج کے عہد اور آج کے انسان، اس کے مسائل کو نئے ڈھنگ ، لہجے، تکنک ، ٹریٹ منٹ، موضوع، فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں اپنے تمام بڑے بھائیوں ، دوستوں اور چھوٹے بھائیوں کا ممنون ہیں جنہوں نے مجھ سے افسانے کے مجموعے کی اشاعت کے لئے ہمیشہ اصرار کیا۔

میں اپنی بیگم ارشاد پروین، بیٹے اتم حیات عرف منال، بیٹی اناحیات عرف منشا اور اسّو پھوپھی (بلقیس بیگم) کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی مساعی اور تعاون سے اس کتاب کی اشاعت کا مرحلہ تکمیل کو پہنچ سکا۔وہ خود عورتوں کے مسائل پر ایک زمانے میں کہانیاں لکھتی تھیں جس کے تذکرے میری افسانہ نگاری کو مہمیز کرتے تھے۔

اپنے مرحوم والد جناب سید محفوظ الحق (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کا ذکر بھی ضروری ہے۔جن کے پڑھنے کے ذوق، کتابوں کے ڈھیر اور مجھے ڈائری لکھنے کی ہدایت نے مجھے افسانہ نگار بننے کی منزل تک پہنچایا۔

افسانوں پر آپ لوگوں کی رائے اور تاثرات کا انتظار رہے گا۔

◄◄ ● ►►

نئی کتابیں

نام کتاب : مظفّی کے نام (کچھ ادبی خطوط)	نام کتاب: دریافت اور بازیافت
مرتب : انجینئر فیروز مظفر	(اردو فکشن پر تحریریں)
سال اشاعت: ۲۰۲۲ء	مصنف: دائم محمد انصاری
قیمت : ۵۰۰/روپے	سال اشاعت:۲۰۲۱ء قیمت :۳۰۰/روپے

● شوکت حیات

گنبد کے کبوتر

بے ٹھکانا کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔

متواتر اُڑتا جا رہا تھا۔اوپر سے نیچے آتا۔بے تابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گُنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اُڑ جاتا۔

اُڑتے اُڑتے ان کے بازو شل ہو گئے۔جسم کا سارا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔بس ایک اُبال کی دیر تھی کہ چاروں طرف.....

لیکن یہ پڑوسیوں کے بچّے بھی کم بدمعاش نہیں۔مرغیوں کے ڈربے میں آدمی رہنے پر مجبور ہو جائیں اور مرغیاں وسیع وعریض ہال میں چہل قدمی کرنے کی سعادت حاصل کر لیں تو کئی باتوں پر نئے سرے سے غور کرنا ہوتا ہے۔لیکن بچّے تو بچّے ٹھہرے۔اپارٹمنٹ کے بچّے ہوں یا عام قصباتی گلیوں اور جھونپڑ پٹیوں کے بچّے .....

بچّے بھی اتنے بے ہنگم ہوتے ہیں.....اتنا شور مچاتے ہیں.....سارے فلیٹ کو سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ لیکن سر پر اُٹھانے کے لئے شہر کے سب سے بڑے اپارٹمنٹ کا سب سے چھوٹا وَن بیڈروم یونٹ یعنی اس کا فلیٹ ہی تھا جس میں کھیل کوُد کی سب سے کم گنجائش تھی۔کارپیٹ ایریا کے نام پر چند انسانوں کے سانس لینے کے لئے جسم کے ملنے ڈلنے بھر کی جگہ دی گئی تھی۔چاروں طرف سے بند ڈربے میں۔بس ایک چھوٹی سی بالکنی ہی راحت پہنچاتی تھی ،جس کے بڑے حصّے میں متعدد گملے سجے ہوئے تھے۔گملوں میں اَنواع واَقسام کے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔گلاب، چنبیلی زنّیا، کروٹن اور.....جینے کی آرزو کے استعارے.....

دن بھر کا تھکا ماندہ، ہانپتے کانپتے بغیر لفٹ کے اپارٹمنٹ کی چوتھی منزل پر پہنچ کر وہ اپنے فلیٹ کی کال بیل بجاتا؛ بدحواسی پورے وجود پر طاری ہوتی۔

بچّے پیروں سے لپٹتے کاندھوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے۔

''تم لوگ اب تک کلچرڈ نہیں ہو سکے.....

دوسرے بچّوں کو دیکھو.....سیکھو کچھ ان سے.....کس طرح نہ ہونے کی طرح ہوتے ہیں۔یہی تو

ان کی شناخت ہے.....!''

لیکن چھوٹی سی بالکنی میں آ کر بیٹھ جاؤ.....گرم گرم چائے کی ایک پیالی مل جائے اور بچّے خاموش اور مصروف ہوں تو معلوم ہوتا کہ زندگی میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ جنّت میں اس سے زیادہ لُطف آئے گا بھلا.....ساری تکان دُور ہو جاتی۔

اپارٹمنٹ کے کیمپس میں بڑے سے پیپل کے درخت کو بلڈر نے اپنی جگہ سالم چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ایک شاخ اس کی بالکنی تک پھیلی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کے اس پہاڑ کے ساتھ پیپل کے درخت کا کولاژ جدید مصوّری کے شاہکار نمونے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

گوریّوں کا جھُنڈ چہچہاتا ہوا اپارٹمنٹ کی اس بالکنی میں منڈلاتا رہتا اور زندگی کی خوبصورتی کے گیت گاتا۔ ایک نٹ کھٹ گلہری تیزی سے آتی اور شرارت بھری آنکھوں سے اُسے گھورتی ہوئی پیپل کے درخت کی ٹہنی کے راستے پیڑ پر واپس چل دیتی۔ ہواؤں کی خنکی میں سورج کی سُنہری کرنوں کی گرمی من پسند دلربا اور سیم تن کی گرمی سے ذائقہ دار ہم آمیزی کا لُطف دیتی۔

زندگی اتنی سفّاک نہ بن.....

سب کچھ داؤں پر لگا کر تجھے حاصل کیا ہے یا ہنوز.....

تجھے پانے کی جستجو میں ہوں.....

وہ دھیمے دھیمے سُر میں گنگناتا۔

وہسکی اور بیئر کو ملا دو تو اس کی تلخی دماغ کو جھنجھناتا ہوا لطف عطا کرتی ہے۔ سارا وجود ہلکا ہو کر آسمان میں اُڑنے لگتا ہے۔ اوپر سے دیکھنے پر زمین پر چلنے والے لوگ کتنے بونے نظر آنے لگتے ہیں۔

ہوائیں تیز چلنے لگیں۔ پیپل کے پتّے ہلنے لگے۔ پیپلیاں ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ گوریّوں کی چہچہاہٹ معمول سے مختلف سماعتی پیکر اختیار کر رہی تھی۔

بغل والا پڑوسی کہہ رہا تھا۔

اس بار پچھلے سال والا اُبال نہیں۔ دن خیریت سے کٹ جائے گا۔ موسم ٹھیک ہے۔ جینے کی چاہت قائم ہے.....آپ بھی مزے سے رہیے۔

نو پرابلم.....''

اپارٹمنٹ کے تمام بچّوں کو میرے ہی فلیٹ میں مجمع لگانا تھا۔ ان کی کوئی کانفرنس ہے کیا۔ ٹو بیڈ روم اور تھری بیڈ روم کے بڑے بڑے فلیٹ چھوڑ کر ون بیڈ روم فلیٹ میں ان کا جماؤ..... ہر جگہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے.....لیکن تمام چھوٹی مچھلیاں مل کر بڑی مچھلی کا روپ دھارن کر لیں تو.....!''

ٹیلی ویژن آن تھا۔ پرائیویٹ چینل کے پروگرام چل رہے تھے۔ دودھیا اسکرین پر تاریخ کی طویل صدیاں لمحوں کی نوک پر خود بخود آخری ہچکی لے رہی تھیں۔

''کوئی تو سمجھائے ان بچّوں کو جا کر..... ناگفتہ بہ حالات میں کیا آسمان سر پر اُٹھا لینے کا ارادہ ہے.....کلیوں، پھولوں اور تلسی کی پتیوں، میرے گملوں پر کوئی ضرب نہ آ جائے..... بڑی محنت سے انہیں سینچا ہے.....اجی سُنتی ہو.....ذرا دیکھو.....اچھا چھوڑو.....شریف آدمی کو تو مرنا ہی پڑتا ہے.....کچھ مت کہو..... بچّے تو بچّے ہی ہیں..... پڑوسیوں کے بچّے..... ہمکلیں گے بھی تو کس حد تک جائیں گے.....!''

بغل والے فلیٹ کے ینگ مین آف سکسٹی ٹو سین دادا کے ساتھ باہر نکلنے سے پہلے اس نے بیوی سے بدبداتے ہوئے کہا۔ پھر ان کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے دُور تک نکل گیا۔ دادا بول رہے تھے۔

''ہاں صاحب' گھبرانے کی بات نہیں -- سب کچھ نارمل ڈھنگ سے ہو رہا ہے۔ اضطراری چیزیں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتیں۔ اَمن و استقامت کی راہ اپنا کر ہی ہم اور آپ چین اور سُکھ کی زندگی گزار سکتے ہیں..... میں تو پچھلے سال کے مقابلے میں بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ راوی چین اور راحت کی سانسیں لکھتا ہے!''۔

پرانے زمانے کے سین دادا اس کے ساتھ ہوتے تو اردو کے ثقیل الفاظ کچھ زیادہ ہی استعمال کرتے تھے۔

سڑک پر گاڑیاں معمول کے مطابق چل رہی تھیں۔ چھٹّی کے دن چہل پہل کی جو کمی عام طور پر دیکھی جاتی ہے، وہ اُس روز بھی تھی۔

پڑوسی نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

''ارے صاحب، کیوں سوگواری کا موڈ طاری کیے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں آپ اپنی بالکنی اپنے پودوں اور گملوں کے تحفظ کے لیے بے چین ہیں۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کے سارے گملے خیریت سے رہیں گے۔ اب دوستوں سے ملنے چل رہے ہیں تو یوں اداس نظر آنا چھوڑیے.....انجوائے کیجیے...دیکھئے گول گول گنبدوں کی گولائی اور نوکیلے اُبھار.....اُف.....سامنے کے پُرکشش منظر سے جسم میں عجب ترنگ پیدا ہو رہی ہے..... ذرا دیکھئے آپ بھی.....!''

''اس عمر میں دادا آپ.....!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا دل دوسرے گُنبدوں میں اُلجھا ہوا ہولناک کیفیات سے گزر رہا تھا۔ سین دادا نرم و گداز جسمانی گنبدوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چٹخارے بھر رہے تھے۔

''عمر کی کیا بات کرتے ہو..... ہمیشہ خود کو جوان سمجھو.....یہی زندگی ہے.....دیکھنا اور دیکھتے ہوئے ان رنگین تصویروں میں ڈوب جانا اور بار بار ڈوبنا اُبھرنا.....!''

سین دادا نے پھر کہا۔

''ینگ مین، تم جوانی میں بوڑھا ہو گیا۔ ذرا نظر تو اُٹھاؤ!''

سین دادا نے اس کے شانے پر اپنی انگلیوں کی گرفت سخت کی۔

آگے تین قیامتیں فاختاؤں کی چال چلتی ہوئی گپ شپ میں مصروف تھیں۔

''سین دادا آپ ان فاختاؤں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ذرا اوپر دیکھئے۔ بے ٹھکانا کبوتروں کا غول مستقل آسمان میں چکر کاٹ رہا ہے۔ اپنے مُستقر کے بے دردی اور بربریت کے ساتھ مِسمار کر کے غائب کر دیے جانے کے بعد کیسی بے گھری اور بے امانی جھیل رہا ہے۔ آپ ان کبوتروں کی آنکھیں دیکھ رہے ہیں۔ ....ان میں اُترتا خون، بیچارگی اور کچھ کر گزرنے کی تڑپتی ہوئی آرزوئیں محسوس کر رہے ہیں....!''

سین دادا اپنی دُھن میں مگن تھے۔ آسمان کی طرف نظر اُٹھانے کی ضرورت کیا تھی۔ ان کے پاس تو پوری زمین تھی اور زمین پر آسمانی جلوے موجود تھے--- وہ ان سنِ رسیدہ لوگوں میں تھے جن کی آنکھوں سے بیویوں کے مرجانے کے بعد شہوت کے شرارے پھوٹتے رہتے ہیں۔

اسے یاد آیا کہ ایک روز جب گارڈ نے اطلاع دی کہ اپارٹمنٹ کے نیچے ایک سانپ نظر آیا ہے تو سب پر وحشت طاری ہو گئی تھی۔ پورے اپارٹمنٹ میں ریڈ ایلرٹ کر دیا گیا تھا۔ لوگ رات بھر سو نہیں پائے۔ ادھر اُدھر سے مانگ کر ڈنڈے اور لاٹھیاں جمع کر لی گئیں۔ کھڑکی دروازے سب کے سب مقفّل تھے۔ آنکھیں پہرے دے رہی تھیں۔ لیکن ہر آن یہ ڈر تھا کہ روشنی گُل ہو گئی یا آنکھیں لگ گئیں تو پتہ نہیں سانپ کس کو ڈس لے۔

اسے تو بس اس بات کی فکر تھی کہ اس کی بالکنی میں آنے والی گلہری اور گوریّوں کا جھُنڈ متوحش نہ ہو جائے۔ کہیں سانپ اُنہیں نہ ڈس لے۔ مَبادا اس کے رنگ برنگ پھولوں والے گملوں، گلہری اور گوریّوں سے جو کولاژ بنتا ہے، اس پر سیاہ بادل منڈلانے لگیں۔

وہ چپ چاپ ایک لوہے کی چھڑ لے کر اپنی بالکنی میں جا کر بیٹھ گیا۔ بالکنی میں گوریّوں نے چھوٹا سا گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ چوں چوں کی آوازیں رنگین روشن فواروں کی طرح پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس کے ایک ہاتھ میں تین سیل والی ٹارچ تھی۔ اس کی بیوی بک بک کرتی رہی۔ اسے بُرا بھلا کہتی رہی۔ بالکنی سے ہٹنے کی ہدایت دیتی رہی۔ اُس نے طرح طرح سے اُسے سانپ کے زہر سے ڈرانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ سنی، آخر کار اُسے کہنا پڑا کہ اگر بہت ڈر لگ رہا ہے تو بالکنی

کے دروازہ اندر سے بند کر لے۔ وہ گوریّوں کے گھونسلے کی حفاظت پر مامور رہے گا۔ بہت دیر تک اس کی بیوی بچّے منت سماجت کرتے رہے۔ اسے خبطی اور بیوقوف قرار دیتے رہے۔ لیکن اس نے گوریّوں کی ننھی سی جانوں سے لاپروائی کے لئے خود کو کسی قیمت پر آمادہ نہیں کیا۔

کسی فلیٹ میں سانپ نہیں ملا۔ تمام کونے کھدرے جھاڑے گئے۔ بکس اور کپ بورڈ کی چھان پھٹک کی گئی۔ بچّے تو بچّے ہی ٹھہرے کچھ دیر تک سانپ کا چکّر انہیں دلچسپ تماشے کی طرح لگا۔ بڑوں کے کاموں میں وہ پوری تندہی کے ساتھ ہاتھ بٹاتے رہے۔ بعد ازاں سب کے سب تھک کر جہاں تہاں سو گئے۔ بڑے بوڑھے رات بھر جاگتے رہے اور بالآخر صُبح ہونے پر سب کے سب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک افواہ تھی جو اُنہیں رات بھر پریشانیوں میں مُبتلا رکھنے کے لئے اُڑائی گئی تھی۔ تفتیش کی گئی کہ سب سے پہلے یہ خبر کس نے اُڑائی تھی۔ آخر کار اپارٹمنٹ کا گارڈ شک کے گھیرے میں آ گیا۔ سب اسی کی کرتوت ہے۔ محافظِت کی ذمّہ داری میں وہ گھپلا کر رہا ہے۔

صُبح کی نرم و نازک ہواؤں کے ساتھ تتلیاں اُڑتی ہوئی پھولوں کی طرف آئیں۔ بھنورے پھولوں کا چکر کاٹنے لگے۔ گھونسلے سے گوریّوں کے جُھنڈ نے دانہ چگنے کے لیے اُڑان بھری۔ سورج کی نرم کچی کرنوں نے اس کی بالکنی کو گلے لگایا تو اُسے محسوس ہوا کہ جینے کے جواز ابھی ختم نہیں ہوئے۔

''دادا میرا دل نہیں لگ رہا ہے...اب واپس چلیں ..... نہ معلوم میرے پھولوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ بچّوں کی بھیڑ کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے.....!''

تم خواہ مخواہ وہمی ہو گئے۔ کسی نہ کسی فلیٹ میں سب برابر اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس بار تمہارے فلیٹ کی باری ہے۔ آخر تمہارے بچّے بھی تو ان میں شامل ہیں.....گھبرانے کی کیا بات ہے.....؟!''

''دادا.....میرا دل نہ جانے کیوں گھبرا رہا ہے..... یہ بے اماں کبوتروں کا اُڑتا ہوا غول دماغ میں عجیب قسم کی وحشت پیدا کر رہا ہے۔ ان کی جائے اماں ان سے چھن گئی۔ گنبدوں کی بلندی دھول چاٹ رہی ہے۔ یہ کبوتر اب کہاں جائیں دادا.....انہیں کہاں آسرا ملے گا؟''

''تم ینگ مین ..... پازیٹو ہو کر سوچو تو ہر جگہ ٹھکانا ہی ٹھکانا ہے۔ گنبد، پہاڑوں کی سفاک چوٹیاں، پتھریلے غار اور گھنے جنگل کے درختوں کی ڈالیاں .....موسموں کے سرد و گرم جھیلنے کے لئے تیّار رہو.....یار.....یار، اپنی کھال تھوڑی کھُری کھُری بناؤ!''

ہر طرف اندر ہی اندر مختلف آہٹیں تھیں۔

کہیں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں، کہیں شہنائی پر ماتمی دُھن بج رہی تھی۔ ایک مدّت کے بعد وہ عجیب و غریب لمحہ ایک نقطے پر مُنجمد ہو گیا تھا، جہاں سے بیک وقت خوشیوں اور غم کے دھارے پھُوٹ رہے

تھے بظاہر چاروں طرف سراسیمگی اور گہرا سنّاٹا تھا جو آنے والے بڑے طوفان کا نقیب معلوم ہو رہا تھا۔

سین دادا دونوں جذبوں سے یکسر بے نیاز تھے۔ ان پر شہوانی جذبات حاوی تھے۔ جن دوستوں کے ہاں جا رہے تھے، ان کی عورتوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کئی جگہوں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں مسٹر تھامسن کے گھر پہنچے۔ مسٹر تھامسن مہمان نواز انسان تھے۔ انہوں نے جھٹ نئی بوتل نکال لی۔ گلاس سامنے رکھ دیے۔ ان کے گھر کی نوجوان خادِمہ مس ریزہ بڑی پھرتی سے ہر کام میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔

جھٹ پٹ اس نے فریج میں رکھے ہوئے گوشت کے قتلے کیے اور اُنہیں فرائی کر کے ان کے آگے رکھ دیا۔ گرم گوشت سے اُٹھتی ہوئی بھاپ سے سین دادا کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ مسٹر تھامسن پہلے ہی سے شغل میں مصروف تھے۔ ان کا نشہ آسمان کو چھُو رہا تھا۔ سین دادا بھی مست ہو رہے تھے۔ ان سے برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے نیم برشت کا جو کی پلیٹ لاتی ہوئی مِس ریزہ کی ننگی گرم پنڈلی پر اپنی لرزتی ہوئی اُنگلیاں رکھ دیں۔

اس نے بڑے پیار سے سین دادا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت بھرا بوسہ دیا اور اُن کا پیگ بنا کر گلاس اُن کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک لمحے کے لئے اُن کی مدّت کی پیاس بُجھ گئی۔ دل کو قرار آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے ان کی تڑپ اور شدّت اختیار کر گئی۔ شریانوں میں خون کا دباؤ بڑھ گیا------ اُن کی اُنگلیاں ایک بار پھر مس ریزہ کی بَرہَنہ پنڈلی کو چھوتی ہوئی اس کی سڈول جانگھوں کی طرف رینگنے لگیں۔

مس ریزہ کچھ دیر مبہوت رہی۔ کوئی تاَثُّر اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ اس نے کوئی تعّرض نہیں کیا۔ ان کی اُنگلیاں اور آگے بڑھنے لگیں۔

مِس ریزہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

دراصل مس ریزہ سین دادا کو دیکھ کر ماضی کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔ اُسے اپنا بچپن یاد آنے لگا تھا۔

''مائی لَونگ ڈیر ریزہ.....

لائف اِز این اینڈلس اسکائی.....

یو ہیوٹو گو لانگ وے.....ویری لانگ.....''

اس کے مُشفق باپ کی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب تھے۔ وہ باپ سے لپٹ گئی۔ تّھے تّھے پیروں سے اس کے کندھوں پر چڑھ گئی۔ مسٹر سین کے چہرے کی اس کے باپ سے مشابہت نے اسے چشم زدَن میں ان کے قریب کر دیا تھا۔ بعد ازاں اس کے باپ نے تابوت میں سکونت اختیار کر لی۔ ہواؤں کے دوش پر اُڑتی ہوئی پتّی کی طرح کئی جگہوں سے ہو کر اُسے تھامسن کے ہاں آسرا ملا تھا جو اس عِلاقے میں بڑا عزّت دار شخص گردانا جاتا تھا۔ یہاں اُسے بہت دباؤ اور جبر میں ہنستے اور خوش دِکھتے ہوئے خود کو تھامسن کے حوالے کرنا پڑا تھا۔

اس کے لیے کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔ کئی دروازے اُس نے بدلے تھے۔ ہر دروازے پر زبانیں

لپلپاتے، سُرخ آنکھوں والے حیوان موجود تھے: رال ٹپکاتے۔ پھر مسٹر تھامسن کیا بُرے تھے۔ صاف ستھرے خوشبودار انسان۔ ان کے لمس میں کم از کم اُسے جمالیاتی طور پر کسی کراہیت کا احساس نہ ہوتا تھا۔ سین دادا مس ریزہ کی ان کیفیات سے بے خبر سرشاری اور لذت یابی کی اپنی دنیا میں محو تھے۔ وفورِ جذبات سے ان کے پلکیں مندنے لگی تھیں۔ مس ریزہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے نزدیک کھڑی تھی۔ نشہ کی حالت میں بھی مسٹر تھامسن نے سین دادا کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ایک دریا دل انسان تھے۔ شراب و کباب میں تو دوسروں کی شرکت پسند کرتے تھے، لیکن اور کسی نجی چیز میں اُنہیں کسی کی حصّہ داری منظور نہ تھی۔

اُنہوں نے خشم گیں نگاہوں سے مس ریزہ کی طرف دیکھا۔ مس ریزہ جس کی آنکھوں میں سین دادا کے لئے ہمدردی اُمنڈ آئی تھی، تھامسن کی یہ کیفیت دیکھ کر سٹپٹا گئی اور خالی پلیٹ اٹھا کر آنسو پونچھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھر وہ نظر نہ آئی۔ یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر مسٹر تھامسن کو اسے چیخ کر بلانا پڑا۔

اس نے سوچا، اس کے اور مس ریزہ کے دُکھ میں کس کا دُکھ بڑا ہے۔ غٹرغوں کرتے ہوئے کبوتروں کا غول اس کے سر پر منڈلانے لگا۔ اس نے ہامی بھری۔ اس سے بڑا غم تو ان بے امان کبوتروں کا ہے۔ جنہیں اب ساری عمر، ہجرت کا عذاب جھیلنا ہے..... کئی نسلوں سے وہ ان گنبدوں کے باشندے تھے.....لیکن اب.....

اسے سین دادا اور مسٹر تھامسن کی مئے نوشی پر غصہ آنے لگا۔ سین دادا بولتے ہیں ینگ مین غم بھلاؤ.....انجوائے کرو.....ایسے حالات میں بھلا کوئی انجوائے کر سکتا ہے.....

اندرونِ خانہ سے برتنوں کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

متوحّش سی ریزہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''انکل.....ایک کبوتر گھر کے اندر داخل ہو گیا ہے.....بغل والے پڑوسی کی بلّی اس پر جھپٹنا چاہ رہی تھی..... کبوتر کچن میں برتنوں کے بیچ چھپ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے بلّی کو بھگایا اور کچن کا دروازہ بند کر کے آ رہی ہوں.....!''

اس کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس نے سین دادا کی آنکھوں میں جھانکا پھر تھامسن کو دیکھا۔ نشے کی چمک ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں میں کبوتر کے بارے میں سُن کر سراسیمگی پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں کے سر جُھک گئے۔ جیسے کوئی افتاد آ پڑی ہو۔

اسی وقت باہر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

''مسٹر تھامسن.....مسٹر تھامسن.....!''

اداس اور سراسیمہ ریزہ نے دروازہ کھولا۔

پڑوسی مسٹر جان کھڑے تھے۔

''مِس ریزہ.....مسٹر تھامسن کو بلاؤ!''

''کیا ہے بھائی.....!''مسٹر تھامسن نشے میں جھومتے ہوئے بھاری بھاری قدموں سے باہر آئے۔

''میرا کبوتر آپ کے یہاں آ گیا ہے.....آپ جانتے ہیں میری مدر اِن لا پرانی مریض ہیں..... آج کل ان کے ہاتھوں میں سنسناہٹ رہتی ہے۔ڈاکٹر نے کبوتر کا سوپ تجویز کیا ہے.....اسے ذبح کر ہی رہا تھا کہ اُڑ کر آپ کے یہاں چلا آیا.....''

'ہاں.....ہاں.....میرے یہاں آ کر چھُپ گیا ہے.....ابھی ابھی مس ریزہ نے مجھے رپورٹ دی ہے.....ایک بلّی بھی ہے جو اس کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے.....مس ریزہ جاؤ.....ان کا کبوتر انہیں واپس کر دو.....آیئے.....آپ ڈرائنگ رام میں بیٹھیں مسٹر جان.....کچھ ہو جائے جب تک.....!''

''اوہ نو تھینکس.....میں صرف ویک اینڈ میں لیتا ہوں.....دوسرے روز چھُٹّی رہتی ہے..... سویرے اُٹھنے کا چکر نہیں ہوتا.....کمبخت کو لینے سے مجھے نیند بہت آتی ہے.....!''

ہزار اندرونی شکست وریخت سے گزرنے کے بعد ناچار مس ریزہ کبوتر کو پکڑ لے آئی تھی.....لیکن اس نے دیکھا کہ اُس کے پورے وجود پر کپکپاہٹ طاری تھی.....مسٹر تھامسن نے اس کی آوازوں کو سُنا۔بہت دنوں سے وہ اسے خود سے اسی طرح کی باتیں کہتے ہوئے سُن رہا تھا۔خاموش نگاہوں سے وہ بُدبُدا رہی تھی.....لڑ نہیں سکتا تو بھاگ جانا مرا.....اُڑ جا.....بستیوں سے دُور وسیع آسمانوں اور جنگلوں کی طرف بھاگ.....

لیکن سہما ہوا کبوتر اس کی ہتھیلیوں میں سکڑتا سمٹتا چھُپنے کی کوشش میں مصروف تھا۔اور جب مسٹر جان نے تھینک یو.....تھینک یو.....کہتے ہوئے اُسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں مس ریزہ کے اندرون سے کسی نے اُچھال لگائی۔

اس منظر نامے میں اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس میں لرزش زیادہ تھی.....کبوتر یا مِس ریزہ میں..... یا وہ خود زیادہ لرز رہا تھا۔یہ کبوتر کہیں.....اچانک اُسے خیال آیا۔

بے اماں کبوتر.....شاید ان میں سے ایک بوڑھی عورت کے ہاتھوں کو حرارت پہنچانے کے لیے مَذبح کا اسیر ہو گیا۔

مِس ریزہ نے ہتھیلیاں ڈھیلی کر دیں۔اس کے اندر کسی نے اُچھل کر جیسے اس کے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔

لڑ نہیں سکتے تو کم از کم بھاگ تو سکتے ہو.....ہائے نامراد.....تو نے یہ صلاحیت بھی کھو دی.....!

کبوتر اُڑا اور روشن دان پر جا کر بیٹھ گیا۔

مسٹر تھامسن نے ایک طمانچا اس کے گال پر جڑ دیا۔وہ بے حد غصّے میں تھے۔مس ریزہ پر سکتہ

طاری ہو گیا۔تھامسن نے ٹیبل پر اسٹول رکھ کر اُسے پکڑنے کا حکم دیا۔اس کوشش میں اسٹول کھسکنے سے مِس ریزہ گری۔اُسے شدید چوٹیں آئیں۔سین دادا اُسے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھے لیکن تب تک مسٹر تھامسن نے بڑھ کر اُسے اُٹھا لیا تھا۔ان کے سینے سے لگی ہوئی مِس ریزہ کانپ رہی تھی۔

وہ دونوں اُٹھ گئے۔

''اجازت ہو مسٹر تھامسن.....آپ کی محفل میں بڑا لطف آیا.....!''

''لیکن یہ صاحب تو اتنے سوگوار ہیں کہ انہوں نے کوئی مزہ نہ لیا.....!''

سین دادا نے بڑے پیار سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ویسے کنکھیوں سے وہ مستقل کانپتی ہوئی مس ریزہ کو دیکھے جا رہے تھے۔

''اس کی اُداسی برحق ہے.....لیکن میرا کہنا ہے کہ خواہ مخواہ اُداس ہونے کا فائدہ کیا ہے.....کوئی راستہ نکلتا تو ٹھیک تھا.....آپ کے پاس لایا تھا کہ انگور کی بیٹی کے ساتھ شغل کرے گا تو بہل جائے گا۔لیکن یہاں کبوتر اور بلّی کا تماشا دیکھ کر یہ اور بھی اُداس ہو گیا۔کوئی بات نہیں.....اپنی اپنی قسمت ہے.....آپ نے بڑی فیاضی دکھائی۔اس گرما گرم محبت کا شکریہ.....!''

رخصت ہونے سے قبل اُنہوں نے مِس ریزہ کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا جو اس متوحش انداز میں بھی بَلا کی حسین لگ رہی تھی۔

''بائی بائی ریزہ.....بائی مسٹر تھامسن.....گڈ نائٹ.....!''

اُس روز کئی دوستوں کے ہاں دونوں گئے تھے۔سب نے اُس روز کے اہم ترین واقعے پر بات چیت کرنے سے گریز کیا تھا۔لوگ دل ہی دل میں یا تو رو رہے تھے یا ہنس رہے تھے۔عجیب بے بسی اور دلی خوشی کی کیفیتیں تھیں۔جن سے مختلف لوگ اپنے اپنے حساب سے گزر رہے تھے۔لیکن تمام کیفیات اور بے نیازی کے باوجود ایک سوال سب کو کرید رہا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟''

وہ اُوب گیا تھا۔تھامسن کے ہاں اس نے بھی مئے نوشی کی۔لیکن اسے نشہ آنا تو دُور، ہلکا سرور تک نہ ہوا۔رہ رہ کر اُسے اپنے گملے کے پودوں، بالکنی اور بچّوں کے اجتماع کا خیال آ رہا تھا۔ایک عجیب تشویش میں وہ تمام وقت مبتلا رہا۔

اس علاقے کے تمام دوستوں کے ہاں سین دادا نے جی بھر کر انجوائے کرنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا۔ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔گلابی نشہ پورے وجود پر طاری تھا۔ریزہ کی لحاتی قربت نے اُنہیں عجیب کیف و سرور سے سرشار کر رکھا تھا۔پھر بھی اتنا ہوش اُنہیں تھا کہ ہم سفر کی چارہ جوئی کرنی ہے۔اسے اپنے پھولوں، پودوں

اور گملوں کی سلامیت کے تعلق سے ڈھارس بندھانی ہے۔ راستے بھر ان کا انداز پچکارنے اور دلارنے والا رہا۔

''گھبراؤ نہیں بچّے .....سب ٹھیک ہو جائے گا!''

گیٹ پر اپارٹمنٹ کے گارڈ نے ان کے داخل ہونے کے لیے رستہ چھوڑ دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر اس نے سین دادا کو سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑتے۔ تیسری منزل پر بہ دقّت تمام اُس نے دادا کی جیب سے ان کے فلیٹ کی چابی نکال کر ان کا انٹرلاک کھولا۔ انہیں ان کے فلیٹ کے اندر داخل کیا۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ دادا نے اندر سے چٹخنی لگالی ہے، وہ اپنے فلیٹ کی جانب روانہ ہوا۔ اوپر کی منزل کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس کے قدم کانپ رہے تھے۔ دل ایک انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔

کال بیل بجانے پر بیوی نے دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں سوُجی ہوئی لگیں۔ جیسے بہت دیر سے روتی رہی ہو۔

''کیا حال ہے میرے پھولوں کا؟''

''خود دیکھ لو جا کر!''

بچّے اپنے بستروں میں گہری نیند میں مبتلا تھے۔ سب کے چہروں پر ایسی اذیتیں جیسے کوئی بہت ڈراؤنا اور تکلیف دہ خواب دیکھ رہے ہوں۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا.....اس کے جسم میں کاٹو تو لہو نہیں۔ بالکنی کے کھُلتے ہی وہاں کے ٹوٹے پھوٹے منتشر حال زار نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ نُچے ہوئے پھول، موزائک کے فرش پر مسلی کچلی بکھری ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں.....ٹوٹے پھوٹے گملے.....گملوں کی مٹیوں کے جابجا ڈھیر.....گوریّوں کے گھونسلوں کے مُنتشر تنکے.....گوریّوں کا کوئی پتہ نہیں تھا.....گلہری، تتلیاں اور بھنورے تو اب ایک مدّت تک دکھائی نہیں دیں گے۔ اس کی بالکنی کا سارا حُسن ملیامیٹ ہو چکا تھا۔

آخر بچّوں نے اپنے کھیل میں میرا سب کچھ.....اس سے کا اندیشہ صحیح نکلا۔ اس دن اپارٹمنٹ میں گھُسے سانپ کو چند بچّوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اس سے کھیلنے کے خطرناک عمل کے عادی ہو گئے تھے۔ اسی لیے تو بچّے اتنے زہریلے اور وحشی ہو گئے تھے۔

آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے اماں کی تلاش اور کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکّر کاٹ رہا تھا۔

بیوی سے اس کی نگاہیں ملیں تو اسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میّت پڑی ہے اور باہر کرفیو میں اس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔

◀◀ ● ▶▶

● **شوکت حیات**

رانی باغ

ا۔ خاک اور خمیر

کہتے ہیں خاک اور خمیر کے اَن دیکھے رشتے آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ خمیر کی پکار میں زبردست لپک ہوتی ہے۔

انسان اکثر اپنے ہوش وحواس گنوا بیٹھتا ہے۔ اسی تعلق سے اپنے وطن عزیز کی یاد پردیس میں اسے چین سے نہیں جینے دیتی۔

شاید اسی لیے ڈاکٹروں نے جب ڈھکے چھپے لفظوں میں رحمت صاحب کو ان کی موذی اور مہلک بیماری سے آگاہ کیا تو انہوں نے وطن واپس جانے کی ٹھان لی اور اس کے لئے اپنے بیٹوں سے ضد کرنے لگے۔

''میں اپنے وطن کی مٹی اور اپنے خمیر کی پکار پر لبیک کہنا چاہتا ہوں۔ ایک عرصے سے میں طرح طرح کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ جگہ جگہ بھٹکنے کے بعد میرے قدم پہاڑ نما مٹی کے ڈھیر کے پاس رک جاتے ہیں۔ میں اس مٹی کو اچھی طرح پہچانتا ہوں.....وطن سے اتنی دور آ کر اور یہاں کے طرح طرح کے خوشبودار صابن سے نہانے کے باوجود اس مٹی کی سوندھی مہک ابھی بھی میری قوت شامہ پر دستک دیتی ہے...رات کے سناٹے میں ان کی دستک سن کر کیا بتاؤں مجھ پر کیا گزرتی ہے.....بس اب میں یہاں نہیں رکوں گا.....!''

بیٹے خوشحال تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد باپ کا ہر طرح خیال بھی رکھتے تھے کہ مبادا انہیں تنہائی کے دکھ کا احساس ہو۔ تاہم رات اور گھنے جنگل میں کوئی مخصوص بات جگنو کی طرح چمکنے لگے تو اکتاہٹ کے ساتھ ساتھ اس کی ہر لحظہ جلتی بجھتی پرکشش چمک میں بھی کسی راستے اور ٹھور ٹھکانے کا تعین آسان نہیں ہوا کرتا۔

اس نوع کی غیر متوقع مصیبتوں کے وقت انسان کی عقل کام نہیں کرتی۔ ڈاکٹروں نے والد کے مرض کے بارے میں ان کے بیٹوں کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو سال۔ اس مہلک مرض میں زندگی کی ڈور اچانک سمٹ کر تھرتھرانے لگتی ہے...اضطراب اور پریشانی کے عالم میں بیٹوں کے ماتھوں پر ٹھنڈک کے باوجود پسینے کی بوندیں چمک اٹھی تھیں۔

بیٹوں کے پاس پیسوں کی کمی نہ تھی لیکن وقت.....

ایک اور دشواری دامن گیر تھی۔

بڑے بیٹے نے لجاجت سے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''ابو! ہم آپ کو وطن کی راجدھانی تک چھوڑ آئیں .....لیکن وہاں سے آبائی گاؤں حیدر نگر جانے کے خیال سے ہی جسم کے پرزے ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں...دنیا بدل لی لیکن آپ کے ہندوستان کے گاؤں اور شہر ایک مقام پر منجمد ہو گئے ہیں.....''

پھر ''آپ کے ہندوستان'' کی ترکیب پر بیٹے کو ہنسی آ گئی.....وہ بھی تو اسی.....

باپ اپنی دنیا میں محو تھا اس کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ بیٹا اس سے بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔ تھوڑے توقف کے بعد بیٹے نے گلا کھنکار کر کہنا شروع کیا۔

''ابو! آپ کی ہر خواہش سر آنکھوں پر.....لیکن آپ.....'' بڑا بیٹا پھر ہکلانے لگا۔

''آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیتے تو بہتر تھا۔ دنیا کی ساری مٹی خدائے پاک کی بنائی ہوئی ہے۔ خمیر کی پکار پر لبیک کہنے کی بات آپ ترک کر دیتے تو ہم سے زیادہ خود آپ کو عافیت ہوتی۔''

والد کی پھٹی پھٹی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ وہ جیسے کچھ بھی نہیں سن رہے تھے۔

''ابو!''

بڑے بیٹے نے ہلکے سے ان کا کندھا دبایا۔

''ابو! آپ میری بات نہیں سن رہے ...اللہ آپ کا سایہ قائم رکھے۔ اس عمر اور صحت کی اس حالت میں آپ کا اتنا لمبا سفر کرنا مناسب نہیں۔ اور پھر ملک سے ملک تک کا سفر تو پھر بھی آسان ہے لیکن اس ملک میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور وہ بھی آبائی گاؤں تک.....میں تو پناہ مانگتا ہوں وہاں جانے کے تصور سے.....''

آخری جملہ اس نے زیر لب کہا کہ مبادا اس کے ابو سن لیں۔

قدرے توقف کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

''ابو.....آپ سمجھا کریں.....کہنے کے لئے وہ گاؤں لبریٹڈ گاؤں ہو گیا ہے، عوام کی طاقت بھی بڑھی ہے.....لیکن وہاں کوئی ترقی ورقی نہیں ہوئی ہے.....رشتہ داروں کے خط گمراہ کن ہیں.....یہ بات جھوٹ ہے کہ مورچہ والوں سے غریب خوش اور کھاتے پیتے لوگ نالاں ہیں...سب کے سب وہاں سے نکلنے کے متمنی ہیں.....''

اس کے ابو اس کی زیر لب باتیں تو دور.....زور سے کہی گئی باتیں بھی نہیں سن رہے تھے۔ وہ چپ چاپ اور گم صم ایک ہی تمنا کی متلاطم لہروں پر ہچکولے کھا رہے تھے.....جیسے بھی ہو.....اپنے وطن پہنچ جائیں.....اپنے جسم کی مٹی کے نزدیک رہیں۔ کب اوپر والے کا بلاوا آ جائے.....پھر رحمت صاحب چھت

کو گھورتے گھورتے کھوتے چلے گئے۔ عنفوان شباب کا ایک منظر ان کے جی کا جنجال بنا ہوا تھا۔

۲ بچپن کی ضخیم کتاب کا روشن باب

چھوٹے بڑے بچوں کے اچھلتے کودتے قدموں کی آہٹیں.....پھلجھڑیوں جیسی ہنسی اور قہقہوں کی ننھی ننھی پھواروں سے شرابور.....آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ہمجولیوں کے گرد آلود چہرے.....

متحرک پیڑ پودوں کی شکل اختیار کرتے ہوئے بچے باغ کا اٹوٹ حصہ بن گئے تھے۔

ملگجی شام...رانی باغ کے احاطے میں کھیل کے دوران ان کا ہاتھ غلطی سے بہکا تو انگلیاں پہلی بار پھڑ پھڑاتے ہوئے نرم و گرم نسائی جسم کے تحریک خیز اور ترغیب انگیز لمس سے آشنا ہوئیں۔ پہلی بار انہیں ایسا لگا جیسے ان کا ہاتھ بجلی کے تار سے چھو گیا۔

گھٹنوں کے اردگرد بانہیں لپیٹے، ناز و ادا کے ساتھ سر کو گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھی ہوئی رانی دم بخود رہ گئی اور انہیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ان کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ نسوں میں پٹاخے چھوٹنے لگے۔ رانی کے ہونٹوں پر عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

پھڑ پھڑاتے ہوئے کبوتروں کا ایک جوڑا بیتابی کے عالم میں سب سے بے خبر درخت کی گھنی شاخوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

''ذرا دیکھوں تمہاری نظروں کو ...اسی طرح دیکھو مجھے.....ٹکٹکی باندھے..... ویسے ہی ہاتھ رکھو.....گھٹنوں کے گِرد.....''

رحمت کی آواز بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ مخمور نیم وا آنکھوں سے رانی کو گھورتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔ چراغ کی لو کی طرح تھرتھراتی ہوئی شہد رنگی آنکھوں والی رانی نے انہیں ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اوڑھنی سے اپنے سینے کو اچھی طرح ڈھانپنے کی کوشش کی۔ ہانپتی ہوئی گرم تیز سانسوں کا زیر و بم بڑھ گیا تھا جو اس کی آبی اوڑھنی سے بار بار جھانک رہا تھا۔ وہ عجیب کیفیت میں مبتلا تھی۔ شروع میں اس نے ہتھیلیوں کو سخت کرتے ہوئے مزاحمت کی کوشش کی۔ چہرے کا معنوی اور ہیئتی ارتکاز دھندلکے میں گم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ چشم زدن میں وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔ بے بس نگاہوں سے رحمت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

تمام جونیئر لڑکے لڑکیاں شام کے دھندلکے اور آسمان میں امنڈ آئے گہرے بادلوں کو دیکھتے ہوئے اپنے ماں باپ کی ڈانٹ کے ڈر سے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

شام کی نیم تاریکی میں باغ کے کونے کی گھنی جھاڑیوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ہوا ہلتی ہوئی

شاخوں کو چھوتی ہوئی ان دونوں کی سرگوشیوں سے لپٹی ہوئی پراسرار گونج پیدا کر رہی تھی۔

دور آسمان میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی لال ٹکیہ اور گھنے کالے بادل کے درمیان زبردست دھینگا مشتی جاری تھی۔ اچانک گھنے کالے بادل کا دبیز ٹکڑا بھاری پڑا اور سورج کا سر قلم کرتے ہوئے نیچے کی طرف گرا۔ سورج کی گردن سے لہو کا فوارہ ابلنے لگا..... شفق کی تیز سرخی سے افق کا ایک کونا لہولہان ہو گیا... شفق کی سرخی کے کچھ چھینٹے چھٹک کر زمین میں جذب ہو گئے۔

شہد رنگی آنکھوں والی رانی نیم غنودگی کے عالم میں آنکھیں موندے گٹھری بنی ہوئی پڑی رہی۔ پھر اچانک تن کر کھڑی ہو گئی۔ اسے شدت سے رونا آیا۔ اس نے متجسس آنکھوں سے جھاڑیوں اور زمین کی طرف دیکھا جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہو۔

کچھ دیر بعد وہ پیچھے ہٹی۔ ان کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی یہ جا وہ جا۔

اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کوشش کے باوجود وہ اپنی ٹانگوں کی تھرتھراہٹ پر قابو پانے میں ناکام تھی۔ انہیں رانی سے بے پناہ ہمدردی ہوئی۔ دل میں اس کے لئے پیار کا اتھاہ سمندر موجیں مارنے لگا..... انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی..... رانی کی اوڑھنی کا پھٹا ہوا ٹکڑا کانٹے دار جھاڑیوں میں پھنسا ہوا ہل رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے اوڑھنی کے اس ٹکڑے کو کانٹوں سے الگ کیا اور سنبھال کر اپنی جیب میں رکھ لیا..... رانی اوڑھنی کے پھٹنے سے بے خبر تھی۔

بہت دنوں تک وہ انہیں نظر نہ آئی۔ ایک دو بار دور سے جھلک ملی تو ان سے نظریں چراتی رہی۔ اپنی اوڑھنی کو لے کر وہ چوکنا رہنے لگی۔ پھر ان لوگوں کی ٹولی سے گریز کرنے لگی تھی۔ اس کا نکلنا بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ شاید ماں باپ نے اوڑھنی پھٹ جانے کے واقعے سے خفا ہو کر اس کے باہر نکلنے پر قدغن لگا دی تھی۔

کتنے سہانے دن تھے..... بے فکری اور موج مستی..... کیسے کیسے معصوم اور شریر دوست..... لڑتے جھگڑتے، پھر بھی ساتھ نہیں چھوڑتے..... ماں باپ سے ڈانٹ سنتے..... مار کھاتے... پھر بھی چھپ چھپا کر گھر سے نکلتے اور یاروں کی ٹولیوں میں شامل ہو جاتے۔ اس باغ میں دھما چوکڑی مچاتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیتے.....

کہتے ہیں، ان کے اجداد کے ترکے میں ملے ہوئے خاندانی باغ کا نام ''آزاد باغ'' اس وقت پڑا جب اس علاقے کے لوگوں نے ان کے خاندان کے چند بزرگوں کی قیادت میں انگریزوں سے مقابلے کے لئے خفیہ میٹنگ کا انعقاد کیا تھا۔ غلامی سے رہائی کی اس زمانے میں ساری تجویزیں اور حکمت عملیاں اسی آزاد باغ کے گھنے پیڑوں کے سائے میں طے ہوا کرتی تھیں۔ اس علاقے میں آزادی کی سرگرمیوں کا وہی باغ منبع بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ تو جانے کب کی سنی سنائی باتیں تھیں۔ انہوں نے تو اس باغ کو اپنے بچپن کے گہوارے کے روپ میں یاد رکھا تھا اور بچپن کی ضخیم کتاب کے سب سے روشن باب کا نام تھا ''رانی''

رانی کی آواز اور شخصیت دونوں میں نغمگی اور سریلا پن تھا۔ رحمت صاحب اس کی لاہوتی آواز اور ہوشربا بدن دونوں کے دیوانے تھے۔ میرا کے بھجنوں میں اسے خصوصی مہارت حاصل تھی۔ رحمت صاحب اس کی آواز کے جادو اور اس کے بدن کی حرارت میں تحلیل ہوتے چلے جاتے۔ ان کے اور دیگر ساتھیوں کے کہنے پر جب رانی کوئی راگ الاپتی تو باغ میں کوکتی ہوئی کوئل خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔

آزاد باغ میں انہیں رانی کے توسط سے تجربے کی جو انوکھی دولت ملی تھی، اس کے لئے وہ عمر کے کسی حصے میں اسے فراموش نہیں کر پائے۔ ممنون نگاہوں نے کبھی ان کی اچھی خاصی نئی نویلی دلہن کو جی بھر کر دیکھنے اور حظ اٹھانے کے لئے آمادہ نہیں کیا۔ ہر وقت رانی کی شہد رنگی آنکھیں، سانچے میں ڈھلا مرمریں جسم، کولہوں کے ابھار کو چھوتے ہوئے لہراتے بال اور زندگی کا پہلا تجربہ ان کے ذہن پر حاوی رہتے اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔

ان کے دل نے ''آزاد باغ'' کی جو تصویر بنائی، اس کے صدر دروازے پر ''رانی باغ'' کا سنہری جلی حروف میں لکھا ہوا بورڈ آویزاں کر دیا۔ تب سے آزاد باغ ان کے تحت الشعور میں ''رانی باغ'' کے نام سے متشکل ہو گیا۔ اور ان کے دل میں اس کا ہری بھری جھاڑیوں والا کونا روشن استعارے کی صورت اختیار کر گیا... اپنی زندگی کے اس سب سے قیمتی سرمائے کو انہوں نے ہمیشہ سنبھال کر رکھا اور مصیبت کے لمحوں میں صبر و استقلال پیدا کرنے کے لئے اس سہارے کا استعمال کیا۔ جب وہ کسی گہری اذیت اور پریشانی میں مبتلا ہوتے، تناؤ سے رہائی حاصل کرنے کے لئے بار بار یادوں کے اس دریا میں غواصی کی راہ اختیار کرتے۔

۳ جبر و اختیار کی کشاکش

پتا نہیں ان کے بچپن اور عنفوان شباب کے زمانے کے دوست کس انجام کو پہنچے..... ہر آدمی جبر و اختیار کی کشاکش جھیلتا زندگی کی چکی میں پستا ہوا اپنے انجام کو پہنچنے کے لئے پوری قوت صرف کرتا ہوا مصروف کار رہتا ہے..... رائیگاں انجام..... جس کے آگے لاحاصلی اور اکارت کے اندھیروں میں کچھ دکھائی نہیں دیتا..... نامراد انسان کچھ بھی کر لے..... بے ثباتی اور مقدر کے شکنجے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سائنس کی ساری ترقی کے باوجود اب تک موت کا کوئی حل سامنے نہیں آیا... کلوننگ ولنگ ...تصویر صاف نہیں ہے..... اپنے چہرے اور اپنے جسم کو دائمی بنا لیں گے..... لیکن تیزی سے گزرتا اور بدلتا ہوا وقت ...اور کیفیات..... ان کا تقید کن مشینوں سے ہوگا۔

انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا انجام اس طرح منتج ہوگا۔

ان کا تو مصمم ارادہ تھا کہ گرین کارڈ حاصل کر کے یہیں بود و باش اختیار کر لیں گے...لیکن اس حالت کو پہنچے کے بعد امریکہ ہر لحظہ انہیں کاٹنے کو دوڑ رہا تھا...سچ ہے انسان کا اپنے مقدر پر اختیار کہاں۔ جبر و اختیار کے مراحل اسے بڑی بے دردی سے کٹھ پتلی میں تبدیل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

بس اب کسی طرح اپنے خمیر تک پہنچ جاؤں اور لپٹ کے روؤں..... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی بانہوں میں سو رہوں۔

چھوٹے بیٹے نے بڑے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بھائی! انہیں سمجھانے کا کوئی حاصل نہیں۔ ان کے جانے کا انتظام کرنا ہوگا...کسی ایک کو چھٹی لینی ہوگی...کہتے ہیں آدمی کا جب چل چلاؤ نزدیک ہوتا ہے تو اسے اپنا خمیر، اپنے بچپن کے ساتھی...بچپن کی یادیں.....عنفوان شباب کا پہلا پیار..... سب بہت یاد آتے ہیں..... آدمی ان آبسیشنز کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔''

بڑے بھائی کی آنکھوں میں سراسیمگی تھی۔

''کیا ہر بوڑھا اسی حالت کو پہنچتا ہے.....اپنے بچپن کی طرف مراجعت کا سفر اختیار کرتا ہے..... حتیٰ کہ قبر کو ماں کی گود سمجھ کر اس میں پناہ حاصل کرتا ہے.....''

امریکہ کی یونیورسٹی میں اردو کی معلّمی کرتے ہوئے بڑے بیٹے نے بڑبڑاتے ہوئے یہ سب باتیں خود سے کہیں۔ بڑے بھائی کا متفکر چہرہ دیکھ کر چھوٹا بھائی پریشان ہو اٹھا۔

''بھائی.....آپ کو پریشانی ہے تو میں ہی چھٹی کے لئے ٹرائی کروں گا...!''

بڑے بھائی نے تردید کی۔

''یہ بات نہیں.....!''

اس نے قدرے توقف کیا۔

''تب.....؟''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ابو کو سمجھانے کا کوئی حاصل نہیں...ہم لوگوں کی باتوں سے بے نیاز سوچوں میں مستغرق وہ جانے کن دنیاؤں میں کھوئے ہوئے ہیں...ان کے ہونٹوں پر چھوٹی چھوٹی مسکراہٹوں کی لہریں اٹکھیلیاں کر رہی ہیں۔''

''ان کی آنکھیں دیکھئے۔''

چھوٹے بھائی نے گہری سانس لیتے ہوئے بڑے بھائی کا ہاتھ دبایا۔

بڑے بھائی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو گہری آنکھوں سے دیکھا۔ پھر ابو کی آنکھوں کی طرف.....نوجوانی کی دہلیز میں قدم رکھتی ہوئی آنکھیں.....رمز و اسرار کے بوجھ سے دبی ہوئی۔

ملگجی اندھیرا چھاتا جا رہا تھا اور دونوں کسی خندق میں گرتے جا رہے تھے۔

''سن رہے ہو تم دونوں.....؟''

اچانک دونوں چونک اٹھے۔ جیسے گہری نیند سے جاگ گئے ہوں۔

''سن رہے ہو.....؟''

رحمت صاحب بستر پر نیم دراز چلا رہے تھے۔ انہوں نے عجیب و غریب لہجہ اختیار کر لیا تھا۔ ''تم لوگوں نے سنا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا.....میں سب سمجھتا ہوں...اب میرا کوئی ٹھیک نہیں...تم دونوں نے میری باتیں نہیں سنیں...میں واپس جانا چاہتا ہوں.....اپنی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں.....!''

''ہاں ابو.....!''

مودبانہ لہجے میں بیک وقت دو آوازیں گونجیں۔ ''بینک کی میری ساری سیونگس، سارا ڈیپازٹ نکال لو.....لیکن کسی بھی طرح میرے جانے کا بندوبست کر دو..... ایک ایک لمحہ مجھے پہاڑ سا لگ رہا ہے.....!''

۴ مراجعت

دور کے رشتے کے ایک آدمی وطن لوٹ رہے تھے۔ تین سال کے طویل وقفے کے بعد۔

دونوں بیٹے ابو کو پہنچانے کی زحمت سے بچ گئے۔

انہیں پوری بات نہیں بتائی گئی۔ بیٹوں نے ان کے ساتھ رحمت صاحب کے جانے کا بندوبست کیا تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا۔

وہ تو بس اپنے گاؤں پہنچنا چاہتے تھے۔ انہیں تنہا بھی جانا پڑتا تو وہ باز نہ آتے۔ ایک بار اور شاید آخری بار وہ جو کچھ ٹھان چکے تھے اس پر عمل درآمد کے لئے ہر طرح تیار بیٹھے تھے۔

''تم لوگوں نے اسے میری بیماری کے بارے میں بتا دیا ہے؟''

انہوں نے بس اتنا ہی پوچھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے ابو...خواہ مخواہ پریشان ہو اٹھتے کہ.....''

''ہوں.....!''

رحمت صاحب نے گہری سانس لی۔

''تو مجھے صحت مند دکھنے کی اداکاری کرنی پڑے گی.....!''

مایوسی کے اس عالم میں بھی وہ زیرلب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

۵ البیلے پنچھیوں کا تعاقب

ہوائی جہاز کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے رحمت صاحب نیم غنودگی کے عالم میں ہواؤں کے دوش پر اڑ رہے تھے۔

اندھیرے میں ایک سراپا جگ مگ کر رہا تھا۔

''رانی.....!'' وہ بڑبڑائے۔

سانچے میں ڈھلا ہوا مرمریں بدن انگڑائیاں لے رہا تھا۔ رحمت صاحب کی آنکھیں اس کے چہرے سے ہوتے ہوتے اس کے کولہوں کے ابھار کو چھوتے ہوئے لمبے بالوں کی طرف مرکوز ہوگئیں۔ انہیں دیکھ کر بل کھاتی ہوئی گھٹاؤں اور لہراتے ہوئے سانپوں کا گمان ہوتا تھا۔

تتلیوں اور البیلے پنچھیوں کے تعاقب میں ان کے اور رانی کے پاؤں میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ کوئی دل پسند تتلی یا خوش نما پرندہ ان کے ہاتھ کبھی نہیں لگا۔

چھوٹے سے اس خوش حال گاؤں میں مذہب وملت، ذات پات اور مسلک کی ایسی کوئی تفریق نہ تھی۔ منڈل اور کمنڈل کا عفریت بوتل سے باہر نہیں نکلا تھا۔ گجرات کا نیا محاورہ وضع نہیں ہوا تھا۔ دوسری جنگ عظیم، ملک کی آزادی، تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فساد کے باوجود وہاں امن چین تھا۔ آزادی کے بعد دیکھے گئے سنہری خواب ٹوٹنے شروع نہ ہوئے تھے۔ لوگوں میں خیر سگالی اور بھائی چارہ تھا...لیکن ایسی روشن خیالی بھی نہ تھی کہ رحمت اور رانی ایک ہو سکتے۔

ان دونوں کی آنکھوں کی تڑپ اور بے قراری کو دیکھتے ہوئے محض انداز اور شک وشبہے کی بنیاد پر بات کا بتنگڑ بنایا گیا۔ سسرال میں رانی مزید سخت گیریاں جھیلنے لگی...ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

کہاں ہو رانی.....اپنی گھرداری میں خوش تو ہو.....؟

پھر سناٹا چھا گیا۔

طیارے کی زوں زوں کی آواز چہار طرف سے مسافروں کو تھپکیاں دیتی رہی۔

''میں بے کلی میں مبتلا ہوں رانی..... ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے..... زیادہ سے زیادہ

دو سال.....''

بغل میں بیٹھے ہوئے نگراں ہم سفر نے ان کی بڑبڑاہٹ سن کر ان کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے زاروقطار آنسوؤں کی لکیریں رواں تھیں۔ انہیں ہوش نہیں تھا کہ وہ اس وقت طیارے میں بیٹھے اپنے وطن کی طرف لوٹ رہے تھے۔

۶ سونی بانہیں دہلیز کی

مسلسل ظلم دیکھتے اور سہتے رحم دل انسان کو بھی ظالم بننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ وہ آزاد باغ جوان کے اجداد کے ترکے کا حصہ تھا اور جہاں سے بہت پہلے اس علاقے میں انگریزوں کے خلاف آزادی کا بگل پھونکا گیا تھا، اب ان جیالوں کے قبضے میں تھا جو موجودہ ظلم کے خاتمے کے لئے کمر کس چکے تھے۔ گاہے بگاہے وہاں سے گولیاں چلنے کی آوازیں آتیں۔ گاؤں والے جانتے تھے کہ موجودہ دور کے انقلابیوں کا گڑھ بن چکا تھا۔ پولس بھی اُس طرف جانے سے احتراز کرتی تھی۔

رحمت صاحب نے جب اس باغ کی طرف جانے کی خواہش ظاہر کی تو لوگوں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ان لوگوں نے متنبہ کیا۔

''بھولے سے بھی اس طرف نہ جائیے گا.....!''

''اس باغ کی ہریالی کیسی ہے؟''

''تتلیاں اور البیلے پنچھی وہاں آتے ہیں یا نہیں؟'' کسی کے پاس ان کے سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ گاؤں میں یوں ہی بلا مقصد گھومتے چلے جاتے۔ کچھ پرانے لوگ انہیں پہچانتے تو گلے ملتے۔ آنکھیں اشک بار ہوا ٹھتیں۔

''بس اپنے جسم کی مٹی کی پکار پر چلا آیا ہوں۔ اپنے وطن کی خاک باہر کے سونے چاندی کے ڈھیروں سے زیادہ قیمتی ہے!''

معانقہ کرنے والا انہیں حیرت سے دیکھتا رہ جاتا۔

دن بھر وہ پہاڑی، میدان اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں کے چکر کاٹتے رہتے۔ اداس اور متجسس نگاہیں کسی کو ڈھونڈتی رہتیں۔ ایک خاص مکان کی سونی دہلیز کے پاس پہنچ کر وہ رک جاتے اور یوں دیکھتے جیسے آنکھیں سجدہ کرنے کو بیتاب ہوں.....انہیں کسی کل چین نہیں تھا۔

۷ روح میں لمس کے سائے

ایک کہر آلود سہ پہر کی بات ہے۔

ایک روز گاؤں کی کچی سڑک پر بلا ارادہ چلے جا رہے تھے کہ اچانک دور سے آتا ایک سراپا جھپاک سے جگمگا اٹھا۔اس کے بدن سے ہر سو روشنی پھوٹ رہی تھی جوان کی آنکھوں کے آگے چکا چوندھ پیدا کر رہی تھی۔

وہ چونک اٹھے۔

''وہی ہے.....!'' دل نے سرگوشی کی۔

ان کے اردگرد رنگین تتلیاں منڈلانے لگیں۔البیلے پنچھیوں کی چہچہاہٹ سے پوری فضا گونج اٹھی تھی۔

وہی سرو قد سراپا.....وہی اب بھی سانچے میں ڈھلا ہوا مرمریں جسم.....انگڑائیاں لے تو ساری کائنات سجدہ ریز ہوتی دکھائی دے۔

اس کے گلے میں رُدراکش کا ہار اس کی رعنائی، ملاحت اور تقدس کو دوچند کر رہا تھا۔

''تم رانی ہو.....؟''

رحمت صاحب دم بخود رہ گئے

''ہاں.....اور تم رحمتے.....؟

سراپا رک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔چشم زدن میں بھک سے رانی باغ اپنے پراسرار کونے، ہلتی ہوئی جھاڑیوں، خنک ہواؤں کے جھونکوں اور کوکتی کوئلوں کے ساتھ روشن ہو گیا۔ پورا ماحول مدھر سنگیت اور بھاری من کے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے پراسرار شکل اختیار کر گیا۔سریلی آواز کے ساتھ رانی خاموش ہونٹوں سے نغمہ سرا تھی۔اس کے اندر سے کوئی چیخ چیخ کر پوری فضا پر سکتے کا عالم طاری کر رہا تھا۔اس کی گردن کی تنی ہوئی نسوں اور شکن آلود پیشانی کو دیکھ کر اسے اپنے اندر کسی پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے کی کسمساہٹوں کا گمان ہوا۔

خاک کے ڈھیر پر
قدموں کے نشان
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے
روح میں تمہارے لمس کے سایوں کا ارتعاش
ابھی تک موجود ہے تازہ زخم کی طرح
کہیں کسی وعدے کی کوئی خوشبو نہیں
گرم سانسوں کا کوئی سراغ نہیں
دور دور تک کسی کی کوئی آہٹ نہیں

لیکن میری روح میں تمہارے لمس کے نشان
اب بھی تازہ ہیں
اب بھی

انہوں نے ڈرتے ہوئے قدرے ہمت سے کام لے کر کہا۔

''تم اب بھی تقریباً ویسی ہی ہو.....اتنے برسوں بعد بھی.....میں نے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈ.....کہتے ہیں بچھڑنے والے نہیں ملا کرتے.....لیکن.....''

شرم وحیا کی لہر سے اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔رانی نے سر جھکا لیا۔نظریں پیروں کی جانب مڑ گئیں جہاں کثرت استعمال کے باعث مرمت طلب چپّل کے تلے پر پیروں کے انگوٹھے اپنا دباؤ بڑھا کر پورے جسم اور عود کر آئی شرم وحیا کے تلاطم کا بوجھ سنبھال رہے تھے۔

''تم کچھ بوڑھے ہو گئے ہو.....لیکن تمہاری آنکھوں کی چمک اب بھی ویسی ہی ہے.....بالکل ویسی ہی جیسی نوجوانی کے زمانے میں تھی.....تم بدلنے کے بعد بھی نہیں بدلے.....!''

ٹھنڈی اور گہری سانسیں لیتے ہوئے رانی نے رک رک کر کہا۔

''آؤ.....کسی کھیت کی منڈیر پر بیٹھتے ہیں.....''

رانی نے بتایا کہ وہ بیوہ ہو چکی تھی اور سسرال والوں نے میکے ڈھکیل دیا تھا۔اس کے شوہر سے اسے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

''کیوں.....کیا ہوا رانی؟''

رانی نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔اس کے ٹوکنے پر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہمیشہ تم میرے خیالوں میں ہوتے تھے۔کانوں کان ایک دن تمہارے بارے میں ان لوگوں کو پتا چل گیا.....مجھے سیتا کی طرح اگنی پریکچھا دینے کے لیے کہا گیا.....میں کہاں سے دیتی.....میں تو من ہی من اور.....کب کی تمہاری اردھانگنی بن چکی تھی.....تم بھی مجھ سے بہت دور چلے گئے.....سچ پوچھو تو میں کھل کر اس کی کبھی نہ ہو سکی.....وہ بھی میرا نہ ہوا۔''

رانی نے توقف کیا۔گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔پھر آکاش کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بولی۔

''مالک نے مجھے بانجھ ہونے کا ڈنڈ دیا۔تم سے دل لگانے کی سزا تو بھوگنی ہی تھی!''

کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رانی زیر لب مسکرائی۔

رحمت کے دل میں اس کی مسکراہٹ کی معنی خیزی، چہرے کی سادگی اور اداؤں کی معصومیت کو دیکھتے ہوئے بے پناہ پیار امنڈ آیا۔

''کیسی ہو رانی؟''

''اپنے بوڑھے ماں باپ پر بوجھ بنی ہوئی ہوں۔ دل گھبراتا ہے تو گھر سے نکل پڑتی ہوں..... بلا مقصد خاموش گھومتی رہتی ہوں..... پاگل کی طرح ڈھونڈتی پھرتی ہوں جیون کا ارتھ... کیا پتا تھا آج اچانک اتنا بڑا خزانہ ہاتھ لگ جائے گا.....!''

کچھ دیر وہ خاموش رہی۔ پھر بُدبُداتے ہوئے کانوں کے قریب ہونٹوں کو لا کر بولی۔

''میرا ابھی تو زندگی بھر بھٹکتی رہی تھی رحمتے..... اسے کیا ملا تھا.....؟

خالی ہاتھ صحرا کی خاک چھانتی رہی..... میں تو پھر بھی لکّی ہوں..... کیوں رحمتے؟''

اس نے کان کی لو کو چھوتے ہوئے سوال کیا۔ اس سے پہلے کہ رحمتے کچھ کہتا، سرگوشیوں میں بولی

''آج گھر پہنچ کر کرشن جی کی تصویر سے پیلے پھولوں کی مالا ہٹا کر لال پھولوں کی مالا پہناؤں گی۔''

رحمت نے سوچا..... رانی اس سمندر کی مانند ہے جو دنیا کی ساری غلاظتوں اور اس کے جیسے سوگوار انسانوں کے سارے دکھوں کو اپنے سینے کے اندر ضم کر لیتا ہے... اور کناروں کو صاف وشفاف لہروں کی خوشیاں بانٹتا ہے۔

''رانی..... تم سچ مچ عظیم ہو..... میں وہ زندہ لاش ہوں جو تمہیں کھو کر ساری عمر پیاس کی شدت میں دریا دریا بھٹکتا رہا۔''

رحمت صاحب بہت دیر خیالوں میں گم رہے۔ پھر کانپتے ہوئے لہجے میں آہستہ سے بولے۔

''رانی باغ چلو گی..... جہاں ہم تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے تھے اور البیلے پنچھیوں کا گانا سنتے تھے... انہیں چھونے کی تمنا میں گھنٹوں مارے مارے پھرتے تھے۔''

رانی ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

۸ وفادار جھاڑیاں اور اوڑھنی کا پھٹا ہوا ٹکڑا

باغ میں داخل ہوتے ہوئے انہیں ذرا ڈر نہیں لگا۔

ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اپنی آنکھوں پر زور دیتے ہوئے دونوں سامنے والے درخت کی ٹہنیوں کو دیکھنے لگے۔

نوزائیدہ پتیاں پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہی تھیں۔

''رانی یاد ہے..... اسی سامنے والی شاخ پر پنچھیوں نے گھونسلا بنایا تھا۔ ایک روز انہیں پکڑنے کے شوق میں ہم سے ان کا گھونسلا تتر بتر ہو گیا تھا۔''

''سچ مچ تنکا تنکا بکھر گیا..... پھر وہ پنچھی کبھی نظر نہیں آئے..... یاد ہے ہم لوگ کتنا روئے تھے۔''

''ہاں..... ہم تو اب بھی.....''

کہیں پاتال سے یہ آوازیں دونوں کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ان کی طبیعت کچھ بشاش ہوئی۔

کچھ دیر بعد رحمت نے محسوس کیا کہ بظاہر رانی البیلے پنچھیوں والی ڈالیوں کو دیکھ رہی تھی لیکن درحقیقت اس سے نگاہیں بچاتے ہوئے درزدیدہ نظروں سے بار بار وہ ''رانی باغ'' کے اس کونے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں اب پرانی خاردار جھاڑیاں موجود نہیں تھیں اور نہ شفق کی سرخی سے چھٹک کر زمین میں جذب ہونے کا نشان۔ رانی نے سوچا پرانی یادوں کی کوئی نشانی کہیں پر دکھائی دے..... چھاجوں برستے پانی میں سب کچھ ختم ہو چکا تھا..... اور وہ اوڑھنی کا پھٹا ہوا ٹکڑا..... تار تار ہو کر وہ بھی خاک کا حصہ بن چکا ہوگا۔

رانی کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ دماغ میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جسم پسینے میں شرابور تھا۔

''رانی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

رحمت نے رانی کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

برسوں سے قابو میں رکھے ہوئے صبر وضبط کا باندھ ٹوٹ گیا۔ کٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے سینے سے آ لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ جس رومال سے رحمت اس کے آنسو پونچھ رہا تھا، وہ اسی کی اوڑھنی کا برسوں پہلے پھٹا ہوا ٹکڑا تھا جسے بڑے جتن سے اس نے اب تک سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ غور کرتی تب بھی اوڑھنی کے اس ٹکڑے کو پہنچاننا دشوار تھا۔ اتنے برسوں میں معطر ہوتے اور دھلتے دھلتے اس کا شوخ رنگ اڑ چکا تھا۔

''رحمتے.....''

بہت دیر کے بعد اس نے ہانپتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''رحمتے..... باغ کے کونے کی وہ جھاڑیاں تمہیں یاد ہیں جہاں میری اوڑھنی پھنس کر پھٹ گئی تھی۔

وہ خیالوں میں کھو گئی۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''میری کربناک کہانی اسی سمئے سے شروع ہوتی ہے... وہ جھاڑیاں کہاں غائب ہوئیں رحمتے..... نامراد خود وہاں سے غائب ہو گئیں لیکن میری اوڑھنی پھاڑ کر میرے دامن پر دھبّا چھوڑ گئیں۔''

کچھ دیر تک وہ رحمت کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے بولنے کی کوشش کی۔ اس کی آواز سے دھیما پن اور تکان جھلک رہی تھی... وہ جیسے گہرے پانی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

''رحمتے وہ جھاڑیاں نہیں ہوتیں تو کیا؟''

درخت کی شاخوں پر سر نہوڑائے بیٹھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے کچھ اونچائی تک اڑے اور پھر دائرے میں چکر کاٹتے انہی شاخوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ سر نہوڑائے.....

رحمت نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور وہ بتدریج نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا کہ کسی طرح راحت کاری کا نظم ہو سکے۔

ان کی دلچسپ اور دلربا اداؤں کو بہت دیر سے نہارتے اور ان کے لیے توقیر کے جذبے سے معمور بدنام زمانہ انقلابیوں نے تالیاں بجاتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔ احتراماً ان کی دست بوسی کی۔ پھر ان کی آؤ بھگت میں لگ گئے۔ ان کے سامنے ستّو کا میٹھا شربت پیش کیا۔ پھر بھنے ہوئے چنے سے ان کی ضیافت کی۔ ایک نوجوان کامریڈ لڑکی چائے بنا کر لے آئی۔

رانی ٹکٹکی باندھے بہت دیر تک محویت کے عالم میں باغ کے اسی کونے کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے سے بیک وقت کشمکش، اضطراب، آسودگی اور تشنگی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں..... اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں..... بے ساختہ رحمت کا دل چاہا کہ ان موتیوں کو چوم لے۔

۹ ایندھن کا حصہ

ان کے دور کے رشتہ دار کے ہاں ان کے بیٹے نے ان کی خیریت پرسی کے لیے فون کیا۔ رشتہ دار نے بتایا۔

''تم دونوں خواہ مخواہ پریشان رہتے ہو... تمہارے ابو یہاں بہت مزے میں ہیں..... رانی کے ساتھ روزانہ چہل قدمی کے واسطے نکلتے ہیں..... وہی رانی..... اچھا چھوڑو..... تم نہیں جانتے ہوگے۔ اس وقت تم لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے..... اس باغ میں جہاں اچھے اچھے سورما جانے کی ہمت نہیں کرتے؛ وہ اور تمہارے ابو اپنے بچپن کو دریافت کرنے کے سفر پر گامزن رہتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انہیں آرام کی ضرورت ہے..... دو سال سے زیادہ.....''

بیٹے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر کی بات چھوڑو..... ابھی اللہ کے فضل سے بالکل ہٹے کٹے ہو گئے ہیں..... ان کی جوانی لوٹ آئی ہے..... ابھی بہت دن زندہ رہیں گے۔''

''کہتے تھے کہ خمیر کی پکار پر وطن واپس جا رہا ہوں!''

''ارے یار..... کرشمہ ہے اس کی قدرت کا..... تم نہیں سمجھ سکتے..... ان کی زندگی میں بہاریں لوٹ آئی ہیں..... ہم کہتے ہیں کہ رحمت صاحب وطن آپ کو راس آ گیا ہے تو مسکراتے ہیں۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ بیٹے بلاتے ہیں کب تک جائیں گے؟ وہ کہتے ہیں البیلے پنچھی جب تک لوٹ نہیں آتے.....''

تھوڑے توقف کے بعد رشتہ دار نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''قصہ مختصر یہ کہ دونوں خود البیلے پنچھی بنے ہوئے ہیں..... دور دور تک دھرتی اور آکاش کے چکر کاٹتے رہتے ہیں..... باغ کے پیڑوں کے سائے میں آرام کرتے ہیں..... باغ میں پناہ گزیں انقلابی بڑی عقیدت اور احترام سے ان کی خاطر تواضع میں لگے رہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اس بات کو لے کر کافی جوش میں رہتے ہیں اور اس سچی حقیقت میں قصّے کہانیوں سے زیادہ دلچسپی دکھاتے ہیں۔ رانی کے ماں باپ بھی خوش ہیں کہ اس حیلے ان کی اداس بیٹی کا مون برت ٹوٹ گیا۔''

''اور انکل؟'' بیٹے نے کچھ اور پوچھنا چاہا۔

اس کے جملہ پورا ہونے سے پہلے رشتہ دار روانی میں بولتے چلے گئے۔

''اب تو تم لوگوں کے پاس جانے کی بات پر بگڑ اٹھتے ہیں۔ تم لوگوں کے فون کا ان کو انتظار نہیں رہتا۔ اچھا تمہارا بل بہت بھاگ رہا ہوگا۔ اللہ حافظ.....''

''ہاں.....! رکو..... چند سکنڈ..... یہ بتانا بھول گیا کہ آزاد باغ کے انقلابیوں سے ان دونوں بوڑھوں کی دوستی بہت بڑھ گئی ہے۔''

''اور کچھ..... اور کچھ بتائیے انکل.....!''

رحمت کے بیٹے نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''تعجب ہوتا ہے..... بوڑھے ہوتے ہوئے بھی رانی اور تمہارے ابو ہنستے رہتے ہیں۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ پھر گھنٹوں خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہتے ہیں۔

ہاں سنو..... ایک اور خاص بات..... اپنی بچی کھچی جائداد انہوں نے آزاد باغ والے انقلابیوں کے لئے وقف کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

''ہم شعلے نہیں رہے... لیکن ایندھن کا حصہ تو بن ہی سکتے ہیں...!''

''ان کو ہمارا سلام کہیئے گا انکل!''

بیٹے نے فون کاٹ دیا۔

◀◀ ● ▶▶

● شوکت حیات

مرشد

(۱)

بزرگ مرشد کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

سوال کرنے والے عقیدت مند کے لیے یہ کیفیت عجیب تھی۔

اس نے خلوص نیت سے کچھ سیکھنے کے جذبے سے سوال کیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بزرگ اس کے سوال کو سن کر خالی خالی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھنے لگیں گے۔

چہرہ ہر طرح کے جذبے سے عاری..... جیسے آج وہ زندگی کی دہلیز پر پہلی بار قدم رکھ رہے ہوں اور کسی شیر خوار بچے کی طرح معصوم ہوں۔

یہاں تک تو بات اتنی غیر متوقع اور پریشان کن نہیں تھی۔ بزرگ، صوفی، مجذوب، فنکار اور بعض دیگر حضرات کا زندگی کے تئیں رویہ عام طور پر عام آدمیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن جب پھٹی پھٹی آنکھیں جھیل اور آبشار بننے لگیں تو حیرت میں مبتلا ہونا فطری ہے۔

کچھ نے سوال کرنے والے کی طرف ناگوار نگاہوں سے گھورا۔

''کیا ضرورت تھی حضور سے اس طرح کی بات پوچھنے کی؟''

''کون سی بات کب نازک دل کو ٹھیس پہنچا دے اور قطرے دریا کا روپ لینے لگیں، کون جان سکتا ہے؟''

سوال کرنے والا بھی تاسف سے دم بخود تھا۔

کچھ حاصل کرنے کی نیت تھی مگر حضور صدمے سے دوچار ہو گئے۔

لیکن وہ سوال آخر کیا تھا، جس نے حضور پر سکتہ سا طاری کر دیا، یہ سوالی کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس نے اتنے قریب جا کر دھیمے لہجے میں سوال کیا تھا کہ آس پاس کے لوگ بھی اس کی آواز کو سن نہیں پائے۔

دروازے پر پاپوش کے نزدیک بوسیدہ جوتے اور چپلوں کے متعدد جوڑے بکھرے پڑے تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہال میں بچھی ہوئی قالین لوگوں کے بوجھ سے دبی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس کے

جسم پر جگہ جگہ زخموں کے داغ دھبے اس کی طویل العمری کی داستان سنا رہے تھے۔

اس قالین پر ایک نسل ادھیڑ سے بوڑھی ہونے کے بعد اپنا رول ختم کر چکی تھی اور دوسری نسل ضعیفی کے اوبڑ کھابڑ راستوں کی سمت گامزن تھی۔ ہال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بزرگ کی آنکھوں کے کناروں تک پہنچتے ہوئے آنسوؤں کے ہلکوروں کی لے دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی تھی۔

آستانہ کی دیوار جگہ جگہ سے شکستہ تھی۔ ایک دیوار پر خوشنما مذہبی طغریٰ کسی کی آمد کا جیسے صدیوں سے منتظر تھا۔ اس کی بغل میں کسی مسجد کی فلک بوس عمارت اور اونچے گنبد ہال کی خاموشی اور سناٹے کو جیسے چپ چاپ اپنے اندر جذب کرتے ہوئے محویت کے عالم میں مغموم تھے۔

ایک زمانے سے چونے گردانی کو ترستی ہوئی دیواریں ورچھت حیرت سے کبھی بزرگ کا سپاٹ چہرہ، بھیگی آنکھیں اور استغراق کا عالم دیکھ رہی تھیں، کبھی آستاں بوس مجمع کے متغیر اور سر جھکائے پریشان لوگوں کے پشیمان چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اگربتی کی دھیمی دھیمی خوشبو کریدتی ہوئی حیات فہمی کی ترغیب دے رہی تھی۔

کھڑکی کے باہر امرود کے درخت کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہلتی ہوئی بزرگ سے خاموشی اور سکتے کا عالم توڑنے کی استدعا کر رہی تھیں۔ پیڑ کے پھل کئی مہینے پہلے فروخت کئے جا چکے تھے اور ٹھیکہ لینے والے نے انھیں کب کا منڈی پہنچا دیا تھا۔ پھل سے خالی درخت اس حال میں بھی سرسبز و شاداب دکھائی دے رہے تھے۔

دور بیٹھا ہوا ایک آدمی دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا سوال کرنے والے شخص کے قریب آیا۔ اپنا منہ اس کے کان کے پاس لا کر اس نے سرگوشیوں میں پوچھا۔

''تم نے مرشد سے کون سا سوال کیا؟''

''میں نے تو.....!''

وہ ہکلانے لگا۔

بہت دھیمی آواز میں پھسپھساتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں نے سیکھنے کی غرض سے محض یہ پوچھا تھا کہ حضور اس زمانے میں جب کہ بڑے بڑے عالم، فاضل، درویش اور عالی مرتبت لوگ در پردہ گردن تک دنیا داری، لہو لعب اور گھوٹالوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، آپ نے خود کو اب تک کیسے بچائے رکھا؟ اپنی بے داغ اور پاک زندگی کا راز بتانے کی مہربانی کریں۔''

اس نے سوالی کو اس انداز میں گھورا جیسے اس نے مرشد کی شان میں گستاخی کر دی ہو۔

''سنو.....''

مرشد کے چہرے پر تناؤ تھا۔ آنکھوں میں فکر کے ڈورے ہچکولے کھا رہے تھے۔ پیشانی پسینے سے تر ہوگئی تھی۔

مرشد کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ اُنھوں نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔

ڈبڈبائی آنکھوں سے اُنھوں نے چاروں طرف دیکھا۔

ان کی جہاں دیدگی نے نہ جانے کون سا نظارہ دیکھا تھا جو مردہ سی بے کیفی کا سمندر ان کے وجود کی مٹّی کو نگلتا جا رہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد سوال کرنے والے کو انھوں نے اشارے سے قریب بلایا۔ کیفیتوں کا متلاطم دریا ان کے اندر موجزن تھا اور وہ بلند آہنگی کی استطاعت سے محروم دکھائی دے رہا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ان پر نقاہت اور بے بسی طاری تھی۔ صدیوں کے سفر کی تکان کے بوجھ سے ان کے کندھے دکھ رہے تھے۔ اشارے سے اسے قریب بلانے میں بھی انھیں پوری قوت صرف کرنی پڑی تھی۔

''تمھارے اس سوال کا جواب مجھ پر قرض رہا۔ وقت آنے پر میں اس کا جواب دوں گا۔''

مرشد کے تذبذب کے انداز اور کنپٹیوں کی تنی ہوئی نسوں سے لوگوں کو ان کے گوشہ نشیں ہونے کی ضرورت کا اشارہ ملا۔ انھیں استراحت کی حاجت تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے سے بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ کئیوں کے ٹیڑھے اور پیچیدہ سوالوں کے اُنھوں نے تفصیلی جواب یوں دیے تھے جیسے کوئی صاف و شفاف دریا مدھر سنگیت کے ساتھ دھیرے دھیرے بہہ رہا ہو۔ اس سوالی کے سیدھے سادے سوال نے اُنھیں الجھا دیا اور اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے۔

لوگ دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔

ہال خالی ہو گیا۔

مرشد کی ڈبڈبائی آنکھوں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اُنھیں پہلی بار دیکھا گیا تھا۔

(۲)

ایک عرصہ بیت گیا۔

مذکورہ واقعہ بھولی بسری باتوں کی طرح دھند کی گہری تہوں میں دب گیا۔

کسی نے اس سوالی تک پیغام پہنچایا کہ مرشد نے اسے یاد کیا ہے۔

دست بوسی کے بعد بزرگ کے سامنے وہ دوزانو بیٹھا تھا۔

''کئی سال پہلے تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا؟''

حیران و پریشان سوالی کو چشم زدن میں سب کچھ یاد آ گیا مرشد کا سکتہ، گہری اداس ڈبڈبائی ہوئی

آنکھیں، جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی بوسیدہ قالین، کسی کی آمد کا منتظر طغریٰ، پاپوش پر بکھرے ہوئے مرمت طلب نعلین اور چپلوں کے ڈھیر، فلک بوس مسجد کی آنکھوں میں منظر نامے کو جذب کرتی ہوئی حیرت اور استعجاب کی جہاں دیدگی۔

''آج میں نے سوچا کہ اپنے اس قرض کی ادائیگی کر دوں۔ تمھارے سوال کا تشفی بخش جواب دے دوں۔''

میں یہ بوجھ لے کر رب العزت کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتا.....!''

''جی مرشد.....!''

اس نے سر جھکائے ہوئے پورے اشتیاق کے ساتھ مرشد کی تجویز پر اثبات میں اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔

''لیکن.....!''

مرشد نے پہلو بدلا۔

''لیکن تمھارے سوال کا جواب دینے سے پہلے تمھیں ایک اہم اطلاع دینی ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس سوال کا جواب لیے بغیر تشنہ کام روانگی اختیار نہ کرو.....!''

''میں سمجھا نہیں مرشد۔''

عجیب سی بے چینی اور اضطراب میں اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''دیکھو.....!''

مرشد کہتے کہتے رک گئے۔

اُنھوں آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر یہی کیفیت رہی۔ پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھولتے ہوئے اُنھوں نے کہنا شروع کیا۔

''دیکھو! تمھارا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ تم چند گھنٹوں کے مہمان ہو۔ صبح کی پہلی کرن کے طلوع ہوتے ہی تم اس دنیا سے کوچ کر جاؤ گے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ آخرت کے اس ابدی سفر پر تم اس سوال کے بوجھ سے لدے پھندے روانگی اختیار کرو.....!''

''مرشد.....!''

اس کے منہ سے لمبی چیخ نکلی۔

''اب جبکہ موت میرے سامنے مجھے نگلنے کے لیے منہ پھاڑے کھڑی ہے، اس سوال کا جواب میرے کس کام کا؟''

وہ روہانسا ہو گیا۔

''اس جنازے کو رخصت کی اجازت دیجیے مرشد.....!''

کہتے کہتے سوالی کے جسم کی ساری قوت سلب ہوگئی۔ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ وہ رینگتے ہوئے واپس مڑا اور گرتے پڑتے، ہانپتے کانپتے اپنے گھر پہنچا۔

''کیا ہوا؟ اس طرح ڈرے سہمے ہوئے کیوں ہو؟..... چہرہ پیلا کیوں پڑ گیا ہے؟''

بیوی نے سوال کیا۔

''مرشد نے کہہ دیا ہے کہ میری موت قریب ہے.....صبح کی پہلی کرن اور.....مرشد کی پیشن گوئی آج تک غلط نہیں ہوئی۔ وہ آدمی کے بھیس میں فرشتہ ہیں۔ انھیں غیب کی سربستہ باتوں کا علم ہے۔''

بیوی اداس ہوگئی۔ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ اس کے آگے کا رکھا ہوا کھانا ٹھنڈا ہوگیا۔

◄◄ ● ►►

اقبال حسن آزاد

کی کتابیں

قطرہ قطرہ احساس (افسانے)

مردم گزیدہ (افسانے)

پورٹریٹ (افسانے)

نثری اصنافِ ادب اور طنز و مذاح کی روایت

(تحقیق)

زیر طبع

اوس کے موتی (افسانے)

● شوکت حیات

ذائقہ

اس وسیع و عریض علاقے کے انجینیرینگ کالج کے الگ الگ ہوسٹل کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ پہاڑوں کے درمیان نشیب میں پتھّروں کو کاٹ کر اوز مین کو مسطح کر کے تعمیر کیا گیا کالج ماڈرن آرکی ٹکٹ کا بہترین نمونہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انسان کسی ترقی یافتہ مغربی ملک کے انتہائی اونچے درجے کے عالیشان تعلیمی ادارے میں پہنچ گیا ہے۔ وہ پورا اعلاقہ پہاڑی تھا جہاں پہاڑوں سے لپٹی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں لوگوں کے سامنے قدرتی نظاروں اور نیچے اڑتے ہوئے بادلوں کی عجیب و غریب تصویر مہیا کر رہی تھیں۔

تکنیکی تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے لڑکیوں کے درمیان رومانس تو عام بات تھی۔ ذات، مذہب، برادری اور علاقے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اس طرح وہ ادارہ بلا تفریق مذہب و ملت نئی امتوں کی تخلیق کا فریضہ بھی انجام دے رہا تھا۔ جہاں کٹر پن کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ کوئی سیکولرزم کا مدعی بھی نہ تھا۔ بس دل اور جسم کے معاملے میں وہ سب ایک نئی تہذیب کی پرورش و پرداخت کے آدم و حوّا بنے ہوئے تھے۔ ویک اند پرڈینگ بھی ہوتی۔

سراج اور مایا کی آنکھیں کئی دنوں سے کلاس میں چار ہو رہی تھیں۔ دونوں کے دل کے تاروں میں جھنجھناہٹ تھی۔ ویک انڈ پرڈینگ کا پروگرام بن گیا۔ دونوں نے لنچ کے لیے کالج کیمپس سے ذرا دور شہر کے ایک ریستوران میں روم بُک کیا اور آرڈر دے کر کمرے میں ہی کھانا منگوالیا۔

''ہم لوگ لنچ کریں گے، کچھ دیر آرام کریں گے اور راحت کی گہری سانسیں لیں گے اور.....''

لڑکی معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ایک پل کو اسکی نگاہیں نیچی ہوئیں۔ پیر کے انگھوٹے سے اس نے کمرے کی نچلی قالین کو کریدا۔ دوسرے لحظے چہرا اوپر کر کے لڑکے سے آنکھیں ملا کر اس نے کہا۔

''ضرور.....ہم آرام کریں گے اور اپنی تینشن دور کریں گے!''

لڑکی کی آنکھوں کی چمک لڑکے کے جسم کو حرارت پہنچانے لگی۔

کھانا کھانے کے بعد جب دونوں مدہوشی کے عالم میں لڑھکے تو بستر کی چادر ہانپنے لگی۔

لڑکا متلاطم سانسوں سے باہر نکلتے ہوئے سکون کے عالم میں واپس آتا تو اس نے محسوس کیا کہ کہیں کچھ کمی تھی۔

کھانے کے ذائقے اور لذت میں کچھ نہ کچھ ایسا کم تھا جس نے انہیں ادھورے پن سے دوچار کیا۔طبیعت میں جیب سی بے کلی اور ہلچل مچی ہوئی تھی۔

لڑکے کو گھر کی یاد آئی۔ماں شدت سے نمودار ہوئی۔اس نے بھینچتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

''میرے بچے..... پیارے بچے.....!''

''امّاں.....تم ٹھیک کہتی تھیں..... پردیس میں کوئی دل سے اپنا لگنے والا مشکل سے ملتا ہے.....''

(۲)

پندرہویں سال میں سیماب صفت رانی کی شادی ہوئی تھی۔سولہویں میں سراج پیدا ہوا۔تیس بتیس سال کی دہلیز پر پہنچ کر جب وہ جوانی کا مطلب ٹھیک ڈھنگ سے سمجھنے لگی اور اسکا اضطراب بتدریج بڑھتا گیا تو اسکا بیٹا سولہ سترہ سال کے سجیلے نوجوان کا روپ اختیار کر کے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔

وہ بیٹے کو دیکھتی اور دیکھتی رہ جاتی۔اس کا شوہر کئی سالوں سے باہر تھا۔دو سال میں ایک مہینے کے لئے آتا اور پھر اسے مچھلی بے آب کی طرح چھوڑ کر اپنی مہم پر روانہ ہو جاتا۔اس حالت کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ اسی نے اپنے شوہر کو باہر جانے پر مجبور کیا۔بہت دنوں تک وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا یہاں کی روکھی سوکھی پر قانع لیکن رانی نے بچے کی مہنگی تعلیمی ضرورتوں کو دہائی دیکر اس عمر میں شوہر کو باہر جانے پر آمادہ کیا جب لوگ اپنے وطن آ کر چین وسکون کی گزارنیکے خواہاں ہوتے ہیں۔

رانی کے جسم میں شرارے اور چنگاریاں چھپی بیٹھیں تھیں اور اندر ہی اندر اس کی روح کے سلگنے کا سلسلہ جاری تھا سلیولیس اور بیک لیس بلاوز سے ابلتا ہوا اس کا جسم لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا۔

مسیں بھیگنے والی عمر میں کچھ دنوں سے سراج کے ذہن میں ماضی کے گاؤں اور پنگھٹ کی یادیں چکر کاٹ رہی تھی۔جانے کیسے یہ خواہش کلبلانے لگی کہ گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح اس کی دلکش ماں کمر پر گھڑا رکھ کر پنگھٹ پر جاتی ہوئی اور وہ اپنی پیاس ماں کے ہاتھوں کے گھروں سے ڈھلتے ہوئے پانی کی دھار کو ہتھیلیوں کے کٹورے میں لیتے ہوئے بجھاتا ہوتا تو کیسے سیر بی ہو رہی ہوتی۔یہ تصور اسکے معصوم ذہن میں اچانک کونپل کی طرح پھوٹ کر دیکھتے دیکھتے تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

گاؤں میں گزرے ہوئے بچپن میں اسے کمر پر گھڑا رکھ کر بل کھاتی ہوئی پنگھٹ پر جاتی ہوئی عورتیں گہرے طور پر لبھاتی تھیں۔اس کی سانسیں تیز چلنے لگتی تھیں۔عجیب وگریب ہیجان میں وہ مبتلا ہونے لگتا تھا۔خود کو نارمل رکھنے کے لئے اسے گہری گہری سانسیں لینی پڑتیں۔اس کی یہ کیفیت خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

اس رات رانی نقطۂ ابال کو پار کر رہی تھی شوہر ایک مدت سے نہیں آیا تھا۔ہر سال نہ آ کر اپنے

آنے جانے کا خرچ بچاتے ہوئے وہ بچے کی اعلیٰ تعلیم اور ایک کشادہ گھر بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

سراج کی آنکھ کھلی ہوئی تھی.....وہ رانی کے اضطراب کو دیکھ رہا تھا.....محسوس کر رہا تھا۔پنگھٹ پر پہنچی ہوئی عورت نے گھڑا بھرنے کے بعد پانی ڈھالنا شروع کیا۔سراج نے ہتھیلیوں کے کٹورے سے ٹکھرتے ہوئے صاف وشفاف پانی کی دھار کو غٹاغٹ پینا شروع کر دیا۔حلق تک اسکی پوری آنت جل تھل ہو گئی اسے یک گونہ سکون حاصل ہوا۔

شعلے اٹھتے رہے اور موسلا دھار بارش میں بجھتے بھی رہے۔عجیب وغریب دل فریب منظر.....جیسے دھوپ اور بارش نے بیک وقت مصافحہ ومعانقہ کرنا شروع کیر دیا ہو۔دھوپ اور چھاجوں برسنے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

(۳)

لمبی چھٹی کے بعد وہ گھر سے پوسٹل آیا تو ماں کی صحت کے تعلق سے تشویش میں مبتلا تھا۔

آنکھوں کی گہری اداسی، چہرے کا اضمحلال اور شفیق انگلیوں کا ارتعاش.....اس نے محسوس کیا کہ ماں چھ پریشان سی ہے۔بوکھلائی بوکھلائی سی، ہمیشہ ڈاکٹروں کے یہاں وہ اسے ہمراہ لے جایا کرتی تھی۔لیکن اس بار وہ اکیلے گئی۔ اور لوٹنے کے بعد عجیب وغریب اضطراب میں مبتلا رہنے لگی۔اکثر وہ بیٹے سے چھپ کر انگریزی کی ڈکشنری کے اوراق پلٹتی رہتی۔ایک بار ڈاکٹر کا نسخہ اس نے ڈکشنری کے ان صفحات میں دبا دیا جن پر انگریزی کے حرف ''ایم (M)'' سے شروع ہونے والے الفاظ درج تھے۔وہ کسی خاص لفظ کے لغوی اور غالباً اصل معنی ماہیت کی تلاش میں سرگرداں تھی۔سراج کے لیے رانی کی یہ چپی، اضطراب اور باطنی ڈسکورس کی کیفیت ناقابل برداشت تھی۔وہ بے حد فکر مند ہو گیا۔

ایک عرصے تک اس کی ماں کی خوبصورتی اور صحت مندی کا بدل اسکے خاندان میں نہیں دکھائی دیتا تھا۔مرد تو مرد، عورتیں بھی اس کے حسن کی قائل تھیں۔اس بار اسے لگا کی ماں کی چمک ماند پڑنے لگی تھی۔ اندر ہی اندر اسے کوئی فکر کھائے جا رہی تھی۔اس کے چہرے پر تکان اور اداسیوں نے دستک دینا شروع کر دیا تھا۔اس نے خود کو دلاسہ دیا۔

شاید اس کی جدائی کا صدمہ اسے کچھوکے لگا رہا ہو۔

رخصت ہوتے وقت اس نے ماں سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کالج میں دیگر سہولتیں یہاں سے بہتر ہیں.....لیکن اماں آپ کے کھانوں کا ذائقہ.....اپنا خیال رکھا کریں.....میں آپ کے تعلق سے بہت پریشان رہتا ہوں.....اماں آپ کے بغیر.....''

اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں ماں نے اسے کس کر بھینچا۔

ہوسٹل کے تنہا کمرے میں اکیلے ہوتے ہوئے اسے ڈر لگتا تھا۔اس کا جی چاہا کہ رات بھر جاگ جاگ کر اور کروٹیں بدل بدل کر بے چینی میں گزرتی ہوئی پریشانیوں کی بابت تذکرہ کرے۔لیکن جانے کیا

سوچ کر اس سلسلے میں وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ ماں سے شدت کے ساتھ لپٹ گیا۔ رانی کی گرم سانسوں اور شفقت آمیز تھپکیوں سے اسے بے حد راحت ملی تھی۔

وہ آسمان کی لامحدودیت کا حصہ بن گیا..... اڑتا چلا گیا..... یک گونہ طمانیت..... عجیب غریب آسودگی..... نرم بادلوں کے کاندھے اسے فضا میں بہائے لے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ تحلیل ہوتے ہوئے آبخارات میں تبدیل ہونے لگا اور فضا کا حصہ بنتے ہوئے دھواں دھواں کیفیت سے گزرنے لگا۔

(۴)

ہوسٹل کا ایک ہی طرح کا ناقص بریک فاسٹ، لنچ اور ڈنر کھاتے کھاتے وہ سب اوب چکے تھے۔ انجینیر نگ کالج کے ہوسٹل کے میس کا ٹھیکہ علاقے کے برسراقتدار جماعت کے سیاسی لیڈروں کے آدمیوں نے لے رکھا تھا۔ جن کا موصد جیسا تیسا کھانا سپلائی کر کے زیادہ سے زیادہ منافع کمانا تھا۔ سراج بے حد اداس تھا۔ اس کے منھ میں پہلے لقمے کے چباتے ہی کنکر مل گیا تھا۔ پورا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ طبیعت منغّص ہوگئی۔ ''یار ایسا کھانا میں نہیں کھا سکتا!'' اس نے بغل میں بیٹھیں ہوئے دوست کو ہٹو کا دیا۔

''اب چھوڑ بھی یار..... یہاں اچھا کھانا کہاں سے ملے گا۔''

سراج روہانسا ہو گیا۔ ایک تو گھر چھوڑنے کا غم..... دوسرے یہاں کا ناپسندیدہ ناشتہ اور کھانا۔ ماں اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ اس چھوٹے سے شہر میں رہ کر وہ انجینئر نگ کی پڑھائی نہیں کر سکے گا۔ اچھے انجینیر نگ کالج بڑے شہروں میں تھے۔ پسماندہ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں تو ڈھنگ کے سکنڈری اور پرائمری اسکول بھی نہ تھے۔

ہوسٹل واپس آتے ہوئے سراج کے بعض دوستوں نے اس کے مضمحل چہرے کو دیکھ کر اس کا سبب جاننا چاہا۔ سراج کی مان کا فون نہیں آ رہا تھا۔ شاید فون ڈیڈ تھا۔

پڑوس والی آنٹی کے ہاں فون کرتا تو وہاں ریسیور کوئی اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ فون خرابی کی بنا پر فالس رنگ سے دوچار تھا یا آنٹی کے گھر میں کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ سب لوگ شاید کہیں گئے ہوں۔

اسے اپنی ماں کی خیریت کے تعلق سے تشویش تھی۔

سراج نے غور کیا۔ اس کے علاقے میں ترقی کی رفتار بہت سست تھی۔ پورا ملک ایک معکوس ترقی کی طرف گامزن تھا۔ لوگ خوش فہمیوں کے شکار تھے۔ برسراقتدار طبقہ چاہتا تھا کہ لوگ عمومی ترقی کے نقلی گراف کے اتار چڑھاؤ میں کھوئے رہیں تاکہ حکمراں طبقے کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی طرف کسی کا

دھیان مرکوز نہ ہو۔ اس کے محلے میں تو ایک ہی ٹیلی فون بوتھ تھا۔ وہ بھی اس کے گھر سے دور، جبکہ گلی گلی میں ٹیلی فون بوتھ ہونے کا شہرہ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

میس کی بلڈنگ کے بغل سے تیستا ندی بغیر کسی آواز کے خاموشی سے رواں دواں تھی۔ میدان عبور کرتا ہوا وہ ہوسٹل میں واپس آیا تو اس کے روم پارٹنر نے بھی شکایت کی۔

''یار یہاں کھانا کھاتے کھاتے تو زبان چھل گئی ہے۔ کنکر اتنے ملتے ہیں کہ دانت ٹوٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔''

ہوسٹل کے لڑکوں میں کھانے کو لے کر بیزاری تھی۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ دوسرے دن ڈائریکٹر سے اس بات کی شکایت کرینگے جنہوں نے اڈمیشن کے وقت موٹی رقم کا ڈرافٹ لیتے ہوئے اچھے ہوسٹل، اچھے کانے، اچھی پڑھائی اور اچھی پلیس منٹ کی یقین دہانی کرائی تھی۔

طے ہوا کہ تین سے چار بجے کے درمیان جبکہ کلاسیس ختم ہو چکی ہوں گی، طلباء اور گارجین سے ملنے کے ڈائریکٹر کے وقت میں وہ لوگ ان سے ملیں گے اور خراب کھانے کی شکایت کریں گے۔

(۵)

تین بجے ڈائریکٹر کے چیبر کیس امنے کئی لڑکے اکٹھا ہوئے۔ ان کے سیکریٹری کو کہا گیا کہ ان کے کچھ مطالبات ہیں اور وہ ڈائریکٹر سے ملنا چاہتے ہیں۔

سکریٹری نے سبب جاننا چاہا۔ لیکن لڑکوں کا اصرار تھا کہ وہ صرف ڈائریکٹر کو بتائیں گے۔

سکریٹری نے ان کا سلپ اندر بھجوایا۔

گارجین سے ملاقات کرنے کے بعد ڈائریکٹر نے انہیں اندر بلوایا۔ ڈائریکٹر گہرے سوچ میں مبتلا تھا۔

لڑکوں نے انہیں ''گود آفٹرنون سر'' کہا۔

ڈائریکٹر نے سر کو خمیدہ کرتے ہوئے ان کا خاموشی سے جواب دیا۔

''بولئے! کیا شکایت ہے آپ لوگوں کو!؟''

''سر.....'' سراج نے کچھ کہنا چاہا۔ ڈائریکٹر نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ سراج گڑبڑا گیا۔ اشوک آگے بڑھا۔

''سر ہم لوگوں کو میں میں بہت خراب کھانا ملتا ہے۔ نہ کوئی ذائقہ نہ کوئی صفائی کا خیال..... ہم لوگوں کے پیٹ خراب رہنے لگے ہیں اور سراج تو اری ٹیبل بوَیل سینڈروم (Irritable bowel syndrome) کا مریض ہو گیا ہے۔ ہر وقت مروڑ اور اینٹھن سے کڑھتا رہتا ہے۔''

سراج نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اپنی قوت مجتمع کرتے ہوئے بولا۔

''سر! آپ خود کھانا کھا کر دیکھیں کوئی مزہ ہی نہیں ہوتا۔ کہنے کو طرح طرح کی ڈشز بناتا ہے!''

ڈائریکٹر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک نظریں نیچی کئے رہے۔

اشوک نے کہا۔ ''سر! یہ بہت بڑی پرابلم ہے۔ رازانہ تین وقت ہمیں جھیلنا پڑتا ہے۔ اس کو ہر حال میں سولوَ (solve) کرنے کی ضرورت ہے۔

سراج نے کہا۔ ''اتنی اہم بات کے تعلق سے آپ خاموش ہیں۔ یہ اگنور (ignore) کرنے والا معاملہ نہیں ہے سر!'' اس نے ہمت کر کے اشوک کے موقف کو مظبوط کرنے کی کوشش کی۔

طلباء کی نگاہیں ڈائریکٹر پر جمی تھیں۔ ڈائریکٹر نے دھیرے دھیرے نگاہ اوپر کی۔ ان کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔ چہرے کا سارا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

طلباء متحیر تھے۔ تذبذب اور استعجاب کی کیفیتوں میں وہ مبتلا تھے۔ انہوں نے غور کیا۔ گہرائی سے جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ ڈائریکٹر کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے بولنا شروع کیا۔ انکی آواز جیسے کسی گہرے کوئیں سے برآمد ہو رہی تھی۔

''آج سے چالیس سال پہلے گاؤں چھوٹا، گھر چھوٹا، ماں چھوٹی..... تب سے دربدر بھٹکتا رہا ہوں..... کہاں کہاں نہیں گیا..... بیرونی ملکوں تک کا سفر کیا..... ایک سے ایک کھانا ملا..... لیکن ماں کے ہاتھ کے ذائقہ کے لئے ترستا رہ گیا۔'' ڈائریکٹر کی آواز پر رقت طاری تھی۔

''بعد ازاں حالات سدھرے اور ماں سے ملنے کا وقت آیا تو وہ دنیا سدھار گئی۔ آج تک ماں کے ہاتھ کے ذائقہ کے لئے دربدر بھٹک رہا ہوں۔''

پھر وہ پھٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دوسرے لمحے ڈائریکٹر کے چیمبر سے متعدد افراد کے سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

ڈائریکٹر نے عالم بدحواسی میں جیب سے رومال نکالا اور اپنا چہرا ڈھانپ لیا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز ہونٹوں تک آنے سے قاصر تھی۔ اس کے لب تھرتھرا رہے تھے ڈائریکٹر نے توقف کیا۔ پوری قوت جمع کر کے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ چھت کی طرف اٹھتی ہوئی نگاہ جیسے چھت کو چیر کر آسمان میں کچھ ڈھونا چاہ رہی تھی۔

''بچو!..... مجھے آپ سب سے ہمدردی ہے..... سب میرے اپنے بچے جیسے ہیں..... میں آپ میں اپنی تڑپتی ہوئی جوانی کی تصویر دیکھ رہا ہوں۔ ماں کو دیکھتا دیکھتا بوڑھا ہو گیا ہوں۔

ڈائریکٹر صاحب ہانپنے لگے۔ ''بچو.....! معاف کرنا..... تم ماں کے کھانے کے ذائقہ کی جستجو میں ہو۔ دنیا اور دنیا کے راستے بڑے سفاک اور ناہموار ہیں..... بچھڑنے کی ابتدا کا سفر دوریاں بڑھاتا چلا جاتا ہے..... میں میس کے ٹھیکے دار کی سرزنش کرونگا..... اسے وارنگ دونگا..... لیکن شاید کچھ حاصل نہ ہو..... شاید کچھ بھی نہیں.....''

بُدبُداتے رہنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے ڈائریکٹر پھر رکے اور گہری گہری سانسیں لینے کے بعد بولے۔

''خدا کرے تم سب اونچے عہدے اور مرتبے حاصل کرو..... اگر زندگی میں کسی مقام پر ماں کے ہاتھ کے کھانے کا ذائقہ تمہیں مل جائے تو مجھے مطّلع کرنا..... زندہ رہا تو اس مقام کی مٹی چومنے ضرور آؤنگا''

ڈائریکٹر نے سر جھکایا اور پیشانی پر سر رکھ کر کسی گہرے سوچ میں غرقاب ہو گئے۔ طلباء کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ رک کر ڈائریکٹر کی ٹھوس یقین دہائیوں کا انتظار کریں یا وہاں سے نکل کر اسی بے ذائقہ کھانے کو زہر مار کرنے کے لئے میس کا رخ اختیار کرنے پر خود کو مجبور سمجھیں۔

شام کے ناشتے کا وقت ہو رہا تھا۔

اور ڈائریکٹر کے استغراق اور محویت کا عالم بدستور قائم تھا۔

سراج کو دکھ اس بات کا تھا کہ سہ پہر کے ڈائریکٹر کے چیمبر کے پورے واقعے کو یاد کر کے اس کے ہم جماعت اور دیگر طلباء رات میں ہوسٹل کے ریکریشن ہال میں ٹھٹھے مارتے اچھل اچھل کر اور پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔

''ذائقہ..... ہاہاہا.....!''

حتیٰ کہ انکے منھ سے جھاگ ابلنے لگا..... کئی تو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ سراج تو صرف ماں کو یاد کرتا ہوا آنسوں کی ندی میں غوطے کھا رہا تھا۔

پہاڑوں سے لپٹی ہوئی بل کھاتی ہوئی تہہ در تہہ پگڈنڈیاں قدرتی نظاروں اور نیچے اڑتے ہوئے دھواں دھواں بادلوں کی تصویریں پیش کرتے ہوئے عجیب و غریب سماں باندھ رہی تھیں۔

اور، اور.....

دور کی چند پہاڑیاں ایک زمانے سے اپنے دامن سے لپٹ لپٹ کر پیار کرتی ہوئی تیستا کے بہتے ہوئے کھارا پانی کا ذائقہ لیتے ہوئے ہوا اور آسمان سے خموش استعجابیہ ڈسکورس میں محو تھیں۔

◀◀ ● ▶▶

● **شوکت حیات**

بانگ

ایک صبح جب وہ نیند کے مارے کافی دیر سے اٹھے اور انھیں یہ معلوم ہوا کہ سورج کی پہل کرن کا غسل نہ لینے کے سبب وہ ہتھیلیوں کی بہت ساری لکیروں کی تابنا کی کھو چکے ہیں، تو سارا غصّہ حسب معمول مرغوں پر اترا۔

''ان حرامزادوں کے بانگ نہ دینے کے سبب ہم دیر سے اُٹھے۔''

یہ جواز پیش کرتے ہوئے کہ مرغ بانگ دینا بھول گئے ہیں اور انھیں یاد بھی ہے تو جان بوجھ کر جی چراتے ہیں جس میں ان کی سازش، کاہلی یا سستی کو دخل ہے، انھوں نے فوراً کئی مرغوں کو ذبح کر ڈالا۔

سب نے بعد میں ہنستے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ دراصل وہ سبزیاں کھاتے کھاتے اوب گئے تھے اور منہ کا مزا بدلنے کے لیے سوندھے گوشت کا چٹپٹا ذائقہ لینا چاہتے تھے۔

جس دم انھوں نے ڈربوں کی طرف رُخ کیا تھا، مرغوں کے درمیان مہا ماری مچ گئی تھی۔ ہیبت ناک فضا میں خوف کے مارے باریک تار کی جالی میں چھپنے کے لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ مرغوں نے ان کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے خونی ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ اور ان کے حلق سے عجیب پھنسی پھنسی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔

''بے ہودو..... چونچ توڑ ڈالوں گا..... بانگ کے لیے تو کھلتے نہیں. لیکن جالیاں توڑنے میں استاد ہیں۔ روز بہ روز تم لوگوں کی چونچیں بڑھتی جا رہی ہیں لیکن بانگ دینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اگر یہ حرامزادے ایک جگہ کر دیے جائیں تو نہ معلوم جالیوں کا کیا حشر ہو۔ جب تک انھیں ذبح نہیں کیا جائے، ان کا دماغ درست نہیں ہوگا. اور یہ بانگ دینا یاد نہیں رکھیں گے۔''

مرغ پھڑ پھڑاتے ہوئے آخری ہچکی کی طرح اڑے اور ڈربے کی چھتوں سے ٹکرا کر فرش پر اوندھے منہ گرے۔ مختلف رنگوں کی چھری ان کی گردنوں پر سوار ہوگئی۔ انھوں نے چن چن کے ان تمام مرغوں کو ذبح کر دیا جن کی چونچیں لمبی اور مضبوط ہونے لگی تھیں اور بانگ دینے کے بجائے جالیوں کو توڑنے کا کام کرنے لگی تھیں۔

۲

معلوم نہیں مرغوں نے بانگ دی تھی یا نہیں۔ کیوں کہ جس وقت مرغ بانگ دیتے ہیں اس وقت کی نرم و گداز ہواؤں کی سپردگی بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔ گھر میں کسی کو یاد نہیں تھا کہ مرغوں نے کب سے بانگ دینا چھوڑا تھا۔ لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ مرغ اگر بانگ نہیں دیتے تو ان کو پالنے کا کوئی حاصل نہیں۔

ایک دن جب وہ پھر دیر سے اٹھنے پر مرغوں کے ڈربوں کی طرف بڑھ رہے تھے، انھیں احساس ہوا کہ کئی بڑی بڑی چونچوں والے مرغ غائب ہیں۔ ہاتھوں میں چھری لیے ان کے چہروں سے سراسیمگی برسنے لگی۔ بڑی حیرت کی بات تھی کہ ایک ساتھ کئی بہترین مرغ غائب تھے۔ ان کی زبان گوشت کی سوندھی بو سے سپ سپا رہی تھی۔ انھوں نے مرغوں کی گنتی شروع کی۔ ایک دوڑ کر رجسٹر لے آیا اور چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ کچھ مرغیاں بھی غائب تھیں۔ مختلف رنگوں کے مرغ اور مرغیاں.....

''کاہلو.....! بانگ دینے کے ڈر سے غائب ہوتے ہو۔ اسی لیے ہم تمھیں چھوڑتے نہیں تھے۔ اگر ہم تمھیں ذبح کر کے کھائیں نہیں تو تم ہمیں ہی غائب کر دو۔'' سب کے چہرے پر غصّہ اور سوالیہ نشان تھا۔ سب کے سب کسی ان دیکھے خوف سے گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

''یہ مرغ آخر غائب کہاں ہوئے؟؟؟'' وہ اٹھے اور انہوں نے چاروں طرف سے جالیوں کا معائنہ کیا۔ سب ٹھیک تھیں۔ وہ حیرت کر رہے تھے کہ آخر اتنے دنوں سے انہیں یہ کیسے نہیں معلوم ہو سکا کہ مرغ غائب بھی ہو رہے تھے۔ پتہ بھی کیسے چلتا۔ ظاہر ہے کہ ہم ہر وقت ان کی نگرانی نہیں کر سکتے۔ جب جب یہ بانگ نہیں دیتے اور ان کی چونچیں مضبوط ہوتی ہیں، ہم ان کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ ان میں ایک بہت دیر سے جالیوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بغور دیکھ رہا تھا۔ دوسرے نے ٹوکا۔

'' ارے جالیوں کے ٹوٹنے کا سوال کہاں اٹھتا ہے؟ جب بھی ان کی چونچیں جالیوں کو توڑنے کے لائق ہوئیں، ہم نے انھیں ذبح کر دیا۔''

''نہیں.....نہیں.....ادھر آؤ.....'' اس نے ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ سب کے سب اس کی طرف لپکے۔

'' یہ دیکھو..... یہ.....'' جالیوں کے چند چھوٹے چھوٹے دائرے ٹوٹے تھے۔

'' دُھت..... اِتّے سے شگاف سے بھی کوئی باہر آ سکتا ہے؟''

'' ارے مرغ باہر نہیں آ سکتے. لیکن سانپ تو اندر گھس سکتا ہے۔''

''تم بھی احمق ہو۔ مان لو اگر سانپ نے گھس کر مرغوں کو ڈس لیا۔تو ان کی لاشیں تو ملنی چاہئیں۔ حیرت تو یہی ہے نا کہ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ مرغوں کی لاشیں بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی مرغ غائب ہیں۔''

''نہیں.....نہیں.....یہ حرامزادے بانگ دینے کے ڈر سے غائب ہوئے ہیں۔''

''لیکن ان کے ساتھ مرغیوں کو کیا ہو؟''

''ہم تو صرف مرغوں کو ذبح کرتے تھے.....اور انھیں مرغوں کو جو بانگ دینے سے جی چراتے تھے۔''

''دیکھو بھائیو! کوئی نہ کوئی سازش ہے.....یا ہماری آنکھوں کی بنیائی کم ہو رہی ہے.....اور نہیں تو پھر ہماری گنتی کا حساب ہی غلط ہے۔

''بہر حال کچھ نہ کچھ تو ہے.....ایک ساتھ اتنے سارے مرغ غائب.....ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔ایسا کرو فیڈ دینے والے کو بلاؤ۔''

معلوم ہوا کہ مرغوں کو صبح شام فیڈ دینے والا بھی غائب ہے۔اب وہ اور بھی پریشان اور فکر مند ہو گئے۔ایک نے کہا۔

''اب ہمیں بھی غائب ہو جانا چاہیے۔''سب نے اس بات پر زبردستی قہقہہ لگایا اور پھر جیسے کھینچا ہوا ربڑ دباؤ ختم ہوتے ہی اپنی جگہ چپاک سے واپس آ گیا۔

''انڈوں کو اکٹھا کر کے بازار لے جانے والا کہاں ہے؟''فوراً ایک آدمی مخصوص سمت میں دوڑا ہوا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں دوڑا دوڑا واپس آیا۔

''کیا ہوا؟''

''وہ بھی غائب.....''.

گویا ان مرغ مرغیوں کے ساتھ فارم کے سارے عملے بھی سالے غائب ہیں۔ ان کی پریشانیاں حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھیں۔

''ذرا اسے دیکھو جو انڈوں کو سائز کی بنا پر الگ کرتا ہے۔''

ایک آدمی دوڑا ہوا گیا اور اس کے بھی غائب ہونے کی خبر لے کر واپس آیا۔ایک نے پوچھا۔

''انڈوں میں سوئی چبھونے والے کو دیکھ کر آؤں؟''

''چھوڑو!

''اور ڈربے کے صفائی کرنے والے کو؟''

''نہیں.....یہ سالے بھی غائب ہوں گے.....کہیں مزا کر رہے ہوں گے پی کے.....کل خبر لی جائے گی ان کی۔''اس نے چھری ایک طرف پھینک دی۔

''گرو.....گرو.....''ان میں سے ایک نے چھری اٹھا کر کہا۔

''پریشانی میں ہم یہ بھول ہی گئے کہ کچھ حرامزادوں نے آج بھی بانگ نہیں دی۔اور آج کا سارا دن ہمیں نحوست میں گذارنا ہوگا۔''

''لو.....اصل کام ہی بھول رہے تھے۔''اس نے فوراً چھری ہاتھوں میں لی اور بچے ہوئے چند مرغوں میں سے قدرے مضبوط چونچ والے مرغوں کو ذبح کر دیا۔

''حرام خورو.....جالیاں توڑتے ہو.....بانگ دیتے وقت چونچ ٹھٹھ ہو جاتے ہیں۔ہم اگر تمھیں ذبح نہیں کریں تو بانگ دینے کے ڈر سے تم یونہی غائب ہو جاؤ کاہلو.....!''

مرغوں کو ذبح کرنے کے بعد سب کے سب خوش و خرّم ہو گئے۔سوندھے سوندھے گوشت کے خیال سے سب کے منہ میں پانی رِسنے لگا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی کچھ پہلے ان کے سروں پر سے کوئی طوفان نہیں گزرا تھا۔

۳

اس دن کے بعد سے وہ پولٹری فارم کی طرف سے کافی محتاط ہو گئے۔انھیں فارم کے عملوں پر بھروسہ نہیں رہا تھا اور اب باری بدل بدل کر خود نگرانی بھی کرنے لگے تھے۔کسی کارندے کو ان سے پوچھے بغیر فارم کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر شام مرغی خانے کے دروازے پر تالہ لگانے سے پہلے جالیوں کے باہر کھڑے کھڑے وہ مرغ مرغیوں کی گنتی کرتے لیکن انھیں حیرت تھی کہ ہر روز کچھ نہ کچھ تعداد کم ہو رہی تھی۔اور تشویش کی بات یہ تھی کہ کبھی یہ تعداد بڑھ بھی جاتی تھی۔ایک دن انھوں نے فارم کے عملوں کو بری طرح مارا پیٹا۔

''حرام خورو.....تم لوگ چوری کرتے ہو۔''وہ سب ہر طرح انکار کرتے رہے لیکن ان کے ہاتھوں نے رکنے کا نام نہ لیا۔

''حرام زادو.....تمھیں بھی مرغ کے گوشت کا مزہ لگ چکا ہے۔مارتے مارتے جب کافی دیر ہو چکی تو ان میں سے ایک ملازم نے مارنے والے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''تم مارے گا سالا.....مادر.....''ملازم نے کالر پکڑ لیا اور مارنے والے کی گردن پر اپنے پنجے

مضبوط کر دیے۔صورتِ حال یوں پلٹنے لگی تو فوراً فارم کے مالکوں میں سے ایک ہوشیاری دکھاتے ہوئے بیچ میں آ گیا۔ملازم کا ہاتھ اپنے پارٹنر کی گردن سے الگ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے بھائی.....ہم سے غلطی ہوگئی۔ہم لوگ معافی مانگتے ہیں.....تم لوگ جاؤ۔'' سارے ملازم واپس ہوگئے۔جس کی گردن مضبوط کھردرے پنجوں کی گرفت سے اب تک سرخ تھی، وہ بھنّا گیا۔

''آخر تم نے یہ کیوں کیا؟ اس سالے کی چمڑی ادھیڑ دیتا۔''

''تم بہت بھولے ہو.....ہوش کھو دیتے ہو.....زمانہ بدل گیا ہے.....ان.....نَ.....نَ.....

''نَ.....نَ.....کیا کہنا چاہتے ہو۔'' اس کی زبان کی لڑکھڑاہٹ پر دوسرا چونک کر بولا۔

''کچھ نہیں.....سالا 'نمک حرامو' بولنا چاہ رہا تھا تو زبان لٹ پٹا رہی تھی۔''

''مرغوں کے گوشت کی سوندھی مہک تو نہیں چبھ گئی؟'' کچھ نے پھر بادل ناخواستہ قہقہہ لگایا۔ کھوکھلے قہقہوں کے سنّاٹے سے اوب کر بگڑے ہوئے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بات پوری کی۔

''میں دار صل یہ کہہ رہا تھا کہ ان نَ.....نمک حراموں کا قصّہ پاک ہو جائے گا....ضروری نہیں کہ ہر کام اپنے ہاتھوں کرو۔آخر اتنی بڑی بھیڑ اور اتنے سارے بھوکے ننگے لوگ کب کام آئیں گے؟ آج رات ان کا انتظام ہو جائے گا۔جو کام سنّاٹے میں ہوتا ہے وہ سنّاٹے کا حصّہ بن جاتا ہے.....ہمیں اپنی تجارت بھی تو دیکھنی ہے۔اس طرح دن دہاڑے سب کے سامنے مار پیٹ کرتے تو فارم کی گڈول کا کیا ہوتا؟''

بھنّانے والا خاموش ہو گیا۔سب کے سب مشورہ دینے والے کی باتوں کو سراہ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے بھائیو!.....ہمارے فارم کی گڈوِل اصل چیز ہے۔آدمیوں کا کیا ہے.....کل سے ہم نئے لوگوں کو بحال کر لیں گے۔''

دوسرے دن نئے عملے بحال کر لیے گئے۔اب وہ اور بھی محتاط ہو گئے۔عملوں کے فارم سے باہر نکلتے وقت وہ ان کے کپڑوں اور جھولوں کی تلاشی لیتے تھے۔لیکن ان کی ساری احتیاطوں کے باوجود مرغ اور مرغیوں کے غائب ہونے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔اور اب انڈوں کی تجارت متاثر ہونے لگی تھی۔گاہک انڈوں کے سائز کی شکایتیں کرنے لگے تھے۔ان سے نکالے جانے والے چوزوں کے رنگوں میں بھی فرق آنے لگا تھا۔رنگوں کی ماہیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔گاہک لال رنگ کی مرغیوں کے انڈے سمجھ کر لے جاتے اور ان میں سے چتکبرے رنگ کے چوزے برآمد ہوتے۔مرغوں کی کمی کے سبب بہت سارے انڈے چوزوں کی تخلیق کے سلسلے میں بے عمل ثابت ہو رہے تھے۔مرغیوں کے مقابلے میں مرغوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔

مرغوں کو کھانے اور پھر ان کے غائب ہونے کی وجہ سے ان کی تجارت ٹھپ پڑنے لگی تو انھیں لگا کہ مرغوں کے سوندھے سوندھے بھُنے ہوئے پارچوں سے بھرے منہ میں کسی نے زبردستی سڑے ہوئے انڈے ٹھونس دیے ہوں۔پورا منہ بدبودار چکنے محلول سے بھر گیا اور وہ آخ تھو کرتے ہوئے نل کی جانب لپکے۔

۴

لال اور سیاہ رنگ کے کچھ مرغ بچ گئے تھے جو اختلاط کے لیے اپنے ڈربوں میں جنون کے عالم میں چکّر کاٹ رہے تھے۔لیکن انھیں سفید مرغیوں کے خانے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔اس طرح ان کے رنگوں کی ماہیت تباہ ہو جائے گی۔یہی سوچتے ہوئے انھوں نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی کہ سفید مرغی کے انڈے چوزے کی تخلیق کے سلسلے میں بے عمل ثابت ہوں گے۔

تمام رنگوں کے مرغ مرغیوں کی نئے سرے سے خریداری ضروری تھی۔انڈے لاکر ان سے چوزے نکالنے میں کافی دیر لگ جاتی اور اس درمیان ان کے بہت سارے گاہک بدک جاتے۔انھوں نے فیصلہ کیا کہ بازار سے تمام رنگوں کے مرغ خرید کر لائے جائیں۔لیکن پھر کسی کے ذہن میں یہ بات آئی۔

''اگر ان مرغوں نے بھی بانگ نہیں دی تو.....ہم صبح میں دیر سے اٹھیں گے اور ہماری ہتھیلی کی لکیریں تڑکے صبح کے غسل آفتاب سے محروم ہو جائیں گی۔''

''لیکن اسی بہانے ہم انہیں.....''

سب کے ہونٹوں پر دھار دار مسکراہٹ دوڑ گئی جسے سب نے بہت تیزی سے ایک دوسرے سے چھپاتے ہوئے اندر اتار لیا اور گمبھیر ہو گئے۔

ان کا کہنا تھا کہ ہتھیلی کی لکیریں سورج کی پہلی کرن سے جوان ہوتی ہیں اور ان میں اتنی توانائی آ جاتی ہے کہ بلندیوں کی پرواز میں آدمی کے قدم نہیں تھکتے۔لیکن اس کے لیے سویرے اٹھنا ضروری تھا۔اور سویرے اٹھنے کے لیے وہ مرغوں کی بانگ کے محتاج تھے۔اور مرغوں نے شاید اس لیے بانگ دینا چھوڑ دیا تھا کہ گھر کے دالان میں پولٹری فارم کے پاس تحفظ کے خیال سے رات بھر جلتے ہوئے اونچے باور کے بلب کی روشنی میں انھیں رات کی سیاہی کے دم توڑنے کا اندازہ ہی نہیں مل پاتا تھا۔سارے عملوں کو سخت ہدایت تھی کہ جس روز بھی کوئی مرغ بانگ نہ دے فوراً اس کی رپورٹ کریں۔انھوں نے موٹے موٹے حرفوں میں لکھوا کر ٹنگوا دیا تھا۔

''بانگ نہ دینے کی سَزا موت ہے۔''

بازار میں مرغ خریدنے سے پہلے انھوں نے دکاندار سے اس کے بانگ دینے کی ضمانت

چاہی۔ دکاندار نے کہا۔

حضور یہ بھی پوچھنے کی بات ہے؟ مرغوں کا کام ہی ہے بانگ دینا.....اور مرغیوں کے انڈے بھرنا۔

''نہ دیں تو.....؟''

''نہ دیں تو.....؟ سمجھئے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔''

''کہاں.....؟''

دکاندار نے ان کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''کہاں.....؟ بتاؤں میں.....؟؟

''ہاں.....ہاں.....'' ان کی آواز سے اندیشہ جھلکنے لگا۔

''ان کے رنگوں میں گڑبڑ ہے۔''

''لیکن ہم نے تو رنگوں کی شُدّھی کا پورا خیال رکھا ہے۔ انھیں مخلوط ہونے سے بچایا ہے۔''

''رنگوں کی شدّھی.....!''

دکاندار نے ان کے ہاتھوں سے مرغ اچک لیا اور فوراً اس کی گردن پر چھُری پھیر دی۔

''یہ لیجیے!''

'دیکھو بھائی.....ہم مرغ کھانا نہیں چاہتے بلکہ صبح سویرے ان کی بانگ پر اٹھنا چاہتے ہیں۔ اور پھر مرغیوں کے بے عمل انڈوں میں چوزوں کی حرارت دوڑانی ہے۔ ہمیں ایسے ہی مرغ چاہئیں جو ہر حال میں صبح سویرے بانگ دیں۔

''ہم سب سمجھتے ہیں حضور.....!''

مرغ فروش نے مسکراتے ہوئے انھیں آنکھ ماری اور ذبیحہ مرغ دوسرے گاہک کے ہاتھوں فروخت کرتے ہوئے کہا۔

''لینا ہو تو لے لو صاحب۔ ورنہ کچھ دن میں مرغ آسمان میں اڑ جائیں گے۔ سویرے اٹھنا ہے تو سونے کی کیا ضرورت؟ سورج تو ان کی بانگ کا انتظار نہیں کرتا۔ مرغوں پر بھروسہ کرنا عقلمندی نہیں..... کیوں کہ مرغوں نے تم پر بہت بھروسہ کیا۔ تم انھیں خانہ بند ڈبّوں میں بند رکھتے ہو۔ میں انھیں آزاد رکھتا ہوں۔ یہ سب کچھ جانتے ہیں اور پھر بھی مجھے دھوکہ دے کر نہیں بھاگتے۔ کیوں کہ میں نے ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ انھیں رنگوں میں نہیں بانٹا۔ یہ بانگ دیں نہ دیں۔ ورنہ پھر کہتا ہوں کہ کچھ دنوں کے اندر یہ جنگلی زمین میں چھپ جائیں گے۔ اور جب برآمد ہوں گے تو ان کے پیچھے جنگلی چوزوں کی ایک فوج ہوگی۔ ان جنگلی

چوزوں کی چونچیں اتنی مضبوط ہوں گی۔ اتنی مظبوط ہوں گی کہ تار کی جالیوں کو توڑ کر تمھاری گردنوں میں پیوست ہو جائیں گی۔''

''بھائی اگر انہیں مختلف خانوں میں نہیں بانٹوں تو ان کی چونچیں جالیوں سے مضبوط ہو جائیں گی اور وہ اسے توڑ کر باہر نکل آئیں گے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ زیادہ تر مرغے بانگ نہیں دیتے۔ ہم تو سب سے بڑا جرم یہی سمجھتے ہیں۔ صاف بات ہے ہمیں ایسے مرغ چاہئیں جو بانگ دیں۔''

''اب آئے نہ تم راستے پر۔'' مرغ فروش مسکراتے ہوئے اچھل پڑا۔

''لیکن ٹھیک سے نہیں آئے۔ میں کہتا ہوں مرغ بانگ نہیں دیں تو اُنھیں لقمہ بناؤ گے؟''

''کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ وہ بانگ دیتے دیتے عاجز آ چکے ہیں۔''

''ہمیں اس سے کیا۔ مرغوں کا پہلا کام ہے بانگ دینا۔ اگر وہ بانگ نہ دیں تو انھیں سزا ملنی ہی چاہیے۔''

''انھیں ڈربوں کی تقسیم سے آزاد رکھنا ہوگا۔''

''یہ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''تو سُن لو کہ مرغ اب بانگ نہیں دیں گے اور تمھارے مُنہ کا نوالہ بھی نہیں بنیں گے۔ ان کی چونچیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ خانہ بند جالیاں توڑ ڈالیں گی۔ اور تمھاری گردنوں میں..... پھر کہتا ہوں کہ بانگ کی آڑ میں انھیں لقمہ بنانا چھوڑ دو۔''.

وہ فوراً خریداری کا خیال چھوڑ کر مرغ فروش کے پاس سے بھاگے کہ وہ ان کے گہرے ارادوں کی ہلکی ہلکی مہک سونگھ چکا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر پوری بو اس نے سونگھ لی اور چاروں طرف پھیل گئی تو پھر مرغوں کو خانوں میں تقسیم کرنے کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور جنگلی چوزوں کی تخلیق کرنے والے مرغے مرغیوں کو ذبح کر کے کھانے کے منصوبے ادھورے رہ جائیں گے اور تجارت بھی۔

بات دراصل یہی تھی کہ مرغوں نے صدیوں کے بعد پولٹری فارم کے مختلف خانوں میں رنگوں کی بنیاد پر اپنے جھنڈ کو بنٹتے دیکھ کر اور بانگ کی آڑ میں اپنے قتل پر چونچ اور پنجوں سے ان خانوں کو توڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دن رات آزاد نہ آوارہ گردی کرنا چاہتے تھے۔ جب کہ ان پر پابندی تھی کہ تمام مرغ صرف اپنے رنگ کی مرغیوں کے ساتھ اختلاط کر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ رنگوں کا بکھراؤ ہو گیا تو ایک دھماکہ پیدا ہوگا اور پولٹری فارم کی جالیاں لرز جائیں گی۔

انھیں زبردستی پولٹری فارم کے خانہ بند ڈربوں میں بند کر دیا گیا تو جیسے جیسے ان کی چونچیں سخت ہوتی گئیں، انھوں نے بانگ دینا چھوڑ کر جالیوں سے لگی زمین کو کھودنا شروع کر دیا۔ اس طرح مرغ یہ بھی چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک مالکان سوئے رہیں اور وہ اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہیں۔ کام پورا ہوتے ہی رنگوں کی تمام پابندیوں سے دور ایسے چتکبرے چوزوں کی تخلیق کریں جنھوں نے کبھی ڈربہ نہیں دیکھا ہو اور جو تمام ڈربوں کو اپنے مضبوط جنگلی پنجوں اور چونچ سے مسمار کر سکتے ہوں۔ تمام مرغ بانگ کے بہانے اپنے قتل پر اس حد تک انتقام کی آگ میں جلنے لگے تھے کہ یوں بھی ان کے رنگ تبدیل ہو رہے تھے۔

وہ پولٹری فارم کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر خطرناک اندیشہ سوالیہ نشان بن کر ثبت تھا۔ مرغ فروش کی باتیں سُن کر اُنھیں تشویش لاحق ہوگئی تھی۔

''اگر اس کی باتیں سچ ہوئیں تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔''

مرغ فروش کی باتیں گونج رہی تھیں۔

(جنگلی چوزوں کی چونچیں اتنی مضبوط ہوں گی کہ جالیوں کو توڑ کر تمھاری گردنوں میں پیوست ہو جائیں گی۔)

جلد سے جلد وہ فارم پہنچ کر دل میں ابھرتے ہوئے وسوسوں اور اندیشیوں کو مطمئن کرنا چاہ رہے تھے۔

''حرامزادے ایک تو بانگ نہیں دے کر ہماری صبح اور ہمارا سارا دن خراب کرتے ہیں اور اس پر سے جالیاں توڑنے کی سازش کرتے ہیں۔''

دور ہی سے انھوں نے فارم کی جالیوں کو اپنی جگہ صحیح وسالم دیکھا تو انھیں اطمینان ہوا۔

۵

دوپہر کی سخت گرمی میں وہ پسینے میں شرابور تھے۔ پولٹری فارم کے نزدیک پہنچے تو اکّا دکّا مرغیوں کو پر پھیلا کر ڈربے میں سوتے ہوئے دیکھا۔ باہر ہی سے جالی کے اندر ڈربوں کا بغور جائزہ لینے پر انھیں کچھ خالی پن کا احساس ہوا۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ پھر سے فکرمند ہوگئے۔ محتاط انداز میں کنجی کی بے آواز حرکتوں سے انھوں نے تالہ کھولا اور ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں مرغی خانے کے اندر داخل ہوئے ایک دوسرے کو انھوں نے انگلیوں کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور آنکھیں پھاڑ کر قدموں کو چھوٹا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ادھر ادھر کچھ مرغیاں سوئی ہوئی تھیں۔ ایک نقطہ پر ان کی نگاہیں اٹک گئیں۔ فارم کے بیچوں بیچ کئی

ڈربوں کے درمیان انھوں نے ایک مہیب غار دیکھا۔ سب کے سب چوکنّا ہو گئے۔ دوپہر کے سورج کی کرنیں زمین دوز غار بہت دور دور تک ان پر روشن کر رہی تھیں۔ ان کے بدن کا خون منجمد سا ہو گیا۔

کچھ لوگ بہت آہستگی اور ہوشیاری سے غار کے قریب آئے۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے اپنی متوحش آنکھوں سے غار کے اندر جھانکا۔ نیچے کافی بڑا تہہ خانہ تھا۔ ایک دنیا آباد تھی۔ جس میں مختلف رنگوں کے ان گنت مرغ مرغیوں کے جھنڈ تھے۔ کئی مرغ مرغیاں رنگوں کی تفریق کے بغیر بے تحاشا اختلاط میں مصروف تھے۔ مختلف رنگوں کے مرغ اور مرغیاں ایک دوسرے سے اس طرح بغل گیر تھے جیسے وہ ازل سے ایک دوسرے سے ملنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ خطرناک حد تک ان کے چہروں پر طمانیت تھی۔ کچھ تھک کر سو رہے تھے۔ ایک طرف اُٹھتی ہوئی سیاہ آندھیوں کی طرح چتکبرے چوزوں کی ایک فوج تھی جو اپنے چھوٹے چھوٹے نوکیلے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے آپس میں چہلیں کر رہی تھی۔ ان کی چونچیں ابھی سے کافی لمبی اور نوکیلی تھیں۔ انھوں نے غور کیا۔ تمام رنگوں کے ڈربوں کے نیچے بڑا سوراخ تھا جو زمین دوز تہہ خانے میں کھلتا تھا۔

ان کے پیروں تلے کی زمین الٹ کر ان کے سروں پر آ گئی۔ ہو ہی گیا آخر جو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ مرغ فروش کی باتیں سچ نکلیں۔

(چونچیں اتنی مضبوط ہوں گی کہ تار کی جالیوں کو توڑ کر تمھاری گردنوں میں پیوست ہو جائیں گی۔)

بے اختیار ان کے ہاتھ گردنوں پر چلے گئے۔

''اب ہم پر خطرہ ہے۔''

وہ بدحواس ہو گئے۔ ایک نے سوچا کہ جلدی سے کمرے سے جا کر بندوق لے آئے۔ وہ دبے پاؤں مڑا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور خوف کا کوئی ٹھکانا نہ رہا کہ ابھی ابھی جو مرغیاں باہر سو رہی تھیں وہ ان کے راستوں میں تن کر کھڑی ہیں۔ سب کے سب اچھل کر دروازے تک آئے۔ ابھی وہ مرغی خانہ کا دروازہ بند کرنا ہی چاہ رہے تھے کہ چتکبرے چوزوں کی فوج ان پر حملہ آور ہوگئی اور وہ بے تحاشا بھاگے۔ چاروں طرف ہوا میں مرغوں کی کلغیاں بجلیوں کی طرح کوند رہی تھیں اور زمین پر چوزوں کی فوج اپنے چھری نما پنجوں سے اچھل اچھل کر ان پر حملے کر رہی تھی۔

فضا کے چپّے چپّے میں جنگلی مرغوں کی پھڑ پھڑاہٹ تھی اور اچھلتے ہوئے ان کے بجلی نما پنجے اور چونچ۔ دیکھتے دیکھتے ان کے سفید کپڑے تار تار ہو گئے۔ اندر سے سیاہ بنیان اور لنگوٹ نظر آنے لگے۔ وہ بے تحاشہ کسی پناہ گاہ کی طرف بھاگے۔ ان کے چہروں پر چڑھا لیپ چونچ اور پنجوں کے وار سے بھر بھرا کر نیچے گر رہا تھا۔ اندھا دھند وہ اس پولٹری فارم سے دور بھاگے جا رہے تھے جہاں آج تک ان گنت مرغوں کو بانگ اور ہتھیلی کی لکیروں کے غسل آفتاب کی آڑ میں وہ ذبح کر کے چٹخارے لے لے کر کھا چکے تھے....اور رنگوں

کی بنیاد پر ان کے جھنڈ کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکے تھے۔

مرغ فروش پیچھے سے چیخ رہا تھا۔

''میں نے کہاں تھا نا حرام زادو..... بانگ کے بہانے جب تک ان معصوموں کو مار رہے ہو مارتے جاؤ..... جب تک انھیں بانٹ رہے ہو بانٹو.....ایک دن آئے گا جب یہ تمام خانوں کو توڑتے ہوئے ایک جھنڈ ہو کر زمین دوز تہہ خانوں میں چھپ جائیں گے اور چتکبرے جنگلی چوزوں کی فوج کے ساتھ برآمد ہو کر ہواؤں میں اڑ جائیں گے.....پھیل جائیں گے.....قاتلو.....! اڑ جائیں گے.....پھیل جائیں گے۔قاتلو.....! ہوا میں بدل جائیں گے.....ایسی بانگ دیں گے.....ایسی بانگ دیں گے کہ.....''

مرغ فروش جنون میں سر اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بہ آواز بلند چیخے جا رہا تھا اور اس کے اردگرد بھیڑ بڑھ رہی تھی۔

''سنو بانگ.....بناؤ لقمہ.....لو چٹخارہ.....ہاہا.....بانگ سنو.....!''

جیسے جیسے بوڑھا مرغ فروش بول رہا تھا، لوگوں کی آنکھوں سے دھند لکا ختم ہو رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے تنی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ بوڑھے کو گھیرے میں لے لیا اور کچھ لوگوں نے اسی طرف دوڑنا شروع کر دیا جس طرف بوڑھا بار بار انگلیوں کو تیروں کی طرح پھینک رہا تھا۔

وہ تمام منصوبہ بند سیاہ بنیان اور لنگوٹ میں دوڑتے ہوئے مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے۔ مرغوں کے حملوں سے ان کے جسم پر جا بجا شگاف بن گئے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ تمام باتوں کی پروا کیے بغیر وہ بس بھاگے جا رہے تھے کہ کسی طرح کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائیں اور اپنے منصوبوں کے دستاویز کو مرغوں کی یلغار سے محفوظ کر دیں۔

دوڑتے دوڑتے رات ہو گئی۔ لیکن انھیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملی۔ مرغوں اور چوزوں کی فوج ان پر مستقل حملہ آور تھی اور ان کے جسم سے جھپٹتے ہوئے گوشت نوچ رہی تھی۔ انھوں نے ایک جگہ دریا دیکھا۔ آسمان سے چاندنی برس رہی تھی۔ اور پانی کی سطح شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ انھوں نے بے تحاشا دریا میں چھلانگ لگا دی۔ ان کے کودتے ہی چمکتا ہوا پانی تاریک ہو گیا۔

اور پھر سرخی پھیل گئی۔

بہت دیر بعد لڑکھڑاتے ہوئے سرخ پانی سے وہ باہر نکلے تو زرد ہو چکے تھے۔

دریا کے کنارے سارے مرغ ایک ساتھ بلند آواز میں بانگ دے رہے تھے۔

◀◀ ● ▶▶

● شوکت حیات

میّت

بیسویں صدی اپنے آخری پڑاؤ پر کینچلی بدل چکی تھی۔ اگر اس نے دھیان نہ دیا ہوتا تو سڑک پر اوندھے منہ گرتا۔

اور پھر کیا پتا کسی ٹرک، موٹر یا بس کے نیچے آ کر کچل گیا ہوتا۔ اور اس دنیا سے...

سائیکل اور اسکوٹر وغیرہ جیسی ہلکی سواری کی زد میں آتا تو جسم کا کوئی عضو اپنی سالمیت کھو دیتا، لیکن جان شاید بچ جاتی.....شکر ہے کہ بغل سے تیز رفتاری سے گزرتے ہوئے نوجوان نے اس کا کندھا پکڑ کر اسے سہارا دیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اب بھی نیک لوگ دنیا میں ہیں۔

آمر کی بیوی کی موت کی اطلاع ملتے ہی اس پر عجیب بدحواسی طاری ہو گئی تھی۔

اچھی بھلی خاتون۔ چالیس بیالیس کے قریب عمر۔ مرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ڈائی بٹیز کی شکایت تو اب عام بات تھی، لیکن بھلا اس کے سبب اس عمر میں کوئی جان سے ہاتھ دھوتا ہے۔

آمر نے فون پر بتایا تھا کہ اس کی بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ وہیں اچانک ہارٹ اٹیک ہوا اور پھر زندہ رہنا نصیب نہ ہوا۔ اس نے بتایا طبیعت میں عجیب اضمحلال اور بے چینی ہے، فوراً آ جاؤ۔

آمر کے یہاں پہنچنے کے لیے اب لمبا راستہ تبدیل کرنا تھا۔ سڑک کی ایک جانب اونچا ٹیلا تھا جس سے ملحق ایک غیر آباد قبرستان تھا۔ اس کے بیشتر حصے پر یاروں نے اونچی اونچی عمارتیں تیار کر لی تھیں۔

۲

گاؤں سے آیا ہوا تیس سال پہلے کا آمر درّانی اب کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ (سماجی انصاف کا علمبردار درّانی) اس کے بچپن کا لنگوٹیا یار تھا۔ درّانی کی رگ رگ سے وہ واقف تھا۔ گزشتہ دس سالوں میں پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر جس طرح اونچی اور چوڑی چمچماتی ہوئی شاہراہ کا درّانی راہ گیر بن گیا تھا، اسے بچپن کا دوست کہتے ہوئے اسے کبھی کبھی شرم محسوس ہوتی تھی۔

لیکن جوانی اور ادھیڑ پن کی سرحد میں پہنچنے کے بعد بچپن کی کسی گلی کا بدصورت کتا بھی پیارا لگتا ہے۔ کبھی بے پناہی کے عالم میں پردیس میں یہ کتا دکھائی دے جائے تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ رک کر اسے

پیار کرنے اور بچپن کی اس گلی کے مکینوں کے احوال جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ کس پر کم اور کس پر زیادہ بھونکتا تھا، یہ سب یاد آنے لگتا۔ یہ الگ بات ہے کہ مصروفیت کی مار جھیلتا آدمی چند لمحے ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی سڑک کی ریل پیل میں آگے بڑھ جانے پر مجبور ہوتا ہے۔ نہ بڑھے تو گر پڑے اور کوئی ٹھیک نہیں کہ بھیڑ کے پیروں کے نیچے کچلتا چلا جائے۔

آمر شہر میں نیا نیا آیا تھا تو ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ غریب گھر کا لڑکا۔ آنکھوں میں بہت سارے خواب سجائے۔ جب کہ اس کے بوڑھے والدین بڑھاپے میں صرف دو وقت کی روٹی کا آسرا چاہ رہے تھے، لیکن آمر کو شہر کی نشیلی ہواؤں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد اسے قناعت کہاں گوارا تھی...وہ اڑا تو اڑتا ہی چلا گیا۔

آمر نے فون کیا تھا۔

''فوراً آجاؤ!''

وہ نشیبی راستے کی طرف مڑا۔

پیدل چلتے ہوئے لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

''شوہر کے رویے سے تنگ آ گئی تھی''!

''غصّے میں میکے چلی گئی!''

''اس نے وہیں کچھ ایسا قدم اٹھا لیا کہ اذیت بھری زندگی سے نجات مل جائے!''

کہنے والے تو بہت کچھ کہتے لیکن وہ اس کا پرانا دوست تھا۔ ایسا نہیں سمجھتا تھا کہ مقابلے اور مسابقت کے پیش نظر دنیاوی اونچائی تک پہنچنے کے لئے اسے اپنی داخلیت کو داؤ پر لگانے میں عار نہ ہوئی ہوگی۔

اس کی بیوی کا بجھا بجھا چہرہ بہت ساری کہانیاں کہتا، لیکن اپنے ہونٹ اس نے سی لئے۔ ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہمہ وقت رینگتی رہتی۔

حد درجہ میک اپ اور شانوں پر کھلے لمبے گیسو سے اسے دلی نفرت تھی، لیکن شوہر کی ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلتی۔ خاص خاص موقعوں پر اس کے کھلے ہوئے بالوں پر از حد اصرار کرتا۔

وہ اکثر انہیں بتاتا۔

بھابی مارننگ واک کیجئے۔ آپ کے بلڈ شوگر کا لیول کافی حد تک نارمل ہو جائے گا۔

جامنی رنگ کی باریک جارجٹ کی ساڑی سے اپنے ابلتے ہوئے گداز جسم کو سنبھالتے ہوئے بھابی بولتیں۔

اذیتیں نہ ہوں تو بھائی صاحب ساری بیماری از خود ٹھیک ہو سکتی ہے!''

''کیا کمی ہے بھابی..... پیار کرنے والا شوہر.....اچھی بھلی چیئر مینی.....سیاسی اثر و رسوخ..... گاڑی، فلیٹ، خوبصورت بچے.....!''

جیسے جیسے وہ بولتا جا رہا تھا، خوبصورت بھابی کہیں کھوتی جا رہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ گھلتی جا رہی تھیں۔ کسی کھائی میں گرتی جا رہی تھیں...سلیولیس بلاؤز میں چمکتے ہوئے بازو اور دمکتا ہوا پورا جسم پسینے میں شرابور.....حواس باختہ..... ہانپتی ہوئی.....بچنے کی کوشش میں ہراساں.....چاروں طرف سے جیسے گدھوں نے گھیرے میں لے رکھا ہو...اور وہ تنہا اپنے صندلی جسم کی حفاظت کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہوں۔

پیر کے نازک انگوٹھے موزیک والے فرش کو کریدنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

''نامراد بھابی.....تم بھری تھالی پر لات مار کر چلی گئیں.....!''

اغل بغل سے گزرتے ہوئے لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''یہ شخص کسی سے باتیں کر رہا ہے؟''

''پاگل!''

''لیکن شکل وصورت سے تو ٹھیک ٹھاک ہے''۔

''اچھی''، شکل والے آج کل زیادہ پاگل پن سے دوچار ہیں!''

اشاروں اشاروں میں اس نے آمر درّانی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن زندگی کی تیز رفتاری کی اندھی دوڑ میں اس نے اس کی باتوں کو ان سنی کر دیا۔ یا شاید سنا ہی نہیں۔

۳

''بہت دیر کر دی تم نے.....؟''

آمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''گاؤں سے سارے عزیز و اقارب آ گئے؟''

''ہاں.....تقریباً سارے!''

''انکل.....آنٹی.....؟''

''وہ دونوں تو سب سے پہلے پہنچے!''

''ذرا دیکھو.....!''

آمر اس کے مزید قریب آیا۔ الگ لے جا کر اس کے کانوں میں بولا۔

''شہر کی تقریباً تمام معزز ہستیاں یہاں موجود ہیں۔اتنی بھیڑ دیکھ کر میں تو محو حیرت ہوں کہ مجھے لوگ.....میرے غم میں اتنے سارے لوگ شامل ہیں..... پچاس گاڑیاں آ چکی ہیں..... گن لو تم..... میں تو کئی بار.....فوٹو گرافروں کی تو ریل پیل ہے.....مختلف چینل والے.....اخبار کے رپورٹر.....کیا بتاؤں کیسا ازدحام ہے۔''

اس کے دل کو دھچکا لگا۔کیا ہو گیا ہے آمر کو۔اس عالم میں بھی اس کے ذہن میں.....

''دیکھ رہے ہو.....ذرا سوچو کون نہیں ہے یہاں.....ذرا سوچو...اس کا کیا مطلب نکلتا ہے،اس کی آنکھوں میں عجیب وغریب چمک تھی۔میں.....اس کی آنکھوں کی چمک پر دبیز دھندلا پن کی پرت پڑی ہوئی تھی۔

آمر نے اس کے ہاتھوں پر دباؤ بڑھایا۔

''اس میں کیا شک ہے.....تم خود راجدھانی کی ایک بہت ہی اہم اور ناگزیر شخصیت ہو.....ایسے موقعوں پر لوگ تمہارے جیسوں کی نظروں کے رجسٹر میں حاضری ضروری سمجھتے ہیں.....''

''سارا کام ہو گیا.....؟''

''سب کچھ ہو گیا۔اتنی ساری عورتیں اکٹھا ہو گئیں اس طرح سے سارا کام ہوتا گیا کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ میں تو مہمانوں سے باتیں کرنے میں منہمک رہا۔ بس پیسے خرچ ہوئے.....سو بھی کیا ہوئے۔قل اور چالیسویں میں کسی قدر خرچ کرنے کا موقع ہوگا..... محلے کی عورتوں نے میت کو غسل دیا۔عصر کی نماز کے بعد جنازے کی نماز ہوگی اور اس کے بعد ہوائی اڈے سے قریب واقع قبرستان میں تدفین ہوگی۔قبرستان ذرا دور ضرور ہے،لیکن کافی گاڑیاں ہیں.....کوئی دقت نہیں ہوگی۔اچھا خاصا لمبا قافلہ رہے گا.....!''

اسے تعجب ہوا۔ محلے میں ایک اچھا خاصا قبرستان تھا۔اغل بغل کے محلوں میں بھی قبرستان تھے، لیکن ہوائی اڈے کے دور دراز قبرستان کی بابت فیصلہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟

وہ سمجھ گیا کہ اس کے دوست کے دماغ میں کیا تھا۔اس قبرستان تک گاڑیوں کی آمد ورفت آسان تھی۔عموماً وی آئی پی وہیں.....

وہ برآمدے میں رکھی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

آنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔

بیشتر لوگ گاڑیوں سے آ رہے تھے۔

آمر آگے لپکتا۔

آنے والا اسے گلے سے لگا لیتا۔

''میں لٹ گیا.....میری ہنستی ہوئی زندگی کو منحوسوں کی نظر لگ گئی.....!''

لوگ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے.....زندگی کی بے ثباتی کی دہائی دیتے ہوئے صبر کی تلقین کرتے۔ اور.....آگے بڑھ جاتے.....عقب سے لائن میں دیگر لوگوں کا دباؤ ہوتا.....سب کو موقع ملنا چاہئے۔

''ہمیشہ زندہ رہنے کون آیا ہے صاحب.....ہم تو پیدا ہی اسی لیے ہوتے ہیں کہ ہمیں مرنا ہے''

ایک طرف اس کا چھوٹا بیٹا دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا زار وقطار روتا جا رہا تھا۔اچھی خاصی گرمی کی دوپہر میں جب کہ سورج چمک رہا تھا۔عجیب سا ملگجی اندھیرا آمر کو اپنے گھیرے میں لے رہا تھا۔

''آپ محسوس کر رہے ہیں آمر بھائی.....!''

ایک لیڈر نے آمر کو ٹہوکا دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

''بھابی کے چلے جانے سے گھر اور آس پاس کا ماحول کتنا سوگوار معلوم ہو رہا ہے۔سب کچھ تاریک دکھائی دیتا ہے۔سورج چمک رہا ہے۔لیکن لگ رہا ہے کہ اس اطراف میں سر پر اماوس کی رات کا سایہ ہے۔''

اس نے صاف محسوس کیا کہ اس آدمی نے مثال دینے میں مبالغے سے کام لیا ہے۔

آمر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ آمر کے اندرون میں کسی عمارت کے انہدام کا ملال نہیں تھا۔بس موقع کی مناسبت سے وہ اپنے برتاؤ کے مظاہرے کی کوشش کر رہا تھا،لیکن دل کی کیفیت تو چھپتے چھپتے بھی اپنی جھلک دکھا ہی دیتی ہے۔

''آمر صاحب! گرمی کو دیکھتے ہوئے میت کی فوری تدفین افضل ہے۔''

مولانا نے اپنی لمبی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے آمر سے کہا۔

آمر نے جواب دینے میں تھوڑا توقف کیا۔گھڑی پر نظر ڈالی۔

''ابھی تو بہت وقت ہے.....میرے کچھ خاص لوگ ابھی آنے باقی ہیں وہ آ جائیں تو پھر سوچتے ہیں۔''

۴

دلیپ شرن،گھوش،داس،کمار کھیمکا اور کچھ اور دیگر غیر مسلم جانکار اور دوست برآمدے کی ایک جانب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔کمار کھیمکا آمر کی سیاسی جماعت کا اہم اور دبنگ رکن تھا۔افسران اعلیٰ کا قریبی بھی۔درحقیقت وہ کسی بھی طرح کے کام میں پچاس فیصد سے کم فائدے کا قائل نہ تھا،لیکن یہ بات

صرف وہ جانتا تھا۔اس طرح کی خاص باتوں میں بیوی تک کو راز دار بنانے سے اسے پرہیز تھا۔

''ہاہا قیں قیں کر کے اس کے ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی آواز عجیب وغریب تھی۔ یوں سیاسی افراد کے درمیان ''ہاہا'' کر کے قہقہہ لگانا ریاکاریوں پر پردہ ڈالنے کا اچھا حربہ ہے۔کمار کھیمکا میں لیکن شرافت کی کچھ بو باس باقی تھی۔ کھیمکا سے اس کی پٹتی تھی۔اس نے اس کی آڑے وقتوں میں خوب مدد کی تھی اور آج آمر درّانی جس اونچے مقام پر فائز تھا،اس میں کمار کھیمکا کی مہربانیوں کی خاص کرم فرمائی تھی۔

دونوں پیروی، چیئرمینوں اور ٹنڈروں کے بے تاج بادشاہ تھے۔انگد کی طرح جہاں پیر رکھ دیتے تھے، کسی کے ہٹانے کی ہمت نہ تھی۔ درّانی اور کھیمکا دونوں پریس کانفرنس کے انعقاد میں ماہر تھے۔ناشتے اور شراب کی فراوانی ایسی ہوتی کہ بڑے سے بڑے قومی اخبار کا کوئی نامہ نگار ان کی پریس کانفرنس میں شرکت نہیں بھولتا تھا۔

کمار کھیمکا تجہیز وتکفین میں اتنی تاخیر ہونے سے بہت بور ہو رہا تھا.....کوئی اور موقع ہوتا تو توند پر ہاتھ پھیرتے اور کندھے اچکاتے ہوئے کیمپس کے اندر داخل ہوتے اور آمر پر نظر پڑتے ہی یوں گویا ہوتا۔

''رے رے آمرے.....ارے مری جانڑ میرے لائک بھی کوئی کام ہو تو بول.....چٹکی میں انجام دوں اور تیری آنکھوں کا تارہ بنوں.....''

اس کی ''تیری آنکھ کا تارہ بنوں'' کا سخن تکیہ افسروں اور دیگر لیڈروں کے درمیان کافی مشہور تھا۔ اس کے قریبی لوگ اسی لیے اسے ''آنکھ کا تارہ بابو'' بھی بولتے تھے۔

کمار کھیمکا کا اندازہ تھا کہ انتم سنسکار کی کریاؤں میں زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے لگیں گے۔ مسلمانوں میں تو یوں بھی ہر شرعی کام وقت کی پابندی سے انجام پاتے ہیں،لیکن اسے تو یہاں آئے ہوئے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے.....اور اب تک میت کو غسل دلانے سے آگے بات نہیں بڑھی تھی۔موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے ہنسوڑ کمار کھیمکا سوگواری کا لہجہ اختیار کیے ہوئے تھا۔

بیچ بیچ میں موقع موقع پر بولتا تھا۔

''بھابی بہت اچھی تھی..... مجھے بہت مانتی تھی.....کہتی تھی کھیمکا جی کھانا کھائے بغیر کیسے جائے گا.....میری بھابی جی.....!''

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ عادت کے مطابق اچھل پھاند کرتے ہوئے ترچھا ہو کر بولے۔

''رے رے آمرے مری جانڑ اتنی بھی کہیں دیر ہوتی ہے؟ ہم لوگ تو تین چار گھنٹے میں سب نپٹا لیتے ہیں۔ساری محبت، تعلق، عداوت کو جلد از جلد اگنی میں سواہا کر دیتے ہیں۔ یہاں تو یار انتم سنسکار کا کوئی

ودھان **آرمبھ** بھی نہیں ہوا ہے۔اوئے کس کا انتظار ہے؟ اوہ سب سمجھ گیا.....ٹھیک ہے.....ٹھیک.....!''

کوئی اور موقع ہوتا تو کمار کھیمکا کی آواز کی اونچائی اعلا افسران کی آواز سے تجاوز کر جاتی۔ دراصل اسے اوپر والے کی جانب سے طاقتور پھیپھڑا اور مضبوط ووکل کارڈ ودیعت ہوا تھا۔

۵

اس کا دوست مشاہدہ کر رہا تھا کہ آمر درّانی گھوم گھوم کر چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتا اور پھر ایک مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھ جاتا۔

چہرہ بوجھل اور سوگوار۔جیسے سب کچھ لٹ گیا ہو۔تکان بھی ظاہر ہو رہی تھی،اس کے باوجود آنکھوں میں انتظار کی چمک۔صدر دروازے کی طرف لگاتار پریشان نگاہوں سے دیکھتا جا رہا تھا۔

اس کا پرائیوٹ سکریٹری آیا اور اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔

''سر.....!''

ڈرتے ڈرتے اس نے لب ہلائے۔

''سر کچھ لوگ جانے لگے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ظہر کی نماز کے بعد ہی نماز جنازہ کی بات ہوئی تھی.....اب تو عصر کا وقت بھی نکلا جا رہا ہے.....''

آمر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اسے جھکنے کا اشارہ کیا۔

سکریٹری جھکا۔اس نے منہ اس کے کان کے قریب کیا۔

''آ رہے ہیں وہ لوگ؟''

''چانس نہیں سر!''

''ٹرائی کر کے دیکھو.....ریکویسٹ کرو.....''

''فون کیا ہے تم نے.....انہیں بتاؤ کہ ان کا انتظار ہو رہا ہے۔''

وہ قریب کی کرسی پر بیٹھا ہوا سب کچھ سن رہا تھا۔

اسے آمر درّانی کی بے چارگی پر ترس آ رہا تھا۔

اتنا کچھ پا لینے کے باوجود ایسے وقت میں بھی اسے کچھ کھو دینے یا کچھ کم پڑ جانے یا پیچھے رہ جانے کا اندیشہ پریشان کر رہا تھا۔

اس موقع پر بھی کچھ چھوٹ نہ جائے۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا۔

مولانا شاید عصر کی نماز پڑھ کر آ چکے تھے۔ تذبذب کے عالم میں کبھی گھڑی، کبھی جم غفیر اور کبھی ایک لائن سے کھڑی چمچماتی موٹروں کی قطار دیکھ رہے تھے۔

ایسی ایسی شوخ رنگوں کی مینڈک اور کچھوا نما موٹریں کہ غروب ہوتے سورج کی روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔

آخر کیا سوچ رہے ہیں آمر درّانی صاحب..... کن لوگوں کا انتظار ہے اب ان کو..... شرعاً تو صرف سگے رشتہ داروں کا انتظار کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے..... مناسب وقت پر تدفین مستحسن ٹھہرتی ہے۔ اب مزید تاخیر مناسب نہیں۔

سوچوں میں مستغرق مولانا ظہر کے بعد سے لگاتار انتظار کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ نقاہت چہرے سے جھلک رہی تھی۔ بدن سیدھا کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کمر اور کولہے کے درد سے بے چینی میں چھوٹی کرسی پر بار بار کروٹیں بدل رہے تھے۔

گھٹنے بیٹھے بیٹھے جام ہو گئے تھے۔

بوجھل قدموں سے مولانا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آمر درّانی کے پاس آئے۔

''جنازے کو رخصت کی اجازت دیجئے۔ حضور..... ابھی کئی مراحل طے کرنے ہیں..... تاخیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔''

آمر نے عجیب بے چارگی سے ایک نظر مولانا اور ایک نظر اندر دالان میں رکھی ہوئی اپنی بیوی کی میت کی طرف دیکھا۔ ایک لمبی ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

''مولانا صاحب کچھ انتظام کرتا ہوں..... تھوڑا صبر سے کام لیں۔''

میت تربت کی منتظر تھی۔

آمر کو جانے کن خاص لوگوں کا انتظار تھا۔

اس کے دوست نے محسوس کیا کہ آمر کی نظروں میں بیوی کی میت نہیں، کوئی بیش قیمت سامان سفید کپڑے کے نیچے ڈھک کر رکھ دیا گیا تھا۔ چیز چلی گئی تو چانس ہاتھ سے نکل جائے گا۔

لوگ آمر کے اس ڈائلیما کو دیکھ کر خموشی سے نظریں بچاتے ہوئے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ پیغام دیتے ہوئے دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔

اس کے دوست نے چاہا کہ لوگوں کی اکتاہٹ اور بیزاری کو دیکھتے ہوئے آمر سے متوقع ''خاص

لوگوں'' کے بارے میں استفسار کرے۔

اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ آمر کے پہلو والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اوپر سے نیچے تک اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب تمہیں کس کا انتظار ہے یار..... بھابی کے میکے کے سارے لوگ اور دیگر رشتہ دار تو آ چکے ہیں۔''

آمر کی آنکھوں میں عجیب و غریب چمک عود کر آئی۔

''نام بتا دوں گا تو تم بگڑو گے..... اتنا اہم آدمی ہے کہ اس کی موجودگی سب کے لیے ایک بڑی سرپرائز ثابت ہوگی اور میرے لیے.....!''

وہ سنجیدگی سے کچھ اور کہتا، کچھ اور سوچتا کہ اچانک اندرونی دالان میں رکھی میت پر اس کی نظر پڑ گئی۔ دوسرے لمحے جگر خراش منظر اس کے سامنے تھا۔

اسے احساس ہوا کہ کفن میں کچھ حرکت ہوئی۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔

اسے لگا کہ بھابی نے کفن ہٹاتے ہوئے اپنا چہرہ باہر نکالا اور سرگوشی کے انداز میں بولیں۔

''میں نہ کہتی تھی.....!''

اس نے آمر کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''ڈائلیما سے نکلو۔ اور میت کی تدفین کے لیے کوچ کی راہ اختیار کرو!''

میت تربت کے لئے ترس رہی تھی اور بیسویں صدی اپنے آخری پڑاؤ پر کینچلی بدل چکی تھی اور آمر درّانی.....

وہ تو.....!!

اس کو بہت غصہ آیا۔ عجیب جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس نے سب سے مخاطب ہو کر چلانا چاہا۔

''پوری کمیونیٹی..... کیا ہم سب لوگ میت میں تبدیل ہو چکے ہیں جو معاملہ ایک جگہ ٹھہر گیا ہے؟''

لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

◀◀ ● ▶▶

● شوکت حیات

کوبڑ

اس نے اسٹیشن پہنچنے میں کچھ اور دیر کردی ہوتی تو ٹرین چھوٹ جاتی۔ اچانک اس کی اماں نے حکم صادر کردیا تھا کہ اسے اپنے چھوٹے بھائی کو دہلی جا کر سی آف کرنا ہوگا۔ وہاں سے آگے اللہ مالک ہے۔ کم سے کم وہاں تک کی خیر وخبر تو اماں کو اس کے ذریعہ مل جائے گی۔

اس طرح اچانک ہزار میل کا سفر اختیار کرنا پڑے گا؟ یہ بات اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی۔ شادی بیاہ کے ہنگاموں کی وجہ سے وہ دو روز سے مستقل جاگا ہوا تھا۔ آج شاید کچھ سکون سے سونے کا موقع ملتا۔ حالانکہ صبح سویرے اٹھ کر بھائی کو ہوائی اڈّے تک الوداع کہنے کے لئے جانا تھا اور یہی نہیں، گھر کے سارے افراد کو وہاں تک پہنچانے کا اہتمام کرنا تھا۔ طرہ یہ کہ گاڑیوں کی ہڑتال تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کس طرح یہ سب بحسن خوبی انجام دے گا کہ اماں نے حکم صادر کردیا کہ اسے ابھی شام والی گاڑی پکڑ لینی ہے تاکہ صبح گیارہ بجے تک دہلی پہنچ جائے۔ اس کا بھائی صبح کی فلائٹ سے دہلی کے لئے روانہ ہوگا اور ساڑھے دس گیارہ تک پہنچ جائے گا۔ وہاں وہ بھائی سے ہوائی اڈے پر ملے گا۔ اسے رات کے ڈھائی بجے نیویارک والی فلائٹ میں سوار کرادے گا۔

بادل ناخواستہ دہلی جانے کے لیے اس نے اپنے آپ کو تیار کیا۔ اتنی جلدی بھی کہیں پروگرام بنتا ہے۔ اب برتھ کی ریزرویشن ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ساری رات جاگتے گزرے گی۔ گھر کے سارے لوگ اصرار کرنے لگے کہ بھائی ہونے کے ناطے اسے دہلی سی آف کرنے کا فریضہ ادا کرنا چاہئے تو اسے تیار ہونا ہی پڑا۔

دوسرے دن سے ہولی کی چھٹی شروع ہو رہی تھی۔ ٹرین میں بے تحاشہ بھیڑ تھی۔ اس کے تو اوسان خطا ہو رہے تھے۔ بغیر ریزرویشن کے اس بھیڑ بھاڑ میں اپنے لیے گنجائش نکالنے کا تصور اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔

سلیپر میں جگہ حاصل کرنے کے لیے ریزرویشن چارٹ لے کر گھومتے ہوئے ایک ٹی ٹی ای سے اس نے بات کرنی چاہی تو اس نے سنی ان سنی کردی۔ یوں بھی اس جم غفیر میں کسی سے اپنی بات کہہ پانا آسان نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم کی جانب لپک رہی تھی۔ انبوہ میں دور سے ٹرین کے انجن کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ یہ گاڑی اس کے سینے کو روندتی ہوئی آرہی ہے۔

''کیا مجھ جیسا ناتواں آدمی کمپارٹمنٹ میں داخل ہو سکے گا؟'' ٹرین رکتے ہی اس نے خود سے سوال کیا۔

کوئی جواب دیئے بغیر امنڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان اس نے خود کو گٹھر میں تبدیل کرلیا۔ یہ ہنر اسے معلوم تھا کہ بچپن سے اب تک اکثر اوقات سنگین حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے خود کو بے جان اشیاء میں تبدیل کردینا پڑتا تھا۔ ورنہ اس کے جیسے آدمی کے لئے جینا آسان نہ تھا۔ اس کے کمزور جسم میں مزاحمت کرنے، حالات پر قابو پانے اور رخ موڑ دینے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

کمپارٹمنٹ میں جیسے تیسے داخل ہونے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ہتھیلی سے خون بہنے لگا ہے۔ خون کا بہنا اس کے نزدیک کوئی اہمیت کی بات نہ تھی۔ اہم تو یہ تھا کہ گٹھر میں تبدیل ہونے کے بعد دھکے کھاتا ہوا وہ کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے میں آخر کار کامیاب ہوگیا تھا۔ اب صرف یہ اندیشہ تھا کہ ریزرویشن نہیں ہونے کی وجہ سے اسے کنڈکٹر سلیپر سے نکال سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی کھل گئی۔ جن لوگوں کے ریزرویشن تھے انہوں نے اپنی اپنی برتھ پر اپنے بستر بچھا دیئے۔ اس کی طرح کچھ اور لوگ بھی تھے جو اس ٹرین میں بے گھر بار تھے۔ ان میں سے بیشتر نے کنڈکٹر کو پچیس پچیس روپے دیئے اور اپنی ٹکٹوں پر ایک ایک برتھ ریزرو کرالی۔

کنڈکٹر اس کی طرف بھی بڑھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ پچاس روپے ٹکٹ کے لگ چکے ہیں۔ سونے کے مزید پچیس دینے کا مطلب تھا کہ اس کے سفر کے خرچ کا پورا بجٹ گڑبڑ ہو جائے گا۔ بھائی امریکہ میں ڈھیر سارا روپیہ کماتا ہے اس سے کیا۔ اسے بہر حال اپنی آمدنی اور اپنی حیثیت دیکھنی ہے۔ آخر اس نے اپنی اوقات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہی تو بھائی کو سی آف کرنے کے لیے طیارے کے بجائے ٹرین کی سواری اختیار کی تھی۔

''ریزرویشن کے سات روپے لگتے ہیں پھر یہ پچیس کیوں؟''

اس نے ڈرتے ڈرتے کنڈکٹر سے سوال کردیا۔ کنڈکٹر کے تیوریوں پر بل آئے۔ اس نے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اتنے سارے لوگ بے وقوف ہیں کیا..... نہیں دے سکتے تو اگلے اسٹیشن پر اتر جانا..... یہ تھری ٹائر ہے..... آپ کو جنرل بوگی میں جانا ہوگا.....''

''جب یہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے تو وہاں کیسے گھس سکوں گا!'' ''پھر لایئے پچیس روپے..... آخر اس بھیڑ بھاڑ میں آپ کے لیے سونے کی جگہ مہیا کروں گا۔ کوئی مذاق ہے کیا.....!''

''بھائی میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں!''

''دہلی بغیر پیسے کے جاتے ہو.....؟ یہ سالی بغیر پیسے کے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھونے دیتی ہے۔''

''پہلی بار جا رہا ہوں۔''

''تو لاؤ بیس ہی دے دو.....تمہارے لیے مروّت کر رہا ہوں۔'' ہنسوڑ قسم کا کنڈکٹر اس کی خستہ حیثیت بھانپتے ہوئے ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔

''بھیا سب میری جیب میں نہیں جائے گا۔''

اس نے کہا وہ اسے دس روپے سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ کنڈکٹر نے دس روپے لیتے ہوئے اسے بتایا کہ تب اسے بیٹھ کر جانا ہوگا۔ یہ بھی کم نہیں کہ اسے بیٹھنے کی جگہ مل رہی ہے۔

گاڑی مغل سرائے سے آگے بڑھ گئی تو اس نے برتھ کی طرف رخ کیا۔ یہ دیکھ کر اس کی کوفت میں اضافہ ہوگیا کہ کئی برتھ خالی پڑے تھے۔ لیکن پیسے کی کمی کی وجہ سے وہ برتھ کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھنے پر مجبور تھا۔

وہ دہلی پہلی بار جا رہا تھا اور متعدد الجھنوں سے دوچار تھا۔ اسٹیشن سے اسے پالم ایئر پورٹ جانا ہوگا۔ نہ معلوم اسے نئی دہلی اسٹیشن اترنا چاہئے یا پرانی دہلی۔ پہلے کون سا اسٹیشن آئے گا۔ جس اسٹیشن پر بھی اترے گا وہاں سے کون سی سواری کرے گا۔ ہم سفروں سے اگر پوچھتا ہے تو سب اسے نرا گاؤدی سمجھیں گے کہ اتنا سن رسیدہ ہونے پر بھی اب تک وہ اپنے ملک کی راجدھانی نہیں گیا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ کتنے لوگ اس ملک میں ایسے ہیں جو دہلی تو بہت دور کی بات ہے اپنے صوبے کی راجدھانی تک نہیں جا سکتے ہیں۔

کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ریلوے لائن نہیں دیکھی.....اور کتنے لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے ایک ساتھ چار روٹیاں نہیں دیکھیں.....!

وہ غمزدہ ہوگیا۔ اسے لگا کہ وہ رات کے سنّاٹے میں کسی مرگھٹ میں بیٹھا ہے۔ دور کہیں سے کتوں کے رونے کی آواز آرہی ہے...چاروں طرف گہرا اندھیرا ہے۔ بجز اس روشنی کے جو ایک جلتی ہوئی لاش سے برآمد ہو رہی ہے۔

ٹرین کے پہیوں کی چھک چھک اور سناٹوں کی ہولناک آوازوں کو سنتے سنتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح ہوئی تو اس کی نیند ٹوٹی۔ ایک طیارے کو اس نے ٹرین کے اوپر اُڑتے دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ لوگوں سے چیخ چیخ کر کہے کہ اس ہوائی جہاز میں اس کا چھوٹا بھائی سفر کر رہا ہے۔ ہوائی جہاز میں اڑنے والے کا وہ بڑا بھائی ہے.....ہو.....ہو.....ہو.....لیکن خود اسے اپنی ہنسی بہت کھوکھلی لگی۔

اس کا ذہن ماضی بعید میں بھٹکنے لگا۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ بے سروسامانی کے عالم میں اس کے باپ کے مرنے کے بعد اس کا کوئی فرزند اس قدر ترقی کرے گا کہ امریکہ جا پہنچے گا۔ وہ تو وہیں کا وہیں رہ گیا۔ ٹھٹھر سا گیا۔ لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔ حالات کے لازمی نتائج کے طور پر یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ اطمینان کی بات تھی کہ کم سے کم یہ چھوٹا پودا تو اگ کر تناور درخت بن گیا۔

ڈرتے ڈرتے ایک سردار جی سے اس نے دہلی کے بارے میں آئیڈیا لینا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ وکرم شیلا تو نئی اور پرانی دونوں دہلی جائے گی لیکن اسے پالم جانا ہے تو نئی دہلی اتر جانا چاہئے۔ اس نے نصیحت کے طور پر گر کی بات بتائی کی اسٹیشن کے کیمپس سے لگی ہوئی کوئی سواری نہ کرے۔ اسٹیشن سے باہر آجائے۔ بائیں جانب پیدل بڑھے اور پھر کناٹ پلیس کے پاس سے تین سو سات نمبر کی بس پکڑ لے یا تھری ویلر کر لے۔

سردار جی نے یہ بھی کہا۔

''لیکن سرداروں کی ٹیکسی کے میٹر کے چکر میں نہ پڑنا..... بھاڑا طے کر لینا.....دس سے پندرہ روپے کے بیچ تیار ہو جائے تو ٹھیک ہے.....میٹر کا حساب کرو گے تو ایسا بھی ہوگا کہ وہ اِدھر اُدھر گھما کر تم سے پچیس تیس اینٹھ لیں گے اور تم پالم سے اتنی ہی دور ہو گے جتنا کناٹ پلیس کے پاس تھے.....''

سردار جی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''یار دہلی میں اچکّے زیادہ بستے ہیں۔ ہندوستان میں کہاں کہاں نہیں گھوما.....لیکن اتنی لوٹ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔''

سردار جی زندہ دل اور بے باک شخص تھا۔ دنیاداری کی باتوں کے علاوہ سردار ہوتے ہوئے اس نے سرداروں کے اتنے سارے دلچسپ لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

کام کی باتیں اس نے بڑی احتیاط سے گرہ میں باندھ لیں۔

ہدایت کے مطابق نئی دہلی اتر کر سڑک پر بائیں جانب بڑھتا گیا۔ اس درمیان کئی ٹیکسی والے اس کے پاس آئے لیکن وہ سب کو اس شان بے نیازی سے نظرانداز کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا جیسے کئی پشت سے وہ کناٹ پلیس کا باشندہ رہا ہو اور چہل قدمی کرتا ہوا اپنے باپ کے مکان کو جا رہا ہو۔ اس درمیان وہ ترچھی نظروں سے گزرتے ہوئے تھری ویلر کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔

وہ ایسے تھری ویلر کا متلاشی تھا جس کا ڈرائیور غیر سردار ہو اور جو دیکھنے میں کچھ شریف قسم کا آدمی نظر آرہا ہو۔ ظاہر ہے اس کے لئے وہ کسی نحیف اور لاغر جُثّے والے ڈرائیور کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس طرح کا ایک ڈرائیور اسے مل ہی گیا۔ دبلا پتلا بیمار سا۔ یہ آدمی خطرناک نہیں ہوسکتا۔ اس نے اشارہ کیا۔

''کہاں چلو گے صاحب.....؟''

''پالم.....کتنے لگیں گے.....؟''

''بیٹھ جاؤ صاحب.....میٹر گرا دیتا ہوں۔''

''نہیں طے کر لو.....''

''پندرہ روپے دینا.....''

''بارہ دوں گا.....''

''آ جاؤ.....''

تقریباً پینتالیس منٹ کے بعد وہ پالم پہنچ گیا۔ پیسے دینے کے لیے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالے تو پتا چلا کہ بھیڑ بھاڑ میں اس کے روپے کسی نے گول کر دیئے تھے۔ اب کیا ہو.....؟ ہوائی اڈے کے اندر بھائی کو ڈھونڈ کر اپنی مصیبت بتائے۔ اس سے مدد لے۔ لیکن یہ اسے اچھا نہیں معلوم ہوا کہ اب چلتے چلاتے وقت اس معمولی سی ضرورت کے لیے بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

یوں بھی اس بار اس نے چھوٹی بہن کی شادی میں تقریباً پچاس ہزار روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ لیکن اس ڈرائیور کا کیا ہو۔ اس نے فوراً قلم نکالا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو محض ڈھائی روپے کا تھا۔ اس سے کرایہ کا بھگتان کیسے ہو سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت تھی۔ کلائی کی گھڑی۔

اس نے سوچا ڈرائیور شریف آدمی ہے۔ ڈھائی سو کی گھڑی کا سو روپے دے ہی سکتا ہے۔ اس میں اس کی واپسی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے تھری ویلر اسٹارٹ کر دیا تھا۔ اس نے گھڑی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''بھائی ایسا ہے کہ میری جیب کٹ گئی...تم یہ گھڑی رکھ لو اور جتنے پیسے مناسب سمجھو مجھے دے دو۔''

شریف اور غیر سردار ڈرائیور نے گھڑی اپنے نحیف ہاتھوں میں لے لی۔ ایک نظر اسے گھور کر دیکھا اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ جا وہ جا۔

وہ دھیمی آواز میں چیختا رہ گیا۔ اس جگہ زیادہ شور اور ہنگامہ کر کے وہ اپنے آپ کو مذاق کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ڈرائیور نے اس کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ تھری ویلر کے اڑتے ہوئے دھوئیں میں اس کے زرد چہرے کی شکست قابل دید تھی۔

انٹرنیشنل ڈیپارچر کے پاس شیشے کی دیوار کے اندر اس کا بھائی ٹہل رہا تھا۔ اس نے بہت لہک کر کہا۔

''بھائی!''

اس کا بھائی اس کے قریب آ گیا۔

''سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ رات کی فلائٹ او کے ہے۔ ٹھیک دو بج کر چالیس منٹ پر۔ فلائٹ نمبر زیرو ون۔ جب تک ہم لوگ چلیں۔ امریکہ کے دوستوں کے لیے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ ادھر ہی ہم لوگ کھانا بھی کھائیں گے۔ میں نے سارا سامان لفٹ لگیج میں رکھ دیا ہے۔ اب کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی

ضرورت نہیں.....ہم لوگ رات بھر جاگ کر ایئر پورٹ پر گپیں کریں گے۔ آپ صبح کی کسی گاڑی سے واپس چلے جائیے گا.....کل یوں بھی ہولی کی وجہ سے دہلی بند رہے گی.....گھومنے پھرنے کا کوئی موقع نہیں.....''

دونوں تمام دن کناٹ پلیس، قرول باغ، پالیکا بازار اور مینا بازار میں گھومتے رہے۔ لگ بھگ تین ہزار روپے کی خریداری کی گئی۔ کسی دوست کے لیے کولہا پوری چپل، کسی کے لیے پینٹ، کچھ ایمی ٹیشن، کچھ اماوٹ وغیرہ وغیرہ۔ ہینڈلوم کے سوتی کپڑوں کا وہاں ایک خاص کریز تھا۔ جامع مسجد کے پاس فلورا ہوٹل میں کھانا کھایا گیا۔ پھر شاپنگ۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔

اس کا چھوٹا بھائی بہت ہوشیار تھا۔ شاپنگ میں مول تول کے طریقے جانتا تھا۔ جس چیز کی قیمت دکاندار سو روپے بتاتا، اسے وہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ میں خرید لیتا۔ دنیاداری کے ان طریقوں سے وہ ناواقف تھا۔ اگر وہ تنہا خریداری کر رہا ہوتا تو سو کی جگہ سو ہی دے کر آتا۔ اتنی بڑی عمر میں محض لٹتے چلے جانے کے علاوہ ہوا ہی کیا تھا۔

دہلی آتے ہی وہ دوبارہ غچا کھا چکا تھا۔ جیب کٹ گئی اور گھڑی بھی لٹ گئی۔ اگر بھائی سے اس کا وہ تذکرہ کرتا تو اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ واپسی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اس ٹھنڈک میں بھی پسینے آ گئے۔ بھائی نے کہا۔

''دیکھا کتنا مقوی کھانا تھا یہاں کا۔ آپ کو پسینہ آنے لگا۔ بھیا آپ اگر پٹنہ چھوڑ دیں تو بالکل چنگے ہو جائیں۔''

وہ بس یک ٹک بھائی کو دیکھتا رہ گیا۔ کچھ نہیں بولا۔

بھلا ہندوستان میں رہ کر بھی صحت بن سکتی ہے؟

خاموشی کی زبان میں وہ یہی کہہ سکا۔

بھائی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں تو ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ہاہا کرتے ہوئے اس نے چند خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔ ''بھیا کیا برا ہے.....اگر دہلی میں شادی کی جائے.....؟''

وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ اسے تو یہاں کی لڑکیوں میں نام کو بھی حسن نظر نہیں آیا۔ یہاں کی حسین ترین لڑکی بھی اس کے یہاں کی قبول صورت لڑکی کے مقابلے میں کمتر لگی۔ لیکن بھائی کو شاید یہی سب پسند ہے۔ بڑی بڑی گول ہپ.....موٹی موٹی گٹھیلی پنڈلیاں..... کیلے کے تنے جیسی گدرائی ہوئی جانگھیں..... بڑے بڑے آہنی گولوں جیسے سخت اور تنے ہوئے.....

اسے تو ان سب کے نیچے کچل جانے کا خوف ہوتا۔ روندتے چلے جانے کا احساس جاگنے لگتا۔

اچانک بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر رکھئے گا۔امریکہ میں سب کچھ کیجئے.....خوب موج مستی لیجئے۔لیکن شادی کے لیے ہندوستانی لڑکی ہی بہتر ہوتی ہے۔وہاں کی لڑکیاں شوہروں کا شوہر پن آسانی سے تسلیم نہیں کرتیں.....اوراس طرح ان میں بیوی پن کبھی نہیں آپاتا.....''

ائیر پورٹ پر بھائی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''بھیا آپ تواب نہ معلوم شادی کریں گے یا نہیں۔لیکن آپ کے انتظار میں اب میں بیٹھا نہیں رہ سکتا۔صرف شادی ہی تو نہیں۔.اولاد اپنی زندگی میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے، یہ بھی تو دیکھنا ہے!''

''صحیح بات ہے.....!''

اس نے دل ہی دل میں کہا۔خوف سے اس کی آنکھیں اندر دھنس گئیں۔

مان لو بھائی میری شہوت کی عمر اگر بچی بھی ہے تو کیا ہو.....اولاد کو اپنے پیروں پر کھڑا کر پانے کا زمانہ تو ختم ہوگیا.....لیکن.....لیکن ہم لوگ تو بچپن میں ہی یتیم ہوگئے تھے۔

یہ باتیں اس نے اتنی آہستہ سے کہیں کہ اس کے بھائی نے نہیں سنیں۔

''اور ہاں سنئے.....اماں کا پاسپورٹ بنوا دیجئے۔انہوں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔اب انہیں آرام اور سیر وسیاحت کا موقع ملنا چاہئے۔اگلی بار آؤں گا تو انہیں ساتھ لے جاؤں گا۔سوچتا ہوں اگلی بار بیگم اوراماں دونوں کو.....!''

''ٹھیک ہے.....میں پاسپورٹ کے لیے اپلائی کردوں گا۔''

''صرف اپلائی کرنے سے کام نہیں چلے گا۔دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔ہاتھ پاؤں چلانے ہوں گے۔ادھر ادھر کرنا ہوگا۔انڈیا میں سرکاری کام بغیر لیے دیئے نہیں ہوتا...!''

''ٹھیک ہے۔''اس نے کہا۔

'اب اور کتنی دوڑ دھوپ کروں گا.....؟''یہ الفاظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔

''اور بھیا اماں کا خیال رکھئے گا.....میں تو برابر پیسے بھیج ہی دیا کروں گا۔''

''آپ کم سے کم اتنا کریں گے کہ مقوی چیزیں خرید کر ان کے لیے لے آیا کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اچھی چیزیں وہ کھانا ہی نہیں چاہتیں۔نہ معلوم انہیں کون سا دکھ کھائے جارہا ہے؟''

یہ بات اس نے خود سے کہی۔

گپ شپ کرتے کرتے رات کے دس بج گئے۔بھائی نے کہا۔

''اب ٹرالی لے آتا ہوں۔سامان نکال کر ان ساری خریدی ہوئی چیزوں کو سیٹ کردیتا ہوں۔''

اس کام میں تقریباً گیارہ بج گئے۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر لینے کے بعد انہوں نے پھر گپ شروع کردی۔بے شمار باتیں۔بچپن کی.....باپ کے زمانے کی.....باپ کی انتقال کے بعد کی.....اوراس کے بعد بھائی نے امریکہ میں اپنے کچھ معاشقوں کی روداد بھی سنائی۔

''آپ نے بھیا یہاں کچھ موقع نکالا کہ نہیں؟''

چھوٹے بھائی نے تھوڑے توقف کے بعد کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بھائی.....ان کاموں کے لیے فرصت ہی نہیں ملی۔اور پھر مجھ میں ہے بھی کیا کہ کوئی لڑکی میر طرف نظر ڈالے.....ڈھنگ کا کپڑا.....قاعدے کی صورت.....نہ انداز گفتار میں کشش.....سب کچھ تو کھڑکھڑاتا ہوا.....ہاہا.....!''

اس نے ہنسنے کی بادل ناخواستہ کوشش کی۔

''آپ رہ گئے بھیا.....!''

''ہاں.....میں رہ گیا.....کہیں چھوٹ گیا میں.....جانے کہاں.....اندھیرے میں ایک ٹرین گم ہوتی جارہی ہے.....میں کنارے گرا ہوا اٹھنے کی ناکام کوشش کررہا ہوں۔میرے چاروں طرف کتّے بھیانک آواز میں رورہے ہیں۔روتے ہوئے کتّے رونے کا فعل چھوڑ کر میری طرف دیکھ کر بھونکنے لگے ہیں۔''

وہ خامشی کی زبان میں خود سے کہتا رہا۔

''آپ کہاں کھو گئے بھیا.....؟''

وہ چونک پڑا۔

''ہاں.....میں سوچ رہا تھا کہ سچ مچ عشق کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔''

اپنی ذہنی کیفیت پر اس نے پردہ رکھا۔

اناؤنسمنٹ ہوئی.....بڑی خوبصورت اور خوابیدہ آواز.....

''امریکہ جانے والے یاتری گن اپنے سامان اور فارین ایکسچینج کی پیمنٹ کے لیے کاؤنٹر کی اور پرستھان کریں۔''

ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔لگا کہ ساری دہلی، امریکہ جانے کے لیے مقابلہ آرائی کررہی ہے۔

آن کی آن میں امریکہ پہنچ جانا چاہتی ہے۔

جیسے تیسے اس کا بھائی ٹرالی پر سامان لیے ہوئے ایئر انڈیا کے کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ وہ دور ہی سے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹر کے قریب ویزی ٹرس کے جانے کی ممانعت تھی۔ سامان جمع کر کے اور رسیدیں لے کر بھائی واپس آ گیا۔

''اب کیمرے کے لیے کسٹم کے سامنے ڈیکلریشن دینا ہوگا.....اور پھر سیکوریٹی چیکنگ..... پھر تو بھیا آپ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔ اوپر ویورس گیلری سے شاید ایک بس نظر آئے جس میں میں بیٹھ کر رن وے تک جاؤں گا۔ میں نظر نہیں آؤں گا۔ پھر ممکن ہے کسی اڑتے ہوئے جہاز پر ائیر انڈیا لکھا ہوا نظر آ جائے۔ آپ سمجھ لیجئے گا کہ بھائی رخصت ہو گیا۔'' بھائی سے جدائی کی گھڑی کی قربت کا خیال آتے ہی وہ اندر سے ٹوٹنے لگا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ بڑبڑا رہا تھا۔

''کیوں چلے آتے ہو ہمیں دکھی کرنے کے لیے؟ کیا رکھا ہے وطن میں..... کیسا وطن ہے، جہاں ساری زندگی کرائے کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں بسری ہو رہی ہے۔ جب ہم تمہارے بغیر رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں، تم آ کر اپنے ہونے کے احساس کا چرکا دے دیتے ہو۔ ہمیں رونے کے لیے چھوڑ جاتے ہو۔ ہم لوگوں سے اگر نہ بھی ملو تو تمہارا کیا بگڑے گا؟ ملنے سے کون سا روحانی سکون ملتا ہے؟؟

خاموشی کی زبان میں کہتے کہتے اس کے جذبات بے قابو ہونے لگے۔ آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ سمندر اچھل اچھل کر اس کے وجود کے کناروں کو ریزہ ریزہ کرنے کے درپے تھا۔

خوابیدہ آواز دوبارہ گونجی۔

''امریکہ کے یاتری گن اب سیکوریٹی چیکنگ کے لیے پرستھان کریں۔ رن وے تک لے جانے والی بس ان کا انتظار کر رہی ہے۔''

اس کا بھائی بھی آبدیدہ ہو گیا۔

''بھیا تم اپنا خیال نہیں رکھتے...کیسی صحت ہو گئی ہے تمہاری..... چند سال بڑے ہو لیکن دیکھنے میں باپ لگتے ہو۔''

''سب چلتا ہے بھائی...اگلی بار جب تم آؤ گے تو میں تمہارا دادا لگوں گا۔ اور اس سے اگلی بار شاید میں.....''

وہ خود کلامی کرتا رہا۔

''بھیا اب رخصت کی گھڑی ہے.....آؤ.....ہم لوگ گلے مل لیں۔ اب نہ معلوم کب ملنا نصیب ہو۔''

اس کے بھائی نے دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ دونوں کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں

تھے۔ اچانک چھوٹا بھائی چیخ مار کر الگ ہو گیا۔

''بھیا.....تمہاری پیٹھ پر یہ کیسا اُبھار ہے.....مکروہ خبیث کے سر جیسا.....!''

بڑے بھائی کو کاٹو تو لہو نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بھائی کی اس بات کیا کیا جواب دے۔ چھوٹا بھائی پھر بولا۔

''بھیا!..... یہ کیسا آسیب سوار ہے تم پر.....تم نے آج تک نہیں بتایا۔''

امریکہ جانے والے ایک ہم سفر نے سیکوریٹی چیکنگ کے لیے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ زور سے پکڑا۔

''جلدی کرو.....دیر ہو رہی ہے..... گیسٹ کو گڈ بائی کہو۔''

''خدا حافظ بھائی.....فی امان اللہ..... بھائی.....!''

اس کا بھائی خوف و دہشت کا تاثر لیے ہوئے جا رہا تھا۔ لگاتار وہ اس کی پیٹھ کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔

''بھیا! اس خبیث سے چھٹکارا حاصل کرو۔ جیسے بھی ہو.....'' جاتے جاتے اس نے پکار پکار کر کہا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دھیرے دھیرے بالکل سنّاٹا چھا گیا۔ مسافروں کی ریل پیل ختم ہو گئی۔ دیوانہ وار وہ ویورس گیلری کی طرف لپکا جو اوپری منزل پر واقع تھی۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ونڈ اسکرین کا شیشہ صاف کیا۔ نیم روشن دھندلے منظر میں ایک بس رن وے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دودھ جیسی سفید بس۔

اس کا بھائی اسی میں ہوگا.....اس نے اندازہ لگایا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک طیارہ اڑا.....ہو نہ ہو اس کا بھائی اسی میں ہوگا۔

الوداع..... الوداع..... اے پردیسی ہم وطن..... اب ہم جانے کب ملیں..... ملیں بھی کہ نہیں..... بے رحم زندگی کے راستے پر سفر کا پہاڑ ڈھونے والے۔ خدا حافظ.....!

طیارہ آسمان میں غائب ہو چکا تھا۔

اب چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ قبرستان کا سا گہرا سنّاٹا۔

اس کا دماغ کچھ دیر کے لیے خالی ہو گیا۔ تکان کے عالم میں اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے اوسان بحال ہوئے تو خیال آیا کہ اس کا بھائی الوداعی کیفیت کی شدت میں جسے خبیث سمجھ رہا تھا وہ اس کی پیٹھ کا کوبڑ تھا اور یہ بھی کہ دہلی سے واپسی کے لیے اس کے پاس ٹرین کا کرایہ نہیں تھا۔

◀◀ ● ▶▶

● **ناولٹ**

● **شوکت حیات**

سرپٹ گھوڑا

پہلا باب

زہریلا پمفلٹ

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ برگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

دفتر کا ایک چپراسی تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح اسی کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور بحیثیت جنرل سکریٹری شاید اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔

کچھ دیر پہلے کئی اسٹاف مل کر اس زہریلے پمفلٹ کو پڑھ چکے تھے جسے خفیہ طریقے سے بانٹا گیا تھا اور جو اتفاق سے ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس پمفلٹ میں چند نکات حسب ذیل تھے:

☆ جس وقت کسی لیڈر کی طرف سے تمھیں طلب کیا جائے فوراً تیار ہو جاؤ۔

☆ راستوں میں مارچ کے دوران زوردار پٹاخے چھوڑو۔

☆ حملہ ایسی جگہ کرو جو تمہارے اپنے علاقے سے دور ہو تا کہ لوگ تم کو پہچان نہ سکیں۔

☆ سامنے سے حملہ ہرگز نہ کرو بلکہ ہمیشہ پیچھے سے وار کرو۔

☆ رات کی تاریکی میں فساد کی آگ زیادہ بھڑکاؤ۔

☆ کسی بھی قیمت پر پولیس کو اس کا موقع نہ دو کہ وہ تمہارے اسلحہ پکڑ سکے۔

☆ ان کے گھروں میں کام کرتے وقت عورتوں کو رجھانے اور پھنسانے کی کوشش کرو اور اپنے لِنگ انھیں دکھاؤ تا کہ وہ تم میں دلچسپی لیں اور پھر موقع پا کر ان کے ساتھ بدکاری کرو۔

اس پمفلٹ کے تعلق سے کچھ دیر پہلے ان کا آپسی مباحثہ بے حد دلچسپ تھا، بالکل فلمی انداز کا۔

''یہ سب حرام زدگی ہے۔ ایک خاص تنظیم اور فرقے کو خواہ مخواہ بدنام کرنے کی سازش۔ ذرا

سوچئے، وہ بھی تو آخر انسان ہیں گوشت پوست کے انسان، ان کی بھی ماں بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔ انھیں بھی امن اور شانتی کی ضرورت ہے۔'' ایک نے فرمایا۔

''تو گویا آپ نہیں مانتے کہ فسطائیت کی تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے؟'' دوسرے نے سوالیہ لہجے میں اپنی بات کہی۔

''سارا معاملہ غلط تقسیم کا ہے اور اس کی ذمہ داری کسی فرقے پر نہیں، اس گھناؤنی مقتدر سیاست کے سر جاتی ہے جو یہ سمجھتی تھی کہ یہ بڑا ملک متحد رہا تو ایک دن دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔'' تیسرا دور کی کوڑی لایا۔

''سچ پوچھو تو دونوں طرف کے معصوم بے گناہ لوگ مفت میں مارے گئے۔ اقتدار کے اس گھناؤنے تاریخی کھیل میں۔'' چوتھے نے تیسرے کی حمایت کرتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

پانچویں نے کہا:

''گاندھی جی کا رول بھی صحیح نہیں تھا۔ انہوں نے انگریزوں، نہرو اور پٹیل کی دلی منشا اور موقف کا ساتھ دیا۔ مولانا آزاد اور جناح کسی قیمت پر تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ ذرا غور کرو کیا وجہ ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ستیہ گرہ کرنے والے گاندھی جی نے اتنے بڑے ایشو اور مسئلے پر ستیہ گرہ جیسے اپنے آزمودہ اور مجرب نسخے کا استعمال نہیں کیا..... گاندھی جی انسانیت نواز ضرور تھے، لیکن برطانوی سامراج اور ہندوستانی جاگیرداری اور پونجی واد کے حامی تھے۔ اور اسی لیے شہید پیر علی، اشفاق اللہ، بھگت سنگھ اور دوسرے انقلابیوں کی رہائی کے سلسلے میں ان کا رویہ مشکوک تھا۔ یہ لوگ کمیونسٹ تھے اور جاگیردار کی اور سرمایہ داری کے مخالف.....''

چھٹے نے بات اچک لی:

''دیکھو بھائی..... صاف اور سیدھی بات ہے۔ اس میں کوئی لاگ لپیٹ نہیں..... انگریزوں نے تاج و تخت مسلمانوں سے حاصل کیا تھا۔ جاتے وقت انہیں اس اقتدار کو مسلمانوں کی امانت سمجھتے ہوئے انہیں واپس لوٹانا چاہئے تھا لیکن انگریز ایک سازشی اور مفاد پرست قوم ہے جو ہر معاملے میں اپنے مفاد کو فوقیت دیتی ہے..... آزادی اور تقسیم دونوں اس نے اپنے مفاد کے تحت منظور کیا۔''

چوتھا گویا ہوا:

''کیوں نہیں دونوں ملکوں یعنی ہندوستان اور پاکستان کا کنفڈریشن بن جائے..... یعنی وفاق..... نیپال جانے کے لیے جس طرح ہمیں پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑتی ویسے ہی پاکستان جانے کے لیے بھی پاسپورٹ کی ضرورت کو ختم کیا جائے۔ آخر ہم دونوں سگے بھائی ہیں سوتیلے نہیں بلکہ ہم دونوں تو

جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان ''نو وارٹریٹی'' کرلیا جائے۔ ذرا سوچو..... یقیناً مزہ آئے گا جب ہم دونوں ہر جگہ آزادانہ سیاحت کریں گے، گھومیں گے، پھریں گے..... زندگی کا حقیقی لطف اٹھائیں گے..... ہم اپنی من چاہی جگہ پر دم توڑتے ہوئے سکون سے نروان اور موکچھ حاصل کریں گے جہاں ہمارے بچپن گذرے۔ اس زمین کی گود..... تبدیل ہو جائیں گے۔ بچّوں میں ماں کی گود..... باپ کے مشفق کندھے..... ہم لوگوں کی دنیا آن واحد میں کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ہم لوگ آزاد پرندوں میں.....

تیسرے نے ایک فلسفیانہ بات کہی:

''میں بہائی مذہب کی کتابوں کی نمائش میں گیا تھا۔ وہاں میں نے بورڈ پر ان کے پیغمبر حضرت بہاء اللہ کے اس جملے کو جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا کہ ساری دنیا ایک ملک ہے اور سب انسان اس کے شہری ہیں..... ذرا سوچو..... بہت پہلے وید میں بھی یہی کہا گیا تھا کہ وسدیو کٹمبھ کم..... قرآن شریف میں بھی کہا گیا ہے کہ الحمدللہ رب العالمین..... سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ٹکڑوں میں بٹ کر آخر کن ملعون کی سازشوں کے شکار ہوئے..... یقیناً مقتدر طاقتوں کے..... کیا ہم لوگوں کو ان کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہئے؟ اور آواز ہی نہیں ،ان کے خلاف بغاوت نہیں کرنی چاہئے۔ عملی بغاوت..... ٹھوس بغاوت..... انقلاب آفریں بغاوت۔''

تو کیوں نہ جرمنی کی طرح ہم بھی دیوار ڈھا دیں؟'' پہلے نے اپنی بات کہنے کے بعد داد طلب نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے یہ پمفلٹ ان لوگوں کی سازش ہے جو خوف کی سائیکی پیدا کر کے ووٹ بینک پر قبضہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پہلے والے عقل مند نے ایک نیا خیال ظاہر کیا۔

''نام نہاد سیکولر طاقتیں کم جواب دہ نہیں جو گھوٹالوں پر پردہ ڈالنے، سرخرو بننے اور کرسی برقرار رکھنے کے لیے اس خوبصورت لفظ 'سیکولرزم' کا استعمال کرتی ہیں۔ ذرا سوچو یہ اگر صحیح ہوتے تو سانپوں کو سر ابھارنے کا موقع ملتا؟'' دوسرے نے ایک اور نئی بات کہی۔

''جو بھی ہو، سیکولرزم بہت خوبصورت تصور ہے۔ چھتّیس، چھبّیس، چھتّیس جیسی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی گداز گل بدن کے تصور سے بھی زیادہ!'' بہت دیر کی سنجیدہ گفتگو کے بعد ایک کو مذاق سوجھا۔ اس نے آنکھ مارتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔

''بھائی عجیب زمانہ ہے کہ اب بادشاہ بھی مجرم ہے اور رعایا بھی۔''

ابھی سب کے چہروں پر زیر لب مسکراہٹ ٹھیک سے رینگ بھی نہ پائی تھی کہ کسی نے پھر ایک گہرا نکتہ پیش کر دیا۔

''بادشاہت.....؟''

سب کے سب ہنسنے لگے۔

ان کی کھلکھلاہٹ اور فلک شگاف قہقہے سن کر پیڑوں پر بیٹھے رنگ برنگے پرندے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے تیزی سے اڑ گئے۔ اڑتے اڑتے بل کھاتے ہوئے انہوں نے ہنسنے والوں کو اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ کیسے جیالے لوگ ہیں۔ اس عالم میں بھی دل کھول کر ہنستے ہیں۔ اور الوداع کہتے ہوئے فضا میں اونچے اور اونچے اڑتے چلے گئے اور دور آسمان میں غائب ہو گئے لیکن ہنسی کا دورہ مکمل ہونے کے بعد وہ سب گہرے سوچ میں مستغرق ہو گئے۔

دوسرا باب

سر نہوڑائے پرندہ اور ناگہانی

وہ سب ایک ہی فرقے کے بندے تھے۔

اس کامپلکس کے مختلف کرایہ دار دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کے درمیان شہر کی اس کثیف فضا میں عام دنوں کے نفاق کے باوجود کچھ زیادہ ہی قربت پیدا ہو گئی تھی۔

حالات اچھے نہیں تھے، لیکن زندگی تو رکتی نہیں۔ مرنے والوں کے ساتھ سارے زندہ لوگ تو مر نہیں جاتے۔ زندگی اپنے زخموں کے اندمال کا راستہ خود ڈھونڈ لیتی ہے۔ سچ مچ زندگی کی سخت جانی بھی خوب تھی۔ ورنہ قیامت کب آ گئی ہوتی۔ بھلا اس طرح کے زہریلے پرچوں سے نامیاتی زندگی کو کوئی فرق پڑنے والا تھا۔

اب عوام خاصے بیدار مغز ہو چکے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا۔ لیکن ہوائیں ہمیشہ طوفانی انداز میں نہیں چل سکتیں۔ لمحاتی اور عارضی جھونکا ہوتا ہے ان کا۔ سب کے سب یہی غور کر رہے تھے کہ فسطائی طاقتوں کی اس طرح کی سازشوں کا کیسے مقابلہ کیا جائے؟ کون سی راہ اختیار کی جائے؟

اس کا خیال تھا کہ لوگ خواہ مخواہ پریشان تھے۔ طوفان گذر چکا تھا اور اب طغیانی اور تلاطم پیدا کرنے کی کوشش عبث تھی۔ ویسے سب لوگ محتاط تو تھے ہی۔

''اپنی تیاری پر نظر ثانی کر لینی چاہئے۔ لیکن یہ تو وہ لوگ کریں گے جو پاکٹس میں رہتے ہیں۔ وہ بے چارے کیا کریں جو اغیار کے علاقوں میں بکھرے پڑے ہیں؟'' کسی نے تردد بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''جہاں مورچہ بندی ہوگی وہاں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے انہیں ہمہ وقت تیار رہنا ہوگا، جو لوگ خود کو سیکولر دکھانے کے لیے دوسروں کے علاقے میں رہتے ہیں، ان سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔'' دوسرے نے عملی بات پر مبنی جواب دینے کے بجائے منفی خیالات کا اظہار کیا۔

''کمال کرتے ہو''، پہلے نے ٹوکا۔قدرے توقف کے بعد اس نے اپنی بات پوری کی۔

''سوچنا تو سب کے بارے میں ہے۔انسان اور شیطان کے ٹرمس میں کیوں نہیں لیتے؟ شیطانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ہم الگ رہ کر ان کی مہلک ذہنیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔اس طرح تو فاصلے بڑھتے جائیں گے۔کچھ لوگ اگر ان کے ساتھ رہتے ہیں تو پوری ملت کی طرف سے رشتہ استوار کرنے کا نیک کام کرتے ہیں۔''

اس کی طرف بڑھتا آ رہا چپراسی اب چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔

''جاؤ نپٹو اس مصیبت سے۔میں نے کہا تھا کہ جنرل سکریٹری بننے کے جھنجھٹ مت مول لو۔ ڈھنگ سے اپنے مسائل پر ہم غور و خوض بھی نہیں کر سکتے۔'' اس کے دفتر کے ایک ساتھی نے چپراسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چپراسی نزدیک آ گیا۔

''سر، ایک صاحب آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔آپ کو ادھر اُدھر بہت تلاش کیا گیا۔اس نئے اڈّے کی تو کسی کو خبر ہی نہ تھی۔انہوں نے ایک پرزہ دیا ہے۔شاید آپ کے بیٹے کی طبیعت خراب ہے۔''

اس نے ہاتھوں میں پرزہ لیا۔عجلت میں لکھی ہوئی تحریر تھی۔

''محترم!

''آپ کے گھر سے بذریعہ فون آپ کی ڈیڑھ سس کے یہاں یہ خبر آئی ہے کہ آپ کے بیٹے کی طبیعت بہت خراب ہے۔آپ کے ساڑھو گھر پر نہیں ہیں اس لیے آپ کی ڈیڑھ سس نے مجھے آپ کو دفتر میں خبر کرنے کے لیے کہا۔آپ سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن ناکامی ہوئی۔جیسے ہی یہ پرزہ ملے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جائیے۔آپ کی ڈیڑھ سس آپ کے گھر کے لیے نکل چکی ہیں۔۔خدا آپ کے بیٹے کی صحت بحال کرے۔

''میں آپ کے لیے اجنبی ہوں۔میرا نام جان کر کیا کیجیے گا، بس جلدی کیجیے۔''

اس نے سوچا کہ صبح اپنے بیٹے کو اچھے بھلے طریقے سے اسکول کے لیے رخصت کیا تھا۔پھر یہ ناگہانی مصیبت کہاں سے وارد ہوئی؟ اس نے ذہن پر زور دیا۔کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ادھر کچھ دنوں سے اس کا بیٹا مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔لیکن اتنا بھی کیا سیریئس معاملہ ہو سکتا تھا کہ بیوی کو اسے خبر کرانے کی ضرورت آن پڑی؟ ناگاہ اسے اس زہریلے پرچے کا خیال آیا۔کسی نے بچّے کو اغوا تو نہیں کر لیا؟

اس نے پُرزے کو دوبارہ پڑھا۔اس کا بچہ غائب نہیں ہوا تھا۔اسے کسی بیماری نے آ لیا تھا۔لیکن کون سی بیماری نے؟

ابھی ابھی جتنے یار دوست اور شناسا اسے حلقے میں لیے ہوئے تھے سب کے سب دھیرے دھیرے

کھسکنے لگے۔ایک دو رہ گئے جنہوں نے کہا کہ فوراً اپنے اپنے گھر کا رخ اختیار کرنا چاہئے۔اسے لگا کہ وہ بھری پُری دنیا میں بالکل یکہ و تنہا رہ گیا ہے۔سر نہواڑے پرندے کی طرح بازوؤں میں منہ چھپا کے بسورتا ہوا۔لیکن نہیں، اس نے جی کڑا کیا۔اگر وہ اس طرح نروس ہوا تو آنے والے سخت حالات کا مقابلہ کیسے کرے گا؟

تیسرا باب

جس تن لاگے وہ ہی جانے

وہ سڑک پر آ گیا اور اپنے گھر کی طرف جانے والے کرائے کے ٹمپو کا انتظار کرنے لگا۔

شائی شائیں، اس کی بغل سے گاڑیاں گذر رہی تھیں۔آدمیوں کی ریل پیل اور جم غفیر میں ٹمپو میں سیٹ حاصل کرنا مشکل تھا۔پریشانی میں وہ پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔جہاں پر بھی ٹمپو میں خالی سیٹ ملے گی، سوار ہو جائے گا۔شاید اگلے اسٹینڈ پر گاڑی ملنے میں اتنی دشواری نہ ہو۔بھیڑ بھاڑ اور ٹھیلم ٹھیل میں اس کا کندھا چھل رہا تھا۔اس کی اضطرابی کیفیت بڑھ رہی تھی۔ہونٹ کانپ رہے تھے۔ہاتھ پاؤں میں تھرتھراہٹ تھی۔کہیں اس کا اکلوتا بیٹا.....

اس کی بیوی بار بار کہتی تھی کہ اکلوتا بچہ بہت بڑی مصیبت ہوتا ہے۔بار بار اس پر دوبارہ اٹمپٹ لینے کے لیے زور ڈالتی تھی۔شاید پھر بیٹا ہو جائے۔اور وہ بیوی کے ہزار سمجھانے کے باوجود خاندانی منصوبہ بندی کی احتیاطی تدابیر سے باز نہ آتا تھا۔پہلے ہی دو بیٹیاں تھیں، مزید بیٹے کے چکر میں وہ پھر کسی بیٹی کا باپ بننے سے احتراز کرتا تھا۔کئی مرتبہ بیوی نے بطور احتجاج راتوں میں اس کے پاس پھٹکنے سے گریز کیا تھا۔ پاس ہوتی تو جھلاّ کر کروٹ بدل لیتی۔وہ بھی اڑیل تھا۔ذہنی پریشانی اور مختلف قسم کے تناؤ جھیلنے کے بعد اکثر دیر رات میں واپس آتا تو اس کے جسم میں بیوی پر تصرف کے لائق سکت نہ بچتی۔کئی دنوں کے بعد صبر و ضبط کا باندھ ٹوٹنے پر تھک ہار کر بیوی کو ہی بچوں کو لانگھ کر اس کی بغل میں آنا پڑتا اور اس طرح اس کی احتیاط کی شرط کے آگے لجاتے شرماتے وہی سر جھکاتی۔کبھی کبھی شوہر کو اپنا منتظر پا کر شرم و حیا کا لبادہ اتار پھینکتی۔اس کی گرم گرم سانسیں تیز چل رہی ہوتیں۔معلوم ہوتا کہ اس کے بازوؤں نے پناہ نہ دی تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ پتہ نہیں عورت اپنے جسمانی تقاضوں کے تحت خود سپردگی کرتی تھی یا اس اندیشے سے کہ اس کے عدم التفات کے سبب کہیں اس کا مرد کسی دوسری عورت کے چکر میں نہ پڑ جائے؟

اسے حیرت ہوئی۔اس کٹھور مصیبت کے وقت بھی اسے یہی سب سوجھ رہا تھا۔اپنے ذہن کو جھٹکا دیا۔اس کا اکلوتا بیٹا گردش میں تھا اور وہ.....

سچ مچ اکلوتا بیٹا بہت خراب ہوتا ہے۔اکثر مصیبتوں میں مبتلا رہتا ہے۔مسز ٹھاکر کا اکلوتا بیٹا حال ہی میں جاں بحق ہو گیا۔اسٹوڈنٹ موومنٹ میں پڑ گیا تھا۔علی گڑھ کا واقعہ تھا۔اکثر بہاری بچّے جہاں رہتے

ہیں چھائے رہتے ہیں۔ پڑھائی، کھیل کود اور نیتا گیری، بہاری بچہ کہیں پچھلا نہیں بیٹھتا۔ آگے آگے تھا بہار کا لعل اور مسز ٹھاکر کا اکلوتا سپوت۔ بات زیادہ بڑھ گئی۔ پولیس کی شرارت، گولی چلی اور.....لیکن مسز ٹھاکر نے تو صبر کرلیا..... یا خدا مجھ سے کیا بھول ہوگئی؟

بہت پہلے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر مسز ٹھاکر نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان سے شادی کرلی تھی۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ بیٹے کی موت کے بعد ان کا اسلام سے اب ناتا ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن عجیب تھی وہ عورت۔ بڑی مشکلوں کے بعد اس نے قرآن شریف پڑھنا سیکھا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ کسی طرح ردعمل میں پڑ کر اپنے پرانے دھرم میں واپس آجاتی، اس کے گھر سے رات گئے تلاوت کلام پاک کی رقت بھری آواز آتی رہتی.....اللہ.....اللہ.. کیسے کیسے ہیں تیرے بندے۔ تو مصیبت بڑھاتا جاتا ہے اور تیرے ساتھ ان کی قربت بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا جیسا آدمی ہوتا تو وہ شاید کب کا اللہ میاں سے.....اس کی بیوی مسز ٹھاکر کی درد بھری آواز میں تلاوت قرآن پاک سن کر اسے جگاتی۔

''ارے سنتے ہو؟ اس کو کہتے ہیں آزمائش اور امتحان میں سرفرازی حاصل کرنا.....ایسے کڑے وقتوں میں دوسرا کوئی ہوتا تو خدا جانے کون سی شیطانی حرکتوں پر آمادہ ہو جاتا۔''

وہ کہتا۔ ''بے وقوف ہے مسز ٹھاکر۔ خواہ مخواہ سمجھتی ہے کہ خدا اس کا امتحان لے رہا ہے اور اسے صبر و شکر کرتے ہوئے ارتفاع حاصل کرنا ہے۔ میں ہوتا تو کب کا اس طرح کے سانحے سے گذرنے کے بعد خدا کو گڈ بائی کہہ دیتا۔''

اگلے اسٹینڈ پر بھی اسے ٹمپو نہیں ملا۔ کیا اسے اسی طرح پیدل گھر جانا پڑے گا؟ اس طرح تو اس کا بچہ.....میری بیوی کتنی پریشانی میں ہوگی۔ لیکن کیا ہوا ہوگا میرے بچے کو؟ کہیں اسکول واسکول میں چھت سے گر ور تو نہیں گیا؟ کمبخت آج کل اسکول والے بھی چھوٹے چھوٹے کرائے کے گھروں میں بچوں کو سڑاتے ہیں۔ اس کے بچے کا اسکول چھ منزلہ عمارت میں تھا۔ یہ سوچ کر اس کے دل کی دھڑکن اور بڑھ گئی، ٹخنے میں کچھ جام سا ہونے لگا۔ اب آگے چلنا اس کے لیے کچھ اور بھی مشکل تھا۔ وہ رک گیا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوگا ہی..... بچے کو اگر کچھ سیریس ہو ہی گیا تھا تو وہ کیوں جان دے؟ بہت ہوا.....اب اگر ٹمپو ملے گا تبھی وہ اس میں سوار ہو کر گھر جائے گا۔ پیدل چلنے کی اس میں سکت نہ تھی۔ لگ رہا تھا کہ ایک قدم بھی چلا تو گر پڑے گا۔

اس نے دونوں ہاتھ سینے پر کس لیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینے کے اندر دھڑکنے والی چیز سکڑنے سمٹنے لگی ہے، عجیب درد اور تناؤ، اس نے سفاک سڑک پر بھرے بھرے ٹمپوؤں کو گذرتے دیکھا اور سوچا کاش اس کے پاس ایک اسکوٹر ہوتا۔ اس کے زرد ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔

چوتھا باب

مسجد کا امام

شہر میں حال ہی میں فرقہ وارانہ فساد ہو چکا تھا۔ چیزیں تو نارمل ہوگئی تھیں، لیکن اب بھی لوگ نو بجے رات کے بعد ایک دوسرے کے علاقے سے گذرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ملی جلی آبادی والے علاقے ٹھیک ٹھاک تھے۔ بلکہ فسادات کے زمانے میں بھی ان علاقوں میں کرفیو نافذ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ ملی جلی آبادی والے وہ علاقے اسی شہر کا حصہ ہیں۔

پرانے علاقوں میں فساد کی شروعات بھی کچھ عجیب ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ ایسا شک تھا کہ کوئی نہ کوئی تنظیم اس معاملے میں کارگر تھی، ورنہ قدیم شہر کی پرانی مسجد کا نوجوان امام یوں اچانک غائب نہ ہوتا۔ اور کچھ ہی دن بعد اسی محلے میں واقع اندھے کنوئیں سے بدبو نہ اٹھتی، حالانکہ اس علاقے کا خاکروب اس کنوئیں کو کوڑے کرکٹ سے پاٹنے میں خلاف معمول کئی دنوں سے بہت فعال دکھائی دیتا تھا۔

نوجوان امام ذرا دلیر قسم کا آدمی تھا اور سنگین حالات میں بھی کسی سے خوف نہ کھاتا تھا۔ اسے خدا پر یقین کامل تھا اور اپنے اجداد کے سینکڑوں سالوں تک حکمراں رہنے کے افتخار سے اس کا سینہ سرشار تھا اور اس سرشاری کا اظہار جمعے کے خطبے میں وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ اب اس کو کیا کیجئے کہ اپنوں میں بھی ایسے لوگوں کی معتد بہ تعداد تھی جنہیں اپنی خوبیوں کے سبب وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

کلہاڑی میں لکڑی کا دستہ نہ ہوتا تو لکڑی کے کٹنے کا رستہ نہ ہوتا.....دلیپ کمار کی فلم ''کرانتی'' کا یہ مشہور مکالمہ محض مفروضہ نہیں تھا۔ محلے کی کچھ لڑکیاں امام کی باتوں سے زیادہ اس کے کسے ہوئے بازوؤں کی مچھلیوں اور کھوئی کھوئی آنکھوں پر فریفتہ تھیں۔ کچھ مسلمان فیشن زدہ لونڈے جوان لڑکیوں پر اپنا حق پیدائشی سمجھتے تھے، یہ دیکھتے ہوئے کہ امام کی بھرپور جوانی کے سامنے ان کی دال نہ گلتی تھی خواہ مخواہ اس سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ نوجوان امام گلیوں سے گذرتا تو کتنی ہی کھڑکیوں پر متعدد نوجوان لڑکیاں، (اور بعض عمر دراز اور تجربہ کار عورتیں بھی) لوگوں کی آنکھ بچا کر اسے للچائی نظروں سے دیکھتی تھیں۔

نوجوان امام مسجد کی اوپری منزل پر ایک کمرے میں اقامت پذیر تھا۔ وہ فجر سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھتا۔ ضروری حوائج سے فارغ ہو کر یوگ آسن اور ڈنڈ بیٹھک کرتا، اس کے بعد منہ دھوتا۔ منہ دھونے میں اپنے حلق کی صفائی کے لیے وہ نرخرے پر زوردار طریقے سے دباؤ دیتے ہوئے اس زور سے غیں غیں کی آوازیں نکالتا تھا کہ آس پاس کے لوگوں کی نیند اچٹ جاتی۔ کئی نوجوان لڑکیاں تو اس سے پہلے ہی اٹھ جاتیں اور ادھ کھلی کھڑکی سے لنگوٹ میں کسے ہوئے اس کے گٹھیلے بدن اور بازوؤں کی مچھلیوں کی ایک جھلک

پانے کی آس میں اپنی کھڑکی پر آ کر بیٹھی رہتیں۔

شروع میں امام کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ صنف نازک کی خفیہ اور ہوسناک توجہات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لیکن نماز فجر کے بعد مسجد سے چائے کے ہوٹل تک جاتے ہوئے اسے متعدد کھڑکیوں سے آہٹیں اور سسکاریوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو اسے احساس ہوا کہ شاید اس کی اذان اور قرأت میں ایسا جادو ہے کہ مسلمان تو مسلمان، ہندوؤں کو بھی وجد آ جاتا ہے۔ ایک دفعہ مسجد کی کمیٹی نے امام صاحب کی مصروفیت کا بوجھ کم کرنے کے خیال سے جب ایک مؤذن مقرر کیا تو محلے میں عجیب تماشا ہوا۔

مسجد کے مینارے سے ایک مریل سی آواز گونجی تو کھڑکیوں کے پٹ بند ہونے لگے۔ پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ لوگوں نے وجد طاری کرنے والی آواز نہیں سنی تو مسلمان تو مسلمان، چند ہندو بھی معترض ہوئے کہ فضا میں اپنی آواز سے جادو بکھیرنے اور شفق کی سرخیوں میں چمک پیدا کرے والا وہ پرانا مؤذن کہاں گیا؟ مسجد کمیٹی کے لوگوں کو لگا کہ یہ کام غلط ہوا۔ بات یہ تھی کہ مسجد کے فنڈ میں کمی نہیں تھی۔ اس علاقے کے بیشتر مسلمان آسودہ حال تھے۔ علاوہ ازیں مسجد کے نیچے کمرے بنے ہوئے تھے جن میں کرایہ دار مختلف اشیا کی دکانیں کھولے ہوئے تھے۔ ان سے اچھی خاصی کرائے کی آمدنی تھی۔

مسجد اور چائے کی دکان کے درمیان ایک پتلی گلی تھی جس کے ذرا پیچھے سنسان اور جنگل جھاڑ والا علاقہ شروع ہوتا تھا، وہیں ایک غیر آباد کنواں بھی واقع تھا جس کا پانی شاید کسی زمانے میں اس علاقے کے کھیتوں میں آبپاشی کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہوگا۔ اب وہاں پانی کوئی نہ بھرتا تھا اور کنوئیں کے آس پاس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر جمع ہونے لگے تھے۔ سارے محلے کا کوڑا کچرا میونسپلٹی کا خاکروب وہیں پر لا کر پھینکتا تھا جہاں سے ہفتے دس دن میں قریب کی سڑک پر آ کر رکنے والے کوڑے کرکٹ کے ٹریکٹر میں اسے منتقل کیا جاتا تھا۔

مسجد کمیٹی کے سکریٹری نے نوتقرر مؤذن سے کہا کہ تم مسجد کی دوسری کارگذاریاں سرانجام دو اور وضوخانے اور دیگر امور کی نگرانی پر مامور ہو جاؤ۔ اذان دینے کا کام حسب سابق امام صاحب ہی کریں گے۔ دوسرے وقت جب امام صاحب کی اذان کی آواز گونجی تو علاقے کے لوگوں کے کام تھوڑی دیر کے لیے رک گئے۔ بیڑی بنانے والے رحمت نے بیڑی بنانا چھوڑ دیا۔ گاہک دکاندار سے چیزیں مانگنا بھول گئے۔ بلرام کیسری کی دکان میں تولتے ہوئے ترازو اپنی جگہ تھم گئے۔ لگا کہ سارا علاقہ اور اس علاقے کی ساری زندگی اس ایک آواز کے نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ علاقے میں چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا۔ جب تک امام صاحب کی اذان جاری رہی، سب کے سب دم بخود رہے۔

واقعی امام صاحب کی آواز میں بلا کی تاثیر تھی۔ پاٹ دار اور گونجتی ہوئی آواز، لیکن اس میں عجیب

لوچ اور کھنک تھی، جیسے پرانے گھنٹے کی آواز کسی دشت میں گونج رہی ہو۔ کیا بانگِ درا اسی کو کہتے ہیں؟ اذان کی آواز سنتے ہی کیا ہندو کیا مسلمان، کیا بوڑھے کیا جوان، سب کے سب قبل از وجود کی ازلی آہٹوں سے ہم آغوش ہو جاتے۔ اذان کی تان جب فضا کا سینہ چیرتے ہوئے آسمان کا رخ اختیار کرتی تو لگتا کہ سننے والوں کے دلوں کو بھی اپنے ساتھ اٹھائے لئے جائے گی۔

''بھئی ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں کے مذہب میں دَم ہے، کم سے کم اس لونڈے کی اذان میں تو جادو ہے۔'' بلرام کیسری کہتے۔

''یہ دنیا فانی ہے۔ اوپر بہت اوپر ساتویں آسمان کے اوپر ہی اصل زندگانی ہے۔''

اذان ختم ہونے کے بعد بعض لڑکیاں اپنا سر جھٹکتیں اور امام کے کسے ہوئے بدن کے تصور سے ان کی رگوں میں کچھ نئی لہریں اور چونٹیاں رینگنے لگتیں۔

لیکن محلے کے بعض مردوں کو نوجوان لڑکیوں کی یہ آوارہ خیالی بھلا کیوں گوارا ہوتی۔

نماز عشا کے بعد طعام کے ارادے سے مسجد اور ہوٹل کے درمیان سنّاٹے علاقے کو پار کرتا ہوا، اکیلا امام اچانک گھات لگا کر بیٹھے ہوئے محلے کے متعدد لونڈوں کے نرغے میں تھا۔ جم کر مقابلہ ہوا۔ امام نے آخری سانسیں لیتے ہوئے اپنے والد کے کندھے اور ماں کی آغوش کو یاد کیا..... پھر اپنی غریبی اور مفلسی جس نے اسے انگریزی پڑھائی کے بجائے مدرسے کی سستی پڑھائی سے گذر کر امامت کا پیشہ اپنانے پر مجبور کیا..... آخری سانسوں کا تلاطم..... ماں باپ کی محرومی اور اپنی بے بسی.....

کرفیو نافذ تھا۔ لوگوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ امام صاحب کہاں رہ گئے۔ کچھ لوگوں نے گمان کیا کہ کرفیو میں کہیں رک گئے ہوں گے، لیکن جب کرفیو کھلا تو اذان کی بدلی ہوئی آواز سے سب کے سب ہراساں تھے۔ مسجد کمیٹی کے ارکان کی سمجھ میں نہ آیا کہ امام صاحب کے سلسلے میں کیا کارروائی کی جائے۔ کئی دن بعد کرفیو پوری طرح ٹوٹا تو محلے کے خاکروب کے ساتھ چند اوباش نوجوانوں کو سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس نے کوڑے کچرے کے ڈھیر کو کنوئیں کے اندر پھینکنا شروع کر دیا۔ لیکن انسانی وجود بھلا اتنی آسانی سے گمنامی قبول کرتا ہے؟

بدبو کا تعاقب کرتے کرتے لوگ آخر کار اس کنوئیں تک پہنچ ہی گئے۔ پیکر کی تمسیخ نے پوری شخصیت کو اجنبی وجود میں تبدیل کر دیا تھا۔ سارا علاقہ بلکہ سارا شہر، ماتم کے گہرے سمندر میں غرق ہو گیا۔ کوئی کسی سے بات نہ کرتا۔ معلوم ہوتا سب کی کوئی عزیز ترین شے گم ہو گئی۔ ایک سوگواری اور نحوست ساری فضا میں پھیل گئی۔

''بے چارہ بہت بھلا آدمی تھا۔''

یہ ایسا دنگا تھا جس میں تعیش پسند امیر زادے مسلمان لونڈوں نے ایک مفلوک الحال مسلمان کا قتل

کیا تھا۔اس دنگے کو کیا نام دیا جائے۔

''کیا بے داغ جوانی تھی اس کی۔''

''اس کا بانکپن، اس کے چلنے کا انداز، واہ واہ کیا بات تھی!''

''اس کی تقریر کی شیرینی اور آواز کی بلندی، سبحان اللہ!''

''دلوں ہی نہیں آسمان میں چھید کرنے والی اس کی اذان کی اونچائی اور نوکیلا پن!''

''شاید اذان بلالی اسی کو کہتے ہیں۔''

''حق مغفرت کرے بے چارہ شہید مرا۔''

''مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مسلمان کی شہادت۔''

''انٹرنیشنل اسلامک برادر ہوڈ۔''

پانچواں باب

ہم ہوں گے کامیاب

اس نے خود کو ملامت کی کہ بیٹا مر رہا تھا اور اسے شہر میں گذرے ہوئے پرانے اور وہ بھی رنجیدہ کن واقعات یاد آ رہے ہیں! اس نے گویا نیند سے چونک کر گرد و پیش کو دیکھا۔ بھیڑ یوں ہی رواں تھی۔ ایک احساس بے چارگی کے ساتھ اس نے گذرتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی سے لفٹ مانگ لے، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ جسم و جان میں کوئی سکت ہی نہیں رہ گئی۔ زبان گنگ ہے اور بدن اپنے قابو میں نہیں۔ اسے شرم بھی آ رہی تھی، مان لو موٹر والا حقارت سے انکار کر دے تو؟

''پلیز.....ذرا سنئے.....'' اس کے آگے آواز لڑکھڑا جاتی۔

گاڑیاں اس کے نزدیک سے شائیں شائیں گذر رہی تھیں۔ وہ ہکا بکا دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھنے والے کی طرح گاڑیوں کی پچھلی کھڑکیاں اور ان کے اگزاسٹ سے نکلتے ہوئے ہلکے گدلے دھوئیں کے ارتعاش کو تکتا رہ جاتا۔ پوری سڑک اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جاتا۔

اسے اپنے معصوم بچے کا چہرہ یاد آیا۔ نہ معلوم کس حال میں ہے اس کا اکلوتا بیٹا۔

اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اسے لگا وہ سڑک پر کھڑا کھڑا کاٹھ ہو جائے گا۔ اچانک ایک ٹمپو اس کے پہلو میں آ کر رکا۔ خدا کا شکر ادا کیے بغیر وہ لپک کر ٹمپو کی سیٹ پر تقریباً گر پڑا اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ بغل میں بیٹھے ہوئے ہم سفروں نے خیال کیا کہ وہ کہیں سے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ وہ محض تیز قدموں سے لپکتا ہوا چل رہا تھا، وہ دوڑا نہیں تھا۔ اس نے دل میں سوچا ازل سے گردش اور بے سروسامانی

اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ گردش اور طوفان اور بھنور۔ نہ جانے کب سے اس کے پاؤں کہیں زمین پر اطمینان اور آسودگی سے زمین پر ٹکنے سے معذور رہے ہیں۔

پرندے کے بازو اڑتے اڑتے شل ہو گئے تھے۔ بہت اونچائی پر جا کر اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی قوت پرواز جواب دے چکی تھی، اب آنکھیں بھی دھندلانے لگی تھیں۔

کہیں گھر پر بھیڑ نہ لگی ہو اور اس کا بیٹا.....

اس سے آگے سوچتے ہوئے اس کے اوسان جاتے رہے۔ پھر کیا رہ جائے گا زندگانی میں؟ وہ تو کسی نہ کسی طرح صبر کر لے گا۔ اس کی بیوی کا کیا بنے گا جس کی زندگی اور امیدوں کا مرکز وہی آنکھوں کا تارا رہ گیا تھا؟ اس کی پوری جوانی شوہر کی محدود آمدنی کی وجہ سے عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ اب تو بس بیٹا ہی اس کے ذہن میں سوئی پڑی خواہشوں اور پژمردہ امنگوں میں رنگ بھر سکتا تھا۔

ٹمپو اس کی قیام گاہ سے تھوڑے فاصلے پر رکا۔ آگے کا راستہ اسے پیدل چلتے ہوئے طے کرنا تھا۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ دروازہ دستک دیئے بغیر کھل گیا۔ لوگ اس کے آنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اس کی بیوی روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

''منّے کو بچاؤ۔''

وہ حواس باختہ اتنا ہی پوچھ سکا۔ ''کیا ہوا اسے، کہاں ہے وہ؟''

''اسکول سے لوٹنے کے بعد اچانک اسے بخار آ گیا اور مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا۔ میں نہ کہتی تھی کہ میرا بچہ ان دنوں بیمار چل رہا ہے، لیکن تم ڈاکٹر اور دواؤں کے خرچ کے ڈر سے میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑاتے رہے۔''

یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ جیب کی حالت دیکھتے ہوئے وہ علاج معالجے کے جھنجھٹ سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اس کے نزدیک ان دنوں ڈاکٹر اور ڈاکو میں زیادہ فرق نہیں رہ گیا تھا۔

''اب کیسا ہے وہ؟ اس نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

اس کے ساڑھو پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ''اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن کچھ دیر پہلے معاملہ سیریس تھا۔ اسے ایک سو چھ ڈگری بخار ہو گیا تھا۔ خدا بھلا کرے بغل والے پڑوسی کا کہ جنھیں معلوم ہوا تو فوراً سارے بدن کو پانی سے بھیگے ہوئے کپڑے سے پونچھنے لگے۔ ان کی اس کارروائی نے بخار ڈاؤن کیا۔ اب ایک سو ایک ڈگری ہے۔ لڑکا اب خطرے سے باہر ہے۔ لیکن علاج تو ہونا چاہئے۔''

اس کی ڈیڑھ سس اس سے مخاطب ہوئیں اور ملامت آمیز لہجے میں بولیں:

"آپ بہت نظر انداز کرتے ہیں بچے کو۔ میری بہن تو کئی دنوں سے آپ کو کہہ رہی تھی کہ بچہ نحیف ولاغر ہوتا چلا جا رہا ہے، اس کے چہرے پر زردی چھا رہی ہے مگر آپ نے اس کی بات کو ہمیشہ ہوا میں اڑا دیا۔ بچہ پیدا کیا ہے تو اس کا خیال رکھنا ہی پڑے گا۔ پیسے کو دانت سے پکڑیئے گا تو بچے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

وہ کیا بولتا؟ ٹکر ٹکر دیدم دم نہ کشیدم والا معاملہ تھا۔ بچے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کے علاوہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

کچھ دیر بعد ہوش ذرا بحال ہوئے تو اس نے دوا علاج کی تدبیروں بات اٹھائی۔ سوال یہ تھا کہ کس ڈاکٹر کو دکھایا جائے اور وہاں تک کیسے جایا جائے؟ طے ہوا کہ ایک خالی ٹمپو میں سب لوگ پرانے شہر چل کر وہاں کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں اور اس کے گھر کا علاقہ چونکہ شہر کے کنارے پڑتا تھا اس لیے احتیاط کے پیش نظر ساڑھو صاحب کے یہاں آج کی رات گذاری جائے۔ بخار اگر پھر بڑھ گیا تو مین شہر میں ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر سے ربط پیدا کرنے میں آسانی رہے گی۔ علاوہ ازیں اس کے ساڑھو کے یہاں ٹیلی فون کی سہولت تھی جس سے ڈاکٹر سے رائے مشورہ کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔

اس نے ڈاکٹر روی کانت کو دکھانے کی تجویز رکھی۔ بیوی مصر ہوگئی کہ کسی قیمت پر وہ ہندو ڈاکٹر کو نہیں دکھائے گی۔ اس زہریلے پرچے اور شہر کے حالیہ واقعات کی وجہ سے وہ خوف زدہ تھی۔

اس نے کہا۔ "کیا کروگی، اللہ میاں اسی ڈاکٹر پر مہربان ہیں۔ شہر کے مسلمان ڈاکٹروں کے ہاتھ میں شفا ہی نہیں۔ پھر فائدہ کیا ان سے علاج کرانے کا؟ پیسہ خرچ کرنا ہے تو صحیح جگہ پر خرچ کیا جائے۔"

لیکن اس کی ڈیڑھ سس اور اس کے ساڑھو بھی ہندو ڈاکٹر سے علاج کے لیے راضی نہ تھے۔ اس پرچے کا ان لوگوں پر بھی اثر تھا۔

"دیکھو بھائی اپنا تو اپنا ہی ہوتا ہے۔ اور ایسے حالات میں جب کہ خفیہ تنظیمیں اس طرح سے لوگوں کا دماغ زہر آلود کر رہی ہیں، اکلوتے بچے کے علاج کے لیے کسی ہندو ڈاکٹر پر کیسے بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"

"یہ پرچہ بکواس ہے۔ کوئی ڈاکٹر اپنے پیشے سے غداری نہیں کر سکتا۔ اس کی قسم، اس کا پیشہ، یہی اس کا اصل مذہب ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرا بچہ جب جب بیمار ہوا ہے اسی ڈاکٹر کے علاج سے ٹھیک ہوا ہے۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

اس آخری دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ بادل ناخواستہ بیوی اور دیگر لوگ اسی ڈاکٹر کے یہاں چلنے

پر آمادہ ہوگئے۔ ٹمپو منگایا گیا، سب کسی نہ کسی طرح بچے کو سنبھالتے ہوئے ڈاکٹر روی کانت کے یہاں پہنچے۔

طویل مدت تک انتظار کرنے کے بعد جب ڈاکٹر نے اس کے بچے کو دیکھا تو بولا:

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وائرل انفکشن ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے اسپورجل اور کئی دیگر دوائیں تجویز کیں۔ اس رات ساڑھو نے انھیں اپنے یہاں رکنے کا مشورہ دیا۔ دوسری صبح بخار پھر ایک سو چھ ڈگری ہو گیا۔ عجب بے بسی تھی۔ ساڑھو نے نسخے پر مطبوعہ ٹیلی فون نمبر دیکھ کر ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ بخار پھر ایک سو چھ ڈگری ہو گیا تھا تو ڈاکٹر نے ٹی۔ سی ڈی۔ سی اور ملیریا کے ٹسٹ کی ہدایت کر کے رپورٹ کے ساتھ بچے کو لانے کی تاکید کی۔ ڈاکٹر کے لہجے میں بھی اضطراب کی جھلک نمایاں تھی۔ اس نے خود دوائیں لکھی تھیں، اس کے بعد بخار بڑھنے کا سوال نہیں تھا۔ لیکن بخار شاید اب اس کی دواؤں کا تابع نہیں رہ گیا تھا۔

سب لوگ پھر ڈاکٹر کے یہاں تھے۔

اس بار معلوم ہوا کہ بچہ بے حد کمزور ہو گیا ہے، اس لیے اسے گلوکوز چڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کی بیوی کو روتا ہوا دیکھ کر ڈاکٹر نے بچے کو نرسنگ ہوم میں بھرتی کرانے کی ہدایت کی۔ اب ان کے سامنے پریشان کن سوال یہ تھا کہ اس نئی مصیبت کا سامنا کس طرح کیا جائے۔ ڈاکٹر کا نرسنگ ہوم شہر کے دوسرے علاقے میں واقع تھا۔ درمیان میں ایک طویل اوور برج تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر بھیڑ میں سے ایک اجنبی شخص اس کے قریب آیا۔

"جی میرا نام لالہ سورج نندن ہے۔ آپ لوگ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

سب چپ ہو گئے۔ کون ہے یہ اجنبی، اس کا کیا مقصد ہے؟ کیا یہ پیشہ ور قرض دینے والا ہے؟ جتنا نقد گھر میں تھا، سب ختم ہو چکا تھا۔ آگے کے علاج کے لئے مزید روپئے درکار تھے۔ اس کے ساڑھو نے کہا۔

"دراصل ان کا اکلوتا بچہ بہت بیمار ہے، اس لیے پریشان ہیں۔ ڈاکٹر نے کلینک میں ایڈمٹ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ کیا کیا جائے۔"

اس آدمی نے کہا۔ "اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ پیسے اگر گھٹ رہے ہوں جناب تو میں حاضر ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا بچہ علاج کے بغیر....."

اس آدمی کی آنکھیں کہیں ویرانے میں اٹک گئیں، لیکن دوسرے لحظے اس نے جیب سے پرس نکال لیا۔ "لے لیجئے صاحب۔ کبھی موقع ملے گا تو ادا کر دیجئے گا۔ فی الحال اپنا کام مت روکئے۔ یہ دوستانہ پیش کش ہے، مجھے صلے میں کچھ نہ چاہئے۔"

اس کی بیوی اس فرشتے کو ممنون نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ تھی کہ اس پرچے کی کھلی

ہوئی زہرناکی کے باوجود ایک ہندو کی طرف سے اس طرح مدد کی پیشکش آئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں شوہر کی اس بات کی گہرائی کا اعتراف کیا کہ ابھی سارے کے سارے لوگ خراب نہیں ہوئے۔ مشترکہ تہذیبی ورثہ اور انسانی جذبہ ابھی ایسا مردہ نہیں ہوا تھا کہ ہر انسان اس طرح کے شرارت انگیز پرچوں کی شرانگیزی پر پر عمل درآمد شروع کردے۔ پھر تو زندگی کا کوئی جواز ہی نہیں رہے گا اور انسان جنگلوں کے عہد میں پہنچ جائے گا۔ بلکہ جنگل کے عہد سے بھی بدتر حالت میں، اس لئے کہ جنگلی سماج میں بھی کچھ نہ کچھ منصفانہ اصول وضع کر لئے گئے تھے اور باہمی وجود کو تسلیم کرتے ہوئے سماج کی تشکیل کا مرحلہ طے کرلیا گیا تھا۔ ایک تقسیم کا زخم ہی ایسا کاری تھا کہ نہ جانے کتنے لوگ اب تک جانبر نہ ہوسکے، اب مزید تقسیم کسی قیمت پر نہیں۔ بلکہ موقع ملے تو..... دونوں جرمنی ایک ہوسکتے ہیں تو کیا ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش پہلی والی حالت میں واپس نہیں آسکتے؟ ہم بیدار ہوجائیں تو یہ دیواریں تحلیل ہوجائیں۔ اس نسل میں نہیں تو شاید آنے والی نسل میں لوگوں کی نیند ٹوٹے اور وہ جان لیں کہ طاقتور انسانوں نے اپنے آمرانہ مقاصد کے حصول کے لئے دھرتی پر لکیریں کھینچ دی تھیں اور آج تو ہم عالمی انسانی سماج اور گلوبل گاؤں کی سمت بڑھ رہے ہیں.....

ہم ہوں گے کامیاب/ہم ہوں گے کامیاب ایک دن
من میں ہے وشواس/پورا ہے وشواس
ہم ہوں گے کامیاب/ایک دن
ہوگی شانتی چاروں اور، ہوگی شانتی چاروں اور
ہوگی شانتی چاروں اور/ایک دن
ہو ہو من میں ہے وشواس/پورا ہے وشواس
ہم ہوں گے کامیاب/ایک دن
ہم چلیں گے ساتھ ساتھ/ڈالے ہاتھوں میں ہاتھ
ہم چلیں گے ساتھ/ڈالے ہاتھوں میں ہاتھ
ہم چلیں گے ساتھ ساتھ/ڈالے ہاتھوں میں ہاتھ
ایک دن/ہو ہو من میں ہے وشواس
پورا ہے وشواس/ہم ہوں گے کامیاب
ایک دن/نہیں ڈرے ہیں ہم
نہیں ڈرے ہیں ہم/نہیں ڈرے ہیں ہم

نہیں ڈرے ہیں ہم/ایک دن
ہو ہو من میں ہے وشواس/پورا ہے وشواس
ہم ہوں گے کامیاب/ایک دن

سراسیمگی کے عالم میں بھی کلینک کے باہر پان کی دکان میں ریڈیو پر بجتے ہوئے اس گیت کو سن کر وہ اپنے بیٹے کی پریشانی بھول گیا

بیوی نے ٹہوکا دیا۔ ''کیا فیصلہ کیا؟''

پہلے چلو ساڑھو بھائی کے گھر، ٹھنڈک شروع ہوگئی ہے۔ سامان تو لینا ہوگا۔ یہاں سے ڈائرکٹ کلینک جانا مناسب نہیں۔''

ساڑھو بھائی کو بھی یہ تجویز معقول معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ گھر چل کر سب لوگ کھانا کھالیں اور پھر ضروری سامان لے کر کلینک کے لیے روانہ ہوں۔

چھٹا باب

پراسرار گھوڑے کی ٹاپ

جب رکشا طویل اوور برج سے گذر رہا تھا تو چڑھائی کے سبب بوڑھے رکشے والے سے رکشا کھینچنا پار نہیں لگ رہا تھا۔ بیٹے کا بخار جوں کا توں تھا۔ اس وقت وہ، اس کی بیوی اور اس کا بچّہ رکشے پر سوار تھے۔ ساڑھو نے کہا تھا کہ تم لوگ آگے بڑھو، پیچھے سے میں اسکوٹر پر سوار ہوکر کلینک پہنچتا ہوں۔

اسے لگا کہ ایک جگہ رکشا آگے بڑھنے کا نام نہیں لے رہا ہے، چڑھائی بہت سخت ہے۔ اسے نہ معلوم اپنے بچے پر رحم آیا جسے فوری علاج کی ضرورت تھی یا بوڑھے رکشے والے کا پسینے پسینے اور ہلکان ہونا اسے گوارا نہ ہوا کہ وہ خود رکشے سے اتر گیا اور رکشے کو پیچھے سے دھکیلنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ رکشے کو نہیں اپنے آپ کو آگے ڈھکیل رہا ہے۔ چوڑی پختہ سڑک پر بھاری بے ڈول رکشے کو ڈھکیلتے اور اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے وہ خود ہانپنے لگا۔ دفعتاً اسے لگا کہ کہیں دور سے کوئی گھوڑا اس کی طرف سرپٹ دوڑتا چلا آرہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں گونجتی ہوئی ٹاپیں سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سرپٹ گھوڑے کی پاؤں کی دھمک بتدریج قریب آتی جارہی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو کوسا، مالک مکان کو گالیاں دیں جس نے اس کی مسلسل گذارشوں کے باوجود پانی ٹنکی میں بلیچنگ پاؤڈر ڈالنے سے گریز کیا تھا۔ حرامزادہ ایک تو عام طور پر ٹنکی سے وافر مقدار میں پانی مہیا کرنے سے کتراتا تھا، کبھی ٹنکی پورے طور پر بھرتا ہی نہ تھا۔ دوسرے کبھی ٹنکی کی صفائی کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں وائرل انفکشن تو ہونا ہی تھا۔ وہ لوگ اب تک کس طرح بچتے آرہے تھے، یہ حیرت انگیز تھا۔ اس کے دیگر

دوستوں نے کرائے کے مکانوں میں رہتے ہوئے فلٹر کا انتظام کر رکھا تھا۔لیکن ایمانداری کی سوکھی تنخواہ میں کیا فلٹر کے لیے ہزار بارہ سو روپے مختص کرنا آسان تھا؟ کمینہ ذلیل سالا پکا مسلمان بنتا ہے۔ یہودیوں کی طرح پیسہ دانت سے پکڑتا ہے۔کہتا ہے بلیچنگ پاؤڈر پہلے کی طرح سستا نہیں رہا،تو کیا انسان کی زندگی سستی ہوگئی ہے؟

اسے یاد آیا کہ اکثر و بیشتر وہ خود اپنے پیسے سے بلیچنگ پاؤڈر خرید لاتا اور اسے پانی میں گھول دیتا تھا۔لیکن ٹنکی کی صفائی کے بغیر پاؤڈر بھی کتنا کام کرتا؟ کچی عمر کی آنتیں تو بہت جلد انفکشن قبول کر لیتی ہیں۔ بیچارا معصوم بچہ.....

پراسرار گھوڑے کی ٹاپ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ملگجی فضا پر کچھ اور ہیبتنا کی طاری ہوگئی تھی۔سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ بم کے دھماکوں کی طرح خوف ناک سنّاٹے کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ لیکن سنّاٹے کی جگہ وہ بھیانک آواز.....

اونچائی چڑھ کر اب سڑک ڈھلان کو گلے لگانے والی تھی۔وہ دوبارہ رکشے پر سوار ہوگیا۔اب رکشے والے کا کام آسان تھا۔اس نے رکشے میں بیٹھے بیٹھے اپنے سانس درست کی۔رکشے کو دھکا دیتے ہوئے اسے لگا تھا کہ بھری پری دنیا میں وہ تنہا تھا۔سڑک پر چلنے والی سواریوں میں کوئی اس کا غمخوار نہیں۔ ہر انسان اپنی اپنی دھن میں لگا ہوا دوسروں کو ڈھکیلتا گراتا کچلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔اسے شکیب جلالی کا شعر یاد آیا ؎

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے　　میری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

''بھائی صاحب! بھائی صاحب!'' کوئی پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔اس نے رکشے میں بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

وہی ہمدرد جس نے رقم دینے کی پیشکش کی تھی،سائیکل پر سوار ہانپتا کانپتا چلا آ رہا تھا۔تیزی سے پیڈل مارتے ہوئے اُس نے اپنی سائیکل رکشے کے برابر کی۔

''بھائی صاحب برا مت مانئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ بھگوان آپ کے بچے کو سلامت رکھے۔ دیکھئے میری نسٹھا کو غلط مت سمجھئے۔ میں جانتا ہوں آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''بہت بہت شکریہ بھائی صاحب۔''

ناگاہ اسے سرپٹ گھوڑے کا خیال آیا۔اس نے خوف زدہ نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ گھوڑا موجود نہ تھا۔تو کیا.....؟

پھر اسے خیال آیا کہ اس نے شکریے کا لفظ استعمال کر کے غلطی کی تھی۔حالات ابھی تک بالکل نارمل نہیں ہوئے تھے،لیکن انسانیت ابھی زندہ تھی۔ورنہ کیا ضرورت تھی کہ یہ آدمی اس کی امداد کے لیے اتنی

مصیبت کی راہ اختیار کرتا؟ ایسا تو نہیں کہ وہ ہمیں ہندو سمجھتا ہے؟ پھر اس نے سوچا کہ اصلیت ظاہر ہو جائے تو کیا ہوگا۔یوں بھی اسے اپنے بچّے کے بچنے کی امید اب کم نظر آ رہی تھی۔مرنا مقدر ٹھہرا تو ہر حال میں مریں گے۔اس نے کنکھیوں سے بائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا:

''جناب آپ خواہ مخواہ زحمت کر رہے ہیں۔جو ہوگا وہ ہم بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔''

''آپ بطور قرض ہی سہی،میری مدد قبول کیجئے۔میں سمجھوں گا میں نے اپنا فرض.....''

محسن کی آنکھیں چشمے کی طرح بہہ نکلیں۔رکشہ اور سائیکل دونوں ڈھلان سے گذر رہے تھے۔ اس پر رقت کی جو کیفیت طاری تھی،وہ عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔اسے لگا کہ تیزی سے چلتی ہوئی سائیکل پر اس بے سدھ کیفیت میں اس سے چوک نہ ہو جائے اور وہ کھڈ میں.....رکشے پر بیٹھے بیٹھے سائیکل کی سیٹ کے پچھلے حصے کو اپنی گرفت میں لے کر بے قابو ہوتی ہوئی سائیکل کو متوازن کرنے کے لیے اسے خاصی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔محسن کے ادھیڑ عمر ہاتھ پیڈل پر کانپ رہے تھے سوگوار چہرہ ایسا جیسے ساری دنیا کا غم اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہو۔آنے جانے والے محو حیرت تھے۔ایک عورت کی گود میں منھ ڈھانپ کر لیٹا ہوا بچّہ .....ایک شخص دوسرے کو بچانے کی کوشش میں اور زندگی.....

اچانک سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ پھر سنائی دی...ٹاپ قریب آ رہی تھی۔اس نے دیکھا کہ وہ،اس کی بیوی اور بچہ گھوڑوں کی ٹاپ کے نیچے روندے جا رہے ہیں،زدوکوب کیے جا رہے ہیں۔ان کے کپڑے تار تار ہوگئے۔جسم کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔سرپٹ گھوڑوں کا قافلہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ایک،دو، تین.....سینکڑوں، ہزاروں..... انگنت.....ٹڈی دل کی طرح چھاتے جا رہے تھے۔ چاروں طرف .....اچانک اس نے ایک چیخ ماری.....اس کی بیوی.....ادھ مری بیوی نہ جانے کیا سمجھ کر سینہ کوبی کرنے لگی۔

''یا خدا! ہم بے کس نامرادوں کا کیسا امتحان لے رہا ہے؟ ہم ابتلائے روزگار کے مارے.....''

پھوٹ پھوٹ کر روتے روتے اس پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔فضا میں دھواں پھیلنے لگا۔دیکھتے دیکھتے منظر دھند آلودگی کی طرف مائل ہوگیا۔دبیز تاریکی کے رینگنے کی آہٹ اس سنّاٹے میں صاف سنی جا سکتی تھی۔غیر مرئی سرپٹ گھوڑے یہاں سے وہاں تک دندناتے پھرتے تھے اور وہ دونوں چپ چاپ اپنے وجود کے غار میں اتر کر نامعلوم سمتوں میں بھٹک رہے تھے۔

ساتواں باب

برابری کا رشتہ

گہما گہمی اور بھیڑ بھاڑ والے شہر میں اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔لوگوں کی رفتار

غیر معمولی ہوگئی ہے۔لوگ کہنے اور کچھ چھپانے کے انداز میں مختلف ٹولیوں میں بٹ کر سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

سورج روبہ زوال تھا۔تازہ لہو کی مہک، سراسیمگی اور وحشت کا سنّاٹا اندیشے کو تقویت پہنچا رہے تھے کہ شہر کے کسی علاقے میں کوئی واردات ہوگئی ہے۔

اچانک ہر طرف دور سے سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی جو دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔

دونوں بہت دیر سے سڑک پر کھڑے ہوئے کسی سواری کے منتظر تھے۔ایک دبلا پتلا.....دونوں سڑ پر گزرتی ہوئی مختلف سواریوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔دونوں کو دور دراز کے کسی علاقے میں جانا تھا۔

سڑک پر ٹہلتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے قریب آ رہے تھے۔قریب آ کر دور جا رہے تھے۔

عجیب پس و پیش میں تھے دونوں۔

.....ایک دوسرے سے ربط پیدا کیا جائے یا نہیں.....؟ کہیں وہ دوسرے فرقے کا ہوا تو.....وہ خواہ مخواہ ایکسپوز تو نہیں ہو جائیں گے.....کیا ایک دوسرے کے تعلق سے گومگو کے عالم میں مبتلا رہنا ان کے حق میں مفید ہے؟

دونوں جائے پناہ کی تلاش میں اور اپنی منزلوں تک پہنچنے کی ادھیڑ بن میں ایک دوسرے کی طرف محتاط نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسی طرح کی باتیں سوچ رہے تھے۔

چاروں طرف تناؤ اور خوف کا ماحول چھایا ہوا تھا،لوگ بچتے بچاتے اپنے اپنے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچنے کی جلدی میں تھے.....جو لوگ محفوظ مقامات پر قلیل تعداد میں تھے سکتے کے عالم میں سہمے ہوئے تھے۔ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں.....اپنے تحفظ کے لیے کون سی راہ اختیار کریں۔

جو لوگ محفوظ علاقوں تھے، وہ تو ایک تھرل سا محسوس کر رہے تھے.....اب بموں کے دھماکے سنائی دیں گے.....آسمان کی طرف شعلے اٹھیں گے.....جھماکے کے ساتھ چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی.....کیا مزہ آئے گا.....

کچھ مقابلے کی تیاری میں تھے..... چھپائے ہوئے ہتھیاروں کو کونوں کھدروں اور تہہ خانوں سے نکال لیا گیا تھا.....

متعدد انگلیاں آنے والے خونی لمحوں سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار تھیں۔

یہ سب اب روز کا قصہ تھا۔کہیں کوئی ناہنجار کوئی شوشہ چھوڑ دیتا۔دیکھتے دیکھتے پوری فضا پر ایک سناٹا چھا جاتا۔بے کار اور خوشحال لوگوں کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا،لیکن دھندا والوں کو مصیبتیں اٹھانی پڑتیں۔ان کے دفتر اور روزگار کا معاملہ ہوتا۔خوانچے اور ٹھیلے والے تو روز کنواں کھودتے تھے اور پانی پیتے تھے۔ناہنجاروں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے اگر کرفیو نافذ ہو جاتا تو ان بے چاروں کو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ جاتے۔

سواریاں رُکے بغیر تیزی سے گزرتی جا رہی تھیں۔شائیں شائیں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔سب کے سب جیسے بے حد عجلت میں تھے۔اپنے اپنے گھروں یا کم از کم محفوظ علاقوں کی سرحدوں میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔

سورج غروب ہونے والا تھا۔

ہلکے ہلکے جاڑے کے آغاز کے ساتھ ہی دن چھوٹے ہونے شروع ہو جاتے ہیں.....جلد دوپہر ہو جاتی ہے.....شتاب شام ہو جاتی ہے.....اندھیرا پھیل جاتا ہے.....دیر تک رات رہتی ہے.....جاڑا لمبی راتوں اور چھوٹے دنوں کے لیے لوک کتھاوں کی طرح شہرت رکھتا ہے۔

دُبلے آدمی نے غور کیا کہ اس کے علاوہ وہی ایک آدمی.....موٹا آدمی سڑک پر موجود تھا جو اس سے تھوڑا فاصلے پر کھڑا تھا۔

اسے ڈر لگا.....کہیں یہی آدمی اس پر حملہ آور ہو جائے تو.....؟

اس نے اندازہ لگانا چاہا کہ مقابلہ ہونے کی صورت میں وہ اس پر قابو پا سکے گا یا نہیں.....اپنے قد و قامت کے چلتے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے اس نے اس آدمی سے اپنا فاصلہ بڑھا دیا۔دور سے کن انکھیوں سے اس گٹھیلے جسم کے تنومند انسان کو لگاتار دیکھتا رہا۔

اس تندرست آدمی سے محتاط رہنا ضروری ہے.....اس نے سوچا۔

اسے بے حد افسوس ہوا کہ آج اس کی جیب میں وہ کی رنگ بھی نہیں تھی، جس میں پھل کاٹنے والا ایک ننھا سا چاقو ہوتا تھا۔اس کے حملہ آور ہونے کی صورت میں کچھ تو اپنا بچاؤ کر سکتا تھا۔لیکن وہ تو نہتا تھا۔اس تنومند آدمی کی جیب میں نہ جانے کون سا ہتھیار ہوگا۔نہ بھی ہوا تو کیا اس کا مضبوط جسم ہی اسے زیر کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس نے غور کیا کہ تنومند آدمی مستقل اپنا ہاتھ جیب میں ڈالے ہوئے تھا۔

اسے یقین ہو گیا کہ ضرور اس کے پاس کوئی نہ کوئی مہلک ہتھیار تھا اور کسی لمحے یہ بھید کھل جانے پر کہ وہ اس کے فرقے کا بندہ نہیں ہے، اس پر حملہ آور ہو جائے گا۔

لیکن یہ اندازہ لگانا آسان نہیں تھا کہ آخر وہ کس فرقے کا بندہ تھا۔وہ بھی اسی کی طرح پینٹ شرٹ میں تھا۔اس نے بھی انگریزی کٹ کے بنا رکھے تھے.....نہ ڈاڑھی اور نہ ٹکّی.....

تھوڑی دیر کے لیے اسے بڑی راحت اور سکون کا احساس ہوا.....ہم کم از کم اتنے مہذب تو ہو گئے ہیں کہ دیکھنے میں کسی مخصوص فرقے کے اسیر نظر نہیں آتے.....اس نے سوچا، مہذب ہونے کا عمل جاری رہا تو ایک دن عمل جاری رہا تو تو ایک دن ہم اندر اور باہر تمام طرف سے.....

تخیل کے پرندے نے آسمان کی کی گہرائیوں میں اڑان بھرنا شروع کیا۔

نگاہوں کے سامنے تارکول کی سڑک سبزہ زاروں میں تبدیل ہوگئی..... ہرنوں اور خرگوشوں نے قلانچیں بھرنا شروع کردیا..... چاروں طرف سبک رو ہواؤں کے نازک لمس نے اس کے تن بدن میں ایک تازگی بھردی..... ہری بھری مخملی گھاس پر لیٹے ہوئے اس نے خود کو نیلگوں آسمان میں تحلیل ہونے کی لذت اور سرشاری سے ہم کنار ہوتے دیکھا.....

''آپ لوگ سڑک پر کیا کرتے ہیں.....اپنے اپنے گھروں کو جایئے.....!''

''ہم لوگ سواری کے انتظار میں ہیں۔''

پولس کے آدمیوں نے غالباً ان کے حلئے اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ شر پسند اور غنڈہ عناصر نہیں ہیں۔ مطمئن ہوکر انھیں فوراً اپنے گھروں کو روانہ ہونے کی ہدایت کرکے جیپ میں بیٹھ گئے۔ پولس کی مداخلت اور غیر متوقع استفسار نے ان دونوں کے درمیان کے فاصلے کو تھوڑا کم کردیا تھا۔ حالانکہ ایک دوسرے کے لئے شک وشبہ اور بے یقینی کیفیت ابھی بھی کم وبیش دونوں کی آنکھوں سے عیاں ہورہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رسمی سا جملہ دونوں کے منہ سے ادا ہوا۔

''آپ کو کہاں جانا؟''

دبلے آدمی کے ذہن میں یہ بات اچانک آئی کہ شاید اس سوال سے تنومند آدمی کی شناخت اجاگر ہوجائے۔ لیکن سوال سے اس حقیقت کا پتا لگانا آسان نہ تھا۔ چلتے پھرتے ہندوستانی الفاظ تھے جن پر کسی زبان اور مذہب کی سکّہ بند مہر نہیں تھی۔ دونوں نے جواب دیا، اس سے بھی کوئی اندازہ نہیں ملتا تھا۔ دونوں نے جو نام لیے وہ دونوں ہی ملی جلی آبادیوں والے علاقے تھے۔ جواب دینے کے بعد دونوں پھر اپنے آپ میں گم ہوگئے۔ جیسے اس طویل شاہراہ پر وہ تنہا ہوں۔

دُبلے پتلے آدمی کے چہرے اور آنکھوں سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ دوسرے آدمی سے بے حد ڈرا ہوا ہے۔

اس پر ایک عجیب غیر معمولی خوف مسلط تھا..... ہر آن شدّت سے وہ خطرہ محسوس کررہا تھا..... یقیناً وہ دوسرے فرقے کا ہے.....اور اس فرقے کا راز عیاں ہوتے ہی ظالم بن کر اس پر ٹوٹ پڑے گا..... کہ حالیہ واقعات وقرائن اسی شک کی توثیق کرتے تھے۔

سڑک کی دونوں جانب کے کئی مکانوں کی بالکنی، چھت اور کھڑکیوں پر کئی ساری آنکھیں اور کئی سارے کان ان دونوں پر ٹکے ہوئے تھے۔ اگر کسی چھت، کسی بالکنی، کسی کھڑکی سے گولی چل جائے تو..... ٹھنڈک کے باجود اس کے بدن میں حرارت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ پیشانی پر خوف کے مارے

پسینے کی بوندیں جھلملانے لگیں۔

اس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ذرا دور جاکر احتیاط کے طور پر سڑک کے کنارے سے ٹوٹی ہوئی اینٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر اپنی پاکٹ میں رکھ لیا۔ اس بات کا اس نے خاص خیال رکھا کہ دوسرے موجود کو اس کی حرکت کا پتہ نہ چلے۔ جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے مضبوطی سے اپنی ہتھیلیوں کی گرفت اس نے اینٹ کے ٹکڑے پر بنائے رکھی۔

اس کے چہرے سے اب کچھ اطمینان اور بشارت کی لکیریں عیاں ہورہی تھیں۔ اتنا بھرا سے سہارا مل گیا تھا کہ وہ تنومند آدمی کے حملے کا مقابلہ کیے بغیر جاں بحق نہ ہوگا۔

اینٹ کے ہتھیار سے مقابلہ کرتے ہوئے شہادت کا درجہ حاصل کرے گا.....

بغیر جدوجہد اور مسابقت کی موت کو وہ حرام سمجھتا تھا.....لڑتے ہوئے مرے گا تو یہ ملال تو نہ ہوگا کہ اس نے مقابلے سے گریز کیا.....اور کیا پتا ادھواڑ کے ایک وار سے وہ اپنے دشمن کا کام.....غازی کا.....

دراصل بچپن میں اس کے باپ نے سنّاٹی سڑک پر اسکول جاتے ہوئے اگر کتے پیچھا کریں تو ان سے بچنے کی یہ ترکیب بتائی تھی.....کسی بھی حالت میں کتوں کو دیکھ کر دوڑنا نہیں ہے ورنہ وہ پیروں میں اپنے دانت گڑادیں گے۔

دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے سڑک پر کسی بڑے ڈھیلے یا اینٹ کے ٹکڑوں کی تلاش کرنی ہے۔ ڈھیلے کے قریب پہنچتے ہی اسے ہاتھ میں اٹھا لینا ہے اور تب کتوں کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر اس نے حملہ کرنے کی حماقت کی تو وہ اسے چھوڑے گا نہیں، اینٹ کے ٹکڑے یا پتھر سے وہ اس کا سر پھوڑ دے گا.....اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گا۔ کتّوں کے ٹلنے سے پہلے بھولے سے بھی اس ہتھیار سے کنارہ کشی خودکشی کے مترادف ہے.....

اس نکتے پر باپ کا خاص زور تھا۔ نعمت غیر مترقبہ کی طرح ایک خالی ٹمپو ان کے پاس رکا۔ دونوں تیزی سے لپکے۔ ٹمپو میں بیٹھنے کے بعد بھی دبلا آدمی تنومند سے ڈر رہا تھا۔ راستے میں کئی طرح آبادیاں ملتی ہیں پتا نہیں کب اس ہمسفر کی نیت خراب ہوجائے.....کب اس کے ارادے اس کے خلاف ہوجائیں اور خطرناک صورت اختیار کرلیں۔

اس نے سوچا کہ ہمسفر کی شناخت کا اندازہ ضروری ہے.....اسی حساب سے آگے کی کارروائی طے کرے.....اگر مخالف فرقے کا ہو تو ٹمپو روک کر اتر جائے.....زندگی میں احتیاط ضروری ہے.....لیکن جب پوری زندگی ہی قدم قدم پر خطروں میں گھری ہو تو.....

ہر آن یہ ڈر ہو کہ کب کون.....

بے یقینی اور تذبذب.....

سب کچھ داؤں پر.....

اس نے ڈرتے ڈرتے لیکن بظاہر بے خوفی کا اندازہ دکھاتے ہوئے پُرتکلف لہجے میں اپنے ہمسفر سے پوچھا۔

''یور گڈ نیم پلیز.....''

''منّا!''

یہ وار بھی خالی گیا۔ اس نے سوچا منّا نام تو کسی کا بھی ہوسکتا ہے۔ تلفّظ اور الفاظ تو پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان ایسے کامن ہوگئے ہیں کہ اس سے کسی کی جڑوں کا کوئی اندازہ نہیں ملتا۔

دراصل پڑھائی لکھائی اور تہذیب وتمدن کہتے ہی اس کو ہیں کہ انسان اپنی حد بندیوں سے بالاتر ہوجائے.....

ان خصوصیتوں کو حاصل کرلے جو اسے اوصاف عالیہ سے متّصف کردیں.....

فرقوں کے غول سے نکال کر.....

دوسرا آدمی نام بتا کر اپنے خیالوں میں گم ہوگیا۔

پہلے کو اس بات کی فکر لاحق تھی کہ جواباً وہ بھی اس سے نام دریافت کرے گا.....

وہ کیا نام بتائے گا یہ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ مبادا اس کی شناخت اجاگر ہوجائے.....

راجہ.....آزاد.....کئی نام اس کے ذہن میں جلدی جلدی آرہے تھے.....اس طرح کے ناموں سے وہ اپنی مذہبی پہچان پر پردہ ڈال سکے گا.....

لیکن دوسرے نے اس کا نام پوچھنے کی روایت نہیں اپنائی۔ اسے یک گونہ راحت کا احساس ہوا۔

عجیب آدمی تھا وہ.....

شک وشبہ۔ تذبذب، خوف وہراس کے اس ماحول میں بھی اب وہ قدرے مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اس بات کی فکر لاحق نہیں تھی کہ اس کے بغل میں بیٹھے ہوئے آدمی کی کیا پہچان ہے۔ کس مذہب، کس فرقے اور ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ تو بڑی بے فکری سے سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔ لیکن اس کا دوسرا ہاتھ مستقل پاکٹ میں تھا۔ ٹمپو کے ہچکولے کھانے پر یا ٹریفک کی وجہ سے اس کے دھیمے ہونے پر چوکنّا ہوکر چاروں طرف دیکھنے لگتا تھا۔ اور پھر مطمئن ہوکر سگریٹ کے گہرے کش لینے لگتا۔

پہلا دزدیدہ نظروں سے دوسرے کی جانب دیکھتا رہا.....سب سے بڑا خطرہ اسے اپنے ہمسفر کی پُراسرار بے التفاتی اور لاپروائی کے برتاؤ سے محسوس ہورہا تھا.....

سب اس کی مکّاری ہے.....

موقع ملے گا اور.....

وہ ذرا سی بھی غفلت کرے گا اور اس کا چاقو اس کے جگر کے پار ہوجائے گا۔

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے خود کو مسلسل چاق وچوبند رکھنے کی کوشش کی۔

ناگاہ اس نے سوچا۔

پتا نہیں یہ ٹمپو والا کس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو سواریوں کی شناخت سے بے پروا اپنی منزل کی جانب اڑا جارہا تھا۔ اس کے فرقے سے یا اس کے ہمسفر کے فرقے سے.....

ان دو مسافروں کو دیکھ کر ایک لحظہ کے لیے وہ ٹھٹکا تھا۔ ان کے ہاتھوں کے اشارے پر تھوڑی دیر کے لیے وہ سوچ میں پڑ گیا تھا.....ٹمپو روکے یا نہ روکے.....

کشیدگی اور تناؤ بھرے حالات سے متاثر ہوکر ٹمپو والا گھر پہنچنے کی جلدی میں تھا۔ مزید پھیرے لگا کر کمائی کرنے کا خیال ترک کرچکا تھا.....زندہ رہا تو بہت کمائی ہوجائے گی...

ایک پل کے لیے اس نے سوچا تھا کہ ان دو مسافروں کے اشاروں کو نظرانداز کرکے تیز رفتاری کے ساتھ گرد اڑاتا ہوا آگے بڑھ جائے.....

ایسے ایسے موقعوں پر کبھی کبھی سواریاں بہت زحمت بن جاتی تھیں.....کیا پتا دونوں شر پسند عناصر ہوں اور ان کے پیٹ ملے ہوئے ہوں.....الگ الگ ہونے کا دکھاوا کرتے ہوں۔ ٹمپو رکتے ہی دونوں ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوجائیں.....

لیکن نہ معلوم کس انسانی جذبے کے تحت خطرے کے خیال کو جھٹکتے ہوئے اس نے ٹمپو روک دیا تھا۔

شاید دونوں سچ مچ مصیبت کے مارے ہوں.....پناہ گاہ کی تلاش میں ہوں.....مدد کے مستحق.....

اس نے سوچا کہ اسے ٹمپو والے سے سبق لینا چاہئے جو سواری کی شناخت کیے بغیر اپنے سفر پر بے محابا گامزن تھا۔ اس کی سیاسی بیداری اور سیکولر شعور کے مقابلے میں اس اناڑی ٹمپو والے کی بے فکری کا اندازہ زیادہ قابل قدر اور دانشورانہ تھا۔

اسے شرمساری ہوئی۔ لگا کہ خواہ مخواہ وہ اندیشے میں مبتلا تھا۔ ہمسفر سے خوف کھانے کے بجائے اس سے رفاقت کی تقویت حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔

رات ہوچکی تھی۔ سنّاٹی سڑک پر الکٹرک پولس کی اسٹریٹ لائٹ عجیب طلسماتی ملگجی روشنی بکھیر رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب گھنی آبادی والے محلّوں میں خوفناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تنہا اس ٹمپو کی تیز آواز ایسی لگ

رہی تھی جیسے کوئی بلڈوزر ملبوں کو روندتا ہوا، آبادی کو تہس نہس کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔ کہیں کہیں گلی اور چوراہوں پر سر گوشیوں میں مصروف لوگوں کی بھیڑ دکھائی دے جاتی تھی جو تیز رفتار ٹمپو میں فوراً نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔

سڑک کی دونوں جانب کی آبادیوں سے وہ دونوں واقف تھے۔

آبادیوں کی مناسبت سے ان کے چہروں پر الگ الگ رنگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔

کسی علاقے میں دبلا پتلا پُرسکون نظر آتا تو تندرس و توانا آدمی چوکنّا ہو جاتا۔ کہیں تندرست آدمی مطمئن ہوتا تو دبلے آدمی کے چہرے کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ محلّوں کی آبادی کے خدوخال کے حساب سے ان کے چہروں کی رنگت میں تبدیلی ہو رہی تھی۔

تندرست آدمی نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''سگریٹ پلیز.....!''

''نو.....تھینک یو.....!''

اس نے جان بوجھ کر سگریٹ قبول کرنے سے گریز کیا.....کیا پتہ اس میں اس میں نشہ آور چیز ملی ہو جو اس کو ٹھکانے لگانے کے لیے چارے کے طور پر.....اس نے طے کر لیا، کسی بھی قیمت پر سگریٹ نہیں پینا ہے۔

تندرست آدمی نے اس کے انکار پر کسی تاثر یا ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

جانے اس کا ذہن کہاں بھٹک رہا تھا۔

سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز نزدیک آتی جا رہی تھی۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ نیم تاریکی میں اگلے موڑ پر ہتھیاروں سے لیس کچھ سائے دکھائی دے رہے تھے۔ جان بوجھ کر الکٹرک پول کی مرکری توڑ دی گئی تھی۔

''پوری تیزی سے آگے بڑھتے جاؤ۔''

دونوں نے ایک ساتھ ڈرائیور سے کہا۔

ڈرائیور بھی لاٹھی ڈنڈوں اور دیگر ہتھیاروں سے لیس سایوں کو دیکھ چکا تھا۔ اس نے ٹمپو کی رفتار بے تحاشا بڑھا دی۔

تبھی ایک آواز آئی اور لڑھکتا ہوا ایک پیپا سڑک کے بیچوں بیچ آ کر یوں ہلنے لگا جیسے کسی پہاڑ کے نیچے دب کر پس جانے کے خوف سے پناہ مانگ رہا ہو۔

ٹمپو ڈرائیور نے کمال ہوشیاری سے اگر بریک نہ لیا ہوتا تو سب کے سب حادثے سے دوچار ہو جاتے۔

کئی چہرے آگے آئے اور چاروں طرف سے انہوں نے ٹمپو کو گھیر لیا۔ غالباً تندرست آدمی کی

شناخت سے ان میں سے کئی لوگ واقف تھے۔ دبلے آدمی کی طرف وہ لپکے۔

''تم اپنا نام بتاؤ؟''

''راجہ!''

''پورا نام.....؟''

تندرست ہم سفر نے فوراً اپنے ہونے کا احساس کرایا۔

''نام کیا پوچھنا ہے.....یہ میرا بھائی ہے.....!''

''جھوٹ.....پینٹ اتارو.....!''

کسی کینہ پرور اور شر پسند نے زمین پر اپنی لاٹھی پٹکتے ہوئے کہا۔

ان میں سے کئی ہنسنے لگے۔ کئی واقعی پینٹ کھول کر دُبلے آدمی کی بے حرمتی کرنے کے لئے آگے بڑھے۔

اسی وقت اس تندرست آدمی نے بل کھاتے ہوئے زوردار آواز میں چیخ لگائی۔

''خبردار.....میری لاش سے گزر کر ہی یہ کام کر سکتے ہو۔''

وہ اچھل کر کھڑا ہو چکا تھا اور پوزیشن لیتے ہوئے ریوالور نکال چکا تھا۔ سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔

وہ ریوالور کی نلی اس وقت تک مشتعل ہجوم کی طرف کیے رہا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

اس نے ہنستے ہوئے پیپے کو کنارے کیا۔

ٹمپو کے اسٹارٹ ہونے اور کچھ آگے بڑھ جانے کے باوجود دبلا آدمی زندگی سے ناامید اب تک سکتے کے عالم میں تھا۔

جو کچھ گزر چکا تھا اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

دہشت اور وہم و گمان کی عجیب کیفیت تھی جس نے اس کے سارے سوچ کو مفلوج کر دیا تھا۔

تندرست آدمی کے ذریعے ٹہوکا دینے پر وہ چونکا اور اسے احساس ہوا کہ فی الحال وہ خطرے سے باہر ہے۔

کچھ لمحوں تک وہ اس کا منھ تکتا رہا.....خالی خالی سا۔

دفعتاً اسے اپنے پنجے میں دبے ہوئے اینٹ کے ٹکڑے کا خیال آیا۔

دو مناظر روشنی کے جھماکے کی طرح نگاہوں میں کوند گئے۔

پہلے کی آمنے سامنے کی لڑائی میں قاسم چچا تلوار کے دستے پر لگاتار مضبوطی سے ہاتھ جمائے کچھ

اس شجاعت سے لڑتے کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ جاتے.....لوٹ کر آتے تو تلوار کے دستے جنگ کرتے کرتے ہتھیلی اور انگلیوں میں اس طرح گُتھ جاتے کہ اسے الگ کرنا مشکل ہو جاتا.....داہنے ہاتھ کی انگلیاں ہفتوں اپنا کام ٹھیک سے انجام دینے کے لائق نہ بن پاتیں۔

نوجوانی کی بلند چوٹی کی طرف بڑھتا ہوا اس کا بیٹا اپنے ساتھیوں سے کوئز کے طور پر آر ڈی ایکس کا فل فارم دریافت کرتا رہتا۔

اس کے پنجے میں اینٹ کا ٹکڑا مستقل دبا ہوا تھا.....کسی مرے ہوئے چوہے کی طرح.....اور اس کی انگلیاں بے حس و حرکت ہو گئی تھیں۔

بے اختیار اسے اپنی حالت زار پر ہنسی آ گئی۔

''بھائی صاحب! آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

ہم سفر کے سوال پر وہ گڑ بڑا گیا.....سچ مچ وہ ہنس رہا تھا یا رو رہا تھا۔

وہ آبدیدہ ہو گیا۔ جذبات سے بے قابو ہو کر اس نے ہم سفر کا ہاتھ چوما۔

اس کی آنکھوں سے زار و قطار خوشی کے آنسو رواں تھے۔ اسے یہ مقولہ یاد آیا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشاں حالی و درماندگی۔

رندھی ہوئی آواز میں آدمی گویا ہوا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ جناب..... میں یہ احسان عمر بھر نہیں بھول سکتا.....آپ نے میری جان بچا کر میرے بڑے بھائی ہونے کا ثبوت دیا ہے....!''

''نہیں....''

تنومند ہم سفر نے زور دے کر کہا۔

''میں نے صرف بھائی ہونے کا فرض ادا کیا ہے۔''

اس نے ریوالور جیب میں رکھا اور سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف پیار سے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اب تو پئیں گے سگریٹ آپ.؟''

نیم تاریکی میں اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اپنائیت اور دوست داری کی لازوال چمک سے منوّر تھیں۔

اس نے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

پھر اس نے سوال کیا۔

وہسکی بھی ہے؟

دوسرا مسکرایا۔ اور پھر قہقہہ لگانے لگا۔

خوب.....بہت خوب.....

اچانک سرپٹ گھوڑوں کی پُراسرار آواز پہلے دور سے اور پھر نزدیک سے آتی ہوئی سنائی دی۔

عالمِ دہشت میں جلتی ہو سگریٹ اس کی انگلیوں سے گر گئی۔

ٹمپو میں دونوں نے مل کر جلتی ہوئی سگریٹ کو تلاش کیا۔

پراسرار ٹاپوں کی آوازیں ان کا محاصرہ کر رہی تھیں۔

آٹھواں باب

عبدالمنان سے آخری ملاقات

عبدالمنّان سے وہ میری آخری ملاقات تھی۔

اس کے بعد اسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔

جب بھی دفتر کے کیمپس میں داخل ہوتے ہوئے آدم قد چہار دیواری پر نظر پڑتی تو نگاہوں میں عبدالمنان روشنی کے جھماکے کی طرح نمودار ہوتا۔

اس کا دُبلا پتلا جسم۔ دھونکنی کی طرح پھولتا پچکتا سینہ تیزی سے ہلتے ہوئے ہاتھ..... ہاتھوں کی جنبش میں عجیب سی بے چینی اور اضطراب..... جیسے زیادہ تیز ہوئے تو ساری دنیا کو الٹ کر رکھ دیں گے۔ آس پاس کے دفاتر کے ملازمین کی بھیڑ اس کے گرد جمع رہتی۔

''یہ دنیا ان پیٹ بھروں نے جہنّم بنا دی ہے.....اور ہمیں اگلی دنیا میں جنّت کے بہلاوے دیے جاتے ہیں..... مجھے کوئی بتائے کہ اس نرک میں جیتے جی موت جھیلنے کے بعد سورگ کے لائق کوئی رہ پائے گا .....اٹھو...آنکھیں کھولو.....ایک زبردست چھلانگ لگاؤ اور پیٹ بھروں کی چھاتیوں کو.....''

اس کی تقریر کے اس طرح جذباتی اور گرما گرم حصے لوگوں کے خون کی حرارت میں اضافہ کر دیتے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے آس پاس کی عمارتیں کانپنے لگتیں۔

ان دنوں عبدالمنان بے حد پریشان تھا۔ نئی نئی ملازمت تھی۔ عرصۂ دراز تک بے روزگاری جھیلنے والے عبدالمنان کی آنکھوں میں چھوٹے بڑے کئی سپنے چھپے تھے۔ مگر اس کا سب سے بڑا خواب دنیا کو بدلنے کا تھا۔ سوویت یونین کے انہدام نے اس کے ارادوں کو متزلزل نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ بہت دنوں سے اسے غلط راستے پر مڑ جانے والا گمراہ ہراول دستہ سمجھتا تھا۔ سویت روس کی جکڑ بندی کی اصلاح دو اچھی چیزوں سے شروع ہوئی تھی۔ گلاستوست اور پیروسترائیکا.....لیکن ان دونوں کو وہاں کے حکمرانوں نے غلط سمتوں

میں موڑ کر اس ملک اور کمیونزم کے شیرازوں کو بکھیر کر امریکی سرمایہ داری کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دیا۔

''عبدالمنان آپ دفتر بہت دیر سے آتے ہیں؟''

افسر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہتا۔

''جناب بہت پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہوں.....میری جگہ کوئی دوسرا ہو تو جینا بھلا جائے.....''

افسر آگے کچھ بولنے کی ضرورت نہ سمجھتا۔

نیچے چائے کے ڈھابے پر وہ بتاتا کہ اس کی پریشانیوں میں نت نئے اضافے ہوتے جا رہے ہیں۔ بھائی کی پڑھائی۔ ماں کی لاعلاج بیماری۔ بہن کی شادی۔ بچوں کے کھلونوں کی فرمایشیں.....اور.....اب اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اپنے اور گھر والوں کے لیے اس نے کیا کیا.....ان کے لیے بھی تو اس کے کچھ فرائض ہیں.....مزے لے لے کر چائے کی چسکیاں لینے والا اور بات بات پر قہقہے لگانے والا بندہ ہاتھوں میں چائے لیے ہوئے بس سوچتا ہی رہ جاتا۔ خالی خالی نگاہوں سے اونچی بلڈنگوں اور آسمان کی طرف گھورتا ہوا۔

''کیا ڈھونڈتے ہو عبدالمنان.....کس کی تلاش میں ہو.....؟''

کوئی اسے دور سے آواز دیتا ہوا سوال کرتا۔

اس کے قلب میں کوئی عمارت ڈھتی رہتی۔

''بیٹے.....اس بار تمہارے لیے بیٹری سے چلنے والی گاڑی ضرور لاؤں گا.....اور ہاں بیٹی..... تمہاری وہ ہنسنے اور رونے والی گڑیا بھی.....

''اماں.....تمہاری دوائیں..... بھائی تمہاری کتابیں.....رجنی پام دت کی انڈیا ٹوڈے کا نیا اور مہنگا ایڈیشن بھی.....''

رجنی پام دت نے تو ہندوستان کے ہندوؤں کی پول کھول کر رکھ دی ہی کہ یہ لوگ ہندوستان کے اصلی باشندے نہیں ہیں۔ اس نے تاریخی شواہد دے کر ثابت کیا ہے کہ جو آریائی یہاں باہر کے ممالک سے آئے وہی یہاں کے اصلی مقامی باشندوں کول، بھیل اور دیگر جنگلی جاتیوں کو جنگلوں اور جنوبی ہندوستان میں کھدیڑ کر یہاں کے مالک بن بیٹھے.....اسی لیے رجنی پام دت نے کہا تھا کہ اگر مسلمان باہری ہیں تو ان سے زیادہ ہندوستان کے ہندو باہری ہیں۔ اگر یہ ملک ہندوستان یہاں کے اصلی باشندو کے حوالے کرنا ہے تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی ہندوستان سے ہجرت اختیار کرنی ہوگی۔

اسے جھنجھوڑنا پڑتا۔

''یار یہ بستر نہیں جو آرام سے لیٹ کر خواب دیکھ رہے ہو.....یہ چائے کا ڈھابا ہے.....جس جگہ

تم بیٹھے ہو، وہ اینٹوں کے سہارے پر ٹکی بوسیدہ بنچ ہے.....سر پر زیادہ بوجھ لیے اس پر بیٹھے رہو گے تو چرمرا کر نیچے آ رہے گی.....''

''آں.....!'' وہ چونکتا۔

''تم نے ٹھیک کہا.....لیکن جہاں ہم ہیں اس سے بھی نیچے کیا.....!''

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس وقت بغل کی گلی سے ایک لاغر سی کتیا اپنے آدھے درجن پلّوں کے ساتھ آتی اور کھانے پینے کی چیزوں کی آس میں ڈھابوں کی طرف دیکھتی ہوئی تھکے تھکے قدموں سے آگے آگے بڑھ جاتی۔ پلّے کوں کوں کرتے ہوئے اس کے پیروں سے لپٹتے رہتے اور کتیا بھونکتی ہوئی اپنے پیروں سے انھیں پرے دھکیلتی رہتی۔

ایک گائے پھولوں کے عرق نکالنے والے خوانچے والے کو غافل دیکھ کر پھلوں پر منہ مارنے کی کوشش کرتی اور دکاندار سے ڈنڈے کھاتی ہوئی آدمیوں سے ٹکراتی ہوئی جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کرتی۔ کئی آدمی ٹھوکر کھا کر گرتے اور حواس باختہ ہو کر اٹھتے ہوئے اپنے کپڑے جھاڑنے لگتے۔

''عبدالمنان ذرا الگ چلو.....کچھ باتیں کرنی ہیں.....!''

میں نے اسے بتایا۔

''گنبدوں کی تاراجی کے دوسرے دن تم نہیں آئے.....کچھ لوگ بے حد خوش تھے.....جیسے کوئی گڑی ہوئی دولت ہاتھ لگی ہو..... بڑا زہر بھرا ہوا ہے.....ارے بھائی ہسٹری بتاتی ہے ہم تو یہاں کے اصلی باشندے ہیں.....ہم سے غیروں سا سلوک وہ کرتے ہیں جو خود حملہ آور رہے ہیں!''

عبدالمنان نے کہا۔

''چھوڑو ان فالتو باتوں کو.....بنیاد پرست ہتھکنڈوں سے میں خوب واقف ہوں.....ہم نے بھی تو حکمرانوں کی سائیکی سے نجات حاصل نہیں کی کہ سینکڑوں برسوں تک مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی .....ہم پر اس بات کا نشہ ہمیشہ سوار رہا.....حکمرانی کے نشے سے ہمیں بھی تو نکلنا چاہئے .....محکوموں کے درد کو سمجھیں گے تو وقت کی حکمت سمجھ جائیں گے.....جانتے ہو اس دن ہزاروں بودھ بھکشوؤں کے دکشا سمارو ہ میں کیسی کیسی تلخ حقیقتیں سامنے آئیں..... یقین جانو سمجھ دار لوگ ابھی بھی اس ملک میں بستے ہیں..... مایوس ہونے کی ضرورت نہیں..... بودھم شرنم گچھامی.....

علاقے علاقے سے اینٹیں جمع ہو رہی تھیں۔ فضا میں پھر سے زہر بھرا جا رہا تھا۔ سڑکوں پر چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ کب کہاں کس کی شامت آ جائے کہنا مشکل تھا۔

اس نے کہا۔

''بھائی جیسے بھی ہو مجھے اپنے بچے کے لیے بیٹری سے چلنے والی گاڑی بیٹی کے لیے ہنسنے رونے والی گڑیا خریدنی ہے اور بہن کی شادی کے لیے پیسے جٹانے ہیں!''

میں نے عبدالمنان کو مشورہ دیا کہ وہ پی ایف یا تھریفٹ سوسائیٹی سے قرض لے کر اپنے یہ مسائل حل کر لے۔ لیکن اپنی زندہ دلی سے کنارہ کش نہ ہو۔ یوں ہاتھوں میں چائے کا کپ لے کر بغیر پیئے ہوئے اسے ٹھنڈا نہ کر دے۔ عبدالمنان نے دونوں جگہ درخواستیں دیں۔ ایک جگہ سے قرض کی منظوری مل گئی۔ عبدالمنان بے حد خوش تھا۔ قرض لے کر کم لوگ اتنا خوش ہوتے ہوں گے۔

میرے ساتھ چل کر اس نے چھٹی کی درخواست پیش کی۔ اپنے شہر کے لیے ریزرویشن ٹکٹ لیا۔ دو دن بعد اس کی گاڑی تھی۔

اپنے گھر والوں کے لیے اس نے جم کر خریداری کی۔ اس دن تو اس کا رویہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جو عبدالمنان کم قیمت کی چیزوں پیسے دینے میں مول تول کرتا، وہ اس دن دکانداروں کو منہ مانگی رقم دے رہا تھا۔ سب کے لئے اس نے کوئی نہ کوئی تحفہ خریدا۔ بہن کی شادی کے لیے الگ سے خریداری کی۔ بیوہ ماں کے لیے رنگین ساری۔ میں تھوڑا معترض ہوا۔ لیکن اس نے کہا کہ کبھی تو وہ بھی گلابی رنگ کا حصہ بنے۔ سفید اور سیاہ نے اسے بہت پہلے بھری جوانی میں ضعیفی کی زنجیر پہنا دی۔ بیٹے کے لیے بیٹری والی قیمتی گاڑی اور بیٹی کے لیے ٹیپ ریکارڈر سے بولنے والی گڑیا۔

زبردستی اس نے مجھے اچھے ہوٹل میں گریل اور پراٹھے کھلائے۔ خود یوں کھا رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اچھا کھانا نصیب ہو رہا ہو۔ مرچ سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آنکھیں پونچھتا اور گوشت پر ٹوٹتا ہوا عبدالمنان مصور کی کسی عجیب سی کیفیتوں والی تصویر کا مرقع پیش کر رہا تھا۔ قرض لیے گئے پیسے کی یہ شاہ خرچی مجھے اچھی معلوم نہ ہوئی۔ وہ کئی پلیٹ گریل اور متعدد پراٹھے صاف کر گیا۔ لیکن میں.....اس کا دوست ہونے کے ناطے مجھے اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ ایک پلیٹ پر ہی میں نے اکتفا کیا۔

چھٹی کی درخواست وہ دے چکا تھا۔ دو دن کے بعد کے ریزرویشن نے اس کے گھر پہنچنے کی بیتابی بڑھا دی تھی۔ دوسرے روز اس نے مجھے بوٹینکل گارڈن چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح وہ دو برس پہلے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں جانے کی یاد کو تازہ کرنا چاہ رہا تھا۔

''وہ دیکھو.....اسی ہاتھی پر میرے بچے نے سواری کی تھی.....بڑا دلیر ہے میرا بیٹا.....اسے ہاتھی پر چڑھاتے ہوئے میں ڈر رہا تھا لیکن وہ ذرا بھی خائف نہ تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہاتھی کی سواری کرتا رہا۔''

عبدالمنان نے دور جاتے ہوئے ہاتھی کو دیکھ کر بتایا۔

کچھ آگے بڑھنے پر بچوں کی ٹرین کے لیے بنے خوبصورت اور دلکش ڈونالڈ ڈک نگر اسٹیشن کے پاس پہنچ کر وہ پھر یادوں میں کھو گیا۔

''یار کمال ہے، چلڈرن ٹرین کے ناہموار ہچکولوں کے بیچ بھی وہ بچہ مستقل کھڑا رہا اور اچک اچک کر شرمیلی بلّی، مور، ہرن، شیر ببر، تیندوے اور مختلف جانوروں کو دیکھتا رہا۔ ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں ہیلو کہتا رہا.....تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہا.....''

میں نے محسوس کیا کہ عبدالمنان اپنے بچے کو یاد کر کے قلبی سکون حاصل کر رہا ہے۔ بیوی کی باری بھی آئی.....اور اس کے ہونٹوں پر عجیب سی دلفریب زیرلب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''وہ سیدھی سادی عورت سیٹ پر گھونگھٹ نکالے اس طرح سکڑی سمٹی بیٹھی رہی جیسے سہاگ رات میں بستر کے کونے پر بیٹھی ہوئی کوئی دلہن شوہر کی آمد سے پہلے آنے والے نامانوس لمحوں کے تصور سے خوف میں مبتلا ہو۔ اس نامراد نے کہیں انجوائے نہیں کیا..... ہر جگہ قافلے سے الگ خاموش تماشائی کی طرح مبہوت بنی رہی.....بینڈ باجوں کے بیچ شامل باجا.....یوں سمجھو کہ سلک کپڑے میں سوتی پیوند.....!''

عبدالمنان حسب معمول اپنے طویل بیانیہ اور جزئیات نگاری میں بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی تشبیہیں اور استعارے بھی گڑھتا جا رہا تھا۔

ہم لوگوں نے بوٹنگ کی.....اس لیے کہ اس نے دو سال پہلے اپنے بچوں کے ساتھ کشتی کا سفر بھی کیا تھا۔ ''سانپ گھر'' بھی گئے.....کیوں کہ اس کے بچوں کو سانپ دیکھنے کو بہت شوق تھا جیسا کہ اس نے بتایا خود وہ سانپوں سے بے حد ڈرتا تھا۔ اس کے بچپن کا ایک بھیانک واقعہ اس کے ذہن پر اب تک ثبت تھا۔ جب اس کا باپ سانپ کی زد میں ہلاکت کا شکار ہوا تھا۔ سارے جادو منتر رائیگاں چلے گئے تھے۔ کوئی علاج کام نہ آیا۔ جس دم پڑوس کی عورتیں اس کی ماں کے ہاتھوں کی سہاگ کی چوڑیاں توڑ رہی تھیں اسے یہ سب قدرت کا انتہائی ناگوار اور ذلیل عمل معلوم ہوا تھا۔ یہ سب یاد کر کے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ بچوں کی ضد کے آگے اس نے گود میں اٹھا اٹھا کر کریت، کوبرا، اجگر اور متعدد سانپوں کے نظارے انھیں کرائے تھے۔

''تعجب ہے میرے بچے سانپوں سے نہیں ڈرتے.....شاید ہمارے بعد کی پیڑھی سانپوں سے نہیں گھبراتی.....ہم ہی ہیں جو سانپوں سے اس قدر خوف کھاتے ہیں.....!''

اس نے بتایا کہ عمرانی ارتقا کی یہ کڑی اطمینان بخش ہے کہ مستقبل میں بچوں کے لیے سانپ مسئلہ نہیں رہیں گے۔

اسی ٹی اسٹال پر اس نے چائے بھی پی جہاں اس نے بیوی بچوں کے ساتھ ناشتہ ناشتہ کیا تھا۔ اس

کے بچوں کو گرما گرم سموسے بے حد پسند تھے۔ اور اسے خالی پیٹ میں چائے پر چائے۔ دو گلاس پانی اور ایک کپ چائے.....دن بھر یہی سلسلہ جاری رہتا۔ وہ ڈرتا بھی نہیں تھا کہ اس طرح وہ السر کو دعوت دے رہا تھا۔

غرض اس روز اس نے بوٹینکل گارڈن میرے ساتھ گھومتے ہوئے اپنے گھر والوں کو جی بھر کر یاد کیا۔

دھوپ کی شدت کم ہونے لگی تھی۔ دن اب زوال کی طرف مائل تھا۔ فضا پر مردنی سی چھانے لگی۔ چڑیا گھر کی سیر کے لئے آئے ہوئے لوگوں پر پژمردگی طاری ہونے لگی تھی۔ اسے واپسی کا خیال آیا ناگاہ اس نے محسوس کیا کہ وقت سے پہلے ہی لوگ واپس جانے لگے تھے۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچے فضا کی خموشی سناٹے میں تبدیل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خطرے کی بو سونگھتے ہوئے اس نے سرگوشیوں میں کہا۔

''معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے.....زندگی کے حقیقی چڑیا گھر میں سانپ گھر کے شیشے شاید ٹوٹ گئے ہیں.....فوراً واپس چلیں.....!''

شاہراہ پر گاڑی موٹر کا نام ونشان نہیں تھا.....اکا دکا ٹمپو ہوا سے باتیں کرتے ہوئے بنا کسی مسافر کی پروا کیے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔

داڑھی والے گیٹ مین نے ہم دونوں کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اشارے سے بلا کر دھیمی آواز میں کہا۔

''شہر میں کشیدگی ہے.....ابھی ابھی خبر ملی ہے.....اپنے علاقے میں ذرا سنبھل کر جایئے گا!''

دیکھتے دیکھتے چاروں طرف عجیب خوف وہراس چھا گیا تھا۔ چڑیا گھر سے نکلے ہوئے سارے لوگ بلاتفریق مذہب وملّت اپنی اپنی جانوں کے تحفظ کو لے کر گہرے خوف میں مبتلا تھے۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ سب ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ چکے تھے۔

مجھے لگا کہ یہ انسان چڑیا گھر کے اندر سلاخوں میں بند جانوروں سے بھی زیادہ بے بس، محصور اور محتاج ہیں۔ دیکھتے دیکھتے فضائی چادر کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ خوف ودہشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں کے چہروں سے سیر وتفریح کی ساری مسرت غائب ہو چکی تھی۔ ہر چہرہ پیلیا کے مریض کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔

عبدالمنان کا پرانی یادوں کو تازہ کرنے کا جنون ختم ہو گیا۔ بیوی بچے سب کے سب ذہن سے محو ہو گئے۔ اس وقت یہی اندیشہ غالب تھا کہ اپنی رہائش گاہ تک کسی طرح محفوظ وسلامت پہنچ جائیں۔ اس نے مجھے پیدل چلنے کا مشورہ دیا۔ ہم دونوں اتفاق سے ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ہم لوگ کسی طرح اپنے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ زہر چاروں طرف پھیل چکا ہے۔ ہلکی سی چنگاری بھی سب کچھ جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔

عبدالمنان کو اب بیوی بچوں کی سلامتی کی فکر ستانے لگی۔ میں اس حق میں نہیں تھا کہ اس ماحول میں وہ اتنا طویل سفر اختیار کرے۔

لیکن اور چارہ کیا تھا۔ چار وناچار اسے جانا ہی تھا۔ میں اسے سی آف کرنے اسٹیشن گیا۔

عبدالمنان سے وہ میری آخری ملاقات تھی۔

اس کے بعد سے اسے دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس گئیں۔ ٹرین کھلنے سے پہلے تک وہ بیوی بچوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا تھا۔ بڑی حفاظت سے اس نے ان کے لیے خریدے ہوئے تحفے اپنے سرہانے رکھے۔ رخصت ہوتے وقت اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔

روانہ ہوتی ہوئی ٹرین کی کھڑکی سے ہلتے ہوئے اس کے کانپتے ہاتھ اور خوف سے اس کا زرد چہرہ اب تک یاد ہے۔

اس کے بعد وہ نہیں لوٹا۔

وہ جس علاقے میں گیا تھا وہاں انسانی اجسام پھول گوبھیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کا سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ ضرور زندہ بچ گیا ہوگا۔

اس کے بعد سے میں بیمار رہنے لگا۔ شاید مجھے علاج کی ضرورت ہے۔ ایک مخصوص خواب مجھے پریشان کرنے لگا۔

چاروں طرف اونچے اونچے اسکائی اسکریپر آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

ہر طرف سے سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ سے اسے کچلنے کے لیے آ رہی تھی۔

چشم زدن میں ان کے درمیان سے ایک بچہ نمودار ہوتا ہے۔

دیکھتے دیکھتے وہ جوان ہوتا ہے اور مجھے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتا ہے۔

''ہیلو انکل.....وی مسٹ بی ہیپی ان انڈیا.....''

اس کے ہاتھوں میں ہتھیار ہے۔

دور کہیں سے دھماکوں کے درمیان اونچی اونچی بلڈگوں کے زمین دوز ہونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

میں اس کے چہرے پر غور کرتا ہوں۔ اس کے چہرے کے نقوش میں عبدالمنان کی نمایاں جھلک ہے۔

وہی سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ۔

میں امن پسند روشن خیال شہری ہوں۔ اس بچے سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔

دھیرے دھیرے سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ کی گونج معدوم ہو رہی تھی۔ پر اسرار اور بھیانک سناٹے اپنے بدہیئت پاؤں پسارنے لگے۔

فضا میں چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔

ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔

نواں باب

روشن خیال ہندوؤں کی انسان دوستی

طوفان تھما تو اپنے شناساؤں اور قرابت داروں کی خیر و عافیت جاننے کی فکر لاحق ہوئی۔

جانے ان پر کیا گزری.....؟

کیسے اس طوفان کا سامنا کیا ہوگا.....؟

ایسے سیدھے سادے لوگ خون خرابے کے سیلاب میں کس طرح خود کو قائم رکھ پائے ہوں گے؟

وہ سوچتا رہا..... دیر تک الجھتا رہا۔

جانے ان پر کیا افتاد آن پڑی۔

کتنے لوگ جاں بحق ہو گئے۔

کتنے گھر بار.....

ارشد کی والدہ مرحومہ کے ایصال ثواب کی مجلس چہلم میں شامل ہونے کی ایک غایت یہ بھی تھی کہ لوگوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل ہو جائیں۔

اس کے بچپن کے دوست ارشد کی والدہ اسے بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ مجلس چہلم کا سیاہ حاشیے والا دعوت نامہ موصول ہوا تو اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود اس اجتماع میں شرکت کا موقع اس نے کسی طرح نکال ہی لیا۔

وہیں مشہور فری تھنکر ایم ٹی خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو ذہن میں پچھلے طوفان کی بابت کئی سوال کوند گئے۔

موٹا بسکٹ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے اس نے کہا۔

''امن پسند لوگ اپنے دروازے کیوں بند کر لیتے ہیں؟''

''طوفان سے ٹکرانے کی جسارت کیوں نہیں کرتے؟''

وہ تڑپتے ہوئے ہلکان ہوتا رہا۔

''تدارک کیا ہے؟ خدا کے بندے کب تک آپس میں.....!''

خاں صاحب نے بتایا۔ لیکن بولنے سے پہلے حسب عادت انہوں نے ایک مشہور شعر پڑھا۔

کچھ یادگار شہر ستمگر ہی لے چلیں　　آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

''سوال کچھ گہرے اور تشویشناک ہیں۔ آئے ہیں تو جان لیجئے کہ اس علاقے میں آج کل کامریڈ آفتاب صاحب بھی رہتے ہیں۔ جو طوفانی دنوں میں اسی بدنام زمانہ سنسے ٹیو علاقے میں رہ رہے تھے..... چلئے ان سے ملتے ہیں اور ان کی روداد سنتے ہیں..... بہت ساری باتیں سامنے آئیں گی.....!''

''آفتاب صاحب؟''

اس نے ذہن پر زور ڈالا۔

ان کے بارے میں تو اس کا خیال تھا کہ حالات سے برگشتہ اور بددل ہو کر وہ اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ رہے ہوں گے۔

شہر کی مصروف زندگی میں سماجی رسوم کی ادائیگی کا موقع کہاں نکل پاتا ہے۔ اس دور میں آدمی کو اپنے آپ سے فرصت نہیں۔ دفتر اور گھر کے پاٹ کے درمیان پستے ہوئے زندگی کے دیگر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا موقع کسے ملتا ہے.....؟ وہ تو کہئے کہ مجلس چہلم کے لیے جب وقت نکال ہی لیا تھا تو آفتاب صاحب سے ملنے کی تجویز پر وہ ان کے ہاں جانے کے لیے آسانی سے تیار ہو گیا۔

بڑی دل آویز شخصیت تھی آفتاب صاحب کی جس محفل میں رہتے اپنے نام کی مناسبت سے اجالا کیے رہتے۔ زندگی کے تاریک سے تاریک اور مایوس کن لمحوں میں بھی انہوں نے حالات کے آگے گھٹنا ٹیکنا نہ سیکھا تھا۔

''لڑتے رہو یہاں تک کہ تم جیتو گے..... اور ہار جیت اضافی چیزیں ہیں..... اصلی چیز ہے کہ تم نے مزحمتوں سے لڑائی کی..... یہ لڑائی اپنے آپ میں ایک جیت کی حیثیت رکھتی ہے.....'' یہ تھا آفتاب صاحب کی زندگی کا بنیادی اصول۔

فسطائی قوتوں کے آگے جانبازی کے ساتھ ڈٹے رہنے والے آفتاب صاحب نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ ان کی صحبت میں فکری طور پر ہمیشہ مالا مال ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ کانٹا کانٹا سی کیفیتیں پھول بردار ڈالیوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ ہر طرف خوش نما زعفرانی اور عنابی فصلیں لہلہانے لگتیں۔

ان دونوں نے ارشد سے اجازت چاہی۔ قرآن خوان، قل و فاتحہ کے بعد میلاد النبیؐ بھی ہو چکی تھی۔ مولانا نے اختتامی تقریر میں دین دنیا کے مختلف مسائل پر بولتے ہوئے فرمایا تھا۔

''شہیدوں کی جانبازی اور دنیاداری ایسی ہے کہ سیدھے جنت میں پہنچنے کے بعد بھی اگر ان سے دوبارہ دنیا میں آنے کی بابت پوچھا جائے تو وہ دنیا میں آ کر صداقت کی بقا کے لیے پھر شہید ہونے کو لبیک کہیں..... اور تم ہو کہ طوفان آتا ہے تو گھر کے کونوں کھدروں کی تلاش کرتے ہو..... باتھ روم میں اور چوکی کے نیچے پناہ گزیں ہو جاتے ہو..... تُف ہے تجھ پر..... تُف ہے تیری اوقات پر..... تو بھول گیا کہ تیرے

اجداد نے ستّر کی تعداد میں ہزاروں کا مقابلہ کیا اور فتح و کامرانی حاصل کی.....!''

جولانیوں پر آئی ہوئی مولانا کی پر جوش اور حقیقت حال سے لبریز تقریر سن کر انہیں امن و آشتی کے پیامبر آفتاب صاحب کی شدت سے یاد آنا لازمی تھا۔

''اسی گنجان آبادی والے علاقے میں انہوں نے شفٹ کیا ہے!''

خاں صاحب نے اسے جانکاری دی۔

''ان کا طوفان زدہ علاقہ چھوڑنا کیا ان کی مایوسی اور حالات کے آگے سر نوانے کی علامت نہیں؟''

اس نے خاں صاحب سے پوچھا۔

''یہی تو پوچھنا ہے ان سے۔ اتنا روشن خیال آدمی باد مخالف کے ریلے میں کیسے بہہ گیا.....اور کیا سچ مچ وہ بھی اب ہار مان چکے ہیں..... یہ سمجھنے لگے ہیں کہ حالات نہیں سدھریں گے.....؟''

کچھ دیر توقف کے بعد انہوں نے پھر کہا۔

''ساری باتیں پوچھیں گے ان سے.....آج موقع مل گیا ہے تو اپنی تشفی کر لیجئے..... یوں بھی فرصت کے اوقات میں شناساؤں کی خیر سلاّ جاننے کے لیے وقت نکالنا چاہئے.....سماج میں رہنے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں..... جینے کو تو کتّے بھی جیتے ہیں.....اور معاف کیجئے گا جانوروں کی بھی ایک سماجی زندگی ہوتی ہے.....ہم تو ٹھہرے منوشیہ جو اپنی بنیادی سرشت کے اعتبار سے ہی ایک سماجک پرانی ہیں.....!''

اپنی دھن میں مست خاں صاحب ایک ایک لفظ چبا چبا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر لگاتار بولتے جا رہے تھے۔

کئی لوگوں کو روک کر خاں صاحب نے آفتاب صاحب کے گھر کی بابت دریافت کیا۔ کسی نے کچھ نہ بتایا۔ افسوس ہوا کہ سماجیات اور عمرانیات کے میدان کا ایسا مایہ ناز انسان جو اپنے علاقے کے سماجی زندگی میں ایک متحرک اور نامیاتی کردار ادا کرتا رہا تھا، اس محلے میں آ کر گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔

اس کے دل کو ایک دھکا لگا۔ طوفان نے آفتاب بھائی کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ ان کی ساری شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔ انقلاب برپا کرنے اور پھول کھلانے کا سارا عزم پانی کا بلبلہ ثابت ہوا۔ آخر کار حالات کے آگے انہوں نے بھی گھٹنے ٹیک ہی دیئے۔

وہ عجیب بے بسی اور گھٹن کے احساس سے گزر رہا تھا۔ ذہن پر منوں بوجھ لدا تھا۔ ایک مدّت کے بعد نماز فجر اور قرآن خوانی کے اجتماع میں شامل ہونے کے لیے علی الصباح اٹھا تھا تو باد صبا نے جسم میں ایک عجیب سی پھرتی اور ارادوں میں تازگی بھر دی تھی۔ خیالات نے انگڑائی لی تھی اور جسم عجیب سی پھُریری سے دوچار ہوا تھا۔ بزرگوں نے غلط نہیں کہا کہ زندگی کا مزہ لینا ہو تو سورج کے اٹھنے سے پہلے اٹھو.....اس

کے جاگنے کا استقبال کرو.....سارا دن انبساط میں گزرے گا۔

لیکن ساری توانائی سوچ اور فکر و تردد میں زائل ہونے لگی۔

وہ پھر گم ہو گیا۔

آفتاب صاحب جیسا آدمی کیوں کر ٹوٹ گیا۔ کیا ان کے عزیز و اقارب کی.....ضرور وہ بھی بادِ صرصر کی زد میں جانی و مالی نقصان سے دوچار ہوئے ہوں گے.....لیکن آفتاب صاحب تو سچ مچ آفتابی خصلتوں سے پُر انسان تھے۔ زندگی میں کیسے کیسے دکھ اور کیسی کیسی مصیبتیں انہوں نے اٹھائی تھیں۔ اور تاریک سے تاریک راتوں کے بعد مثل آفتاب صبح ہونے کی بشارت دیا کرتے تھے۔

آفتاب صاحب جس علاقے میں رہتے تھے وہ دیارِ اغیار تھا۔ اچھے خاصے غنڈوں شہدوں کا علاقہ، لیکن وہاں بھی انہوں نے مایہ ناز سوشل ایکٹی وسٹ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی سرگرمیوں سے خیر و شر کے درمیان تفریق اور شر کے سامنے مزاحمت کی جدو جہد جاری رکھی تھی۔ مختلف کمیٹیوں...میٹنگ...جلوس اور مظاہروں کے ذریعہ لوگوں لوگوں کو جانوروں سے انسان میں تبدیل کرنے کے اپنی زندگی کے اصلی مشن کے سفر پر بحسن و خوبی گامزن تھے۔ راستے میں اکثر و بیشتر انہیں لہولہان ہونا پڑا۔ غنڈوں شہدوں کے چھرے اور پستول اور پولس کے ڈنڈوں کا سامنا کرنا پڑا.....لیکن آفتاب صاحب منور کرنے اور اجالا پھیلانے کی اپنی خصلت سے باز نہ آئے۔

ان کے درمیان آفتاب صاحب انتہائی آئیڈیل انسان تھے۔ مرد کامل شاید ایسے ہی لوگوں کو کہتے ہیں۔ گاڑھے گاڑھے سیاہ بالوں کا انہوں نے مقابلہ کیا اور زمین و آسمان روشن کرنا نہ چھوڑا۔

باپ نے اپنے بچوں کو کہا۔

''دیکھو بیٹا آسمان میں سورج اور اس سیاہ بادل کے درمیان زوردار اٹھا پٹک چل رہی ہے..... بتاؤ جیت کس کی ہوگی.....؟''

بچہ چکرایا.....کیا جواب دے.....ہوا ز پاور فل.....کلاؤڈ اور سن.....؟

بچہ آسمان کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر باپ کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس سوال کا معقول جواب اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔

باپ نے بچے کے گال پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''جیت سورج کی ہوگی بیٹے.....صبح ہوگی اور تمہارے اسکول اور میرے دفتر کا وقت ہو جائے گا۔''

طبیعت میں تکان ہو اور آرام کرنے کی خواہش ہو تو جی چاہتا ہے جیت سیاہ بادل کی ہو.....سورج

نہ نکلے.....دن نہ چڑھے.....اسکول اور دفتر جانے سے نجات مل جائے.....کیسی کیسی خواہشیں ہوتی ہیں۔

''کہاں کھو گئے؟''

خاں صاحب نے پوچھا۔

''آفتاب صاحب کے بارے میں سوچ رہا تھا اور بہت ساری باتیں ذہن میں سر ابھار رہی تھیں .....میں تو بہت مایوس ہو گیا ہوں.....!''

اس نے دھیرے سے کہا۔

''مایوسی کفر ہے.....اس زہر کو بھولے سے بھی ہاتھ نہ لگایئے۔ساری زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ ہر حال میں ایکزرٹ کرنا ہے..... بھاگنے سے کام نہیں چلے گا.....اِدھر اُدھر جانے سے بھی بات نہیں بنے گی .....کسی بھی قیمت پر یہیں رہنا ہے اور مسئلہ کا حل نکالنا ہے.....!''

خاں صاحب ریڈیکل آدمی ہیں.....لوہے کے چنے چبانے کی تلقین کرنا نہیں بھولتے۔

''لیکن وہ خاں صاحب.....ایسے مشہور آدمی کی گمنامی کیا مایوس نہیں کرتی.....؟''

اس نے بڑی بے چارگی کے عالم میں آفتاب صاحب کے متعلق سوال کیا۔

''خواہ مخواہ اندیشے میں مبتلا رہنا اچھا نہیں.....فکر صحت کے لیے بے حد مضر ہے۔ان سے واہمے جنم لیتے ہیں اور واہموں میں ذہن کی نامیاتی صلاحیتوں کا بڑا زیاں ہوتا ہے۔چلئے ان ہی سے پوچھتے ہیں.....ممکن ہے آفتاب صاحب نے جان بوجھ کر اس محلّے میں خاموشی کی زندگی اختیار کر رکھی ہو.....گوشہ نشینی اپنانے والوں سے عموماً لوگ ناواقف ہوتے ہیں علاوہ ازیں اس محلّے میں ابھی نئے نئے آئے ہیں.....فی الوقت جان پہچان اور شناسائی کے مرحلے میں ہوں گے۔میں نہیں مانتا کہ آفتاب صاحب تھک ہار کر بیٹھنے والوں میں ہیں!''

خاں صاحب نے بتایا کہ اس علاقے میں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ ان سے مل چکے ہیں۔ گلی ٹھیک سے یاد نہیں آ رہی ہے۔لیکن اسی طرح کی گلی تھی۔وہاں پر کئی گلیاں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ملتے جلتے مکانات، ملتی جلتی نالیاں، ایک سے کوڑے کے ڈھیر.....اور ملتے جلتے امک ڈھمک چہروں کا ہجوم..... تاش کے پتوں میں الجھے ہوئے.....گالی گلوچ میں مصروف.....نل پر پانی کے لیے لائن لگی ہوئی ابھرے ہوئے گول کولہوں والی عورتوں کی کھسر پھسر اور بدکلامیاں۔لوانڈین کی آوازیں.....کسی کسی گھر کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی سسکاریوں کی آہٹیں.....کہیں کہیں نشہ آور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے زرد چہرے اور سرخ آنکھوں والے نوجوان لڑکوں کی پتلی پتلی ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ گلی کے موڑ کے ایک کونے پر ایک تنومند متمول زٹیل آدمی بیگ میں رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پیکٹ کو نوجوانوں میں فروخت کرتا اور پراسرار

ڈھنگ سے مسکراتا ہو..... میلے کچیلے بچے.....ناک سے بہتی ہوئی رطوبت.....گولیاں کھیلتے ہوئے..... آپس میں جھگڑتے ہوئے تیسری دنیا کے کسی قصبے کی گلیوں کے منظر نامے عموماً ایسے ہی تو ہوتے ہیں..... صرف رنگوں اور لکیروں کا تھوڑا فرق ہوتا ہے.....مجموعی اعتبار سے تصویر کی شبیہیں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔

خاں صاحب نے آخر کار ڈھونڈ نکالا۔مختلف گلیوں میں استفسار کرنے اور گھومنے کے بعد ایک گلی کے موڑ پر انہوں نے رک کر پورے تیقن سے کہا۔

''یہی گلی ہے.....اس گلی کے چوتھے یا پانچویں مکان کے دروازے پر یہ اسٹیکر چسپاں ہوگا!''

''ہٰذا من فضل ربی۔''

''آپ چلیں، ملاحظہ کر لیں!''

خاں صاحب بے حد خوش تھے جیسے کوئی بڑی دولت مل گئی ہو۔اس کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ پتلی پتلی لمبی ٹانگیں کپکپاہٹ سے دوچار تھیں۔وہ مایوسی کے عالم میں گھسٹتا ہوا ان کے ساتھ چلتا رہا۔جتنے لوگوں سے وہ آفتاب صاحب کے بارے میں دریافت کر چکے تھے اور جتنی دیر سے وہ دونوں انہیں ڈھونڈنے کی تگ و دو میں مصروف تھے، اسے تو اب آفتاب صاحب سے مل پانے کی امید موہوم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

''جھوٹ بولتے ہیں خاں صاحب.....رجائیت پسندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔آفتاب صاحب شاید بچے ہی نہیں۔اور اگر جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تو پہلے والے آفتاب صاحب نہیں رہے۔''

ایک شکستہ سے دروازے کے سامنے وہ رک گئے۔سچ مچ وہ طغریٰ دروازے پر چمک رہا تھا۔

''ہٰذا من فضل ربی۔''

خاں صاحب نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔

''آفتاب صاحب یہیں رہتے ہیں بابو.....؟''

''ہاں ہاں آ جایئے۔''

اجاڑ سے بنے کتاب، اخبار اور رسائل کے بکھرے ہوئے انبار والے چھوٹے سے اس تنگ ڈرائنگ کم بیڈروم میں چیزیں بے قرینہ پڑی ہوئی تھیں۔ایک طرف فارین میڈ واشنگ مشین رکھی ہوئی تھی جس کی چمک دمک دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج تک استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

''معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب بھائی نے کسی لڑکے کی شادی کر دی۔جہیز میں یہ واشنگ مشین بھی ملی

ہے ورنہ آفتاب صاحب جس طرح عسرت میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے زندگی گزار رہے تھے، وافر مقدار میں ڈٹرجنٹ پاؤڈر کا آنا بھی محال ہوتا تھا۔ شاید آفتاب صاحب کے دن اچھے چل رہے ہیں۔ لڑکا ڈاکٹر یا انجینئر ہونے کی دوڑ میں کامیاب ہوگیا۔ اب سب کچھ وارے نیارے ہیں۔ اسی لیے تو سماجی اور معاشرتی سرگرمیوں سے باز آ کر انہوں نے کمبل اوڑھ کر گھی پینے کا روایتی وطیرہ اختیار کرلیا ہے!''

اس نے دھیمی آواز میں آفتاب صاحب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اتنے پر بھی دل کی بھڑاس نہیں نکلی۔ اس نے مزید کہا۔

''لٹنے پٹنے کے بعد آفتاب صاحب ردعمل کا شکار تو نہیں ہوگئے؟ لوٹنے کھسوٹنے کے اسی طرز زندگی کے تو خوگر نہیں ہوگئے۔ جس کے خلاف احتجاج کرتے رہنا ان کی بنیادی پہچان تھی۔''

خاں صاحب نے اس کے ہاتھ پر دباؤ دیا۔

اندرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔

پردہ ہٹا۔ تقریباً کلیجہ پکڑے اور کھانستے ہوئے آفتاب صاحب زنان خانے کی طرف سے وارد ہوئے۔

''السلام علیکم!''

دونوں کھڑے ہوگئے۔ اس نے آفتاب صاحب کی طرف بغور دیکھا۔ آنکھوں میں وہی چمک تھی..... چہرے پر وہی زیرلب مسکراہٹ..... ہار کر بھی جیتنے کی اور جیت کر بھی ہارتے رہنے کے معصوم احساس کی مسکراہٹ۔

''معاف کیجئے بھائی..... ان دنوں طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ تنفس کی پُرانی شکایت پوری شدت کے ساتھ عود کر آئی ہے۔ اوپر چھت پر دھوپ میں لیٹا ہوا تھا..... آنے میں تھوڑی دیر ہوگئی..... معافی چاہتا ہوں!''

''آفتاب بھائی ان کو تو آپ جانتے ہی ہیں.....!''

خاں صاحب نے گلا کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔

باہر گلی سے میلے کچیلے بچوں کے گولی کھیلنے اور لڑائی جھگڑا کرنے کا شور خاں صاحب کی گفتگو میں حارج ہو رہا تھا۔ انہوں نے آواز میں تھوڑا اور زور پیدا کیا پچھلے واقعے اور آپ کی پرانی رہائش گاہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے ان کے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوگئے ہیں..... بھائی صاحب بے چینی میں مبتلا ہیں..... مجھ سے پوچھ رہے تھے..... میں نے کہا خود آفتاب بھائی سے دریافت کر لیجئے.....!''

آفتاب صاحب اس کی طرف مخاطب ہوئے۔ ایک پھیکی مسکراہٹ ان کے لبوں پر رینگ گئی۔ آنکھوں سے نقاہت کی کیفیت عیاں ہو رہی تھی۔ پوری طاقت لگا کر خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

اس نے خود کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ آفتاب صاحب جیسے اسکالر سے سوال کرنا بھی آسان نہ تھا۔

اس نے ذہن میں الفاظ جمانے شروع کئے۔

''آفتاب بھائی.....! پچھلی بار جو طوفان آیا اس نے اچھے اچھوں کے پیرا کھاڑ دیئے..... بستیاں اجاڑ دیں یہاں تک کہ آپ جیسے جانباز ثابت قدم انسان کو بھی وہ دیار چھوڑنا پڑا۔ اب بھی کیا آپ اپنے پرانے اسٹینڈ پر قائم ہیں کہ ہمیں یہیں رہنا ہے اور مل جل کر رہنا ہے اور حالات ایک دن بدلیں گے؟''

''یقیناً..... میں آج بھی پوری شدت اور تیقن کے ساتھ اسی پرانے اسٹینڈ پر قائم ہوں۔''

آفتاب بھائی نے کھانستے ہوئے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ تھوڑی دیر رکے..... اندر کی طرف منہ کر کے کسی لڑکے کو آواز دی جس کا مطلب تھا چائے لے آؤ اور گویا ہوئے۔

''ہاں صاحب میں آج بھی ہنڈریڈ پرسنٹ اپنے اس پرانے موقف پر قائم ہوں..... ہمیں یہیں رہنا ہے اور مل جل کر رہنا ہے..... ساجھے کی سنسکرتی کی ڈور تھامے رکھنا ہے اور ہم جائیں گے بھی کہاں..... بنگلہ دیش بننے کے بعد جینا مرنا سب کچھ یہیں ہے..... پٹروڈالر ہمارے مسئلہ کا مستقل حل نہیں..... مل جل کر رہنے اور شیر و شکر بن کر رہنے میں ہی سب کی عافیت ہے..... خود ان کی بھی نجات ہمارے وجود کو مان کر چلنے میں ہی ہے..... میں تو بھائی مایوس نہیں ہوں..... اپنی پُرانی باتوں پر قائم ہوں۔''

آفتاب بھائی کے اندر پرانے حوصلے اور امنگ کو دیکھ کر اسے حیرت اور خوشی ہوئی۔ یک گونہ اطمینان ہوا کہ ابھی مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں لیکن ایک سوال اسے کریدے جا رہا تھا۔

''جب آپ مانتے ہیں آفتاب بھائی یہ سب..... تو آپ کو افراتفری میں.....''

اس کا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی آفتاب صاحب نے ٹوک دیا۔

''دیکھئے.....''

آفتاب صاحب نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''وہ ایک وقتی بات تھی..... ایک سیلاب..... ایک طوفان..... تموج اور تلاطم..... یہ بڑے سے بڑا طوفان تنکوں کو اڑا لے جا سکتا ہے..... لیکن ان کے وجود کو ختم نہیں کر سکتا..... بڑی سے بڑی سیلابی لہریں تنکوں کو غرقاب نہیں کر سکتیں..... جہاں مٹھی بھر لوگوں نے علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا وہیں انہی میں سے بہتیرے لوگ ایسے تھے جو مفسدوں کی تمام سرگرمیوں کی مجھے جانکاری دے رہے تھے۔ انہی میں سے بہت سارے لوگوں نے ایک دن آ کر اطلاع دی کہ آج شر پسندوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔'' آفتاب صاحب نے تھوڑی دیر کے لیے توقف کیا۔ اندرونی دروازے کی طرف مضطرب آنکھوں سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے قدرے دھیمے لہجے میں بولنے لگے۔

''سچ مچ یہ تو صحیح ہے بھائی کہ کچھ ایسے زنگ آلود ذہن کے لوگ ابھی بھی ہیں جو اس طرح کا موقع آتے ہی اپنا لہجہ بدل لیتے ہیں.....لگتا ہی نہیں کہ وہی آدمی ہے.....وہی پڑوسی ہے وہی بھائی ہے.....آدمی کے اندر سے بھیڑیا جھانکنے لگتا ہے.....لیکن انہی میں سے ایسے ثابت قدم شیر آسا فرشتہ صفت لوگ بھی ہیں جو ساجھے کی سنسکرتی کی دولت ان لمحوں میں بھی سنبھال کر رکھتے ہیں.....اکثریت اس ملک میں اچھے لوگوں کی ہے بھائی..... بھائی چارگی، رواداری اور اخوت کی جڑیں اس ملک میں بہت گہری ہیں.....جنہیں یہ سیاسی اور فسطائی قوتیں ساری زندگی کاٹ نہیں سکتیں.....!!'' آفتاب صاحب بول رہے تھے۔اسی درمیان اندر سے ایک لڑکا چائے لے کر آ گیا۔اس نے کہا۔

''آفتاب بھائی.....! آپ جیسے آدمی کا یہاں آ کر پناہ لینا اور اپنی ایکٹی ویٹی کا علاقہ چھوڑنا کیا حیرت اور دکھ کی بات نہیں ہے؟''

''حیرت کی بات ضرور ہے لیکن ابھی ہم نے کام ہی کتنا کیا ہے۔ہم جیسے لوگوں کو اپنی دال روٹی اور مکھن ملائی سے فرصت ہی کہاں جو روشن روایت کے چراغ میں تیل مہیا کرتے رہنے کا موقع نکالتے رہیں۔خود تیل بن کر جلنے کی بات تو دور ہے۔شہید ذکی انور جیسے لوگ کتنے ہیں.....وہ تو کہئے کہ اس مٹی کے خمیر میں دوسروں کو قبول کرنے اور برداشت کرنے کا قدرتی وصف ہے کہ فرقہ پرستوں کی دال نہیں گلتی..... وقتی طوفان تو وہ پیدا کر دیتے ہیں.....لیکن یاد رکھئے، مستقل امن انسان کی فطری اور جبلی ضرورت ہے۔اس کو وہ کیسے ختم کر سکتے ہیں..... پورے اطمینان سے رہئے.....سر اٹھا کر چلئے.....گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' اپنی بات ختم کرنے کے بعد آفتاب صاحب چائے کی چسکی لینے لگے۔

''آفتاب بھائی، آپ نے وہ فیصلہ نہیں سنایا کہ کیوں کر آپ کو ترک علاقہ کرنا پڑا؟''

اس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

''دیکھئے بھائی مٹھی بھر لوگ کوشش میں تھے ہی کہ خیر سگالی والے اس شہر میں جہاں کبھی اس طرح کا واقعہ رونما نہیں ہوا زہر پھیلایا جائے.....اس کا اکاروبار کیا جائے.....وہ زہر پھیلاتے رہے لیکن امرت بانٹنے والے بھی تھے جنہوں نے اس کے خطرناک سازشی ارادوں کی خبر مجھے دے دی۔میں نے گھر میں تالا لگایا اور بال بچوں کو لے کر اس علاقے میں آ گیا۔گھر کی کنجی بھی میں انہیں رپورٹ کرنے والوں میں سے ایک ہمدرد پڑوسی کے ہاتھ میں رکھ دی۔میری زندگی کی ساری پونجی کے تم ہی امانت دار ہو۔مال تال تو تھا ہی نہیں۔میرے پاس کچھ بکسے.....چند کتابیں.....اگڑم بگڑم چیزیں.....وغیرہ وغیرہ۔میرے پڑوسی نے کسی قسم کی انہونی اور لوٹ پاٹ کے اندیشے سے تالا کھول کر سارا سامان اپنے ہاں محفوظ کر لیا۔طوفان تھما تو ایک ایک چیز میرے حوالے کی۔''

''آفتاب بھائی.....!'' اس نے ٹوکا۔

''آپ نے کہا کہ بُرے لوگوں کے ساتھ اچھے لوگ بھی ہیں جو مدد کرتے ہیں۔سچ ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ سارے لوگ نہیں مر جاتے اور زندگی ہر حال میں اپنے آپ کو نارمل بنا لینے کی طبعی قوت سے مملو ہے لیکن یہ اچھے لوگ برے لوگوں کے سامنے ڈٹتے کیوں نہیں۔فرار کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے سامنا کیوں نہیں کرتے؟''

''یہی تو بات ہے جناب.....! بس یہی تو کمی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ برے لوگ مٹھی بھر ہیں.....لیکن زیادہ تر اچھے لوگ مل کر مزاحمت کریں تو کہیں کسی طوفان کے ٹکنے کی امید ہی نہیں۔بُرے لوگوں کے پہلے کے مقابلے میں زیادہ منظّم ہونے کے تناظر کا خیال رکھتے ہوئے میں یہ بھی کہوں گا کہ ہمیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی جانبازی بھی بنائے رکھنی چاہئے لیکن پھول بانٹنے کی ہمارے سنت صوفیوں کی روایت بھی اپنی جگہ پوری تابندگی سے قائم رہے۔'' تھوڑی دیر کے لئے آفتاب صاحب رکے اور اندرونی دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

دستو و ورزش بازو کی مشقیں جاری رہیں.....نرم و نازک جذبات سے ہم رشتگی بھی قائم رہے۔عسکری ہنرمندیوں کی صیقل گری جاری رہے لیکن پہلو بہ پہلو صوفی سنتوں کی روایت کی پاسداری کی نرم روش بھی قائم رہے۔جو صوفی اور سنتوں کے واقعات یاد ہیں نہ آپ سب کو.....طوفان اور سیلاب آتے بھی تھے تو ان کے پاؤں چوم کر لوٹ جاتے تھے.....ہمارے قدموں میں ایسی استقامت بھی تو ہو.....''

وہ دونوں آفتاب صاحب کی باتیں غور سے سن رہے تھے.....کھانسی اور دمّے کے زور کے باوجود اپنے کلیجے کی پوری طاقت سے بول رہے تھے۔ان کے ارادوں میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا تھا۔

''تو آپ کیا پھر اس علاقے میں جائیں گے؟''

اس نے سوال کیا

''یقیناً.....میں جا تا رہتا ہوں.....اور پھر اسی علاقے میں مکان ڈھونڈ رہا ہوں۔وہ مکان تو کسی اور نے کرایے پر لے لیا۔ہم الگ تھلگ ہو جائیں اور ایئر ٹائٹ کمپارٹمنٹ میں رہیں تو ان کے زہریلے ارادے تو پورے ہی ہو جائیں.....یہی تو وہ چاہتے ہیں.....ہمیں پوری جانبازی کے ساتھ بیک وقت پھول اور کانٹوں کے ساتھ ان ہی کے ساتھ رہنا ہے؟''

''واہ آفتاب بھائی.....! سچ ہے زندگی آپ ہی جیسے مرد مجاہد کے دم سے قائم ہے.....زندگی پن آپ ہی جیسوں سے عبارت ہے۔''

وہ آبدیدہ سا ہو گیا۔

شہید وہ ہے جو صداقت کے قیام کے لیے جنت چھوڑ کر بار بار دنیا میں آنے اور یہاں کی

صعوبتیں جھیلنے کے لیے ہنس ہنس کر تیار ہو جائے۔''

اس کا دل چاہا کہ آفتاب صاحب کی دست بوسی کرے لیکن وہ تو اس طرح کے فرسودہ رسم و رواج کے قائل نہ تھے۔

اس کی آنکھیں ان پر عقیدت کے پھول برسا رہی تھیں۔ اور وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے لڑتے جھگڑتے گلی کے میلے کچیلے بچوں کو بیٹھے بیٹھے ڈانٹ رہے تھے۔

''کیوں صاحب! اطمینان ہوا آپ کو..... کچھ تشفی ہوئی.....؟''

خاں صاحب نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تشفی تو ہوئی خاں صاحب لیکن سوالات پھر بھی رہ جاتے ہیں۔ شاید زندگی کا یہی تقاضا ہے۔''

وہ بعض دیگر اہم سوالوں کو لے کر بے چینی میں بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

مسئلے کے کئی گوشے نگاہوں سے اوجھل تھے۔

اس نے بکھرے ہوئے اجزا کو سمیٹتے ہوئے ان اطراف میں بھی آفتاب صاحب کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔

دیکھئے آفتاب بھائی.....!''

بدلے ہوئے منظر نامے میں نئے حقائق پر غور کیا ہے آپ نے..... نئے ہتھکنڈوں..... منصوبہ بند طریقوں..... منظّم پلان..... نت نئے طریقوں سے کام لینے لگے ہیں..... سب طے شدہ پروگرام کے تحت ہوتا ہے..... انتظامیہ، پولس..... یہاں تک کہ کبھی کبھی فوج بھی..... یعنی کہ پورا کا پورا جینوسائٹ اور پوگروم''۔

بولتے بولتے تھوڑی دیر کے لیے اس نے خاموشی اختیار کی۔

کمرے میں سنّاٹا چھایا تھا۔

باہر گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کا شور کچھ کم ہو گیا تھا۔

خاں اور آفتاب صاحب اس کا چہرہ بغور دیکھ رہے تھے۔

اس نے بات پوری کی۔

''اینٹی رائٹ فورس پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے..... اور کہاں کہاں پہنچے گی..... اچھے پڑوسی ہونے کا دم بھریں گے اور دوسروں کو اشارے کر دیں گے..... ان امور کے متعلق کیا فرمائیں گے آپ.....؟''

آفتاب صاحب نے پورے تیقّن سے کہا۔

''میں ابھی بھی یہی کہوں گا کہ میجرٹی آف دی پیوپل آر سیکولر..... اکثریت کی اکثریت امن پسند

اور روادار ہے..... مایوس ہونے کی ضرورت نہیں..... ہمیں ہمّت نہیں ہارنی چاہئے۔''

''تمام باتیں ہو گئیں لیکن ایک سوال تو اپنی جگہ رہ ہی جاتا ہے۔ آپ کے اس علاقے سے بھاگنے کی نوبت کیوں آئی؟ ہمنواؤں کے ساتھ حالات کا سامنا کرتے ہوئے آپ فائٹ کیوں نہیں دے سکے؟''

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

بالوں میں انگلیاں پھیرتے اور سر کھجاتے ہوئے آفتاب صاحب کو چپّی لگ گئی۔

''بولئے آفتاب صاحب..... چپ مت رہئے۔''

خاں صاحب نے اکسایا۔

دونوں ہمہ تن گوش تھے۔

گہرے کنوئیں سے آفتاب بھائی نے کہا۔

''جو بھی ہو بھائی.....''

آفتاب صاحب نے توقف کیا اور کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

''بد سے بدتر حالات میں بھی میں اپنی کوششوں سے باز نہیں آ سکتا..... بنجر سے بنجر زمین میں بھی پھول کھلانے کی کوششوں کو نہیں چھوڑ سکتا..... آگے اللہ کی مرضی.....''

آفتاب صاحب کا چہرہ سورج کی طرح روشن تھا۔

انہیں دوسرے کئی سوالات کریدرہے تھے۔

دفعتاً اندر سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

ان کی انگلیوں سے چائے کی پیالیاں گرتے گرتے بچیں۔

کوئی زوردار لہجے میں بول رہا تھا۔

''بند کرو یہ بکواس..... ذلیلو..... تفتیش کرنے نکلے ہیں..... زخم پر نمک چھڑکنے..... حرامزادو..... دانشورو..... کیڑو..... کتّو..... بھیڑیو.....!''

کراہتی چیخ لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ استعاروں کے حجم میں اضافہ ہو رہا تھا۔

دفعتاً سرپٹ گھوڑے چھلانگیں مارتے ہوئے منظر نامے میں آگے بڑھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو لوگ مل کر پکڑے ہوئے ہیں اور وہ گرفت سے رہائی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

آفتاب صاحب کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

''معاف کیجئے ایک قریبی رشتہ دار ہیں..... متاثرہ علاقے سے بڑی مشکلوں سے انہیں بچا کر لایا

گیا ہے.....ان کے کئی لوگ.....میں ابھی انہیں سنبھال کر آیا۔

آفتاب صاحب ایک ہاتھ سے اپنا سینہ پکڑے ہوئے بھاری بھاری قدموں سے تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے اندر کی جانب روانہ ہوئے۔

سینے پر رکھے ہوئے ان کے دبلے پتلے ہاتھ کی انگلیوں کی رگیں اتنی تنی ہوئی تھیں جیسے ذرا بھی ڈھیلی اور غیر محتاط ہوئیں تو سینے سے دل باہر آ کر گرے گا۔

''چلئے صاحب.....! دن ڈھل چکا ہے.....شام ہو رہی ہے.....اس زمانے میں رات ہونے سے قبل گھر پہنچ جانا اچھا ہے۔''

خاں صاحب نے کہا اور لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے باہر نکلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈوبتی ہوئی شام کے ساتھ دور ابھرتی ہوئی سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ تیزی سے نزدیک آتی جا رہی تھی۔گھوڑے کی ٹاپوں میں اس کے ہنہنانے کی ہیبت ناک آوازیں شامل تھیں۔

ان کے چہروں سے خوف و دہشت اور سراسیمگی جھلکنے لگی تھی۔

دسواں باب

اپنے گھر کی تلاش

ٹرین کسی ویران علاقے سے گذر رہی تھی۔کمپارٹمنٹ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔اس کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔

کسی نے اس کے اندر اس کے پھیپھڑوں کو بے دردی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔

''بدبخت تیرا کوئی اسٹیشن ہے.....؟''

دباؤ بڑھتا گیا۔اس کی سانس اکھڑنے لگی۔آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں نے اسے حیرت و استعجاب سے دیکھا اور اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے کہ اسے قلب کا دورہ پڑنے والا ہے۔اس نے دھیرے دھیرے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے سوچا کہ سچ مچ اس کا اور اس کے جیسے کروڑوں لوگوں کا اس بھری پری دنیا میں کہیں کوئی اسٹیشن نہیں۔

پورے سفر میں دو افراد کے متعلق وہ شدت سے سوچتا رہا تھا۔ایک وہ جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا.....اس کا باپ.....اور دوسرا وہ شخص جس سے کسی طرح کا کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب سا نا معلوم تعلق تھا۔جس کے ادکھلے کھڑے ہونٹ کا ذائقہ اب بھی اس کی شریانوں میں سنسنی کی لہر دوڑا دیتا تھا اور جس کے سانولے سلونے وجود کے تصور کی گرمی بھی خود اس کے وجود کو موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔جس

کے ابھرے ہوئے گول تناور کولہے اس کے راتوں کی نیند اڑا دیتے تھے اور اس کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگتی تھیں۔یہ لوگ ملاقات ہونے پر کس طرح چونک جائیں گے۔پہلے تو حواس باختہ ہو جائیں گے پھر جب ان کے اوسان بحال ہوں گے تو سوچیں گے کہ آن واحد میں انھیں فرط و انبساط کی کیسی بیش بہا دولت مل گئی۔

انہیں سرپرائز دینے کے خیال سے بغیر کسی اطلاع اور خبر کے وہ اس سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو وہ اتر گیا۔باہر گھُپ اندھیرا تھا۔ہر شے پر ایک عجیب پُر اسرار سی گم شدگی کی کیفیت طاری تھی۔اس نے ایک راہ گیر سے بغیر کسی ارادے کے پوچھ دیا۔

''کیوں بھئی.....لائٹ کب سے آف ہے؟''

''کیا کہا جائے بابو جی.....جب سے بڑے شہر میں بجلی کی سپلائی بڑھ گئی ہے، یہاں کا کوٹا کاٹ دیا گیا ہے۔بہت دیر کے لئے روشنی غائب رہتی ہے.....اور آس پاس جو گاؤں ہیں، ان کا تو حال پوچھو ہی مت.....بجلی کے کھمبے ہوتے ہوئے بھی سب ایک کرن کو ترستے ہیں.....کہیں کوئی پیداواری ہی نہیں ہوئی.....!''

بڑے شہروں کو سڑی ہوئی گالیاں دیتے ہوئے اس نے قدم بڑھائے۔رات زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن دبیز تاریکی کی وجہ سے ڈھلی ہوئی رات کا گمان ہوتا تھا۔پلیٹ فارم کے باہر رکشے قطار میں کھڑے تھے۔سب کے سب اپنی طرف توجہ کھینچنے کے لئے طرح طرح سے اپنے اپنے رکشوں کی گھنٹیاں بجا رہے تھے۔اور منہ سے مختلف سروں کی آوازیں نکال رہے تھے۔اچانک پورا ماحول ان کے شور سے متحرک ہو گیا تھا۔اسے لگا کہ کوئی پرندہ عرصۂ دراز کے بعد صعوبتوں بھرے سفر سے نجات حاصل کر کے اپنے گھونسلے کے قریب پہنچ گیا ہے۔وہ خود کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور تکان کی گرد کو اپنے وجود سے جھاڑ دیا۔قلی نے ایک رکشے پر اس کا سامان رکھا، رکشے والے نے اندھیرے میں اسے گھور کر دیکھا۔اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔زیادہ دیر وہ ان کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور سیٹ میں دھنس گیا۔

''کہاں چلنا ہے بابو جی؟''

''بس چلنا ہے۔باہر کا آدمی نہیں ہوں.....اسی مٹّی کا یہ جسم ہے.....چلو.....میں تمہیں راستہ بتاتا چلوں گا.....بس فی الحال سیدھ میں آگے بڑھتے چلو.....مگر جلدی جلدی نہیں.....دھیرے دھیرے ایک مدت کے بعد یہ سب دیکھنا مقدر ہوا ہے تو راستے کے سارے مناظر کو جذب کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ راستے کی سمتوں کے متعلق ہدایتیں دیتا ہوا اطراف کے سارے نیم تاریک جلوؤں کو اپنے اندر سمیٹتا جا رہا تھا۔

دیکھتے ہو بدبخت.....سب کچھ بدل گیا ہے.....تم اپنے ٹھکانوں پر پہنچ بھی نہیں سکو گے.....مجھے تو

سب کچھ بہت اجنبی اور ڈراؤنا لگ رہا ہے۔اب تک میں تمہیں ڈسٹرب کر رہا تھا۔اب تم میری جان کو آ رہے ہو۔''

اس نے اپنے اندر کے آدمی کی بکواس کی طرف دھیان نہیں دیا اور رکشا والے سے پوچھا۔

''بھائی رکشا والے یہ وہی شہر ہے نا؟''

''کون سا؟''

''وہی اپنا شہر.!''

بڑی تیزی سے اس کے اندر کسی نے اپنے پلپلے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پھر جیسے اس کے پھیپھڑے کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔

''بد بخت تیرا کوئی شہر ہے؟''

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا۔اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔نقاہت کے عالم میں وہ رکشے کی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔اس کا پاؤں رکشا والے کے پاؤں سے ٹکرایا۔اس نے گردن گھمائی۔

''بابو جی.....آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے.....آپ کہیں تو اسپتال کا رخ کروں؟''

وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے بڑی بے بسی سے رکشے والے کو دیکھتا رہا۔اسے جیسے سکتہ لگ گیا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔رکشے والے نے رکشا روک دیا اور اتر کر اسے جھنجھوڑنے لگا۔

''بابو صاحب.....بابو صاحب.....!''

''ہاں.....!'' کسی گہرے کنوئیں سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔''

''ٹھیک ہوں بھیا رکشے والے.....کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے..... بات یہ ہے بھائی کہ میں صدمے برداشت نہیں کر پاتا.....اور میں کر بھی لوں.....لیکن وہ جو ایک کتّا میرے اندر بیٹھا ہے.....وہ حرامی پن سے باز نہیں آتا.....موقع ملتے ہی کچوکے لگاتا ہے.....''

''کون کتا.....؟''

''جانے دو بھائی.....جانے دو.....کوئی نہیں.....ایسے ہی وہ میرے لیے مصیبت بنا رہتا ہے .....کچھ بُرا لگ گیا تو جانے کیسے عذاب میں مبتلا کر دے گا...''

(''میں تمہارے لیے.....یا تم میرے لیے مصیبت بنے ہوئے ہو.....مجھے کتّا سمجھنے والے کتّے)

رکشے والے نے رکشا چلاتے ہوئے گردن گھمائی۔

''آپ اکیلے ہیں بابو جی.....تو بات کس سے کر رہے ہیں.....؟''

''بھائی رکشے والے.....تم پریشان نہ ہو.....میں بیمار آدمی ہوں..... میرے وجود میں کچھ

سانپ، کچھ کتّے اور کچھ خنزیر اپنا ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں..... جب جب ان کا حملہ ہوتا ہے بڑ بڑانے لگتا ہوں۔'' رکشا والے نے اسے بہت گھور کر دیکھا۔

''اب بتایئے بابو جی الٹے ہاتھ یا سیدھے ہاتھ؟''

''الٹے ہاتھ.....!اس نے جواب دیا اور پھر اندر والے کی طرف سے دھیان ہٹاتا ہوا عہد گزشتہ کو یاد کرنے لگا۔اس کے ابّا کتنے ضدّی اور رجعت پسند ہیں۔ہوم سکنس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔اس نے اتنا کہا کہ وہ تو اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے ہیں،اسی کے ساتھ چل کر رہیں،لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ اپنی زمین،اپنی ڈیوڑھی چھوڑ کر جانا ہی نہیں چاہتے۔بار بار سمجھانے پر بھی انہوں نے یہی کہا کہ وہ اپنی روایتوں سے کٹنا نہیں چاہتے۔ان کے مدفن میں ہی نئی زندگی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور جو اپنی جڑوں سے کٹ جاتے ہیں ،وہ پروان نہیں چڑھتے.....اب انہیں کیسے سمجھایا جائے کہ روایتیں زمین میں نہیں بلکہ دل و دماغ اور رُوح میں اگتی ہیں....سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہیں.....گھر اور جائیداد روایتوں کا مدفن ہی نہیں،نئی روایتوں کا مذبح بھی ہیں۔

جس دن یہ باتیں اس نے کھل کر کہیں،بابا نے اس سے ناطہ توڑ لیا۔

''بدخلف.....مجھے پڑھاتا ہے.....جاہل.....''

''اب کدھر چلوں بابو جی.....؟''

اس کا دھیان بٹ گیا۔

''بس.....بس.....ذرا دھیرے کرو.....رکو.....یہیں اترنا ہے۔''

حیرت سے اس نے ادھر اُدھر دیکھا کافی غور کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ جہاں پر بابا کا گھر سمجھ کر اس نے رکشا رکوایا تھا،وہاں تو دور دور تک چٹیل میدان تھا۔اس سے ضرور کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ گھر پہنچنے کی مسرت پر قابو نہ پاتے ہوئے وہ اپنا محلّہ آتے ہی ہڑ بڑا کر رکشہ سے اتر گیا تھا۔لیکن اب اسے احساس ہوا کہ راستوں اور سمتوں کے متعلق رکشے والے کو ہدایت دیتے ہوئے اس سے سہو ہو گیا ہے۔وہ رکشے پر بیٹھ گیا۔

''یار رکشے والے.....گاڑی گھما لو.....بھائی اتنے زمانے کے بعد اپنے علاقے میں آیا ہوں.....پھر روشنی بھی نہیں ہے۔اندھیرے میں راستے کا مجھے صحیح اندازہ نہ ہوا۔اب چلو،پوری احتیاط سے ہدایت دوں گا۔''

''بابو جی آپ محلّے کا نام تو بتایئے!''

''یار نام میں کیا رکھا ہے.....میں تو ساتھ ہوں.....اس سے زیادہ شرم کی بات کیا ہوگی کہ باپ دادا کی حویلی تک میں خود اپنی رہنمائی نہ کر سکوں.....ہاں رکشا کو سیدھے ہاتھ موڑ لو.....اب الٹے.....اب سیدھے.....پھر دیکھو.....آگے جو چوراہا ہے۔اس سے نکلتی ہوئی سب سے پتلی شاہراہ کی طرف.....''

اس بار اس نے بالکل نئے راستوں سے رکشے والے کی رہنمائی کی۔ اندھیرے میں منزل مقصود پر پہنچتے ہی جھٹکے کے ساتھ رکشے سے اترا تو دیکھا کہ اس کے مطلوبہ علاقے کی جگہ چٹیل میدان تھا۔

''اف ف پھر غلطی ہوگئی.....رکشا گھماؤ بھائی.....''

اس نے پھر راستے بدلے۔ تاریکی میں اس بار دوسرے راستوں کا انتخاب کرتے ہوئے آگے بڑھا اور اس بار بھی سفر نے اسی چٹیل میدان پر دم توڑا۔ جھنجھلاتے ہوئے چوتھی مرتبہ وہ پھر نئے راستوں سے آگے بڑھا اور پھر وہی چٹیل میدان۔ اس نے سوچا ضرور کوئی گڑبڑ ہے، لیکن اس کے علاقے کے سامنے اور اڑوس پڑوس کے جو علاقے تھے، وہ تو اپنی جگہ پر قائم تھے اور اس کے علاقے کی پہچان اور حوالہ بن رہے تھے۔ صرف اس کا علاقہ.....اس کا گھر اپنی جگہ سے غائب تھا۔

وہ سامنے ہی رام انکل کا مکان ہے.....اس طرف گیتا چاچی ہیں.....ادھر شنکر چاچا.....سبھوں کے مکان تو اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں.....اس کے اندر جذبوں کا ابال برداشت سے باہر ہو رہا تھا.....جی چاہا کہ جا کر رام انکل کے سینے سے لپٹ جائے.....گیتا چاچی کو سلام کر کے آشیرواد لے.....کتنا خوش ہوں گی وہ مجھے دیکھ کر.....اور شکنتلا تو اب کافی بڑی ہوگئی ہوگی۔ شاید شادی کر کے سسرال جا بسی ہو..... اس زمانے میں زیر لب شرمائی شرمائی یوں مسکراتی تھی جیسے جوانی کے سربستہ رازوں کے متعلق سب کچھ سمجھتی ہو.....اب تو بال بچوں والی ہوگئی ہوگی.....ممکن ہے اب تک شادی نہ ہوئی ہو۔ چلوں انھی لوگوں سے پوچھ لوں.....میرا گھر کہاں ہے.....؟ نا.....شہر میں مکانوں کی بھیڑ میں ان کی انفرادی شناخت مشکل ہے۔ بھلا ہمدرد پڑوسیوں کے گھروں کے سلامت ہوتے ہوئے اپنا گھر کہاں غائب ہوسکتا ہے؟ میں بھول کر رہا ہوں.....اندھیرے میں میرا حافظہ میرا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے.....اندھیرے میں..... ہر طرف اندھیرا ہی تو ہے..... گہرا اندھیرا.....اسی اندھیرے سے کسی انجان لمحے میں ہم برآمد ہوئے تھے.....اسی اندھیرے میں ہم سب کو گم بھی ہو جانا ہے.....رام انکل، گیتا چاچی، شنکر چاچا، شکنتلا، بابا، یہ رکشا والا.....سب کے سب اندھیرے کی خوراک بن جائیں گے۔

''بابو جی.....آپ کہاں کھو گئے؟''

''ہاں.....!'' وہ چونکا۔

''میں اپنے گھر کے جغرافیہ پر غور کر رہا تھا کہ کہیں سے اس کا صحیح سراغ ملے۔''

اس نے ان گنت راستے بدلے اور ہر بار اس تاریکی میں چٹیل سنگلاخ میدان کی نحوست سے دوچار ہوا۔ اس نے سوچا، کیا اس شہر کے سارے راستے اسی چٹیل میدان تک پہنچتے ہیں.....میرا گھر اور میرا علاقہ آخر کہاں ہے.....؟''

اس کے اندر پھر کلبلاہٹ ہوئی اور کسی نے پھر اس کے پھیپھڑے پر دباؤ تیز کر دیا۔

بدبخت تیرا گھر اور تیرا علاقہ ہے.....؟''

اسے جیسے سکتہ لگ گیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ رکشے والے نے اسے جھنجھوڑا تو اس کا سکوت ٹوٹا۔

سچ مچ میرا کوئی گھر اور میرا کوئی علاقہ کہاں ہے.....؟''

''اس بار مسجد والے راستے سے چلو.....!''

نتیجہ پھر وہی چٹیل میدان۔ مندر والا راستہ بھی چٹیل میدان ہی تک پہنچا۔ یہاں تک کہ چرچ اور گوردوارے کے راستے بھی اسے چٹیل میدان کے علاوہ اور کہیں نہیں پہنچا سکے۔

اس نے محسوس کیا کہ رکشے والے نے اچانک رکشے کی رفتار تیز کر دی ہے اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہے۔

''کیوں کیا ہوا رکشے والے؟''

رکشا والا اس کے سوال سے بے خبر اندھا دھند رکشا چلائے جا رہا تھا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھا رہا تھا۔

''تم اتنا تیز کیوں چل رہے ہو رکشے والے اور پیچھے مڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو؟''

اس نے رکشے والے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ رکشے والے نے جھٹکے سے بریک لیا اور خوف زدہ آنکھوں سے پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے رکشے والے؟'' اس نے بڑی ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ حالاں کہ اس کی سراسیمگی کو دیکھ کر وہ خود بھی خوف میں مبتلا ہوگیا تھا۔

''نہیں معلوم کیوں بابو جی.....کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان گنت بھاری بھرکم بوٹ گھوڑوں کے ٹاپوں کی طرح سرپٹ دوڑتے ہوئے میرے رکشے کا پیچھا کر رہے ہیں..... مجھے روندنے کے لیے میرے تعاقب میں ہیں.....''

''نہیں.....نہیں..... یہ تمہارا وہم ہے..... یہاں سے وہاں تک پوری سڑک پر سناٹا بھائیں بھائیں کر رہا ہے.....لگاتار رکشا چلاتے رہنے کی وجہ سے تمہیں ایسا گمان ہو رہا ہے.....''

''ہوسکتا ہے بابو جی.....ہوسکتا ہے.....رکشا والا پسینہ پونچھنے لگا۔ اتنی طویل مسافت اور اس کی پراگندہ باتوں سے رکشا والا اوب چکا تھا۔ اس نے کہا کہ اب اس میں آگے بڑھنے کی طاقت نہیں ہے۔ بھاری بھرکم بوٹ اور سرکش گھوڑوں کی ٹاپ اس کے تعاقب میں ہیں اور بہتر ہوا گر وہ اس کی اجرت ادا کر کے اسے چھٹکارا دے۔

''تم تھکے نہیں ہو..... ڈر گئے ہو..... میں بھی دیکھوں کدھر سے آتی ہے وہ بوٹوں کی چاپ

بدمست گھوڑوں کی سرپٹ ٹاپ.....''

اس نے رکشے والے کو سیٹ پر بیٹھا دیا اور خود اگلی سیٹ پر سوار ہو کر رکشا چلانے لگا۔ نت نئے راستوں سے ہوتا ہوا اس بار بھی وہ اسی چٹیل میدان کے نزدیک پہنچا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا رکشے والا سسکتا ہوا زار و قطار رو رہا تھا۔

''رکشے والے تم رو کیوں رہے ہو؟''

وہ اس کی بغل میں آ کر بیٹھ گیا۔ رکشا والا اور زور زور سے رونے لگا۔ روتے ہوئے بڑی مشکلوں سے وہ بس اتنا کہہ سکا۔

''تم جس علاقے، جس بستی کو ڈھونڈ رہے ہو، اسے عرصہ پہلے بلڈوزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا..... میں بھی ہفتوں اسی طرح پورے شہر میں دیوانہ وار پاگلوں کی طرح چکّر کاٹتا ہوا بار بار اسی چٹیل میدان تک پہنچتا تھا..... بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا..... بھری پُری بستی کو ملبے میں تبدیل کیا اور پھر چٹیل میدان بنا دیا..... میری دکان، میرا گھر اور تمام اہل و عیال زندہ درگور ہو گئے۔ بیٹے! میں نے تو صبر کر لیا تھا لیکن آج بار بار اس چٹیل میدان کو دیکھ کر پُرانے زخم ہرے ہو گئے..... بابو جی بابو جی..... تم سن رہے ہو؟''

اس بار رکشے والے کے بار بار جھنجھوڑنے پر بھی بابو جی کا سکوت نہیں ٹوٹا۔

دُور آسمان میں ایک چھوٹا سا طائر اپنی پوری طاقت سے اپنے گھونسلے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

گیارھواں باب

تگ و دو

عموماً مردہ جسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس کی بیوی کی گود میں ایک گرم لاش تھی۔ ایک سو چھ بخار میں پھنکتے ہوئے اس کے بچے کی آنکھیں نقاہت کے بوجھ سے بند تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے سسکیاں لیتی جا رہی تھی۔ اس نے متنبہ کیا۔

''بھولے سے بھی آنسو مت گرانا۔ بچہ جس طرح بخار میں تپ رہا ہے، چھن کی آواز کے ساتھ آنسو بھاپ بن کر اڑ جائیں گے اور بچے کے جسم پر آبلے چھوڑ جائیں گے۔''

کتنی منّت مرادوں کے بعد یہ لڑکا پیدا ہوا تھا اور اس زہریلی فضا میں اغیار کے علاقے کی طرف بچے کو لے جاتے ہوئے اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام شدت سے یاد آئے۔ حضرت کا بیٹا صحت مند تھا اور وہ اسے خدا کی راہ میں قربان کرنے جا رہے تھے۔ اس کا بیٹا قریب المرگ تھا اور اسے بچانے کی آخری کوشش اسے دشمنوں کے علاقے کے جبڑے میں پہنچانے پر مجبور کر رہی تھی۔ زندہ سلامت بچ گیا تو رب کی

مہربانی، ورنہ مشیت ایزدی میں کس کو دخل تھا؟

پرانے اور نئے شہر کو جوڑنے والے اوور برج کی اٹھان اور ڈھلان سے ہوتے ہوئے اور پھر اوبڑ کھابڑ علاقے سے گذرتے ہوئے اس کا رکشہ بالآخر ہنومان چلڈرنس کلینک تک پہنچ چکا تھا۔

سنگل کے بجائے اس نے چار بیڈ والا کمرہ لیا۔ اس کے پاس پیسے کم تھے اور ذرائع بھی محدود۔ وہ ہاتھ روک کر چلنا چاہ رہا تھا۔ اتنا کچھ بھی اس کے ساڑھو اور ڈیڑھ سس کی مہربانی سے ہو رہا تھا۔

''کمینے..... ذلیل..... کم اوقات.....''

اس نے پاؤں کی طرف سے گزرتے ہوئے کاکروچ کو جو اس کے بیٹے کی جانب بڑھ رہا تھا، اپنے بوسیدہ جوتے کے نیچے مسل دیا۔

شام اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔

چھریرے بدن والا جونیئر ڈاکٹر حال چال پوچھ چکا تھا اور بڑے ڈاکٹر کی تجویز کردہ ہدایتوں کے مطابق عمل درآمد کے لئے کمپاؤنڈر کو ہدایات دے رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! بخار کیسے اترے گا؟'' اس نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''کم ہو جائے گا جی کم ہو جائے گا۔ بس آپ لوگ تھوڑی تھوڑی دیر پر گیلے کپڑے سے بچے کا چہرہ اور بدن پونچھتے رہئے۔ جب بخار ایک سو ایک سے آگے بڑھے یہ گولی کھلا دیں۔'' جونیئر ڈاکٹر نے ایک دوا کی طرف اشارہ کیا پھر بولا:

دیکھئے صاحب!''

''جی؟'' وہ قریب کھسک آیا۔

''کسی کو بولیے گا نہیں۔'' ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔'' میرا مشورہ ہے کہ بخار ڈاؤن کرنے کے لیے پانی کے پونچھے پر ہی زیادہ بھروسا کیجئے۔ اس گولی کا زیادہ استعمال آگے چل کر ہانی کارک سائڈ ایفکٹ پیدا کر سکتا ہے، یہاں تک کہ ہرٹ ٹرابل بھی پیدا کر سکتا ہے۔''

گولیوں کے پیکٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف سما گیا، گویا وہ گولیاں نہ ہوں زہریلے کیڑے ہوں۔

کمپاؤنڈر نے گلوکوز چڑھانے کا انتظام کیا۔ بچّے کی نس میں سوئی چبھوئی جا رہی تھی تو اس کی ماں کی آنکھ سے آنسو نکل رہے تھے۔

''یا خدا..... تیرے حبیب کے صدقے..... ہم نے کیا گناہ کیا ہے جس کی پاداش.....'' بیوی نے سرد آہ

بھری۔اس نے بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔''یوں ہار جاؤ گی تو بڑی مشکل ہوگی.....بچہ تو قدرت کی امانت ہے۔''

''ہاں میرے مالک، کیا تیری قدرت ہے۔داتا کے تین گن۔دیا دیا نہ دیا اور دے کر بھی چھین لیا۔''

اسے لگا، اس کا سینہ چیر کر کوئی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر نچوڑ رہا ہو۔اس حالت میں بھی اس کو غصہ آ گیا۔

''خبردار عامیانہ باتیں مت بولو۔دیا ہوگا تمہارے اللہ نے۔لیکن اس وقت ٹھیک اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ سائنس ہے۔خواہ مخواہ میرے حوصلے پست مت کرو، اپنی آہ وزاری سے ڈاکٹر اور دوسرے مریضوں کی حوصلہ شکنی سے باز آؤ۔''

جونیئر ڈاکٹر مسکرایا۔''بھائی بھگوان وگوان کو میں بھی نہیں مانتا۔ابھی دو ہزار روپے ماہوار کماتا ہوں، شاید یہ بھی ایک وجہ ہو۔لیکن نہیں.....''اس نے سر کو جھٹکا دیا۔''میرا ذہن شروع سے انے لی ٹی کل اور سائنٹیفک ہے، اور بھابی جی.....''اس کی بیوی کو اس نے بڑی اپنائیت سے مخاطب کیا۔

''آپ کا بچہ اگر بچے گا، اور یقیناً بچے گا، تو اس میں سائنس کی کرامت ہوگی۔ویسے سچ پوچھئے تو میری بیوی بھی مجھ سے بہت ناراض رہتی ہے۔کہتی ہے، 'بھگوان کو نہیں مانتے اسی لیے تو دو ٹکے کے ڈاکٹر ہو۔اگر بھگوان جی سے ٹکّر نہ لی ہوتی تو آج کام کے ڈاکٹر ہوتے۔تمہارے آگے بھی مریضوں کا تانتا لگا ہوتا، یوں نہ ہوتا کہ میرے کان معمولی سونے کے بندے تک کو ترس رہے ہوتے اور بچّے پلاسٹک کے کھلونوں کو۔تمہارا بچپن ابھاؤ میں نہ گذرا ہوتا تو تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔میں اسے جھونپڑی دکھاتا ہوں جہاں پیپل کے پیڑ کی جڑ میں چینی اور پانی ڈالتی ہوئی عورتیں روزمرہ کی زندگی میں اکثر پیٹ بھر کھانے کو ترستی ہیں۔اور ہندوستان کے مزار اور پوجا استھلوں پر اللہ اور بھگوان کے نام کا جاپ کرتے ہوئے لوگوں کے بارے میں اسے بتاتا ہوں کہ وہ دو وقت کی روٹی جٹانے میں ہلکان ہو کر ساری عمر گنوا بیٹھتے ہیں۔ویسے کیا کیجئے گا۔''

جونیئر ڈاکٹر نے رک کر کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا۔

''بڑے ڈاکٹر صاحب بڑے ہنومان بھکت ہیں۔یہ کلینک انھوں نے اپنی کمائی سے بنوایا ہے۔فارورڈ ہیں..... براہمن.....کیا جَس ہے ان کے ہاتھوں میں۔بیماری دیکھتے ہی دیکھتے چھومنتر ہو جاتی ہے۔لکشمی دیوی ان پر بہت مہربان ہیں۔پیسوں کی ورشا ہو رہی ہے۔میرے پاس بھی وہی ڈگری ہے۔اسی کالج میں میں نے بھی پڑھا ہے۔مارکس بھی میرے ہی زیادہ تھے۔لیکن میری یہ حالت ہے کہ ان کے اس ہاسپٹل میں دو ہزار روپے پر ملازمت کرنے پر مجبور ہوں۔اور میں ہی نہیں کئی اور میری ہی طرح کے ہیں۔میری شفٹ آٹھ گھنٹے کی ہے، پھر کوئی اور آئے گا۔وہ بھی بہت اچھا آدمی ہے۔بس بھائی ہم لوگوں کا فیملی بیک گراؤنڈ بڑا بیک ورڈ اور..... خیر چھوڑیئے ان بیک ورڈ اور فارورڈ کی باتوں کو۔بابا امبیڈکر

امر رہیں..... جیتے جی فارورڈ کو مار دیا جس کی وجہ سے فارورڈ کے دل میں بیک ورڈ کے لیے نفرت بھر گئی ہے۔مجھے تو پرافٹ محمد، اشفاق اللہ اور رام منوہر لوہیا کا راستہ زیادہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔آپ گھبرائیے بالکل نہیں۔یہاں سے ڈسچارج سرٹیفکٹ اور ہنستا کھیلتا بچہ میں ہی آپ کو دوں گا۔میرا وشواش کیجئے۔''

اس کی بیوی کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔صاف جھلکتا تھا کہ وہ محض دکھاوے کے طور پر مسکرا رہی ہے۔

جونیئر ڈاکٹر چلا گیا۔اس کے بیٹے کے جسم میں قطرہ قطرہ پانی سرایت کرنے لگا۔بغل میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور کپڑے کا ٹکڑا رکھا پڑا تھا۔تھرمامیٹر اس کی جیب میں تھا۔بخار چڑھتے ہی پانی سے بھیگے ہوئے کپڑے سے اس کا پورا جسم پونچھنا تھا۔جونیئر ڈاکٹر نے امید ظاہر کی تھی کہ جسم میں پانی پہنچتے ہی بچے کے بدن میں طاقت آئے گی اور بخار ڈاؤن ہونا شروع ہو جائے گا۔اب اس نے سوچا کہ رات کے کھانے اور چائے کا انتظام کیا جائے۔اس کلینک کے قریب چند ڈھابے تھے، جو اسی کلینک کے بل بوتے چل رہے تھے۔اس نے بیگ میں پڑا ہوا تھرمس نکالا اور نیچے کی طرف چل پڑا۔

جونیئر ڈاکٹر کی حوصلہ افزا باتوں سے اس کا اضطراب کچھ کم ہو گیا تھا۔برآمدہ پار کرتے ہوئے سیڑھی کے پاس اس نے ہنومان جی کے بت کی طرف دھیان دیا۔آتے وقت عجلت اور افراتفری کے سبب اس نے مورتی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ہنومان جی دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ شق کیے ہوئے تھے اور ان کے سینے کے اندر سیتا اور رام براجمان تھے۔

اس نے سوچا کاش ہنومان جی کے سینے کے اندر اسپتال کے بیڈ اور مریض کے اسکلچر بنے ہوئے ہوتے تو اسپتال کی مناسبت سے اس کی معنی خیزی دو چند ہو سکتی تھی۔لیکن ہو بہو لیجنڈ کو روایتی انداز میں پیش کرنا کون سی دانشوری تھی۔اور تعجب کی بات یہ تھی کہ ہنومان جی کی پیشانی پر تازہ تازہ سیندور لگا ہوا تھا یعنی عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی اور لوگوں کو فیض پہنچ رہا تھا۔

اسے یاد آیا۔ہائی کورٹ کے پہلو میں بابا سید صفدر شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر کتنی بھیڑ رہا کرتی تھی۔وہ بدعتوں کو نہیں مانتا تھا، ایک روز اتفاق سے اس کے پاس ٹمپو کے بھاڑے کے لیے پیسے نہیں تھے تو وہ پیدل ہی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔راستے میں انجانے طور پر اس کے مزار کی جانب اٹھ گئے۔جہاں تک اس کا خیال جاتا تھا، اس میں اس کے شعوری عمل اور فیصلے کو کوئی دخل نہیں تھا۔معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے کانوں میں سرگوشی کی ہو اور پاؤں کو مزار کی طرف چلنے کی ہدایت کی ہو۔پھر اسے اپنے ہی پاؤں بے گانہ محسوس ہوئے۔اس کے اختیار اور قابو سے باہر۔کم بختو، ایسی دغابازی۔ساری زندگی کے اصول پر پانی پھیرنے پر مصر ہو گئے۔

بعد عصر کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس نے دیکھا، واقعی کیا عالیشان مقبرہ بنا ہوا تھا۔ صاف ستھرا، چم چم کرتا۔ تقدس اور پاکیزگی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ نگاہ کا ایک جگہ ٹھہرنا مشکل تھا۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

انشا کے مصرعے یاد آئے اور وہ آبدیدہ ہوگیا۔ مزار کے دونوں طرف دریچے اور جھروکے، خوش نما نقش و نگار والے جالی دار جنگلے۔ آستانے کے باہر اس نے اپنے بوسیدہ جوتے اتارے اور دھیمے قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ کچھ مدہوشی کی سی کیفیت میں وہ مزار کے پائیں قدم بوس ہو گیا۔ اس کے پورے وجود پر وجد کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ ایک عالم ہو میں پہنچتا جا رہا تھا۔ نعتیہ قوالی گانے والا قوال جذب کی کیفیت میں گا رہا تھا۔

بھلا گردش چمن کی چین دیتی ہے کسے انشا غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

چند عمر رسیدہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ چند بوڑھے افراد مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے آہ وزاریاں کر رہے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جن پر سکتہ طاری تھا .....کاٹو تو لہو نہیں بدن میں.....ٹکر ٹکر نہیں دیکھنے کی طرح دیکھ رہے تھے، ان کی زندگی میں اب کچھ بھی نہیں رہا تھا..... ہائے نامراد.....سب کچھ اکارت چلا گیا۔

دوزانو بیٹھے بیٹھے ایک عرصہ بیت گیا۔ دل میں اندر ہی اندر عجیب تلاطم برپا تھا۔ وہ ایک نئی بے خبری کی پراسرار منزلوں کی طرف گامزن تھا کہ کسی ملنگ کی چیخ سے اس کی محویت کا شیرازہ بکھر گیا۔ چند لمحوں بعد اس کے اندر کا مارکسسٹ باہر نکل آیا اور اسے ٹھوکے لگانے لگا۔

آخر تم بھی! کہا گئی وہ مارکسی جدلیاتی قوت؟

چند ساعتیں قبل اس راحت اور یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔ اس نے مارکسسٹ کی سنی ان سی کرتے ہوئے دل ہی دل میں فاتحہ پڑھنا شروع کیا۔ زبان ابھی اس کے قابو سے باہر تھی اور دماغ.....اس کی نئے سرے سے واشنگ ہو رہی تھی۔ ہائے اس کا اپنا ذہن بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ اسے کیا ہو رہا تھا؟ وہ متحیر تھا کہ مارکسزم سے متعلق ہندی اور انگریزی اصطلاحوں کے جنگل میں مدتوں گم رہنے کے باوجود قرآن کی کئی آیتیں وہ اب تک بھولا نہ تھا۔ لیکن پوری پوری سورتیں اسے اب یاد نہ تھیں، چاروں قل بھی اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھے۔ سورہ اخلاص کو جوں توں ذہن میں تازہ کر کے اور اسے کئی بار پڑھ کر اس نے کمی کا ازالہ کیا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

اسلام میں لچک بہت ہے مختلف مسلکوں کے بعض کٹر نام نہاد مولویوں کی بات الگ ہے۔ چشم زدن میں اسے پھر آگہی حاصل ہوئی۔ مارکسزم اور اس کے انقلابی اصول تو ٹھیک ٹھاک تھے، بلکہ بہتر تھے۔ لیکن بہتیرے مارکسسٹوں کے انداز، خصوصاً ایلیٹ مارکسسٹوں کے...اس نے یاد کیا روزہ دار لوگ غیر روزہ داروں کو کتنی حقارت سے دیکھتے تھے اور انقلاب پسند لوگ ان دنوں کس طرح سرمایہ داروں سے دوست داری میں منہمک تھے۔

اس نے مزید یاد کیا سردار جعفری جیسا انقلاب پسند ادیب گیان پیٹھ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد تقریر میں ارباب اقتدار کو عزت مآب کے خطاب سے مخاطب کر رہا تھا تو شرم سے اس کی نگاہیں زمین میں گڑ گئی تھیں اور اسے کلام حیدری، باقر مہدی، وارث علوی، قمر رئیس وغیرہ جیسے ترقی پسند ادبی انقلابی اس دور سوداگری میں فرشتوں کی صورت قابل احترام شخصیتیں دکھائی دئے تھے۔

اس نے دیکھا مسلمانوں سے زیادہ ہندو اس مزار پر چادریں چڑھا رہے تھے اور ماتھے ٹیک رہے تھے۔ کئی ہندو صاحبان تو تعظیم اور تقدس کے بوجھ سے اس قدر بوجھل تھے کہ مزار کی چوکھٹ کو بوسہ دیتے ہوئے واپس جاتے ہوئے الٹے پاؤں چل رہے تھے کئی اور لوگ دروازے سے ملحق سیڑھیوں کو دیوانہ وار چوم رہے تھے۔ کئی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اسے وہی ملنگ مل گیا۔ جلتی ہوئی سرخ آنکھوں سے چنگاریاں پھلجھڑیوں کی طرح جھڑ رہی تھیں۔ سر کے بال بکھیرے ہوئے، اسے گھورتے ہوئے وہ چلّایا۔

''تو انتقام کی آگ میں جل رہا ہے! چھاجوں برستے غسل میں ہی تری نجات ہے۔ ہم ملنگ لوگ.....ہم جانتے ہیں کہ نماز روزے میں کچھ نہیں رکھا۔ دکھاوے کی زندگی سے راہ فرار اختیار کر۔ جسم پر زندگی کی بھبھوت مل اور شان استغنا سے جی۔ یا غوث پاک..... یا صفدر شاہ.....! دے چھپّر پھاڑ کے .....تر رر ہو.....اللہ ہو! حق.....حق!''

ملنگ نے پھر ایک چیخ ماری۔ ملنگ کی ہاو ہو سنتے نہ سنتے ہوئے اس نے ڈھابے کی طرف قدم بڑھائے۔ وہاں پہنچ کر اپنے لیے خالص دودھ کی چائے کا آرڈر دیا اور ہوٹل کے لڑکے کو کلینک کا بیڈ نمبر بتاتے ہوئے گرما گرم چائے اور بسکٹ وہاں بھجوانے کے لئے کہا۔ آج کی رات آنکھوں میں کاٹنی ہوگی۔ ہر تھوڑی دیر پر بخار دیکھ کر اندازہ کرنا پڑے گا کہ ایک سو ایک ڈگری سے آگے تو نہیں بڑھا۔ مزید برآں یہ بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ دوا ملا ہوا پانی اس کے بیٹے کے جسم میں مقررہ رفتار سے قطرہ قطرہ سرایت کرتا رہے۔ ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھنا ہوگا، بلکہ رات بھر بچے کے ہاتھ کو پکڑے بیٹھے رہنا پڑے گا، کہ وہ نیند میں ہاتھ کو جھٹک نہ دے اور پانی جانے کے لیے اس کی نس میں چبھوئی گئی ڈرپ جگہ سے بے جگہ نہ ہو جائے۔ اگر کچھ تشویشناک صورت حال پیدا

ہوتو اس کے لئے اسے ہدایت کر دی گئی تھی کہ بے تامل ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے رجوع کرے۔

پتہ نہیں اگلی شفٹ میں آنے والا ڈاکٹر کیسا ہوگا؟ اس جونیئر ڈاکٹر کی طرح تعاون کرے گا یا نہیں؟ اس نے رات بھر جاگنے کا انتظام کرنے کے لیے ڈھابے والے کو چار پیالی چائے تھرمس میں ڈھالنے کی ہدایت کی اور خیالوں میں دوبارہ گم ہو گیا۔

مغل شہزادہ ہمایوں جاں بلب ہوا تو تو بابر نے اس کے جسم کا طواف کرتے ہوئے خداوند قدوس سے اس کی بیماری کی منتقلی کی دعا کی۔ یارب میرے بیٹے کی بیماری مجھے لگ جائے، اس کی آئی مجھے آجائے۔ بیٹے کی بیماری کی تقلیب ہوگئی۔ ہمایوں صحت یاب ہونے لگا اور مغل بادشاہ بابر عارضے میں مبتلا ہو گیا۔ پھر کیا مجھے بھی اپنے بیٹے کی گرد چکر کاٹنے پڑیں گے او.....؟ لیکن میں تو اس طرح کی فضول توہماتی فرسودہ باتوں میں یقین نہیں کرتا؟

جب سے اس کے قدموں کو بابا صفدر شاہ کے مقبرے کا لمس حاصل ہوا تھا، وہ اپنے موقف میں متزلزل ہو گیا تھا۔ توہم پرستی سے بھرے ہوئے دقیانوسی خیالات اسے بھی چھونے لگے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ راستے کی دھول کی طرح ان خیالات کو جھاڑ دے، پاک وصاف ہو جائے۔ لیکن ''پاک صاف'' تو مذہبی اصطلاحیں ہیں؟ مجھے ان سے کیا مطلب؟ ناگاہ اس نے اندھیرے میں چمکتی ہوئی دو آنکھیں اپنی جانب گھورتی ہوئی دیکھیں۔ کچھ ہی دیر بعد کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔

''کیسا ہے تیرا بیٹا؟''

وہی ادھیڑ عمر کا آدمی جو کئی مرتبہ اسے امداد کی پیش کش کر چکا تھا! اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ آدمی تھا یا بلا۔ کیا وہ مسلسل میرے تعاقب میں تھا یا کوئی فرشتہ جو میری اور میرے بچے کی نگہبانی پر مامور تھا۔ اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی وہ اجنبی بولا، گویا اس نے اس کے دل کا حال پڑھ لیا ہو:

''میں مستقل تیرے ساتھ ہوں۔ میں بھی وقت کا مارا ہوا ہوں۔ ان دنوں میں بالکل قلاش تھا۔ کسی حرامزادے نے میری مدد نہیں کی۔ ڈاکٹروں کو میرے اوپر رحم نہ آیا۔ مجھے جب بھی کسی اکلوتے بچے کے بیمار ہونے کی خبر مل جاتی ہے، میں اس کی مدد کے لیے نکل پڑتا ہوں۔ اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ رکھ لے میری طرف سے ہزار روپے۔''

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا پرس نکالا اور زبردستی اس کی جیب میں سچ مچ کے روپے رکھ دیئے۔ اسے یقین نہ آیا کہ اس آدم خور زمانے میں کوئی اتنا مہربان بھی ہو سکتا تھا۔

''چل آ، میں بھی تیرے ساتھ رات بھر جاگوں گا۔''

''نہیں، نہیں۔ آپ کیوں جاگیں، آپ کا اتنا ہی احسان کافی ہے۔ لیکن آپ اپنا پتہ تو بتایئے۔

جب بھی موقع ملا میں آپ کے پیسے واپس کر دوں گا۔''

''پتہ؟ ہم فقیروں کا پتہ کیا؟ لیکن.....تو ایسے نہیں مانے گا۔ لے۔'' یہ کہہ کر ایک پرزے پر اس نے اپنا نام پتہ لکھا اور اس کی جیب میں رکھ دیا۔

اس نے کرم فرما کا شکریہ ادا کیا۔ چائے کی پیشکش کی۔

اس نیم روشن ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے کرم فرما کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اسے انوکھی بے چینی دکھائی پڑی۔ اس کے چہرے پر کچھ بے ثباتی، ناپائیداری اور ناکارگئی ہستی کے احساسات اور اداسی کا شعور تھا۔ اس کا پورا وجود مایوسی کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ پاؤں پھیلائے ہوئے، چائے پیتے ہوئے آسمان کی طرف یوں دیکھ رہا تھا گویا چائے نہ پی رہا ہو آسمان کی طرف چائے کے چھینٹے اڑا رہا ہو۔ تو یہ شخص محض یوں ہی میرا ہمدرد بن گیا ہے، ورنہ اس کے پاس کوئی طاقت نہیں، کوئی چمتکار نہیں؟ میرا بچہ اس کے ٹھیک کئے نہ ٹھیک ہوگا؟

اجنبی محسن کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک اور بات نوٹ کی۔

اس کے چہرے اور جثّے سے اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ملتا تھا۔ چہرے کے متغیر رنگوں اور بنتے بگڑتے نقوش کی بنا پر کبھی وہ ادھیڑ عمر کا دکھائی دیتا، کبھی سن رسیدہ بوڑھا نظر آتا، اور کبھی ہٹا کٹا جوان۔ کبھی وہ خمیدہ ہو کر بیٹھتا، کبھی تن جاتا، اور کبھی نیم دراز ہونے کے انداز میں کہنیاں بنچ کی پشت پر ٹکا دیتا۔

ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ سواریوں کی آمد و رفت کم ہو جانے کے باعث سناٹے کی دبازت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈھابے والے کو پیسے ادا کرنے کے بعد اس نے اپنے گمنام محسن کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور اسے گھر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ محسن نے جواباً بھرائی ہوئی سی آواز میں پھر کہا۔

''تو اپنا کام کر۔ میں اپنا کام کروں گا۔'' اس کے کہنے کا انداز کچھ ایسا سحر آمیز تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس نے شفاخانے کی راہ لی۔ اجنبی کی آنکھ میں ایسی روشنی تھی کہ اسے لگا، پیچھے مڑ کر دیکھوں گا تو پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو کر رہ جاؤں گا۔ بچے کے بیڈ کے پاس سائڈ ٹیبل پر سامان رکھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ چار پلنگ والے اس کمرے کے دوسرے پلنگ کی چادر تبدیل کی جا رہی تھی۔ کوئی نیا مریض آنے والا تھا۔

وارڈ بوائے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سینئر ڈاکٹر رات کے دس اور گیارہ بجے کے بیچ میں آتے ہیں۔ وہ پرانے شہر کے کلینک کے مریضوں کو نپٹانے کے بعد ہی نرسنگ ہوم میں روند مارتے تھے۔

ڈرتے ڈرتے اس نے بچے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بخار ایک سو تین ڈگری کے آس پاس رہا ہوگا۔ تھکی ہوئی بیوی کی طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر اس نے تھرمامیٹر بچے کی بغل میں لگا دیا۔ دو منٹ بعد

معلوم ہوا کہ واقعی اس کا اندازہ صحیح تھا۔

اس نے کپڑا پانی میں بھگو کر بچے کا بدن پونچھنا شروع کیا۔ پہلے ران سے تلوؤں تک پاؤں کو پونچھا۔اس کے بعد گردن سے لے کر سینے تک۔ پھر پورا چہرہ اور ہاتھ۔نیم غشی کی حالت میں کراہتے ہوئے بچے نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور منہ بسورنے لگا۔ بچے کو بھیگے ہوئے کپڑے سے عجیب کراہیت کا احساس ہو رہا تھا۔ پانی کا پونچھا اسے بہت ناگوار گذر رہا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ وہ اپنے سوئی چبھوئے ہوئے ہاتھ کو بھی جھٹک دے گا۔ بیوی کو اس نے ہاتھ پر دباؤ بنائے رکھنے کے لئے اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد کمپاؤنڈر داخل ہوا۔ بوتل سے قطرے قطرے ٹپکتے ہوئے پانی کی رفتار کا اس نے معائنہ کیا ۔جانے سے پہلے کہہ گیا کہ تقریباً چار گھنٹے میں یہ پورا پانی اور دوا بچے کے بدن میں پہنچے گی۔اس کے بعد دوسری بوتل چڑھائی جائے گی۔اس نے مزید کہا کہ کلینک کے باہر والی دکان سے مزید دوا اور گلوکوز کی بوتلیں احتیاطاً خرید لی جائیں۔

کمپاؤنڈر کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔اس کلینک میں اس نے اپنے بچے کو بھرتی تو کرا دیا تھا لیکن اسے اب بھی عجیب وحشت ہو رہی تھی۔اب تک کوئی بھی شناسا یا اس کا ہم مذہب اس جگہ اسے نہ ملا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔اسے تو حالات کی ستم گری کی چکی میں پسنا ہی تھا۔

لوٹتے ہوئے گیٹ مین سے اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نرسنگ ہوم کا آہنی پھاٹک نو بجے بند کر دیا جاتا ہے۔اسے اطمینان ہوا۔شہر کے حالیہ واقعات کے تناظر میں تخریب پر آمادہ کوئی ہجوم اگر اس طرف آنکلا تو براہ راست ان پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔

کچھ ہی دیر بعد اس کے ساڑھو اور ڈیڑھ سس ٹفن کیریئر میں ان کے لیے کھانا اور بستر لے کر آ گئے۔اس نے بتایا کہ جونیئر ڈاکٹر نے انھیں رات بھر جاگ کر مریض کی نگرانی کرنے کی تاکید کی تھی۔سونے کا سوال کہاں اٹھتا تھا۔ان لوگوں کے آنے سے تھوڑی دیر کے لیے چہل پہل ہو گئی۔ پھر سینئر ڈاکٹر بھی آ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب بخار اترنے کا نام نہیں لیتا۔'' اس کی بیوی نے بہت تشویش سے کہا۔

ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا ''دیکھئے میڈم، سیویئر وائرل انفکشن ہے۔ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے انٹرک فیور نہ ہو جائے۔ چوبیس گھنٹے سے پہلے نہیں اترے گا۔آپ کو دھیان بھی رکھنا ہے کہ بخار ایک سو ایک ڈگری سے اوپر نہ جائے۔آپ لوگ گھبرائیے نہیں۔اس بخار میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ہم کل ملیں گے۔اس وقت تک بخار اتر چکا ہوگا۔''

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کی طرف دیکھا اور ایک خاص انداز میں سر کو خم کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔سالی کا اشارہ پاتے ہی اس کے ساڑھو بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔

نہ معلوم اس کے ساتھ چلتے ہوئے ساڑھو نے دھیمے دھیمے کیا گفتگو کی۔آنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر سے پوچھ رہے تھے کہ کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں تھی۔کہیں ملیریا یا میعادی بخار تو نہیں تھا۔ڈاکٹر نے ان کے اندیشے کی نفی کی۔اب وہ اپنی سالی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''تم تو خواہ مخواہ گھبرائی ہوئی ہو۔بچوں کی زندگی میں یہ سب لگا ہی رہتا ہے۔ڈاکٹر نے بتا دیا ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔''

روانہ ہونے سے پہلے ساڑھو اور ڈیڑھ سس نے کھانا کھا لینے کی ہدایت کی اور صبح صبح اسے ٹیلی فون پر سارا حال بتانے کو کہا۔ان کو رخصت کرنے کے لئے وہ نیچے تک آیا۔ان لوگوں کے جانے کے بعد سناٹا چھا گیا۔اسے وحشت ہونے لگی۔

''اب بھگتئے جناب زندگی کی لعنتیں اس بیابان میں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ انہیں چھوڑنے کے لیے اسپتال سے کچھ فاصلے تک آ گیا تھا۔واپس آیا تو گیٹ پر بڑا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔گیٹ مین کو پکار کر اس نے گیٹ کھلوایا۔اندر آنے کے بعد مڑ کر دیکھ لیا کہ گیٹ مین پھر تالا لگا رہا ہے یا نہیں۔

بارھواں باب

جھینگر کی آواز اور دلربا

رات بھر دونوں میاں بیوی جاگتے رہے۔ بیچ بیچ میں بچے کا ہاتھ پکڑے پکڑے اسے نیند آنے لگتی تو بیوی اسے ٹھوکا دیتی۔اس کی بیوی نے نیچے فرش پر بستر بچھا لیا تھا اور بدن کو ڈھیلا کرتے ہوئے نیم دراز ہو گئی تھی۔بغل والے پلنگ پر مریض کے آ جانے سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ ان کے ساتھ جاگنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا اور یہ ان لوگوں کی تقویت کا سبب بن گیا تھا۔

اس نے اپنے خشک گلے میں کچھ پھنستا ہوا محسوس کیا۔دن بھر کی تکان کا اثر تھا شاید یا کچھ اور۔بغل کے پلنگ پر پڑا ہوا بچہ بخار کی تپش میں کچھ بڑبڑاتا ہوا کچھ سسک رہا تھا۔اس کی ماں جھک کر اس کی پیشانی پر بھیگے ہوئے کپڑے کی رکھی ہوئی پٹی بدل رہی تھی۔ ماں کے چہرے پر فکرمندی کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔اس کے باوجود کس کر لپیٹی ہوئی آسمانی رنگ کی ساری، اور تنگ سلیولیس اور بیک لیس بلاوز سے اس کا گدرایا ہوا جسم ابلا پڑ رہا تھا۔مصیبت کے ان ناگوار لمحوں میں بھی وہ اس کے بدن کی جگمگاہٹ دیکھ کر مسحور اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اس نے تعجب کیا کہ اتنی دیر تک اس قیامت خیز امر کی طرف سے وہ غافل کیسے تھا۔

سوگواری کے اس ماحول میں بھی اس کی تیز نگاہ بیوی نے اس کی رومانی آوارہ گردی کو بھانپ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس لمحۂ فکریہ میں بھی وہ ایک غیر محرم عورت کو لگاتار دیکھتے چلے جانے کی مردانگی میں مصروف ہے۔

شوہر کا دھیان بٹانے کے لئے اس نے بچّے کے ہلتے ہوئے ہاتھ پر دباؤ دینے کے لئے اسے پھر ٹوک دیا۔

بچے کے ہاتھ پر دباؤ دیتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر کرسی پر ایسا رخ اختیار کیا کہ کن انکھیوں سے اس دلربا کے کسے، گٹھیلے اور ابلتے ہوئے جسم کا عرق آنکھوں آنکھوں میں نچوڑتا رہے۔ بیوی اس کے عندیے کو سمجھ گئی۔ عام طور پر حاسد اور چہرے مہرے سے کمتر عورت ان معاملات میں بڑی ذی حس واقع ہوتی ہے۔ اس نے شوہر سے کہا کہ آپ نیچے چلے آئیں، مجھے کرسی پر بیٹھنے دیں۔

اس نے محسوس کیا کہ بیوی کی اس ہدایت پر وہ خجل ہوگیا تھا۔ نیچے آتے ہوئے اپنے بوسیدہ جوتے کو اس عورت سے چھپانے میں اسے خاصی زحمت اٹھانی پڑی تھی۔ بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے پھر بھی ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ قیامت خیز عورت اس کی نگاہوں کے دائرے میں رہے۔ بلکہ اب تو دیدار کی کچھ اور بھی آسانی حاصل ہوگئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بیوی نے اسے مزید سہولت فراہم کردی تھی۔

کچھ دیر بعد اس حقیقت کو محسوس کر کے بیوی بے کیف سی ہوگئی۔ اس نے معنی خیز انداز میں اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر عورت کو تاکتے ہوئے افسردگی کے ساتھ آہ بھری۔

اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ اس کی بیوی نے اس کی نگاہیں بچا کر اپنے ڈھیلے ڈھالے بدن کا جائزہ لیا اور اپنے ہاتھوں کو چپ چاپ بلاؤز کے اندر لے جا کر اپنے برا کو کسا، ڈھلتے ہوئے بدن کو کسی قدر درست کرتے ہوئے اس نے کچھ ضد کے سے عالم میں بچے کے اس ہاتھ پر دباؤ سخت کردیا جس کے ذریعے دوا اس کی شریانوں میں سرایت کر رہی تھی۔ بیوی نے سر جھکا لیا۔ فکرمندی میں ڈوبی اس کی آنکھوں میں سمٹی ہوئی کوئی بھولی بسری ندی باہر آنے کو بیتاب اور مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

سناٹا شاید کچھ بڑھ گیا تھا۔ جھینگر کی پراسرار آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس ماحول میں اس پرکشش عورت کی موجودگی بڑی پرکشش اور سحر طراز معلوم ہو رہی تھی۔ اسپتال کے باہر چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا شاید محلے میں کہیں اور بجلی نہیں آرہی تھی۔ وارڈ کے اندر ہلکے پاور کے بلب کی دھیمی روشنی میں کچھ اور بھی اچھی لیکن بے سہارا لگتی ہوئی عورت نے جھک کر اپنی کہنی اپنے بچے کے بستر کے سرہانے ٹکا دی تھی۔ دباؤ سے اس کے بدن، کاص طور پر جوبن کا ابھار اور نمایاں ہوگیا تھا اور پلّو سے جھانکتے ہوئے بغل کے چمکیلے سیاہ بال مستقل دعوت نظارہ دیئے جا رہے تھے۔ اب اسے محسوس ہوا کہ کسی ہلکی مغربی پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیل رہی ہے۔ اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔

دوسرے لمحے اس کے تخیل نے اسے مادرزاد برہنہ کردیا۔

کچھ دیر میں وہ اس پُرکشش دلربا سے ہم آغوش تھا اور اسے پاگلوں کی طرح چوم رہا تھا۔ اس کے

بغل کی بالوں کو چاٹ رہا تھا۔ اس کے جسم میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں اس نئی زندگی کے عالم میں عورت کی آنکھیں وفور لذّت سے بند تھیں دونوں کی سانسیں تیز چلنے لگیں دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ ہڑ ہڑ کرتا ہوا جھرنے کا پانی دریا میں گر رہا تھا اور دھوئیں میں تبدیل ہو رہا تھا۔

دلربا کے ساتھ ابھی وہ کچھ اور دست درازی کرتا، لیکن بیوی نے اسے ٹھوکا دیا۔ وہ چونک کر جاگا اور ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے وحشت ہویدا ہوئی، لیکن وہ شرمندہ نہ تھا۔

بیوی نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ ''دیکھئے بخار پھر بڑھ رہا ہے۔''

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

تخیل کی لذت کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ بدن ٹوٹ رہا تھا۔ پاؤں اور ہاتھوں کی لرزش کے باوجود وہ تن کر کھڑا ہوگیا، بیوی کو دکھانے کیلئے ایک لمبی جمائی لی اور پانی سے کپڑے کی پٹّی کو تر کر کے بچّے کا بدن پونچھنے لگا۔ بخار دیکھنے کی ضرورت اس لئے پیش نہ آئی کہ بچّے کا بدن شدید بخار سے جل رہا تھا اور اس کے اندازے کے مطابق ایک سو چار ڈگری سے کسی حال میں بخار کم نہ تھا۔ بدن پونچھنے کے بعد بھی بخار نیچے نہ آیا تو اس نے بیوی سے مشورہ کر کے بخار اتارنے والی آدھی گولی پانی میں گھول کر بچے کو پلائی۔ بڑی مشکلوں سے روتے ہوئے بچے نے دوا حلق کے نیچے اتاری تھی۔

بچے کی ابتر حالت دیکھ کر وہ گھبراہٹ اور تشویش کی پرانی ذہنی حالت پر لوٹ آیا اور اب اس بلاخیز عورت کے تعلق سے اپنے ذہن میں دوڑتے ہوئے خیالات پر اسے ندامت کا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے اس نے اس دلربا سیم تن کی بیچارگی کا فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کیا ہو۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں تخیل اور خواب کی لذت کے سرخ ڈورے اب بھی تیر رہے تھے۔ اور اسے اپنے آپ پر حیرت نہ ہوئی تھی۔ ادھر ایک عرصے سے اس کے جسم کے مختلف عضو اور اس کا ذہن اس کے قابو سے باہر ہونے لگے تھے۔ سوچتا کچھ اور کرتا کچھ اور، ہاتھوں سے کچھ اور کام لینا چاہتا، وہ کچھ اور کام سرانجام دیتے۔ لمحہ لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے اعصاب کمزور پڑنے لگے ہیں۔ عمر کی ڈھلان پر انسان ایسی ہی بے بضاعتی میں گھر جاتا ہے۔

بچے کا بخار کم ہوگیا تھا۔

بیوی اب اپنے بچے پر کم اور اس پر نگاہ رکھنے میں زیادہ منہمک ہوگئی تھی۔

یوں ہی آنکھوں آنکھوں میں رات کٹ گئی۔ اس درمیان کتنی ہی بار بچے کا بخار سو سے اوپر چڑھا اور اسے دوا اور پونچھے کے زور سے سو پر لایا گیا کمال یہ تھا کہ بخار کسی بھی حالت میں سو سے نیچے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کے بچے کے جسم میں دو بوتل گلوکوز اور دوائیں سرایت کر چکی تھیں۔

صبح بھی بخار کا وہی عالم تھا۔کم بخت گویا یہ کوئی بخار نہیں کڑا آسیب تھا جس نے اس کے بچے کو آلیا تھا اور اب جان چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اچانک اسے ایسا لگا کہ اس فلک بوس عمارت کو چاروں طرف سے سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہو...

گھوڑے ہر منزل کی جانب چھلانگیں لگاتے ہوئے دلدوز آواز میں ہنہنا رہے تھے۔

اس نے عمارت کے گارڈ سے ملنے کے بارے میں سوچا۔

دلربا کا پرکشش وجود پارہ پارہ ہو چکا تھا۔

اس کا مادرزاد برہنہ جسم اپنے نشیب وفراز کے ساتھ پوری آب وتاب سے چمکتا ہوا آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ دھیرے دھیرے پس منظر میں معدوم ہوتی چلی گئی....وہ پھر دلربا کے ساتھ وسال یار میں محو تھا۔

تیرھواں باب

موجِ تہہ نشیں

صبح حوائج ضروری سے فراغت کے بعد اسے ڈیڑھ سس کو فون کرنے کا خیال آیا۔وہ پی۔سی۔او کی طرف نکلا ہی تھا کہ راستے میں کسی نے شفقت سے اس کے پٹھے پر ہاتھ رکھا۔

''بخار نہیں اترا؟ کوئی بات نہیں۔گھبراؤ نہیں۔علاج جاری رکھو۔اس میں کمی نہ کرنا۔''

اس نے کچھ ناگواری اور کچھ سراسیمگی سے مڑ کر دیکھا۔وہی پُراسرار محسن اسے بڑی اپنائیت سے گھور رہا تھا۔جانے کون ہے یہ شخص۔اسے دیکھتے ہی میرے احساسات میں ہلچل مچ جاتی ہے۔جسم پر کپکپی طاری ہونے لگتی ہے اور.....

''میرے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا کہ میں بے یار و مددگار تھا۔پھر میں کہاں سے کامیابی حاصل کرتا۔میں نہیں مانتا کہ موت کا وقت پہلے سے لکھا ہوتا ہے۔موت کا وقت تو ہم لوگ لکھتے ہیں۔لیڈر، ڈاکٹر، ہم تم، پورا نظام اپنی مکروہ انگلیوں سے ہم جیسوں کی موت لکھتا رہتا ہے۔تمھیں غصہ نہیں آتا؟''

''آتا ہے بہت آتا ہے۔اسی لیے تو سائنٹیفک سوشلزم کے جمہوری نظام اور انقلاب پر یقین رکھتا ہوں۔

''جاؤ آگے کام کرو۔اس نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔''تمھیں فون کرنا ہے؟''

''ہاں.....جی ہاں فون کرنا ہے۔''وہ کچھ گڑبڑا کر بولا۔

اس پُراسرار آدمی کو کیسے خبر ہوگئی کہ میں کسی پبلک فون بوتھ کی تلاش میں جا رہا تھا؟ اس کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوا وہ کانپتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔اجنبی ابھی وہیں کھڑا تھا۔وہ کچھ شرمندہ ہو کر تیز تیز قدم بڑھانے لگا اور پھر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ معمر شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے یا نہیں۔

ٹیلی فون پر بچے کا بخار نہ اترنے کی خبر سن کر ڈیڑھ سس صدمے سے دوچار ہوگئیں۔ان کی آواز سے نقاہت جھلکنے لگی۔انہیں اچھی خبر ملنے کی توقع تھی۔پھر انھوں نے خود کو سنبھالا۔اسے گھبراہٹ سے باز رہنے کی تلقین کی۔یہ بھی بتایا کہ سخت اور زود اثر دواؤں سے بخار اتارنے کی ضرورت نہیں۔دوا کو آہستہ آہستہ اپنا کام کرنے دینا چاہئے۔بچپن کے ٹائیفائیڈ میں بخار اتارنے کی زود اثر دواؤں کے استعمال کا پھل وہ اب تک بھگت رہی تھیں اور عارضۂ قلب میں مبتلا تھیں۔ان کے دل کا ایک والو کمزور ہو گیا تھا۔اب وہ مستقل پیس میکر پر تھیں۔

فون کرنے کے بعد اس نے ناشتے کا خیال ترک کر دیا۔ڈیڑھ سس نے بتایا تھا کہ وہ ناشتہ تیار کر کے لا رہی ہیں۔اس نے صرف چائے پر اکتفا کیا اور ڈھابے کے لڑکے کو ایک نہیں بلکہ دو کپ گرما گرم چائے اپنے کمرے میں پہنچانے کی ہدایت کی۔ساتھ میں چار بسکٹ بھی۔

ایک چائے بیوی کے لیے اور ایک چائے اس پڑوسی گداز بدن دلربا کے لیے جس کے ساتھ رات میں وہ اس نے سوچا کہ کم از کم اتنی خوش اخلاقی کا مظاہرہ تو کرنا ہی چاہئے۔

اس نوازش کے لیے اس عورت نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے سروں میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔اس کی بیوی شاید دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئی۔اس نے جواب میں کہا۔

''نہیں صاحب، یہ تو میرا فرض تھا، پڑوسی ہونے کے ناتے۔صبح میں چائے کی شدید طلب کی کیفیت سے میں واقف ہوں۔''

بات کی راہ نکلی تو اس عورت نے پھیکے سے تبسم کے ساتھ بتایا کہ وہ ایک پرائیویٹ کالج میں معمولی سی اجرت پر ملازمت کر رہی تھی۔اس کا شوہر مرکزی حکومت کی نوکری میں تھا اور اس وقت دور دراز کے شہر میں تعینات تھا۔اب گھر پر تنہا وہ اپنے سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ایک زمانے سے امید تھی کہ اس کے شوہر کا تبادلہ اسی شہر میں ہو جائے گا۔وہ شوہر کے ہمراہ نہیں گئی۔پھر یہ بھی مسئلہ تھا کہ اس کے سسر کی دیکھ بھال کون کرتا۔اس کی ساس کو مرے ہوئے کئی برس گزر چکے تھے۔اس کا شوہر بہت فرماں بردار اور سعادت مند قسم کا بیٹا تھا جو اپنی ضرورتوں پر اپنے باپ کی ''ضرورت'' کو فوقیت دیتا تھا۔اس کے لیے بہتیرے ''راستے'' تھے، لیکن باپ کے لیے آج کے عہد میں یہ واقعہ بیٹے کی سعادت مندی کی نمایاں مثال تھا۔

رات کے دوسرے یا تیسرے پہر اس کا خرانٹ رنڈوا سسر اسے آ کر اپنی گرآغوش میں دبوچ لیتا

تھا اور وہ اپنا سراپا اس کے سپرد کر دیتی۔

یوں بھی چھلکتی اور ابلتی ہوئی جوانی شوہر کی عدم موجودگی کے کرب کے ازالے کی متقاضی رہتی تھی۔

سن رسیدہ کہنہ مشق سسر اسے جڑوں تک لازوال لذتوں سے سرشار کرنے کے ہنر میں طاق تھا۔

اپنے اناڑی شوہر سے وہ کبھی اس طرح لذیابی کے دریاؤں میں غوطے نہیں کھا سکی تھی۔ شوہر کے ہاتھوں ہمیشہ ایک ادھورے اور تشنگی کے احساس سے دوچار رہنا اس کا مقدر بن چکا تھا۔ اس کا سسر اس کے انگ انگ کے تار چھیڑ کر ان سے موسیقی نکالنے میں ماہر تھا۔ وہ موسیقیوں کی لہروں پر بلندیوں تک اڑتی ہی چلی جاتی تھی۔ ایسا سرور اسے کنوارے پن کے عاشق اور شوہر کے ساتھ کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

مشتعل بدن کے روم روم میں آسودگی کی لہریں پھیل جاتیں۔

سسر کے جانے کے بعد دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹانگیں پسار کر وہ بھرپور گہری نیند میں ڈوب جاتی۔

شروع شروع میں جب وہ نازک کلی تھی۔ شوہر اور کنوارے پن کے زمانے کے اناڑی عاشق کے ہاتھوں پھول نہیں بن پائی تھی؛ سسر کے پرزور بھوکے اور جوشیلے مردانہ حملوں تاب نہ لا پاتی۔ تکلیف سے بلبلا اٹھتی۔ دیر تک کراہتی رہتی۔ بعد ازاں پھول بن جانے پر لطف اندوزی اور تلذذ سے ہمکنار اور سرشار ہونے لگی..... مزید پرجوش حملوں کی متلاشی اور آرزومند رہنے لگی..... اپنی ٹانگیں وا کر کے کولہے کو اٹھا کر پہل قدمی کرتی اور سسر کے زوردار حیوانی حملوں کی طلبگار ہوتی۔

خوبصورت ندی متلاطم ہو کر سمندر میں ضم ہونے کے لیے بے قرار ہو جاتی..... لہریں مچلنے لگتیں..... اوپر اٹھنے لگتیں..... بار بار دیوانگی اور جنون کے عالم میں سمندر کا رخ اختیار کرتیں..... عجیب بے خودی، وارفتگی اور مدہوشی..... جیسے ذرا بھی دیر ہوئی تو سورج کی آگ میں بھاپ بن کر پورا وجود آسمان میں اڑ جائے گا..... ساری مستی کا عالم رفع ہو جائے گا۔

اس کے اشارے کنایے کی گفتگو ٹھہر ٹھہر کر زور دیتے ہوئے الفاظ کی ادائیگی کا دل نشیں انداز اور میٹھی رسیلی آواز جس میں بجتی ہوئی چوڑیوں کی کھنک بھی کبھی کبھی شامل ہو جاتی تھی۔ سننے والے پر محویت طاری کر دیتی تھیں۔ نہ معلوم ''ضرورت'' اور ''راستوں'' جیسے الفاظ کے بیان میں رمزیہ لہجہ اختیار کرنے کے پیچھے اس کا کوئی عندیہ تھا، اس کو ٹٹولنے کی ایک کوشش، یا صرف ایک سادہ، معصوم اور سپاٹ بیانیہ بغیر کسی مدعا کے بس یونہی۔

یا محض تکلم کا ایک مخصوص اسٹائل۔

اس کی بیوی استعجاب کی مورت بنی ٹکٹکی باندھے ہوئے دونوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ وہ پڑوسی عورت کی باتوں پر ہنکار بھر رہا تھا۔ لامحالہ اس کی بیوی

کو گلا کھنکھارتے ہوئے اس کا دھیان توڑنا پڑا۔

بچے کا بخار اب سو کے آس پاس تھا اور اب وہ اسی کو غنیمت سمجھنے لگے تھے۔ گھبراہٹ اس وقت طاری ہوتی جب تھرمامیٹر کا پارہ اوپر کی جانب چڑھنے لگتا۔ اس درمیان کمپاؤنڈر نے دوا اور گلوکوز کی نئی بوتل چڑھا دی تھی۔ ملازمین اسپتال کی صفائی اور دوسری سرگرمیوں میں چاق و چوبند دکھائی دے رہے تھے۔ بغل کے ٹوائلیٹ سے فنائل کی بو آ رہی تھی۔

اس نے بیوی کی نظریں بچا کر اس عورت کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا آنچل کندھے سے ڈھلک گیا تھا۔ اس کا رنگین ٹانسپیرنٹ بے آستین اور بیک لیس بلاؤز قیامت ڈھا رہا تھا۔ رات کے وقت اس نے ساری کو ذرا سختی سے لپیٹ رکھا تھا۔ بلاؤز سے باہر نکلے ہوئے سڈول بازو بے حد اشتعال انگیز تھے۔ کندھے اور پیٹھ کی مچھلیاں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں..... بیوی نے اسے پھر ٹہوکا دیا اور بچے کا منہ پونچھنے کی ہدایت کی۔ وہ پھر شرمندہ ہو کر نظریں کسی اور طرف رکھنے کے لیے جگہ ڈھونڈنے لگا۔

اسی اثنا میں جونیئر ڈاکٹر آیا اور بخار نہ اترنے کی شکایت پر اس نے شام تک افاقے کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے بتایا کہ اب اس کی شفٹ بدلنے والی ہے اور وہ دوسرے جونیئر ڈاکٹر کو چارج دے رہا ہے۔

تھوڑی دیر میں ڈیڑھ سسر اور ساڑھو اسکوٹر پر سوار ہو کر صبح کا ناشتہ اور دن کا کھانا لے کر آ گئے۔ ساڑھو نے بھی بغل والے بستر پر بچے کی ماں کو گرسنہ نظروں سے دیکھا۔ امتداد وقت کے ساتھ جب ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے عورتیں اپنے جسم میں ضرورت سے زیادہ چربی اکٹھا کر کے ڈھیلی ڈھالی بے ڈول ہو جاتی ہیں یا گٹھیلے گوشت پوست وقت کی چکی میں پستے پستے پنجر میں تبدیل ہونے لگتے ہیں تو ایسی عورتوں کے شوہروں کی نفسیاتی و جنسی خواہش دوچند ہو جاتی ہے۔ ایسا اس نے اپنے سینئر دوستوں سے سنا تھا۔

اس کے ساڑھو عمر میں کم تفاوت کے سبب اس سے خاصے بے تکلف تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرائے اور سرگوشی میں بولے۔

''رات اچھی گذری ہوگی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

عورت کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اس کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

معاً اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی کے کان ضرورت سے کچھ زیادہ کھڑے ہو گئے ہیں۔

خطرے کا احساس کرتے ہوئے اس نے بات بدل دی۔

''بخار ہے کہ اترنے کا نام نہیں لیتا بھائی صاحب!''

بخار کا نام لیتے ہی قدرتی طور پر اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بیوی کا

اضطراب ختم ہوگیا۔

''نوشے بھائی! آپ خود ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر کے بات کیجئے۔ یہ تو بس لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مریض کی ایسی سیریئس حالت میں کہیں ڈاکٹر سے آدمی الجھتا ہے؟''

اس کے ساڑھو نے اپنی سالی کی بات بڑے تحمل کے ساتھ سنی۔ پریشانی اب ان کے چہرے سے بھی عیاں تھی۔ لیکن وہ خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ایسا بھی کیا کہ آج چوتھا دن ہونے کو آیا اور بخار ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ سوڈگری سے نیچے آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔''

وہ نیچے گئے اور کچھ دیر بعد وہی مژدہ لے کر واپس آئے، جس کی اطلاع رات میں ہی سینئر ڈاکٹر دے چکا تھا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اللہ کا سب کرم ہے!''

اور کب گھبرائے انسان؟ ننھے سے بچے کے جسم میں اتنی بھی جان نہیں بچی تھی کہ ڈھنگ سے کسی بات کا جواب دے پاتا۔ سوال پوچھے جانے پر نقاہت کے مارے بس آنکھ اور گردن کے ہلکے اشارے سے اثبات ونفی کا اظہار کرتا تھا۔ بخار چڑھنے پر جس وقت اسے پونچھا لگایا جاتا تو شدید ردعمل اور اکتاہٹ سے اس کا چہرہ تمتمانے لگتا۔

پانی سے بھیگے ہوئے کپڑے کی مستقل رگڑ کھاتے کھاتے اس کے جسم کی کھال سفید پڑنے لگی تھی۔ اسے اپنے بچے کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر محسوس ہوا۔ چھوٹے سے دو غاروں کے اندر بجھتے ہوئے دیے۔ انہیں روشن رکھنے کے لیے وہ اپنی پوری قوت صرف کر رہا تھا۔

اس کا دل بھر آیا ''میرا بچہ۔ بچارا میرا بیمار بچہ۔ جب سے پیدا ہوا ہے تکلیفیں اٹھا رہا ہے۔'' وہ اپنے بچے کے چہرے پر جھک آیا۔ اس کے منھ سے سسکی نکل گئی۔

بغل والے بچے کے ساتھ آئی ہوئی عورت سے اس کا رونا شاید برداشت نہ ہوا۔ ''بھائی صاحب، بھائی صاحب'' کہتے ہوئے اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گرم گرم لمس پا کر وہ زور زور سے رونے لگا۔

''جب یہ پیٹ میں تھا، اس کی ماں کو بی کولائی ہوگئی۔ پیدائش کے وقت اس بات کا ڈر تھا کہ اسے بھی بی کولائی یا پیلیا ہو جائے گا۔ بی کولائی کے علاج کے لئے جو اینٹی بایوٹک استعمال کی جا رہی تھی وہ بے حد گرم تھی اور اس کا سائڈ ایفیکٹ براہ راست جگر پر تھا۔ ڈاکٹر کو اس کی ماں کے علاج میں خصوصی احتیاط برتنی پڑی تھی کہ جگر خراب ہونے سے بچ جائے۔ بچ تو گیا لیکن بیماریوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔ اور اس بار بے چارہ ایسی مصیبت میں پھنس گیا ہے کہ.....''

عورت نے اسی رسمی لہجے میں دلاسا دیا۔

''بھائی صاحب۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے دیکھئے میرا بچہ رات سے بخار میں جل رہا ہے۔

اکیلی ہوں۔ کوئی مدد کرنے والا نہیں، پھر بھی ہمّت نہیں ہار رہی ہوں۔ آپ مرد ہو کر..... ذرا سوچئے بھابی جی کے بارے میں، ان کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔''

اسے اپنی حماقت کا احساس اس وقت ہوا جب ''کیوں کیوں'' کی پراسرار اور بھرائی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ سب لوگ اس نامانوس اور بھاری آواز کو سن کر چونک پڑے۔ اس نے گردن گھمائی۔ دروازے پر وہی محسن کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ تبسم کے باوجود اس کی آنکھوں میں گہری اداسی مترشح تھی۔

''کیوں؟ کیوں گھبرا گئے؟ کیوں گھبرا گئے؟ اجی کہہ دیا نا کہ تمھارے بچے کو کچھ نہ ہوگا۔ تمہیں جشن مناتے ہوئے یہاں سے واپس ہونا ہے۔ میرے رہتے تم پریشان کیوں ہو گئے؟ میرا تو کوئی غمخوار نہ تھا۔ تمھیں فتح حاصل ہوگی، دیکھنا تو سہی۔''

وہ آگے بڑھ آیا اور اسے جھنجھوڑ کر درشت لہجے میں بولا۔

''خبردار! میں تمہیں روتے دھوتے اور ہمت ہارتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ بولو اور کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟''

اس کی توسٹی گم ہوگئی، اس کی ذرا سی بھول کی وجہ سے دروازے پر بھیڑ سی اکٹھا ہوگئی تھی۔

اس فلور کے تمام مریضوں کے تیماردار وہاں پر کسی کی موت ہو جانے کے اندیشے سے جمع ہو گئے تھے۔ معمّر آدمی سب سے مخاطب ہوتے ہوئے زور سے بولا۔

بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ صرف بخار نہیں اتر رہا ہے۔ آپ لوگ بھیڑ چھانٹئے۔ چلئے ہوا آنے دیجئے۔ ہوا مت روکئے۔''

اس کی گونجتی ہوئی آواز اس بھیڑ میں اس کے لئے راستہ بناتی چلی گئی۔ چشم زدن میں لوگ تتر بتر ہو گئے۔

اب وہاں دو مریضوں کے علاوہ صرف دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔

اس کی بیوی نے رات کے کھانے کے جوٹھے برتن صاف کر کے اپنی بڑی بہن کے جھولے میں ڈال دئے۔ اس کے ساڑھو نے گھڑی دیکھی۔ دفتر کا وقت ہو رہا تھا۔ اجازت طلب انداز میں انھوں نے اپنی سالی کی طرف دیکھا، پھر اس سے مخاطب ہو کر بولے:

''یار تم نے تو حد کر دی، عورتوں سے بڑھ گئے۔ مرد کہیں اس طرح روتے ہیں۔ گھبراؤ نہیں ہم لوگ رات میں پھر آئیں گے۔ انشاءاللہ اس وقت تک بابو ٹھیک ہو جائے گا۔

چودھواں باب

انگنت گھوڑوں کا قافلہ

اللہ اللہ کر کے دن ختم ہوا۔

کئی بوتل گلوکوز چڑھا جس کے ساتھ مختلف دوائیں بچے کے جسم میں اتاری گئیں۔

جونیئر ڈاکٹر کئی بار آیا۔ ہمیشہ مسکراتا ہوا۔لیکن بیوی کی اندرونی پژمردگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ دن بھر وہ اپنے بچے کے تخم پڑنے سے لے کر اب تک کے واقعات کو گہری تشویش کے ساتھ الٹ پلٹ کر ٹٹولتی رہی۔ بار بار وہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتی، ''ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟'' کا وِرد کرتی رہی۔

بغل والے بیڈ کے مریض بچے کا بھی بخار گھٹنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ بیوی نے کڑوے دل سے سوچا، اس بلا کو بھی اسی کمرے میں آنا تھا۔ رات میں اپنے شوہر کا اس عورت کو گھور گھور کر دیکھنا اور صبح اس عورت کا اپنے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھنا اور پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے دلاسا دینا اسے ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ ویسے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے جذبۂ منافرت پر قابو پا کر وہ ملائمت کا رنگ چڑھا لیتی تھی۔

بچہ مستقل آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی، کہیں بھاگ چلوں۔ اپنے بچے کو اٹھا لے جاؤں۔ یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ کسی دوسرے نرسنگ ہوم میں۔

شوہر پان سگریٹ کی علتیں پورا کرنے نیچے گیا ہوا تھا۔ دونوں عورتیں اپنے اپنے بچوں کی بغل میں بیٹھی خود کو دنیا کی بدقسمت ترین عورت شمار کر رہی تھیں۔ اسپتال کے باہر فضا میں شاید کرگسوں کے جھنڈ منڈلا رہے تھے۔ ملگجے بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان نیچے کی طرف جھکتا دکھائی دیتا تھا۔ سورج اپنا رخت سفر سمیٹ چکا تھا۔ ساکت بازوؤں کے ساتھ فضا میں تیرتے ہوئے کرگسوں کو دیکھ کر دونوں عورتیں لرز اٹھتی تھیں۔

یا معبود! کیا ہونے والا ہے؟''

''ہے بھگوان اپنی شرن میں رکھنا۔''

دوسرے کسی کمرے سے کسی سیریئس مریض کی تیماردار کی بار بار ''واہگرو.....واہگرو'' کی آواز ان کے کانوں سے ٹکراتی تھی۔ دونوں عورتیں گویا دنگ سی ہوگئی تھیں۔ ان کے بچوں پر کیسا بحران آپڑا تھا جو ہلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

کسی طرح شام ہوئی۔ اس کے دفتر کے اکا دکا لوگ عیادت کو آئے تھے۔ لگاتار بخار کی جکڑ بند کی تفصیل سن کر سب گہری تشویش میں مبتلا ہوگئے لیکن ہمت نہ ہارنے کی تلقین کی رسم ادا کر کے ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔

رات ہوئی۔ ضبط کا باندھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آج سینئر ڈاکٹر سے پوچھ کر رہوں گا۔

اٹھارہ گھنٹے۔

پھر چوبیس گھنٹے۔

پھر.....

آخر کب بخار نیچے آئے گا؟

بچہ بھیگے ہوئے کپڑے کے لمس سے عاجز آچکا تھا لیکن اب اس میں اس کے خلاف اظہار نفرت کی سکت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جلد کی شکنیں اور پانی کی پیدا کردہ بدرنگی ہی اس کی دلی نفرت اجاگر کر رہی تھیں۔

سینئر ڈاکٹر آیا، حسب معمول مصنوعی اور کاروباری مسکراہٹ سے لدے پھندے منحوس چہرے کے ساتھ۔ تلخ لہجے میں تقریباً جھگڑتے ہوئے اس نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کی بار بار یقین دہانی اور ساری دواؤں کے استعمال کے باوجود بخار سوڈگری سے نیچے نہیں آیا۔''

ڈاکٹر حسب معمول زیر لب مسکرایا۔ اس نے گردن ہلائی۔ کندھے اچکائے اور پھر قدرے طویل مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ مرد کے شانے پر رکھ دیا۔

''میں جانتا تھا آج آپ بہت غصے میں ہوں گے۔'' اس کی مسکراہٹ بدستور جاری تھی۔ وہ ایک لحظے کو رکا، ''دیکھئے۔ آپ کے بچے کا بخار نیچے لا کر نارمل کرنے کا کام میں ایک منٹ میں انجام دے سکتا ہوں۔ یوں،'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''لیکن میں جان بوجھ کر ٹمپریچر اچانک ڈاؤن نہیں کر رہا ہوں۔ اس کا آفٹر ایفیکٹ بہت خراب ہوگا۔ گٹھیا اور ہارٹ کے کامپلی کیشن ہو سکتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو بخار دوبارہ آجائے گا، چار ہی پانچ دن بعد۔ انفکشن، انٹرک فیور میں کنورٹ نہ ہو۔ اس کے لیے یہ احتیاط رکھنی چاہئے۔ دھیرے دھیرے ٹمپریچر کو نارملائز کرنا۔ بخار کھنچ کھنچ کر جسم کے cells سے نکلے تو ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ دواؤں اور گلوکوز کی سپورٹ اس لئے دے رہا ہوں کہ انفکشن بڑھنے نہ پائے، آہستہ آہستہ بدن میں اس سے لڑنے کی قوت پیدا ہو۔ بچے کے بدن میں بخار سے ہونے والے دوسرے نقصانات سے لڑنے کی شکتی قائم رہے، To maintain his power of resistance"۔ کچھ سمجھے آپ؟'' اچانک اس کے لہجے میں کچھ برہمی سی آگئی۔

ڈاکٹر ایک لمحے کے لئے رکا، پھر اس نے ذرا بلند آواز میں کہا۔

''نادان ڈاکٹر مریض کی تسلّی کے لیے بخار فوراً اتار دیتا ہے۔ مریض کو فیوچر میں اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ آپ کے حساب سے تو میں خراب ڈاکٹر ہوں۔ آپ جسے شہر کا سب سے اچھا ڈاکٹر سمجھتے ہوں اس کے پاس چلے جایئے۔ اگر وہ میری بات غلط قرار دے تو اب تک آپ کا جو خرچ ہوا وہ میرے سر۔''

''جی نہیں، اب میں اسے کہاں لے جاؤں گا۔'' اس نے بیوی کی ملامت بھری نگاہوں کو دیکھ کر معذرت کے لہجے میں کہا۔ ''میں تو آپ کا نام سن کر، آپ پر پورے اعتماد کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔''

''تو جناب، مجھ پر وشواش بنائے رکھئے، آپ کے بیٹے کا بخار دھیرے دھیرے اترے گا۔ دیکھئے پہلے ایک سو چھ ڈگری تھا۔ اس کے بعد اتر کر ایک سو تین اور ایک سو دو ہوا۔ اب وہ سو ڈگری اور اس سے ذرا اوپر کے رینج میں چل رہا ہے۔ کل سے ننانوے ڈگری میں آئے گا اور پھر اوپر بھاگے گا۔ پھر ایک دو روز کے بعد انٹھانوے پوائنٹ چھ آئے گا اور پھر اوپر جائے گا۔ اسی طرح دھیرے دھیرے نیچے آتے آتے نارمل ٹمپریچر کی consistecny حاصل کر لے گا۔ لیکن سنئے، اتنا وقت میں ایک مریض کے تیماردار کو سمجھانے میں لگا دوں تو دوسرے کو کب دیکھوں گا؟ آپ تو مجھ پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ ہاں آپ کی میم صاحب میرے علاج سے کترا رہی تھیں۔'' ڈاکٹر نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ میری بیوی کی طرف دیکھا۔

''میڈم نشچت ہو کر اپنے بچے کو صرف پونچھا لگاتی رہئے۔ دھیرے دھیرے کر کے بچہ اچھا ہوگا تو بعد میں اس کی جوانی کے بانکپن کو دیکھ کر آپ مجھے دعائیں دیں گی۔''

''چوبیس گھنٹوں میں بخار اترنے کی جھوٹی گارنٹی اس لیے دی تا کہ آپ کی ہمت بنی رہے۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے مریض اور اس کے اٹنڈنٹ کی ہمت بڑھانا بھی تو ہمارا کام ہے! اچھا بائی بائی۔''

ڈاکٹر چلا گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اس نے سوچا کیسا وائرل انفکشن ہے؟ اور انٹرک فیور، یا ٹائیفائڈ..... میرا بچہ بچے گا بھی تو اس کی جوانی کا جشّہ کیا ہوگا؟ جسم لاغر اور مریل، دماغ کمزور، سر کے بال اڑے ہوئے۔ وہ اپنی ایک بہن کا حشر دیکھ چکا تھا جو ٹائیفائڈ میں مبتلا رہنے کی وجہ سے میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکی تھی۔ جیسے تیسے خوب کھلا پلا کر اس نے اسے تگڑا بنا بھی دیا تو کیا ہوگا؟ اونھ، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا، اور حالات کو مقدر کے حوالے کر کے یک گونہ سکون محسوس کیا۔ اس نے پھر اپنے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔

خارجی چیزیں حسب معمول اپنی جگہ پر قائم تھیں۔ فرق صرف اتنا آیا تھا کہ رات کے دس بج گئے تھے اور اب تک ساڑھو یا ڈیڑھ سس کا اتا پتا نہ تھا۔ دبی زبان میں اس نے بیوی سے اس امر کا اظہار کیا تو چشم زدن میں میکے کے لوگوں کی فوقیت کا خیال کرتے ہوئے اس نے تیوری چڑھالی۔ لیکن ماتھے کی سلوٹوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اندرونی طور پر وہ بھی گہری تشویش میں مبتلا تھی۔

''کوئی کب تک اپنا کام دھام چھوڑ کر..... تمہاری طرف کا رشتہ دار آیا؟ بس دفتر کے اکا دکا لوگ۔ اس لئے پلیز طعنے مت دو۔ میرا دل یوں ہی بہت رنجیدہ ہے۔''

جان چھڑانے میں ہی اس نے اپنی عافیت سمجھی۔ وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

''اپنا بچہ سنبھالو۔ میکے والا ہو کہ سسرال والا، اس زمانے میں کوئی زیادہ دور ساتھ نہیں چلتا۔''

رات ڈھلے اسپتال کے باہر کسی کتّے نے دردناک آواز میں رونا شروع کر دیا۔ سرپٹ گھوڑوں

کی ٹاپوں کی پراسرار آواز دھیمے دھیمے ابھری۔ جاگنے والے تیماردار دہل کر رہ گئے۔ سب نے گہری اداسی کے ساتھ اپنے اپنے مریض کا چہرہ دیکھا۔ اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یا مشکل کشا!''

اچانک سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ زور سے گونجنے لگی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بیوی ساری کے پلّو میں سر چھپا کر آنسو خشک کرنے لگی۔

جیسے تیسے آنکھوں آنکھوں میں رات کٹی۔ صبح اس نے بچے کی بغل سے تھرمامیٹر نکالا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کے چہرے کو خوشی سے کھلا ہوا دیکھ کر بیوی نے استعجاب اور امید بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''اجی سنتی ہو! بخار ننانوے پر آ گیا۔ ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ واہ بھئی واہ۔'' اس کی بیوی کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھ گئے۔

صبح ختم ہوئی۔ دن شروع ہو گیا۔ اس کی ڈیڑھ سس اور ساڑھو نہیں آئے۔ بخار اوپر چڑھا لیکن ہلکے پونچھے کے بعد پھر ننانوے ڈگری پر واپس آ گیا۔ گلوکوز کی نلیوں کے ذریعہ اس کی شریانوں میں مستقل سرایت کرتی ہوئی دوا اس کی قوت مدافعت میں اضافہ کر رہی تھی۔

وہ اسپتال ٹمپوروٹ میں نہیں پڑتا تھا۔ ایک ہفتے بعد صحت یاب بچے کو لے کر مختصر سے رخت سفر کے ساتھ وہ رکشے پر گھر کے لیے روانہ ہوئے۔

وہی شہر کے دو علاقوں کو ملاتا ہوا نشیب و فراز والا اوور برج راستے میں پڑا تو آمد کے وقت اس نے جس طرح متعدد گھوڑوں کی ٹاپوں کے درمیان خود کو روندتا اور پارہ پارہ ہوتا دیکھا تھا اب جاتے وقت خود کو گھوڑ سوار کی شکل میں دیکھ رہا تھا۔

اس کو لگا کہ وہ گھوڑے پر سوار، جشن مناتا اور کلیلیں کرتا ہوا لوٹ رہا ہے۔ ایک گھوڑے پر خود وہ، اس کے پیچھے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اس سے لپٹی ہوئی بیوی۔ اور دوسرے گھوڑے پر سوار گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا اس کا بانکا چھیلا بیٹا..... اور پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے انگنت گھوڑوں کا قافلہ۔

پندرھواں باب

ہجر و وصال

بچے کی بیماری کے جھنجھٹ میں اس پرکشش دلربا عورت کا ذکر رہ ہی گیا کہ بعد میں اس کا کیا ہوا۔ ہونا کیا تھا۔

دونوں بچوں کو ایک ہی دن چھٹی مل گئی تھی۔ وہ بھی ان کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔
اسے بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چھوڑ کر جاتے وقت اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں نم تھیں۔ زیر لب معنی خیز مسکراہٹ اور آنکھوں کی گہری نامعلوم اداسی کے ساتھ وہ دور دور تک اس کی طرف ٹکٹکی باندھے رہی، نہارتی رہی، حتیٰ کہ وہ نقطہ بن کر معدوم ہو گیا۔

وہ جب اپنے بچے کی صحت یابی کے بعد لوٹ رہا تھا تو پُل پار کرتے ہوئے بار بار اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی (پیچھے بیٹھی ہوئی بیوی اس حقیقت سے، ظاہر ہے کہ انجان تھی)۔

بھینی بھینی خوشبو سے معطر عورت کا گداز کولھا مرد کی گود گرما رہا تھا۔

ہوش اڑا دینے والے مدور اشتعال انگیز کولہے مرد کے اندر شدید ابال پیدا کر رہے تھے۔

ان کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

عورت کے بدن کی گداز چرب دار پہاڑی کی سخت و نرم گولائیوں کے لمس سے مرد کے جسم میں شرارے چھوٹ رہے تھے۔

خون کا درجہ حرارت بڑھ گیا۔

نسیں پھٹنے لگیں۔

سانسیں تیز تیز اور تیز۔

گھوڑے کی چکنی پیٹھ پر سوار مرد اور عورت اشتعال انگیز ہچکولے کھا رہے تھے۔

کیف و مستی کے عالم میں قطرہ قطرہ دونوں کا وجود پگھلتے ہوئے ایک دوسرے میں سرایت کر کے ضم ہونے کا سفر اختیار چکے تھے۔

دونوں کے منہ سے لذت آمیز سسکاریاں نکلنے لگیں۔

سرخ کبوتروں نے پر پھڑ پھڑائے۔

مرد کی انگلیاں رقص کرنے لگیں۔

عورت نے زوردار انگڑائی لی۔

خوش آہنگ اور رنگ برنگ پرندے ان کے سروں پر رقص کرتے ہوئے منڈلانے لگے۔ پھر دور دور تک سناٹا پسر گیا۔ ایسے میں ایک شدید دبی ہوئی چیخ ابھری۔

کا گا سب تن کھائیو رچن چن کھائیو ماس
ای دو نیناں مت کھائیو رپیا ملن کی آس

امتداد وقت کے ساتھ ہجر و وصال کے تلاطم میں ہچکولے کھاتے ہوئے وصال کو ایک عرصہ گذر گیا۔

صدیاں بیت گئیں۔

وقت قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

آسمانی کتابوں کے اوراق گہرے طوفان میں گھٹی گھٹی چیخیں بلند کرتے ہوئے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ معلوم ہوتا کہ اب اور بس اب دم توڑ دیں گے۔

کراہتی ہوئی چیخیں مرد اور عورت دونوں کے حلق سے مسلسل نکل رہی تھیں۔

ناپائیداری رہے ثباتی رنا کارگی ہستی
رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
کا گا سب تن کھائیو رچن چن کھائیو ماس
ای دو نیناں مت کھائیو رپیا ملن کی آس
بے در و دیوار سا ایک گھر بنایا چاہئے
کوئی ہم سایا نہ ہو اور ہمنوا کوئی نہ ہو
کاوے کاوے سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کوئی جنازہ اٹھتا نہ کوئی مزار ہوتا

سولھواں باب

میجک ریلزم

کچھ دن کے بعد حالات نارمل ہوئے تو اسے انجان فرشتہ صفت محسن کا خیال آیا۔ ادھر ادھر سے

پانچ سو اکٹھا کر کے اس نے قرض کی ایک قسط فوراً ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

پرانی پتلون کی جیب میں پڑے ہوئے کاغذوں کے انبار میں وہ اس کے پرزے کو بڑی مشکل سے ڈھونڈ پایا۔لیکن لکھے ہوئے پتے اور ٹھکانے پر پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ وہ گھر خالی ہے۔محلّے میں بہت دریافت کرنے پر پتا چلا کہ اپنے بیٹے کی موت پر انھیں خودکشی کیے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا۔اب تو ان کی راکھ بھی فضا میں کب کی تحلیل ہو چکی تھی۔

سکتے کے عالم واپس لوٹتے ہوئے اسے لوگوں کے ازدحام میں سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ معدوم ہوتی ہوئی سنائی دی۔

پست لہجے میں بیوی کو واقعے کی روداد سناتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کی اپنی آواز ایک ناتواں سی ہنہناہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

''کیا ہوا آپ کو؟''

بیوی نے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔لیکن اب اس کے منہ میں کوئی لفظ نہ رہ گیا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

شوکت حیات کے قہقہے

شوکت حیات کے قہقہوں کی بنیاد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔محفل میں تو ان کے قہقہے بھونچال لاتے ہی تھے،فون پر بھی دھمال مچا دیتے تھے۔جن لوگوں کو ان سے بات کرنے کا موقع ملا ہوگا وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ جب وہ کسی پر لطف جملے یا فقرے پر ہنستے تھے تو ان کے قہقہوں کا رینج اتنا پھیل جاتا تھا کہ کبھی کبھی تو کان کے پردے پناہ مانگنے لگتے تھے۔اور اگر گفتگو کرنے والا بھی حسِ مزاح سے مملو ہے تو پھر ان کے قہقہے روکنے سے بھی نہیں رک پاتے تھے۔مجھے یاد ہے جب میں نے ان پر لکھے ہوئے خاکے کا کچھ حصہ جس میں ان کے پیری میں ادا کی گئی رسمِ عقیقہ اور اسی قبیل کی ایک دوسری رسم کا ذکر تھا،سنایا تو ان کے قہقہے ایک ایک جملے پر بلند ہوتے چلے گئے اور اس دن مجھے پتا چلا کہ فلک شگاف آوازیں کیسی ہوتی ہیں۔

غضنفر

تبصرے

نام کتاب: دیکھ لی دنیا ہم نے
صنف: سوانحی ناول
مصنف: غضنفر
سال اشاعت: ۲۰۲۱ء
صفحات: ۳۳۶
قیمت: ۳۵۰/روپے
تبصرہ نگار: اقبال حسن آزاد

''دیکھ لی دنیا ہم نے'' اردو کے مشہور و معروف قلم کار غضنفر کی تازہ ترین تصنیف ہے۔یہ ایک سوانحی ناول ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔

غضنفر کا اشہب قلم کئی میدانوں میں دوڑتا رہا ہے۔انہیں نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ان کے موضوعات بھی گوناگوں ہیں۔غضنفر کی اب تک ستائیس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں نو ناول، دو افسانوی مجموعے، تین شعری مجموعے، چھ تنقیدی کتابیں، ایک ڈراما، ترتیب و تدوین، دو، خاکوں کی تین مجموعے اور زیر نظر سوانحی ناول ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' شامل ہیں۔یہ ساری کتابیں مشہور و مقبول ہیں۔

غضنفر کی ناول نگاری کے تعلق سے لکھے گئے مضمون میں پروفیسر وہاب اشرفی نے صنف ناول کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''ایک زمانے سے ناولوں کی ایک مختصر سی تعریف چلی آتی ہے کہ It is a vehicle of social criticism کئی لحاظ سے یہ تعریف ادھوری ہے۔اس لیے کہ سماج زندگی کے وسیع عوامل پر محیط ہوتے ہوئے بھی کل نہیں ہے۔ذاتی زندگی کے پیچ و خم، سماجی effections پیش کر سکتے ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی اندرون کی دنیا ان سے الگ بھی ہو سکتی ہے۔فکر و نظر کے مدارج میں سماج ایک جزو ضرور ہے لیکن کل نہیں۔لہٰذا ناول کی تعریف وسعت چاہتی ہے تاکہ زندگی اور زمانے ہم پر اپنے تمام تر سیاق و سباق کے اس طرح عیاں ہوں کہ ہر ناول کے تجزیے کی ایک صحیح صورت نکل سکے۔بہ ظاہر یہ ایک دور از کار بات ہے

لیکن میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ شاعری کے بعد شاید ناول ہی نے ایسے جوکھم اٹھائے ہیں اور پوری زندگی کی تعبیرات کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔'' (غضنفر: ایک نئے ذہن کا ناول نگار.....وہاب شرفی)

آگے وہ لکھتے ہیں:

''غضنفر کی فکر اور سوچ کا دائرہ وسیع ہے لیکن ان کا ہنر اختصار اور جامعیت ہے لہٰذا ان کے ناولوں کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔'' (ایضاً)

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' ایک سوانحی ناول ہے اور اس میں وہ تمام فنی خوبیاں موجود ہیں جو ایک بہترین ناول میں موجود ہوتی ہیں۔ ابتداء، ارتقاء، انجام، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور نظریہ حیات.....اس میں سبھی کچھ موجود ہے۔ مشہور اور معتبر فکشن نگار سید محمد اشرف کا یہ کہنا بجا ہے :

''غضنفر کی خودنوشت 'دیکھ لی دنیا ہم نے' اردو کی تازہ ترین خودنوشت ہے جو اپنے اندر ناول جیسا حجم اور افسانے جیسا لطف رکھتی ہے۔'' (دیکھ لی دنیا ہم نے صفحہ نمبر۔۱۲) کتاب کی ابتداء بالکل افسانوی انداز میں ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''میں جس حلیے میں گھر کے اندر تھا اسی حلیے میں باہر نکل پڑا تھا۔ بغیر کسی سے ملے، بنا کسی کو کچھ بتائے ماموں کی بیٹھک سے نکل کر سیدھے سیوان ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ نیم بدحواسی کے عالم میں کیے گئے اس سفر پر اب جب غور کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ میرا یہ ناگہانی سفر ضرور کسی اضطراری کیفیت کے دباؤ کا نتیجہ تھا اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قربتوں میں جب دوریاں در آتی ہیں تو در و دیوار ڈرانے لگتے ہیں اور توقع کی لو جب بجھتی ہے تو رشتوں سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے اور یہ دھواں ایسا دیز اور دم سوز ہوتا ہے کہ اس کے گھنیرے گھیرے میں کھڑا ہونا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔'' (دیکھ لی دنیا ہم نے صفحہ نمبر۔۱۳)

غضنفر یوں تو کئی اصناف سخن پر قدرت رکھتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ 'کہانی انکل' ہی ہیں۔ 'آغاز قصہ'' کے تحت وہ لکھتے ہیں؛

''قصے کو لاکھ علّت و معلول کی رسّی سے باندھیے کوئی نہ کوئی سرا، سرک کر گرفت سے باہر نکل ہی جاتا ہے۔ شاید یہ ضروری بھی ہے کہ ذہن اصول و ضوابط کی باڑھ والے استدلالی رستے پر جلدی تھک جاتا ہے۔ سراوں کا منطقی دائروں سے باہر نکلنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو فسانہ فکشن نہ رہ کر فیکٹ بن جائے اور قصہ اپنا افسانوی فسوں کھو دے۔ اور قصہ جب جنوں کا ہو تو عقل کی دوڑ کو کہیں نہ کہیں سے تو ٹوٹنا ہی ہے۔ عقل پرست انسانی زندگی بھی کبھی کبھی ایسے موڑ سے گزرتی ہے کہ ہونی انہونی لگنے لگتی ہے۔ جو کچھ ہوا، لگتا ہے ویسا نہیں ہوا ہوگا۔ یا ویسا ہو ہی نہیں سکتا اور اسی لیے جو کچھ ہوا خود اپنی نگاہ میں بھی غیر معتبر

ٹھہرنے لگتا ہے۔ اسی لیے میری زندگی کے ایک مخصوص دور میں جو کچھ ہوا اور جس طرح ہوا، بغیر عقلی جانچ پرکھ کے میں اسے لکھتا چلا گیا۔ اور جب لکھ گیا تو لگا کہ کارِ جنوں کا سلسلہ آگے تک جاتا ہے اور اس جنوں کے دھاگے میں دوسرے سودوں کے سرے بھی جڑتے ہیں۔ اس طرح جنوں کا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اگر میں اسے استدلال کی کسوٹی پر چڑھاتا تو شاید کارِ جنوں میرے قلم کی نوک تک نہ آپاتا۔'' (صفحہ نمبر۔۷)

یہ افسانوی طرز بیان از اول تا آخر پوری کتاب میں یکساں ہمواری کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ کہیں پر بھی خشکی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

سیوان سے شروع ہوئی خودنوشت حج بیت اللہ پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ درمیان میں علی گڑھ، سولن، چنڈی گڑھ، لکھنو اور دہلی بھی آتے ہیں لیکن جس قدر روشن، تابناک، خوبصورت اور دل نشیں تصویر علی گڑھ کی پیش کی گئی ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ علی گڑھ ایک عجوبۂ روزگار شہر ہے۔ یہاں ایک جانب تالے بنتے ہیں جن سے بکسوں اور گھروں کو بند کیا جاتا ہے اور دوسری طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے جہاں دل و دماغ پر لگے تالوں کو علم کی چابی سے کھولا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جو پتھر کو ہیرا اور لوہے کو سونا بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ایک بار یہاں آجاتا ہے وہ اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چاہے دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلا جائے علی گڑھ اس کے ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ جگمگاتا رہتا ہے۔ غضنفر کے رگ و ریشے میں بھی علی گڑھ سمایا ہوا ہے۔ یہ ان کا وطن ثانی ہے۔ وہ خواہ سولن میں ہوں یا لکھنو میں، دہلی میں ہوں یا کہیں اور وہ کسی نہ کسی بہانے علی گڑھ کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ کبھی وہاں کے اساتذہ کے حوالے سے تو کبھی دوستوں کے حوالے سے۔ اسی علی گڑھ میں انہیں پروفیسر شہریار، پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر نادر علی خان، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر نسیم قریشی، پروفیسر خلیل الرحمٰن اور پروفیسر قاضی عبدالستار جیسے مشفق اور مہربان اساتذہ ملے جنہوں نے ان کی زندگی کی سمت اور رفتار متعین کی۔ شہریار صاحب تو غضنفر کے لیے فادر فیگر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ان کے سرپرست اور رہبر تھے۔ غضنفر کی شادی میں ان کے والد چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر شریک نہیں ہو سکے تھے۔ شہریار نے اس وقت ان کے والد کا کردار نبھایا اور اس طرح یہ شادی بحسن و خوبی انجام پائی۔ انہوں نے غضنفر کا کیریئر بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ کئی بار انہیں آوٹ آف وے جا کر بھی کام کرنا پڑا، اکثر لوگوں سے لڑائیاں مول لینی پڑیں مگر ان کے قدم پیچھے نہیں ہٹے اور انہوں نے بگڑی بنا کر ہی چھوڑی۔ غضنفر نے بھی خوب خوب حق شاگردی ادا کیا اور کتاب میں ہر جگہ ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی کتاب کا عنوان بھی شہریار کے مصرعے کے ایک ٹکڑے کو بنایا ہے۔

ان کے علاوہ علی گڑھ میں غضنفر کو کچھ ایسے احباب و افراد بھی ملے جن سے ان کی زندگی متاثر ہوئی۔ سینیئرز میں جاوید حبیب اور جونیئرز میں شافع قدوائی اور افراد میں کرنل یونس راہی معصوم رضا، کیپٹن افتخار وغیرہ۔ غضنفر نے اپنے تمام محسنوں کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ ان کے تعلق سے نہایت عمدہ باتیں بھی کہیں۔

غضنفر دوست بنانا بھی جانتے ہیں اور دوستی نبھانا بھی۔ گوپال گنج کے دوست ڈاکٹر نسیم عالم سے لے کر علی گڑھ، سولن، لکھنو، چنڈی گڑھ، پٹنہ، رانچی، کلکتہ، حیدرآباد، ممبئی تک ان کے کئی دوست ہیں۔ غضنفر ان کا تذکرہ نہایت اپنائیت اور محبت کے ساتھ کرتے ہیں البتہ دلی میں واحد نظیر اور کچھ اور دوستوں کے علاوہ کچھ زیادہ اشخاص ان کے قریب نہ آسکے کیونکہ بقول ان کے دلی والوں کا ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جس کے پاس سب کچھ ہے سوائے دل کے۔

علی گڑھ میں انہیں عزیز از جان رفیق بھی میسر ہوئے مثلاً طارق چھتاری، خورشید احمد، یونس اسلم، سید محمد امین، محمد زاہد، جاوید حبیب، رشید قریشی، سید محمد اشرف، محی الدین اشرف، صغیر افراہیم وغیرہ۔ ان کے علاوہ انہوں نے اپنے بچپن کے دوست نسیم احمد اور مشہور فکشن رائٹر پیغام آفاقی کا تذکرہ بھی نہایت محبت کے ساتھ کیا ہے۔ صفدر امام قادری بھی ان کے قریبی دوستوں میں ہیں۔ صفدر کے علاوہ بہار کے عبدالصمد، حسین الحق، شموئیل احمد، شوکت حیات، عالم خورشید، خورشید اکبر، مشتاق احمد نوری، فخرالدین عارفی، اسلم آزاد، اعجاز علی ارشد وغیرہ بھی ان کے حلقۂ یاراں میں داخل ہیں۔ ان میں سے بیشتر پر بھی غضنفر نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ اگرچہ اسی علی گڑھ میں ان کے خلاف سازشیں بھی رچی گئیں اور ان کی راہ میں کانٹے بھی بونے کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن کچھ اللہ کی مہربانی، استادوں کی سرپرستی، دوستوں دوستداری اور کچھ اپنی ذہانت کی مدد سے وہ ہر مشکل سے سرخ رو ہو کر باہر نکلے۔

اس کتاب میں غضنفر کی ذہانت اور فطانت کے جلوے جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ خواہ وہ گیزر میں انڈے ابالنا ہو، یونیورسیٹی کے گیٹ کا تالا کھلوانا ہو، ہوسٹل میں نان ویج شروع کروانا ہو یا پھر کلاس روم کے کوریڈور کو کوڑا کرکٹ سے پاک کرنا۔

غضنفر کا تعلق اگرچہ بہار سے ہے مگر علاقائیت ان میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ نہ ہاؤ بھاؤ میں، نہ برتاؤ میں، نہ سوچ وچار میں، نہ ہی زبان و بیان یا زبانی اظہار میں مگر وہ اس تصور کے خلاف ہیں جو بعض وجوہ کی بنا پر بہار کے باہر لوگوں کے ذہنوں میں اہلِ بہار کے بارے میں ابھار دیا گیا ہے۔ مثلاً بہار سے باہر بہاریوں کو نہ صرف نیچی نظر سے دیکھا جاتا ہے بلکہ ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے لیکن غضنفر نے اپنی خوبصورت منطق سے بہاری ہونے کے معنے کو بدل دیا ہے۔ جب ایک دفعہ کچھ بہاری اسٹوڈنٹس ان سے ملنے آئے تو ان کی بیگم نے ان لوگوں کے لیے چائے ناشتے کا انتظام کیا اور جب وہ لوگ ساری پلیٹیں صاف کر کے چلے

گئے تو ان کی بیگم نے انہیں ندیدے کے خطاب سے نوازا۔ غضنفر نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ بہاری ندیدے نہیں صاف دل کے اور تکلف و تصنع سے پاک صاف ہوتے ہیں۔

خالق کائنات نے جتنی بھی مخلوقات پیدا کی ہیں ان میں سب سے زیادہ عجیب و غریب انسان ہے۔ یہ ایسی مخلوق ہے جس کے بارے میں کوئی بھی بھوشیہ وانی نہیں کی جا سکتی۔ انسان کی نفسیات سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ اس کتاب میں گونا گوں قسم کے کرداروں سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ یہاں ایسے کردار بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے محسنوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں۔ یہاں ایسے خاکی پینٹ والے بھی ہیں جو بغیر کسی ضمانت کے ایک مسلمان کو ایک خطیر رقم بطور قرض دے دیتے ہیں۔ ایسے کارسیوک بھی ہیں جو اپنے کیے پر شرمندہ ہیں۔ پنجاب کے وہ سادہ لوح سکھ بھی ہیں جو نہایت ہی احترام کے ساتھ ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور ایسے فرشتہ صفت انسان بھی ہیں جو دوران حج بھیڑ کو چیر کر پیاس سے جاں بلب ایک اجنبی خاتون کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھما دیتے ہیں۔

پانی ہر ذی روح کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ غضنفر کو شروع سے ہی اس کی اہمیت کا اندازہ تھا لیکن سولن جانے کے بعد ترل پدارتھ نے ان کی سوچ کو ایک نئی جہت دی اور انہوں نے پانی کی عدم دستیابی پر ایک لازوال ناول ''پانی'' لکھ ڈالا۔ پانی کے حوالے سے انہوں نے دو اور ناول ''مم'' اور ''شوراب'' بھی تحریر کیے۔

ہر فنکار عاشق مزاج ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو فن اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہو سکتا۔ غضنفر بھی عاشق مزاج ہیں اور بڑے پائے کے عاشق مزاج ہیں۔ بقول شاعر ؎

مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

غضنفر کی عاشق مزاجی کی جھلکیاں اس کتاب میں جا بجا موجود ہیں۔ کبھی کسی استاد سے معشوق کو رام کرنے کا نسخہ دریافت کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی اسے بس میں کرنے کے لئے دعا تعویذ کرواتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دفعہ منفی صورت حال میں جان بچا کر بھاگتے ہوئے بھی پائے گئے۔ ان کی شادی بھی محبت کا نتیجہ ہے۔ اور اپنے اس عشق کی داستان انہوں نے نہایت مزے لے لے کر بیان کی ہے۔

اس کتاب میں غضنفر کی ایک اور خوبی کھل کر سامنے آتی ہے۔ انہیں ہر جگہ اچھے اور بُرے دونوں قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ انہوں نے اچھے لوگوں پر تو تفصیل سے لکھا لیکن جو لوگ انہیں الجھاتے رہے ان کا نام انہوں نے نہیں لیا۔ فرماتے ہیں کہ:

''سنجے کا نام میں نے اس لیے لیا اور ان پر قدرے تفصیل سے اس لیے لکھا کہ سنجے کو اپنی ذہانت اور لیاقت کی داد مل جائے اور اُلجھانے والے بابوؤں کا نام میں نہیں لوں گا کہ ان کا نام لینا میرے مثبت

رویے کے خلاف ہوگا۔'' (صفحہ نمبر: ۳۲۶۔۳۲۷)

یہ اعلیٰ ظرفی کی بہترین مثال ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ سرکاری سطح پر اردو کی ترویج وترقی کے لئے کئی اقدام کیے جاتے ہیں لیکن یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھا پاتے یعنی مدعی سست، گواہ چست والا معاملہ ہے۔

اب چند الفاظ غضنفر کے بے مثل اسلوب پر..... کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

جادو تھی، سحر تھی، بلا تھی ظالم تری نگاہ کیا تھی

غضنفر کا اسلوب ایک ایسا جادو ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ یہ ایسی خوبصورت بلا ہے جس کا شکار ہونا خوش قسمتی کی علامت ہے۔ عصر حاضر میں ایسا رچا ہوا اسلوب شاید کسی اور قلم کار کو نصیب نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غضنفر نہ صرف کثیر المطالعہ ہیں بلکہ انہوں نے بحیثیت ماہر لسانیات ہندوستان کے کئی اہم اداروں میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دئے ہیں۔ پوری کتاب میں ایک اسلوب کو سنبھالے رکھنا اور حسبِ ضرورت کئی اور اسالیب بیان کو بھی نہایت خوبی سے برتنا بہت مشکل کام ہے لیکن غضنفر اس مشکل امر سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

غضنفر کی ادبی وعلمی خدمات کو دیکھ کر بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ادب کے بڑے سے بڑے انعام کے مستحق ہیں۔ لیکن افسوس کی اربابِ حل وعقد کا انداز فکر کچھ اور ہی ہے۔ انعامات اور اعزازات حاصل کرنے کے جو طریقے اور ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں غضنفر ان سے خوب واقف ہیں لیکن ان کی فطری شرافت اور اعلیٰ ظرفی اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ وہ کچھ پانے کے لیے اپنا سب کچھ کھو دیں۔

◀◀ ● ▶▶

ثالث پر تبصرے

● عشرت ظہیر

اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں، کمیاب ہیں ہم

جب میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا، ابن صفی کے ناولوں کا چسکا لگ چکا تھا۔ عالم یہ تھا کہ ابن صفی کے نئے ناول کے لیے جاسوسی دنیا کی متوقع آمد سے ایک ہفتہ قبل ہی سے بک اسٹال کا چکر لگانے لگتا۔ ابن صفی نہیں رہے۔ زمانہ ہوا ایسی صورت حال کی لذت کی آشنائی موقوف ہے۔ لیکن نہیں، ان دنوں انتظار کی ویسی بیقراری گویا لوٹ آئی ہے۔

واقعہ ہے کہ مجھے 'ثالث' کے نئے شمارے کا انتظار رہتا ہے اور شاید اس کیفیت اس انتظار کا میں تنہا اسیر نہیں اور بھی شائقین ادب اس کے بیمار ہوں گے۔

مقبول ومعتبر رسالہ 'ثالث' ۲۰ پیش نظر ہے۔ اس کی مقبولیت کی توضیح مذکورہ تمہیدی سطور میں ہے، اور اس کے معتبر ہونے کے گواہ اس کے مشمولات ہیں۔

اداریہ سے قبل 'صفحۂ فہرست' پر نظر ڈالتے ہی اس کے بلند معیار اور اس کے گذشتہ شماروں سے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی دمک نظروں کو خیرہ اور قلب کو آسودہ کرتی ہے۔

مرغوب اثر فاطمی کی غزل گوئی پر حسین الحق کا مضمون 'جنسی ترجیحات کا تخلیقی بیانیہ، اسرار گاندھی کے افسانے (شافع قدوائی)، شعیب نظام، شخص اور شاعر (صغیر افراہیم)، خالی فریم بھرنے کی کاوش (مشتاق احمد نوری)، اودھ کی چند معروف خواتین قلمکار (شعیب نظام) اور اقبال حسن آزاد کی افسانہ نگاری از پروفیسر اسلم جمشید پوری..... یہ مضامین مطالعہ سے قبل ہی پرکشش اور جاذب نظر دکھتے ہیں، کہ مستند قلمکاروں کے ذریعہ متعلقہ فنکاروں کی تخلیقات پر خامہ فرسائی، ان فنکاروں کے لیے اعزاز اور رسالہ 'ثالث' کے لیے باعث افتخار ہے۔

اقبال حسن آزاد، پیش نظر شمارہ کے اداریہ میں اقبال کے اشعار کے حوالہ سے آفات وبلاؤں میں گھرے انسان کے لیے مثبت انداز فکر اور استحکام حیات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''انسان ختم ہوجاتے ہیں، مگر زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی...! اگر کچھ برا ہو رہا ہے تو یقیناً کچھ اچھا بھی ظہور پذیر ہوگا۔''

اقبال حسن آزاد نے 'ثالث' شمارہ ۱ تا ۱۸ مشمولات کے جن نمائندہ تخلیقات کو نشان زد کیا ہے، وہ حیران کن ہیں۔ اس لیے بھی کہ یہ رسالوں کی عام روش سے قطعی مختلف اقدام اور فعالیت کے گواہ ہیں، اور اس لیے بھی کہ یہ فنکاروں کو پرعزم اور ادب کو ثروت مند بناتے ہیں۔ فائن آرٹس کے شعبۂ موسیقی میں فنکاروں کی پذیرائی کی مثال دوسرے شعبوں سے منفرد، انوکھی اور قابل تقلید ہے۔ اس کے برعکس اردو ادب میں فنکاروں کی ناقدری کی مثال انتہائی درجہ افسوس ناک ہے۔ ایسے میں ادارہ 'ثالث' اپنے عمل، اور اپنی پیش کش کے لحاظ سے انوکھا ہے کہ یہ سنگلاخ علاقے میں ادب و شعر کی خاموشی اور لگن کے ساتھ خدمت انجام دے رہا ہے، لہٰذا زبان خلق کی صدا یہ ہے:

اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں ، کمیاب ہیں ہم

روایتی قدر کی پاسداری کے تحت اس مجلّے کی شروعات حمد باری تعالیٰ سے ہوئی:

ہوا نام کاغذ پہ کس کا رقم وہی ابتدا ہیں وہی انتہا

(ضیا فاروقی)

ڈاکٹر ذکی طارق نعت پاک میں عقیدت و حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

زندگی ہوتی ہے حامل وہ بڑی عظمت کی عشق سرکار کے جو زیر اثر ہوتی ہے

غزلوں کی پیش کش میں فکر کی تازگی اور عصر حاضر کے تفکرات کی جھلکیاں بھی نمایاں ہیں اور یہ متنوع اسلوب و طرز ادا کے انوکھے پن سے مزین بھی ہیں۔ زندگی کی تمازت، جذبوں کی وارفتگی اور نشاط آگیں احساس سے روشناس کراتی ان غزلوں کے شعرا ضیا فاروقی، ڈاکٹر ذکی طارق، جمال اویسی، اسحاق وردگ، شمسہ نجم، نوشاد احمد کریمی اور اصغر شمیم کو داد و تحسین۔

افتخار حیدر اپنی نظم 'تم سراپا نظم ہو' میں اس جہان آب و گل میں ایسی چاہت کے متلاشی دکھتے ہیں ، جو ان کے احساس میں مجسم ہو کر ابھر آتی ہے۔ امین کنجاہی نے اپنی نظم 'میں کیا بھیجوں' میں نارسائی اور حسرت ناتمام کے نقوش کو خوبصورتی اور ہنرمندی سے نظم کے پیکر میں منقلب کیا ہے۔

گوشہ خراجِ عقیدت میں مرغوب اثر فاطمی نے اپنی نظم 'الوداع حسین الحق' میں ناسٹلجک پیرایۂ اظہار کے تحت وقت موجود کی المناکی اور حزن کو منعکس کیا ہے۔

'میرے ہمراز جنوں، شام الم کے دمساز' کے زیر عنوان پروفیسر عین تابش نے نہ صرف یہ کہ لمحۂ یاس انگیز کے دھندلکوں میں حسین الحق کی شبیہ کی تابناکی کا خاکہ پیش کیا ہے، بلکہ ان کے تخلیقی زاویے اور سروکار خلق کے منصب اعلیٰ اور فکر کی وسعت کو بھی نمایاں کیا ہے:

''وہ اپنے کرداروں کی تعبیر، عشق سے کرتے تھے اور انھیں انسان، فطرت اور کائنات سے عشق کا ترجمان بنا دیتے تھے۔''

اس گوشۂ خراج عقیدت کے تحت ثالث کی اگلی پیش کش، میرے دوست نثار احمد صدیقی کا انٹرویو حسین الحق سے فکشن پر مکالمہ ہے۔ انٹرویو، مواد و ہیئت، اسلوب ادا اور انداز پیش کش کے اعتبار سے دلچسپ مختلف النوع اور ذہن کشا ہوتے ہیں۔ 'شمع' میں مسافر کے انٹرویو کا اپنا انوکھا انداز اور طرز ادا ہوا کرتا تھا، جس میں مواد و بیان کو ہضم کر کے مسافر اپنے حسن بیان کے دلچسپ پیرائے میں پیش کرتے تھے۔ زیادہ تر اور کامیاب انٹرویو فنکاروں کے روبرو مکالمے کی صورت، انجام پاتے ہیں۔ اس طرز کی ایک بڑی اور اہم صفت یہ ہے کہ فنکاروں کے جواب کے بطن سے سوال ابھرتے ہیں، اور یوں ہم نئے آفاق سے متعارف ہوتے ہیں، لیکن نثار احمد صدیقی نے ایک سوالنامہ ترتیب دیا ہوا ہے، جسے حسب موقع کتر بیونت کر کے قلمکاروں کو ارسال کر دیا کرتے ہیں، اور قلمکاروں کو خود اپنے جواب تحریر کرنے ہوتے ہیں۔ پیش نظر انٹرویو نثار احمد صدیقی کے اسی اختراع کا نمونہ ہے جس میں انھوں نے چھ دفعہ ''تفصیل سے جواب دیں۔'' اور ایک بار ''تشفی بخش'' جواب دیں'' کا شوشہ بھی استعمال کیا ہے۔ تاہم یہاں حسین الحق کے فکشن اور ہم عصر فکشن نگاروں سے متعلق خیالات اور نظریے سے ہم روبرو تو ہو ہی رہے ہیں:

''..... پریم چندی، ترقی پسند اور جدیدیت پسند، یہ تین ایسے بیانیے ہیں کہ ان تینوں کے انضمام سے ایک کامیاب افسانوی بیانیہ وجود میں آ چکا ہے اور اس کی خوبصورت مثالیں، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، انور عظیم، سلام بن رزاق، شوکت حیات، شفق، مشرف عالم ذوقی، خالد جاوید، صدیق عالم اور ترنم ریاض وغیرہ کے یہاں بقدر وافر دستیاب ہیں اور یہ سب نو جدید رجحان (Trend of neo modernism) کے تحت سامنے آنے والے افسانہ نگار ہیں۔ (اقبال مجید، انور عظیم اور غیاث احمد گدی کے علاوہ۔)''

اقبال حسن آزاد نے اپنے مضمون ''حسین الحق..... کچھ یادیں کچھ باتیں' میں ان سے اپنی ملاقاتوں کے توسط سے ان کے اوصاف حمیدہ کو عکس ریز بھی کیا ہے اور ان کی تخلیقی صفتوں سے متعلق اپنے تاثرات بھی رقم کیے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ نثر نگاری بھی مرصع سازی ہی ہے اور بلاشبہ حسین الحق ایک بہترین مرصع ساز تھے..... صرف مرصع ساز ہی نہیں بلکہ ایک عمدہ مجسمہ ساز بھی۔ وہ اپنے الفاظ سے ایسی تصویر کشی کرتے تھے کہ

سارا منظر نگاہوں کے سامنے متحرک ہو جاتا ہے۔''

''جہان فکشن کا ایک معتبر نام، پروفیسر حسین الحق'' میں محمد الیاس انصاری ان کی افسانوی تحریروں کی اہمیت، موضوعات کی وسعت اور ہم عصروں میں انفرادیت کی توضیح کرتے ہیں اور رقم طراز ہیں:

''حسین الحق نے نئی علامتوں، نئے استعاروں اور نئے اسالیب بیان کے ذریعے اردو فکشن کو ایک نئی جہت سے متعارف کرایا۔''

ڈاکٹر رمیشا قمر نے اپنے انٹرویو 'بات کر کے دیکھتے ہیں..... غضنفر سے ایک مکالمہ' میں معروف قلم کار غضنفر کے روبرو ان کی تخلیقی جہت کو منکشف کرنے کی تحسین آمیز سعی کی ہے۔ اور ان کے رجحان و آرا سے ابھرتے نئے سوالوں کے ذریعے انٹرویو کو دلچسپ اور فکر انگیزی عطا کی ہے۔

''مرغوب اثر فاطمی کی غزل گوئی..... ایک مختصر جائزہ'' میں پروفیسر حسین الحق نے مرغوب اثر فاطمی کی شاعری کے تعلق سے زندگی کے رنگا رنگ جلوے، احساسات، کیفیات، مشاہدات، زمانہ شناسی اور خود شناسی وغیرہ کو ان کی شاعری کے خام مواد کے طور پر کام آنے کی صفت کا اظہار ہے، اور ان کی شاعری کے خوش آئند امکان کو بھی واضح کیا ہے۔

''جنسی ترجیحات کا تخلیقی بیانیہ: اسرار گاندھی کے افسانے'' شافع قدوائی کا یہ مضمون اپنے پیٹرن اور اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے مضمون کی تمام تر آرائشی صفتوں سے مزین ہے۔ یعنی اس کے تمہید کی موضوع سے منطبق عبارتیں، اور ان میں فکر انگیزی اور فکر و تدبر کے امکانات کی رعنائیاں اور افسانوں کے لطیف ترین نکتوں اور گوشوں کی وضاحتیں..... کچھ ان کے کھلتے اور کھلتے حساس پہلوؤں کے رہسیہ سے ایسی آشنائی کہ افسانوں کی بازیافت، ان کے از سر نو قرأت کی چاہت قاری کو مضطرب کیے دیتی ہے۔ اپنے اس مضمون میں شافع قدوائی، استدلالی اور کنونسنگ طرز تحریر کی سحر خیزی کے توسط سے افسانہ 'ایک جھوٹی کہانی کا سچ' اور افسانہ 'ہڈیاں' کا تجزیاتی جائزہ پیش کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اسرار گاندھی کے افسانہ صرف متنازعہ موضوعات کی فنی سطح پر حسی تجسیم کرتے ہیں بلکہ مانوس تجربات کے بعض نادیدہ اور فراموش امکانات کی بھی آبیاری کرتے ہیں اور معاصر افسانہ میں ایک منفرد شناخت قائم کرتے ہیں۔''

صغیر افراہیم نے اپنے مضمون 'شعیب نظام: شخص اور شاعر' میں شعیب نظام کی شخصیت، ان کی حیات اور ادبی کاوشوں کو بطریق احسن پیش کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ:

''شعیب نظام ادبی منظر نامہ پر یگانہ شناس کی حیثیت سے ابھرتے

ہیں۔ شعیب نظام کی شخصیت میں محبت، مروت، غیرت اور خودداری کا رنگ بہت گہرا ہے، جو ان کی غزلوں میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔''

مشتاق احمد نوری اپنے مضمون 'خالی فریم بھرنے کی کاوش' میں غضنفر کی فسوں کاری کو محسوس کرنے کے لیے 'خالی فریم' کی جانب رجوع کرتے ہیں اور بالآخر سمندر منتھن میں ان کے ہاتھ، جو امرت اور زہر آتا ہے، اسے نذر قارئین کرتے ہیں:

امرت: ''طاقت اور دولت کبھی بھی علم کی روشنی برداشت کرنے کو تیار نہیں، کیونکہ علم کا عرفان اس کی دہشت گردی اور چمک دمک کو ماند کر دے گا۔ غضنفر نے حالات حاضرہ کو جس تباہی اور دہشت گردی میں جکڑا پایا اور ہر جگہ طاقت اور دولت کی حکومت دیکھی اسے استعاراتی پیکر میں پیش کر دیا۔''

زہر: ''انھیں (غضنفر کو) یہ خدشہ بھی لاحق ہو گیا کہ شاید قاری کہانی کے بھید سے محروم نہ ہو جائیں، اس لیے ان کے دو کردار اپنی گفتگو سے ان بھیدوں کو کھولتے بھی نظر آئے جب کہ انھیں قارئین پر بھروسہ کرنا چاہیے تھا۔''

(معذرت: ''امرت'' ستائش کے لیے اور ''زہر'' بطور مشورہ استعمال ہوا ہے)

تین بہترین افسانوی مجموعے کے مصنف، اقبال حسن آزاد کی افسانہ نگاری سے متعلق پروفیسر اسلم جمشید پوری کا مضمون ''اقبال حسن آزاد کی افسانہ نگاری'' دراصل ان کے افسانوی کائنات کے موضوعاتی وسعت اور زندگی کے لیے انسان کی جدوجہد کے مابین فنی حسن و قبح کا اعتراف ہے۔ اس ناقدری اور قصداً نظر انداز کیے جانے کی اردو ادب کے اس روش عام کے دور میں 'نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ' کے بموجب اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں سرگرداں اقبال حسن آزاد نے بے نیازانہ اور پروقار رویہ ختیار کیا ہوا ہے اور یہی وقار اور رویہ زندگی کے مسائل اور زندگی کی سخت جانی سے متعلق اپنے افسانوں میں، انھوں نے اپنی نجی شمولیت کو قطعی پرے رکھتے ہوئے روا رکھا ہے، یہ ان کے افسانوں کا خاصہ ہے اور فنی پختگی کے اشارے بھی۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری کا مضمون غالباً انھیں بنیادوں پر استوار ہے جس کی وضاحت میں وہ رقمطراز ہیں:

''اقبال حسن آزاد نے نہ تو جدیدیت، نہ مابعد جدیدیت اور نہ کسی اور رجحان کو اپنا آئیڈیل بنایا بلکہ خود جو محسوس کیا اسے اپنے آس پاس کے کرداروں کا ظاہر اور اندرون پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔''

صدام حسین نے مشہور افسانہ نگار طارق چھتاری کے افسانوں کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ اپنے

مضمون ''طارق چھتاری کے افسانوں کا فکری وفنی نظام'' میں پیش کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''ان کے یہاں علامت اور تمثیل ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔''

ڈاکٹر وصیہ عرفانہ نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر منصور خوشتر کا ادبی شعور'' میں ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادبی سرگرمیوں اور کاوشوں کا متوازن جائزہ رقم کیا ہے۔ان کا خیال ہے:

''منصور خوشتر کا تنقیدی و تجزیاتی شعور بالیدہ ہے، وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو پس منظر اور پیش منظر دونوں کو مدنظر رکھتے ہیں۔''

ڈاکٹر قسیم اختر کا مضمون ''حقانی القاسمی: ایک تخلیقی نقاد' اہمیت کا حامل ہے، اس لیے کہ حقانی القاسمی کی تنقید کا دائرہ تنوع آمیز اور وسیع تر پس منظر اور موضوعات کا احاطہ کرتا ہے، ان کی تنقیدی نگارشات تخلیقی جوہر سے آراستہ بھی ہیں اور فکر و تدبر کے کئی در وا بھی کرتی ہیں۔''

ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا مضمون ہندی و اردو کے ممتاز شاعر اور تحقیقی و تنقیدی کتابوں کے مصنف ''ڈاکٹر اجے مالوی: شخصیت اور فکر و فن کی روشنی میں' اہم بھی ہے اور قابل تعریف بھی کہ اجے مالوی کی تحقیقی، تنقیدی اور تراجم کی کاوشیں تحسین آمیز اقدام ہیں، ان کی شاعری لب و لہجے کے اعتبار سے اور فکری تناظر میں بھی، منفرد ہیں اور سحر انگیزی کی حامل بھی—

ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے اجے مالوی کے ادبی اثاثے اور کاوشوں کا جامع تعارف پیش کیا ہے—

شعیب نظام کا مضمون ''اودھ کی چند معروف خواتین قلمکار' دلچسپ طرز تحریر میں، دلچسپ واقعات کا ناسٹلجک اظہار ہے جس میں انھوں نے سرزمین اودھ کے تعلق سے قرۃ العین حیدر، بانو باجی، افسانہ نگار صبیحہ انور، اور عصمت چغتائی کے فکر و ادب کے رویے اور یادوں کی بازیافت کی ہے۔

ڈاکٹر احسان عالم نے ممتاز و مستند شاعر ''مظہر امام شخصیت اور شاعری'' میں مظہر امام کی شاعری و شخصیت کو زیر بحث لاتے ہوئے ان کی شاعری کے محاسن اور شاعری میں ان کے تجربات، 'آزاد غزل' اور 'کشمیری غزل' کو بطریق احسن اجاگر کیا ہے۔

''ادبی مجلّہ 'ثالث' کے اداریے'' ڈاکٹر جگ موہن سنگھ کے اس مضمون کے عنوان سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سہل اور سرل موضوع ہے لیکن اس مضمون میں شامل نکات اور وضاحتوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس بظاہر سہل اور سرل مضمون کی آراستگی میں کتنی پیچیدگیوں اور کس قدر نزاکتوں کی راہ کو عبور کرتے ہوئے اسے فنی دائرے کی تازگی عطا کی گئی ہے۔اس مضمون کے حسن آراستگی کا انداز ڈاکٹر جگ موہن کی تمہیدی عبارت سے بخوبی ہوتا ہے:

''اخبار ہو یا رسالہ اداریہ اس کی حکمت عملی اور اخبار یا رسالہ نکالنے کی غرض و غایت کا اشاریہ ہوتا ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے اداریہ کی اہمیت و افادیت کے اشارے دیتے ہوئے، اقبال حسن آزاد کے اداریوں کے مختلف النوع موضوعات سے متعلق فکر انگیز اور قابل اعتنا بحث کی ہے۔ثالث کے مختلف شماروں میں مختلف اور اہم موضوعات کے اداریوں کے تذکروں اور ان کی افادیت کے بیان سے اس مضمون کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ادبی سمیناروں، اردو کی لسانی ساخت، شعر و ادب کی عصری معنویت، ہندوستان کے مختلف دوروں یعنی مغل اور برطانوی دور کے ادبی نظریات، صنف افسانہ کے اقسام، متن سے مکالمہ، اور اشاعتی ادارتی دشواریوں کا تذکرہ، جیسے بے شمار موضوعات پر 'ثالث' کے اداریوں کی خصوصیتوں اور افادی پہلوؤں کو بطریق احسن اس مضمون میں اجاگر کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جگ موہن سنگھ نے اپنے ایماندارانہ طریقہ کار کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف محض اقبال حسن آزاد کے اداریوں کو دائرہ تحریر میں لایا ہے، بلکہ مہمان اداریے کے طور شامل شفیق احمد شفیق، پیغام آفاقی اور منظر اعجاز کے اداریے سے متعلق بھی خوبصورت اور لائق تحسین نکتے اجاگر کیے ہیں۔

گوشۂ افسانہ کی شروعات شموئل احمد کے افسانہ ''کٹوا'' سے ہوتا ہے۔

افسانہ ''کٹوا'' اپنے اسلوب، اپنی ساخت کے اعتبار سے سجا سنوارا ہے اور یہ سلیقہ مندی اور ہنرمندی کا بہترین نمونہ ہے۔ دھیرے دھیرے، سہل اور سجل انداز میں واقعات کے تہہ در تہہ سلسلوں کا نزول، اس طرح ہوتا ہے، جیسے کرشماتی طور پر زمین سے پانی کے فوارے ابل رہے ہوں۔

شموئل احمد کے افسانے کی کہانی، حقیقت، اور حقیقت کہانی میں محلول ہو جاتی ہے۔ یہ ان کے طرز بیان کی سادگی اور روانی کا اعجاز ہے۔اس افسانے میں حقیقی واقعات کہانی کے اندر سے سپورٹنگ لمحاتی عناصر کی طرح ابھرتے ہیں اور تھیم میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً 'دیش کے غداروں کو جوتے مارو' اور 'آپ انھیں ان کے کپڑوں سے پہچانیے' جیسی عبارتیں کہانی کے اندر سے ابھرتی ہوئی دکھتی ہیں۔

افسانے کا کردار رویندر جب سوچتا ہے کہ وہ:

''اب وطن میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔اس نے سوچا نیپال میں سکونت اختیار کر لے گا۔وہاں چین سے رہ سکتا، وہاں نفرت کی فضا نہیں۔''

تو ۱۹۴۷ء کی خوں ریزی، نفرت انگیزی اور ہلاکت خیزی کے مناظر گویا نظروں کے سامنے عکس ریز ہو جاتے ہیں۔ لوگ جوق در جوق ہجرت کر رہے ہیں، اور گویا مولانا ابوالکلام آزاد جامع مسجد کی سیڑھیوں سے آواز دے رہے ہیں۔

''کہاں جا رہے، ہو وطن عزیز کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو، بھاگنے والوں کو کہیں جائے اماں نہیں ملتی۔''

''ہاہا..... ہاہا..... آپ انکل آپ..... ہو ہو ہو..... ہی ہی ہی.....''

''ہنس کیوں رہی ہو؟'' رویندر کو غصہ آ گیا۔ اس کو بالا کی ہنسی تضحیک آمیز لگ رہی تھی۔''

''آپ کٹوا ہیں انکل..... کٹوا..... ہاہا..... ہاہا..... ہا.....'

کہانی کے فریم میں یہ منظر اور بالا کی ہنسی قطعی مصنوعی ہے لیکن حقارت کا جذبہ اصلی ہے۔ رویندر کا غصہ حقیقی ہے۔

یہ منظر مصنوعی اس لیے ہے کہ یہاں مصنوعی فضا خلق کی گئی ہے، مقصد تضحیک کر کے بے چارگی کے احساس میں محصور کیا جانا ہے لیکن رویندر کا غصہ حقیقی ہے، اور یہ زندگی کی حرارت اور اپنے استحکام کا اظہار ہے۔ یہ احساس خودی اور یہ احتجاج مستحکم ہو کر اس وقت ابھرتا ہے جب:

''ایک نے اس کا گریبان پکڑ لیا''

''بول جے شری رام!''

''نہیں بولوں گا۔'' رویندر کو غصہ آ گیا۔

یہ افسانے کا قیمتی اور معنی خیز منظر ہے اور یہاں افسانہ کلائمکس کے دائرے میں ہے اور اب افسانہ کھلتا ہے، رویندر کو اپنے جے شری رام نہیں بولنے کا عجیب سا 'سرور بخش' احساس ہوتا ہے اور وہ نیپال نہیں جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔

''اس نے قصد کیا کہ اپنے ملک ہی میں رہے گا اور دہشت گردوں کا مقابلہ کرے گا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک دن فضا بدلے گی اور چمن پھر سے گلزار ہوگا۔''

یہ افسانہ نازک وقت کے لیے ایک راہ نما صورت، پرعزم جذبوں اور عزت نفس کی بقا اور محافظت کی راہ دکھلاتا ہے۔

رینو بہل ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ انھیں کہانی بننے کا فن بخوبی آتا ہے۔ ان کے افسانہ ''مجازی خدا' کے اسلوب بیان میں بلا کی روانی ہے اور قاری کو یہ افسانہ آخر آخر تک باندھے رکھتا ہے کہ آج کا افسانہ موضوعات کے مقابل اظہار بیان کی خوبیوں سے متصف ہے۔

''محبت..... ایک عام سا واقعہ'' شاکر انور کا یہ افسانہ محبت کی تاثیر اور اثر انگیزی کو نمایاں کرتا ہے کہ زندگی میں اکثر عام سے واقعے فیصلہ کن لمحوں کو مقابل کر دیتے ہیں۔ افسانے کی فضا میں ساحرانہ عنصر،

کشش اور تجسس کے جوہر اسے دلچسپ اور کامیاب تخلیق کے منصب پر منطبق کرتے ہیں۔

شاہین کاظمی کا افسانہ ''چنبے دی بوٹی'' درد اور یاس انگیزی میں ڈوبی ہوئی محبت کی کہانی ہے۔ یہ ایسی محبت ہے، جس کی تقدیر میں آہ و بکا اور حسرت و یاس کی زہرناکی تھی۔ عشق کے بے اکسیر زہر میں بجھی زندگی جینے کی مجبوری کے باوجود عشق کی اثر انگیزی اور اس کی کرشماتی قوتوں کا اعتراف کا ایک دلکش پہلو بھی اس کہانی میں ابھرتا ہے:

''کملیا اس عشق کا بھار تو پتھر بھی نہ سہہ سکے سرمہ ہو گئے۔ پر روح حوصلہ کر گئی کس کے ایسا پلے باندھا کہ مٹی ہو کر بھی معراج کو جا لیا۔ سدرہ سے آگے، تو جبرائیل کے پر بھی جلتے تھے پر عشق اس پل صراط سے بھی گزر رہی گیا۔''

'بے اکسیر عشق' کی اثر انگیز اور درد انگیز اور بے پناہ قوتوں سے مزین یہ افسانہ دراصل اپنے اسلوب اور اپنے ڈکشن کے اعتبار سے بھی اہم اور کامیاب ہے، لہٰذا اس کے نامانوس مکالمے بھی ذہن پر بار نہیں لگتے۔

''حکایت در حکایت'' اقبال حسن آزاد کا یہ افسانہ ہماری زریں قدروں کے زوال اور ان کی کھوئی ہوئی اہمیت و افادیت کے پس منظر میں آج کی زوال آمادہ زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اقبال حسن آزاد نے حکایتوں کے تذکروں کے توسط سے زندگی کا وہ رخ پیش کیا ہے، جس کی چاہ تو انسان اپنے دل میں بسائے رہتا ہے، لیکن اس کے حصول کے دروازے وہ بند کیے ہوئے ہے۔ یہ در، کھل جا سم سم کہنے سے نہیں کھلیں گے اس کے لیے 'عزم کے ساتھ کارزار حیات میں کود پڑنا ہوگا' کہ:

''یہ دنیا ایک بازار ہے اور یہاں ہر چیز بیچی اور خریدی جاتی ہے۔ محبت بھی ایک قابل حصول اور قابل فروخت شے ہے۔''

افسانہ ''حکایت در حکایت'' اپنے مقصد و منصب کی پاسداری بھی کرتا ہے، فن کی پاسداری بھی۔

''بارگاہ خداوند'' قرب عباس کا ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں سماج کے مکروہ بے رحم چہرے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک انسان جس کا وجود بذات خود آلودہ نہیں ہے سماج نے اسے اذیت ذہنی کا نشانہ بنایا ہوا ہے، تاہم وہ بارگاہ خداوند میں حاضر ہوتا ہے اور مولوی جی سے سوال کرتا ہے تو..... تو مولوی جی صرف نظر کرتے ہیں۔ گویا یہ سماج، اس سماج کے بظاہر پارسا افراد بھی اس کی اذیت اور ہزیمت آمیز زندگی کے ساتھ اسے تنہا چھوڑ جاتے ہیں..... یہ سماج کے کھوکھلا پن کا بہترین اظہار ہے۔

افسانہ ''دھوبی گھاٹ'' میں ڈاکٹر مریم عرفان نے انسان کی بے بسی اور مسلسل حالات کے شکنجے میں گرفتار مبارک کی زندگی کے حزن آمیز اوراق افسانے کی شکل میں پیش کیے ہیں۔ بسا اوقات انسان کی زندگی میں یکے بعد دیگرے آفات و حادثات کے سلسلے دراز ہوتے جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو خوبصورتی کے

ساتھ 'دھوبی گھاٹ' میں عکس ریز کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر شکیل احمد خان نے افسانہ ''میلی عورت'' میں سماج کے مکروہ چہرے والی ایک ستم زدہ عورت کی کہانی رقم کی ہے۔ یہ عورت سماج میں گھناؤنے اور کراہیت آمیز فعل کی مرتکب ہونے کے باوجود، رشتوں کے تقدس اس کی محافظت اور پاسداری کے لیے مجسم قہر بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے.....

''میں میلی ضرور ہوں، بے ضمیر نہیں۔''

ڈاکٹر شکیل احمد خان کا یہ افسانہ ان کے کہانی بننے کی صلاحیت کا گواہ ہے۔

''خلا'' نوشابہ خاتون کا ایسا افسانہ ہے، جس میں انسان زندگی جینے کے تمام تر لوازمات کے حصول میں اتنا آگے نکل آتا ہے کہ خود کی زندگی میں دائمی اور ازلی خسارا بہ شکل سناٹگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ گویا یہ افسانہ زندگی جینے کے سلیقے اور تیزی سے گزرتے ہوئے شب و روز کے بہاؤ کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں زندگی میں در آئے خلا کی اذیت اور حسرت و یاس کا خوبصورت اظہار ہے۔

''دہلیز'' صابر رضا رہبر کا ترجمہ کردہ مشہور فکشن نگار نرمل ورما کا افسانہ ہے۔ ''دہلیز'' جذبوں اور لطیف احساس میں گندھی سحر انگیز اور اثر انگیز کہانی ہے۔ نازک احساسات کی آنچ سے روتی کا وجود پگھلتا جاتا ہے کیونکہ وہ دیکھتی ہے، محسوس کرتی ہے اور سوچتی ہے۔

''جیلی میں کیا کچھ ہے؟ شمی بھائی جو اس میں دیکھتے ہیں، وہ رونی میں نہیں دیکھتے؟''

یوں رونی کے ''آنسوؤں کے پیچھے سب کچھ دھندلا دھندلا سا ہو جاتا ہے'' پھر وہ مایوس اور تجاہل بھرے لہجے میں کہتی ہے ''مہر و بتی بجھا دے، دیکھتی نہیں میں مر گئی ہوں۔''

نرمل ورما کا یہ افسانہ رونی کے احساس کے حزن کو قارئین کے دلوں میں منتقل کرنے کی قوت سے متصف ہے۔

''ثالث'' کے اس شمارہ میں اقبال حسن خان کے قسط وار ناول 'راج سنگھ لاہوریا' کا دلچسپ سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔ اس ناول کی کہانی دلچسپ بھی ہے اور وقت موجود میں اخوت اور رواداری کی راہیں بھی روشن کرتی ہے۔

قارئین کے انبساط اور دلچسپی کے مستقل گوشے، بصورت تبصرے، ثالث پر تبصرے اور مکتوبات بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس شمارہ کی زینت ہیں۔

☆☆☆

● سلیم انصاری

ثالث کا شمارہ نمبر ۲۰ پیشِ نگاہ ہے۔ یہ شمارہ اپنے اداریے کے حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ ثالث نے ہمیشہ نئے اور اچھا لکھنے والوں کو ترجیح دی ہے۔ ثالث کے اس عمل سے نو واردانِ ادب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اس کے علاوہ ادب میں تخلیق کاروں کی نئی کھیپ کا راستہ بھی روشن ہوتا ہے۔ ثالث کے زیرِ نظر شمارے میں خراجِ عقیدت کے طور پر حسین الحق کے فکر و فن پر ایک مختصر گوشہ بھی شامل ہے۔ اردو فکشن کے باب میں حسین الحق ایک نابغۂ روزگار ہستی کا نام ہے جن کی خدمات کو کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ منظوم خراجِ عقیدت کے طور پر مرغوب اثر فاطمی کا یہ اعتراف اور یقین اہلِ ادب کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے کافی ہے کہ تم روٹھ گئے ہو تو جاؤ، ہم تمہاری تخلیقات کے سوز و گداز میں، تمہیں ڈھونڈ لیں گے، ڈھونڈ ہی لیں گے۔ پروفیسر حسین الحق کی رحلت پر اپنے ذاتی تاثرات رقم کرتے ہوئے پروفیسر عین تابش نے لکھا کہ بھیا صاحب پروفیسر حسین الحق کی زندگی اور علم و ادب و تصوف سے ان کی بے مثال اور با کمال وابستگی دراصل ان کے مخصوص اور منفرد طرزِ فکر سے عبارت تھی۔ جس کا مرکز و محور عشق تھا۔ فکشن پر مکالمہ کرتے ہوئے نثار احمد صدیقی کے ایک سوال کے جواب میں جدید اور ترقی پسند کہانیوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے پروفیسر حسین الحق نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ ترقی پسندی میں طبقات کی اہمیت ہے جب کہ جدیدیت میں فرد کی اہمیت ہے۔ دراصل یہی وہ فرق ہے جس سے جدیدیت اور ترقی پسندی کے درمیان حدِ فاصل قائم کی جاتی ہے۔ ''حسین الحق۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں'' کے عنوان سے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد نے ان سے اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور پروفیسر حسین الحق کے اس جملے کو خصوصی طور پر یاد کیا ہے کہ مجھے نرم گدے پر نیند نہیں آتی۔ محمد الیاس انصاری نے اپنے مختصر مضمون میں حسین الحق کی تخلیقی مہارت اور متعدد خوبیوں کا ذکر کیا ہے، ان کے مطابق ان کی کہانیوں میں محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ اس آگ کے دریا میں ڈوب کر پار اترنے کا ہنر جانتے ہیں۔

منظوم حصہ میں ضیا فاروقی، ڈاکٹر ذکی طارق، جمال اویسی، اسحاق وردگ، شمسہ انجم، نوشاد احمد کریمی، اصغر شمیم کی غزلیں اور افتخار حیدر اور امین کنجاہی کی نظمیں شامل ہیں۔ ان غزلوں اور نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ ثالث کے لیے آپ کا طرزِ انتخاب واقعی غیر جانب دار اور سخت ہے۔ غضنفر سے کیا گیا ریشما قمر کا انٹرویو کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس انٹرویو میں ریشما قمر نے ادب کی موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے کئی ضروری سوالات قائم کئے ہیں۔ اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں غضنفر نے بڑی وضاحت سے کہا ہے کہ ادب کا اظہار خالصتاً تخلیقی ہونا چاہیے۔ اسی انٹرویو میں غضنفر

نے اگر چہ یہ تسلیم کیا ہے کہ اردو قارئین کی تعداد میں کمی آئی ہے مگر اس زبان کی طاقت کمزور نہیں پڑی ہے۔

گوشۂ اعتراف میں نو مضامین شامل ہیں جس کے تحت سب سے پہلا مضمون حسین الحق کا ہے جو مرغوب اثر فاطمی کی شاعری کے حوالے سے ہے۔ اپنے مضمون میں فاضل مضمون نگار نے جہاں ایک طرف مرغوب اثر فاطمی کی شعری انفرادیت کا اعتراف کیا ہے وہیں انہوں نے بڑی صاف گوئی سے یہ بھی کہا ہے کہ ''مرغوب اثر فاطمی کو میں بڑا شاعر نہ کہہ رہا ہوں نہ مان رہا ہوں مگر یہ احساس ضرور ہوا کہ زندگی کے رنگا رنگ جلوے ان کی شاعری کا قالب تیار کرتے ہیں۔'' اپنی اس بات کی تائید میں حسین الحق نے مرغوب اثر فاطمی کی شاعری سے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ ان اشعار میں مرغوب اثر فاطمی کا فکری تنوع اور اسلوب کا عکس نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گوشۂ اعتراف کا دوسرا مضمون شافع قدوائی کا ہے جو اسرار گاندھی کے افسانوں میں جنسی ترجیحات کا تخلیقی بیانیہ کے عنوان سے شامل ہے۔ شافع قدوائی کے مطابق ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جس کی صورت گری کا ہر حوالہ میڈیم فراہم کرتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ بہت تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں میڈیا کی ضرورت اور اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے مختصر مضمون میں شافع قدوائی نے لکھا ہے کہ اسرار گاندھی نے جنسی ترجیحات کے بدلتے ہوئے منظر نامے کی مروجہ سماجی ڈسکورس سے آویزش کا فنی رویہ خلق کیا ہے۔ یہ بات اگر مان بھی لی جائے تو یہ کہنا مشکل ہے ناقابلِ یقین بھی کہ جنسی ترجیحات کا تخلیقی بیانیہ اسرار گاندھی کے افسانوں کا عمومی اور غالب رویہ ہے۔

اپنے مختصر مضمون ''شعیب نظام: شخص اور شاعر'' میں صغیر افراہیم نے کئی اہم باتیں لکھی ہیں مثلاً شعیب نظام کے فکر و احساس میں زندگی اور موت کی کشاکش خصوصی موضوعات ہیں یا پھر شعیب نظام کی شخصیت میں محبت، مروت، غیرت اور خودداری کا رنگ بہت گہرا ہے جو ان کی غزلوں میں بھی تحلیل ہوتا چلا گیا ہے یا پھر انتشار، اضطراب، بے چینی، عدم تحفظ، بے قدری، خوف، مایوسی اداسی، اجنبیت، بیزاری نے شعیب نظام کے یہاں عکسِ گم گشتہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب ظاہر ہے اتنی ساری شعری اور تخلیقی جہتوں کا جواز ایک مختصر سے مضمون میں فراہم کرنا آسان کام نہیں اس کے لیے شعیب نظام کی شاعری پر ایک تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد مشتاق احمد نوری کا مضمون خالی ''فریم بھرنے کی کاوش'' شامل ہے جس میں انہوں نے غضنفر کی کہانیوں کی تخلیقیت کا جواز ان کے خالی فریم کے حوالے سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنے مضمون ''اقبال حسن آزاد کی افسانہ نگاری'' میں ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ نہایت عمدگی سے لیا ہے اور یہ بات واضح کی ہے کہ ان کے یہاں نہ مواد کی کمی ہے نہ ہنر مندی کی، وہ افسانے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ ان کے یہاں افسانے کے موضوعات میں تنوع ہے اور یہاں تک کہ وہ

انسان تو انسان خدا سے مکالمہ کرنے کی بھی جرأت رکھتے ہیں۔ اپنے خیال کی تائید میں اسلم جمشید پوری نے اقبال حسن آزاد کے افسانوں سے کئی اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ ''طارق چھتاری کے افسانوں کا فکری اور فنی نظام'' میں مضمون نگار صدام حسین نے ۱۹۸۰ء کے بعد نمایاں طور پر اپنی شناخت بنانے والے افسانہ نگاروں میں طارق چھتاری کا شمار کیا ہے، یہ بات بالکل سچ ہے کہ طارق چھتاری اپنے موضوع، تکنیک، اسلوب اور علامتی پیرایۂ اظہار کے ذریعہ ناقدین کو متوجہ کرنے میں کامیاب رہے تھے، ان کے کئی افسانے اپنی انفرایت کے سبب اب بھی شاہکار افسانے تسلیم کیے جاتے ہیں مگر اب وہ بہت کم ہی ایکٹیو ہیں اور افسانوی کینوس سے تقریباً غیر حاضر۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر وصیہ عرفانہ کا ایک مضمون ''ڈاکٹر منصور خوشتر کا ادبی شعور'' کے عنوان سے بھی شامل ہے۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر منصور خوشتر کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کے علاوہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر منصور خوشتر کا ایک اہم ادبی کارنامہ ان کے ذریعہ جاری کیا گیا رسالہ سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' ہے جس نے کئی یادگار نمبر شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر وصیہ عرفانہ کے مطابق منصور خوشتر اردو ادب کے حوالے سے ایک متحرک اور فعال شخصیت ہیں اور ان کا تنقیدی اور تجزیاتی شعور بالیدہ ہے۔

اپنے مضمون ''ڈاکٹر حقانی القاسمی: ایک تخلیقی نقاد'' میں ڈاکٹر قسیم اختر نے کئی بار اس بات پر زور دیا ہے کہ حقانی القاسمی ایک تخلیقی نقاد ہیں، یعنی ان کی تنقید میں تخلیقیت نظر آتی ہے مگر وہ اپنی اس رائے کی تائید میں خاطر خواہ جواز پیش نہیں کر سکے یہی نہیں ان کا نصف سے زیادہ مضمون اقتباسات اور حوالوں پر مشتمل ہے۔ یہی صورتِ حال ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے مضمون میں بھی نظر آتی ہے یعنی ان کے مضمون کا بھی تقریباً نصف حصہ حوالوں اور اقتباسات کی نذر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر اجے مالویہ کی ادبی خدمات سے کسے اعتراض ہو سکتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے فکر پاروں کا براہِ راست مطالعہ کر کے ان پر اپنی رائے قائم کی جائے، نہ کہ دوسروں کی آراء کی روشنی سے اپنے چراغ روشن کئے جائیں۔ کسی فنکار کے بارے میں یہ لکھ دینا کہ ان کی شاعری منفرد لب و لہجے کے سبب اپنا منفرد مقام رکھتی ہے نسبتاً آسان ہے مگر انفرادیت کا جواز اور اس کے حوالے سے مثالیں پیش نہ کرنا ایک طرح کی ادبی غیر ذمہ داری ہی ہے۔

''ثالث۔۲۰ میں مضامین کے باب میں سب سے پہلا مضمون ڈاکٹر احسان عالم کا ہے، جو مظہر امام کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ہے، مظہر امام کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا مگر فاضل مضمون نگار کی تحریر کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مظہر امام کے متعلق کئی ایسی دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں جو میرے لیے بھی نئی ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر جگ موہن سنگھ کا ایک تجزیاتی مضمون ''ثالث کے اداریوں'' کے تعلق سے ہے جس میں انہوں نے ثالث کے متعدد شماروں میں شامل فکر انگیز اداریوں میں عصری

ادب کی سمت ورفتار کی نشاندہی کے علاوہ ثالث کی ادارتی پالیسیوں اوراس کے ادبی مؤقف پر بھی تجزیاتی گفتگو کی ہے۔اپنے مضمون ''صفدرامام قادری کا سفرنامۂ بنگلہ دیش؛ایک تجزیاتی مطالعہ'' میں شبنم پروین نے تفصیلی تجزیاتی گفتگو کی ہے۔ان کے مطابق اس سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صفدرامام قادری نے بنگلہ دیش کی تہذیب، تعلیمی نظام، تمدن، ثقافت اور معاشرت وغیرہ کو نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب کی صورتِ حال کے حوالے سے بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

ثالث ۲۰۔میں پروفیسر قدوس جاوید کا ایک مختصر مضمون بھی شامل ہے جس میں ان کے مجموعۂ کلام ''دشتِ وحشت '' کے حوالے سے ذوالفقار نقوی کی شاعری پر بحث کی گئی ہے ان کے مطابق ذوالفقار نقوی کہیں غزل کی روایت کی توسیع کرتے ہیں تو کہیں اس کی تجدید اوراپنے اس خیال کے ثبوت کے طور پر انہوں نے کئی اشعار بھی نقل کیے ہیں۔کیفی اعظمی پر اپنے مضمون میں وسیم فرحت علیگ نے وارث کرمانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کیفی اعظمی بنیادی طور پر غنائی شاعر تھے لیکن ترقی پسندانہ آمریت انہیں دوسرے راستے پر لے گئی۔اگر وہ دل کھول کر غنائی شاعری کرتے تو ان کے حسن واثر میں یقیناً اضافہ ہوتا۔حالانکہ وارث کرمانی کی اس رائے سے وسیم فرحت علیگ نے بھی جزوی طور پر ہی اتفاق کیا ہے۔راتھر سلطان روحی نے اپنے مضمون'' آفتاب اقبال شمیم کے کلام میں انسانیت کا پیغام'' میں اس بات پر زور دیا ہے کہ آفتاب اقبال شمیم کی تقریباً تمام تر شاعری کا مرکزی موضوع انسان دوستی کے گرد ہی گھومتا ہے۔ان کے مطابق آفتاب اقبال شمیم بشر کے قائل ہیں اور انسان کی عظمت پر کسی بھی طرح کا حملہ انہیں گوارہ نہیں اوران کے تمام تر مجموعے انسانیت کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔عرفان رشید نے اپنے مضمون میں انور سجاد کی افسانوی جہتوں پر اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔انور سجاد کے افسانوں کا ایک غالب حصہ علامتی اسلوب میں لکھا گیا ہے، یہی نہیں انہوں نے اپنے افسانوی اسلوب میں بھی کئی کامیاب تجربے کئے ہیں،جس کی وجہ سے ان کے کئی افسانے ابہام کی زد میں آجاتے ہیں یعنی ان کے بعض افسانوں کے مرکزی خیال تک قاری مشکل سے ہی پہنچ پاتا ہے۔

افسانوں کے باب میں سب سے پہلا افسانہ ''کٹوا'' ہے، جو شموئل احمد کے مخصوص اسلوب کے سبب مکرر قرأت کا مطالبہ کرتا ہے۔شموئل احمد کے افسانوں کے موضوعات عام ڈگر سے الگ ہوتے ہیں،اور پھر موجودہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی عوامل کی آمیزش سے افسانے کو ایک بالکل نئی نہج پر منتج کرنے کی ان کی ہنرمندی بے مثال ہے۔ثالث-20 میں شامل ان کا افسانہ کٹوا ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔افسانے کا مرکزی کردار روندر ختنہ کرانے کی اپنی خواہش کو انجام تک پہنچانے کے بعد جن مسائل ومصائب سے دوچار ہوتا ہے،اسے شموئل احمد نے نہایت ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔زیرِ نظر افسانہ گزشتہ چند برسوں کے درمیان

پیدا ہونے والی سیاسی، سماجی اور مذہبی صورتِ حال کی روشنی میں نہایت اہم ہوجاتا ہے۔

رینو بہل کا افسانہ ''مجازی خدا'' بظاہر ایک سادہ سا رومانی افسانہ معلوم ہوتا ہے، اس افسانے میں بلال اور امبر کی دوستی کی شروعات سوشل میڈیا سے شروع ہوتی ہے، امبر، بلال سے عمر میں کافی چھوٹی ہے۔بلال اور امبر چند ہی ملاقاتوں کے بعد شادی کا فیصلہ کرتے ہیں جس کی اجازت بلال اپنی بیوی سے بمشکل حاصل کرتا ہے اور پھر امبر سے شادی کے بعد اپنے فارم ہاؤس میں منتقل ہوجاتا ہے۔مگر دو تین دن بعد جب اسے ہوش آتا ہے تو فارم ہاؤس اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے، یعنی اس کے ساتھ دھوکا ہوتا ہے، اور وہ ٹھگا سے محسوس کرتا ہے۔مجازی خدا ایک ایسا افسانہ ہے، جو بیانیہ پیرائے میں لکھا گیا ہے، مگر اس افسانے میں ایک پیغام بھی پوشیدہ ہے، اور وہ یہ کہ سوشل میڈیا پر ہونے والی دوستی اور پھر شادی کے بارے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے ،ورنہ ایک بڑے فراڈ اور دھوکے کا امکان ہمیشہ بنا رہتا ہے ایک دوسرا پیغام یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی پہلی شادی ،بیوی اور بچوں میں ہی خوش رہنا چاہئے یعنی سوشل میڈیا کی چکا چوندھ سے دوری بنانے میں ہی عافیت ہے۔

''محبت ایک عام سا واقعہ'' شاکر انور کا ایک ایسا افسانہ ہے جو انسانی رشتوں، جذبوں، بھروسے اور تشکیک کے اردگرد گھومتا ہے، جو اپنے بیانیہ اور تکنیک کے سبب متاثر کرتا ہے۔شاہین کاظمی کا افسانہ ''چنبے دی بوٹی '' دراصل عشق اور زندگی کے درمیان پھیلی ہوئی ایک ایسی روشنی عبارت ہے جو دلوں کو نہ صرف روشن رکھتا ہے بلکہ عشق کے آداب اور شعور سے بھی آشنا کرتا ہے۔اس افسانے کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کے بعض مکالمے بے حد معنی خیز اور افسانے پر بھاری ہیں۔''باؤ زخموں پر کھرنڈ آنے لگے تو چھیلتے نہیں'' یا ''ساڑ گہرا ہو تو زخم چھیلتے رہنا ہی جان بچانے کا واحد حل ہوتا ہے'' یا ''عشق بھی کیا کیا رنگ دکھاتا ہے۔سارے فلسفے خود بخود سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔'' ایسے ہی کچھ مکالمے ہیں جو افسانے کو زندگی اور عشق کی صداقتوں سے ہم کنار کرتے ہیں۔

اسی طرح اقبال حسن آزاد کا افسانہ ''حکایت در حکایت'' بھی اپنے اندر کئی ساری سبق آمیز اور نصیحت آمیز کہانیوں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔بیانیہ کی عمدہ مثال کے ساتھ یہ افسانہ اپنے ساتھ قاری کو بھی شریکِ سفر کرتا ہے اور آخر کار اس کلائمکس پر ختم ہوتا ہے کہ عشق، پیار، محبت، دوستی، رشتہ داری سب ذاتی مفاد کے آگے ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جاتے ہیں اور انسان حالات کے سامنے بے بس اور مجبور ہوجاتا ہے لیکن اسے نامساعد حالات کے آگے سپر نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے ان سب باتوں کے باوجود زندگی ختم نہیں ہوجاتی اور آخر کار زندگی کا تسلسل اور سفر جاری وساری رہتا ہے ۔اس کے علاوہ قرب عباس کا ''بارگاہِ خداوند''، ڈاکٹر مریم عرفان کا ''دھوبی گھاٹ''، اور ڈاکٹر شکیل احمد خاں کا ''میلی عورت'' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو آپ کے حسنِ انتخاب کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔اس کے علاوہ

اقبال حسن خان کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا آخری باب بھی دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

تبصروں کے باب میں متعدد کتابوں پر اہم تبصرے شامل ہیں اس کے علاوہ ثالث پر چند تفصیلی تاثرات بھی شامل ہیں جن میں مشتاق احمد نوری، سلیم انصاری، ڈاکٹر شاہد جمیل، ڈاکٹر احسان عالم، اور ڈاکٹر جگمو ہن سنگھ کے تفصیلی تبصرے، ثالث کی اہمیت، افادیت اور ادبی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں۔

مجموعی طور پر ثالث ایک ایسا ادبی دستاویز ہے جو اپنے عہد کی ادبی سمت ورفتار اور معیار ومزاج کی تاریخ رقم کر رہا ہے، جس کے لئے آپ کی محنت اور لگن کو کریڈٹ نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔

☆☆☆

● عظیم اللہ ہاشمی

ثالث کا تازہ شمارہ نمبر ۲۰ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء ڈاک سے موصول ہوا۔ جو ۳۲۸ صفحے پر مشتمل ہے۔ پرمغز اداریہ میں مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد صاحب نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے قول کو یاد کرتے ہوئے ان کے شکوہ کو بجا تسلیم کرتے ہیں کیونکہ لاکھ مصائب کو جھیل کر بھی انسان اپنے وجود کو قائم رکھنے میں کامیاب ہے۔ اس اداریے سے یہ روشنی ملتی ہے کہ انسان کو شکستہ دل کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس کو ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر نگاہ مرکوز رکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ اس اداریے میں پتے کی بات یہ ہے:

ہم عصروں جن پر قلم اٹھاتے وقت لوگوں کے ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں اساتذہ ریسرچ اسکالرز کو ایسے موضوعات دیتے ہیں جن پر پہلے ہی سے وافر مواد دستیاب ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کاٹو ساٹو کی ترکیب سے مکھی پر مکھی ماری جاتی ہے۔ نہ کوئی مقالہ کسی نئے موضوع پر لکھا جاتا ہے اور نہ ہی تازہ کار مضامین وجود میں آتے ہیں کیونکہ اس کے لیے پڑھنا پڑتا ہے محنت کرنی ہوتی ہے، لیکن پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے اور راتوں رات تنقید نگار بننے کی دھن میں ان بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ (اداریہ ثالث)

ضیاء فاروقی کی حمد اور ذکی طارق کی نعت روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ حمد اور نعت دونوں میں روحانیت کے کشف وکمالات، عبد ومعبود، سرور روحانی اور وجدانی کیفیت سے لبریز اشعار ہیں جو روح وقلب کو طمانیت کے خوشگوار گل زار سے گزار کر فرحت بخش تازگی کا احساس دلاتے ہیں اور متصوفیت کا سبق پڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کل سات غزلیں، دو خراجِ عقیدت، ۱۹ اعترافی اور ۹ متفرق موضوعات پر پرمغز مضامین، ۱۹ افسانے، ایک ترجمہ کے علاوہ مختلف کتب پر تبصرے نیز ثالث پر خصوصی تبصرے کے علاوہ مکتوبات شامل اشاعت ہیں جن کو پڑھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ہر تین مہینے بعد یوں ہی گلشن ادب پر برسے ساون تو پانچ کے ہوں باون۔

افسانوں میں کٹوا، مجازی خدا، چنے دی بوٹی اور حکایت در حکایت متاثر کرتے ہیں جہاں کردار نگاری، منظر نگاری کے جلوے خوب خوب رقص کناں ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر اس نکتہ پر پہنچتے ہیں کہ جو فن پارے ادب کی فنی سطح کو چوم لینے میں کامیاب ہوتے ہیں ان کا تأثر قاری کے فکر وذہن پر دیرپا ہوتا ہے۔ رینو بہل کا افسانہ یہ پیغام دیتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بہت سی زندگیاں ایسی ہیں جو سمجھوتے کی بنیاد پر قائم ہیں جن کو ہمارا معاشرہ صدیوں سے جبراً ڈھو رہا ہے۔ لہذا ایسی بے بس زندگی کے لیے زندگی کی تلاش بہت ضروری ہے۔ دوسرے افسانوں میں بیانیہ کی سادگی اور افسانے کا بانکپن شباب پر ہے۔

گوشہ حسین الحق بطور خراج عقیدت اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔ جس میں کل چار مضامین اور ایک شعری خراج عقیدت ہے۔

حسین الحق کے لیے خراجِ عقیدت کا یہ گوشہ پڑھ کر آنکھیں اس لیے نم ہوئیں کہ ایسا گوہرِ ادب ہم لوگوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور ہم بے بسی سے کف افسوس ملتے رہ گئے۔ ویسے یہ چار مضامین حسین الحق کے ادبی خدمات کا مکمل اعتراف نامہ نہیں ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ''ثالث'' نے ان کی حیات میں ہی ان کے ادبی خدمات کے اعتراف میں خاص نمبر نکال کر اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مرغوب اثر فاطمی کی نظم دل گداز ہے جو جگر کو چھلنی کرتی ہے۔ نثار احمد صدیقی کا ''حسین الحق سے فکشن پر مکالمہ'' اور ڈاکٹر ریشا قمر کا انٹرویو ''بات کر کے دیکھتے ہیں..... غضنفر''، اردو ادب کے ہر طالب علم کو ایک بار ضرور پڑھنا چاہے۔ صفدر امام کا سفرنامہ ''بنگلہ دیش کو میں نے دیکھا''، پر شبنم پروین کا مضمون پر تأثر ہے۔

وہی فن پارہ کامیاب ہوتا ہے جو قاری تک خیال کی ترسیل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ صارفیت کے اس دور میں زندگی جس بحران کا شکار ہوئی ہے اس کے اثرات شاعری پر پڑے ہیں، اس کا عکس زیر نظر شمارے میں شامل شعراء کے کلام میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سیاست نے انسانی زندگی پر جو یلغار کیا ہے اس کے اثرات انسانی زندگی پر کیا پڑے اس کو نوشاد احمد کریمی کی دوسری غزل کے اشعار میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اصغر شمیم کی دونوں غزلوں کا تأثر بہت گہرا رہا۔ ڈاکٹر ذکی طارق کی پہلی غزل میں حسن وعشق کا موسم بڑے شباب پر ہے جہاں عشق بہاراں کی ہلکی ہلکی گلابی پھول کا لمس قاری محسوس کرتا ہے۔

حیا کی سرخی، ادا کا جادو، نظر کی مستی، سخن کی خوشبو
تمام عشوے، تمام غمزے، تمہارے حسن و جمال تک ہیں
سب آزمالیں ہمارے دل پر، ہیں ان کی ترکش میں تیر جتنے
ہمیں یقیں ہے ستم کے پنجے، ہماری ہمت کی ڈھال تک ہیں

مبصر علی رفاد فتحی کے تبصرے میں ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کی تکرار اس قدر ہوئی ہے کہ تبصرے کی فضاء میں اس کی بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے جہاں زندگی اپنے زمانے کی روح سے پیوست ہے اور ناول نگار کا نقطہ نظر ہی ناول کی ہیت کا تعین کرتا ہے۔اس میں معروف فکشن نگار غضنفر صاحب نے مشاہدات تجربات، کے علاوہ نفسیات اور جذبات کے پیچ وخم کو معروضیت کے ساتھ مدھم سروں میں پیش کر کے خودنوشت سے زیادہ دلچسپ بنادیا ہے جو تاریخی شہر علی گڑھ کا تہذیبی دستاویز کی صورت قاری کے سامنے آیا ہے۔ثالث پر مشتاق احمد نوری اور ڈاکٹر شاہد جمیل جیسے پائے کے افسانہ نگار وادیب کے تبصرے خوب ہیں۔''چراغاں سرخواب'' پر سلیم سرفراز کا تبصرہ قابل تعریف ہی نہیں بلکہ قابل تحسین بھی ہے۔یہ تبصرہ کم اور مضمون زیادہ لگ رہا ہے کیونکہ ارشد عبدالحمید صاحب کی مذکورہ کتاب پر جی کھول کر لکھا گیا ہے۔مطالعے کے بعد چند اشعار ذہن میں مثلِ مقناطیس چپک گئے۔

پھر وہی خواب ہے اور خواب میں روشن خیمہ — پھر رواں جادۂ آوازِ درا پر کوئی ہے
مورچہ باندھتے ہیں اور نہ صف کھینچتے ہیں — ہم تو دشمن کو فقط دل کی طرف کھینچتے ہیں
خوف کے کون سے گنبد سے ہوئے ہیں آزاد — یہ پرندے کہ نہ منقار نہ پر کھولتے ہیں
یہ رختِ خواب نہ ہوتا تو مرگئے ہوتے — یہی ہے چھاؤں ہماری، یہی سرائے سفر

المختصر جب جب ثالث کا شمارہ نظر نواز ہوتا ہے پڑھنے کے بعد نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ رسالہ بڑے خاموشی سے کہہ رہا ہو۔

حوادث لاکھ آئیں چشم نگرانی میں رہتے ہیں — کوئی تو ہے کہ ہم جس کی نگہبانی میں رہتے ہیں
(اقبال حسن آزاد)

☆☆☆

● اصغر شمیم

زندہ ادب کی پہچان.....ثالث

ثالث مونگیر، بہار سے شائع ہونے والا ایک اہم ادبی جریدہ ہے۔ثالث نے بہت جلد سنجیدہ ادبی حلقوں میں اپنی پہچان مستحکم کر لی ہے۔اس رسالے کے مدیر برصغیر کے مشہور ومعروف افسانہ نگار اقبال حسن آزاد جو خود ایک متحرک قلمکار ہیں اور اردو دنیا اب ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کی بھی قائل ہو چکی ہے انہوں نے بہت کم مدت میں ثالث کو اردو کے چند معیاری رسالوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ثالث کا تازہ شمارہ (۲۰) ایک ضخیم شمارہ ہے جو ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس شمارے میں خراج عقیدت کے طور پر مشہور ومعروف افسانہ نگار حسین الحق پر ایک مختصر گوشہ بھی شائع کیا گیا ہے حسین الحق جو بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے مگر بحیثیت ناول نگار بھی ان کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ثالث کا اداریہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اداریہ میں اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں۔''مایوسی کی باتیں کرنا، دل شکستہ ہونا، خود کے ساتھ اوروں کی ہمت بھی توڑنا اچھی علامت نہیں ہے حالات خواہ جیسے بھی ہوں انسان کو ہمیشہ زندگی کے روشن پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہیے۔اگر کچھ برا ہو رہا ہے تو یقیناً کچھ اچھا بھی ظہور پذیر ہو رہا ہوگا۔یہی وہ سوچ ہے جو مجھ جیسے لوگوں کو تعمیری کاموں میں مشغول رکھتی ہے اور اس کی ایک مثال یہ رسالہ بھی ہے'' اقبال حسن آزاد کی یہی مثبت سوچ انہیں اس پر آشوب دور میں بھی رسالہ جاری رکھنے پر مجبور کر رہی ہے۔رسالے کا آغاز ضیاء فاروقی کی حمد اور ڈاکٹر ذکی طارق کی نعت سے ہوتا ہے۔اس شمارے کی غزلیں اور نظمیں معنویت سے پُر ہیں جن میں ضیا فاروقی، ڈاکٹر ذکی طارق، جمال اویسی، اسحاق وردگ، شمسہ نجم، نوشاد احمد کریمی اور اصغر شمیم (راقم الحروف) کی غزلوں کے علاوہ افتخار حیدر اور امین کنجاہی کی نظمیں بھی ہیں۔اس شمارے کی غزلوں کے چند اشعار دیکھیں۔

پہلے آنکھوں نے منظر سمیٹے سبھی — پھر جو رنگین تھے ان کو سادہ کیا
(ضیا فاروقی)

توڑ کر صدیوں کی دیوارِ انا — دل کے آئینے کا منظر دیکھنا
(ڈاکٹر ذکی طارق)

میں نے مانا کہ سمٹنے کو ہے سارا عالم — کچھ نئے خواب نئی صبح کے بونے دینا
(جمال اویسی)

عجیب بات ہے تم تک خبر نہیں پہنچی — یہاں پہ روز بہایا گیا لہو لوگوں
(اسحاق وردگ)

کتنی آسانی سے دنیا نے اسے چھین لیا — ایک مدت کی ریاضت سے کمایا ہوا شخص
(شمسہ نجم)

قصہ گو ڈھونڈ کہیں اور ٹھکانا اپنا — شہر یہ جادو بیانی سے نکل آیا ہے
(نوشاد احمد کریمی)

آنکھ جب کھولی تو دیکھا سامنے — دھند میں لپٹا سویرا دور تک
(اصغر شمیم)

خراج عقیدت کے تحت پروفیسر حسین الحق پر ایک مختصر گوشہ ہے۔جس میں مرغوب اثر فاطمی نے خراج عقیدت کے طور پر مرحوم حسین الحق پر ایک منظوم تأثرات پیش کرتے ہوئے ان سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

الوداع حسین الحق
تم روٹھ گئے ہو تو جاؤ
ہم تمہاری تخلیقات کی سوز و گداز میں
تمہیں ڈھونڈ لیں گے، تمہیں ڈھونڈ ہی لیں گے
اثر کو یہ یقین کامل ہے
تمہارے کارنامے تمہیں زندہ دکھیں گے
ادب کو تم پر ناز تھا، ہے اور رہے گا
الوداع حسین الحق، الوداع الوداع

میرے ہمراز جنوں، شام الم کے دمساز (پروفیسر عین تابش)، حسین الحق سے فکشن پر مکالمہ (نثار احمد صدیقی)، حسین الحق کچھ یادیں کچھ باتیں (اقبال حسن آزاد) اور جہان فکشن کا ایک معتبر نام (محمد الیاس انصاری) نے اپنی تحریروں سے حسین الحق پر اچھا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔اس شمارے میں ڈاکٹر ریشا قمر کا غضنفر سے مکالمہ بھی خوب ہے ادب سے تعلق رکھنے والے ہر طالب علم کو اس انٹرویو کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

گوشہ اعتراف کے تحت ان لوگوں پر مضامین پیش کئے گئے ہیں جو اندنوں مسلسل لکھ رہے ہیں اور ادبی دنیا کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔اس گوشہ کے تحت مرغوب اثر فاطمی کی غزل گوئی.....ایک مختصر جائزہ (پروفیسر حسین الحق)، جنسی ترجیحات کا تخلیقی بیانیہ اسرار گاندھی کے افسانے (شافع قدوائی)، شعیب نظام :شخص اور شاعر (صغیر افراہیم)، خالی فریم بھرنے کی خواہش (مشتاق احمد نوری)، اقبال حسن آزاد کی افسانہ نگاری (پروفیسر اسلم جمشید پوری)، طارق چھتاری کے افسانوں کا فکری وفنی نظام (صدام حسین)، ڈاکٹر منصور خوشتر کا ادبی شعور (ڈاکٹر وصیہ عرفانہ)، حقانی القاسمی ایک تخلیقی نقاد (ڈاکٹر قسیم اختر) اور ڈاکٹر اجے مالیوی شخصیت اور فکر وفن کی روشنی میں (ڈاکٹر صالحہ صدیقی) نے اپنے مضامین کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔

گوشہ مضامین کے تحت اس شمارے میں نو مضامین پیش کئے گئے ہیں شعیب نظام (اودھ کی چند معروف خواتین قلم کار)، ڈاکٹر احسان عالم (مظہر امام شخصیت اور شاعری)، ڈاکٹر جگ موہن سنگھ (ادبی مجلّہ ثالث کے اداریے)، شبنم پروین (صفدر امام قادری کا سفر نامہ بنگلہ دیش ایک تجزیاتی مطالعہ)، پروفیسر قدوس جاوید

(دشت وحشت کا شاعر ذوالفقار نقوی)، ڈاکٹر سیفی سرونجی (شاہ نجم الدین آبرو کی غزل اور اس کی خصوصیت)، وسیم فرحت (مجسم کیف: کیفی اعظمی)، راتھر سلطان روحی (آفتاب اقبال شمیم کے کلام میں انسانیت کا پیغام) اور عرفان رشید (انور سجاد انہدام اور تعمیر نو کا مسافر) یہ تمام مضامین نہ صرف مطالعے کی دعوت دیتے ہیں بلکہ رسالے کی معیار کا پتہ بھی دیتے ہیں۔اس رسالے کا افسانوی حصہ بھی ہمیشہ کی طرح کافی توانا ہے اور دور حاضر کے ممتاز افسانہ نگار اپنے منفرد انداز اور اسلوب کے افسانہ کے ساتھ اس شمارے میں حاضر ہیں شموئل احمد (کٹوا)، رینو بہل (مجازی خدا)، شاکر انور (محبت ایک عام سا واقعہ)، شاہین کاظمی (چنبے دی بوٹی)، اقبال حسن آزاد (حکایت در حکایت)، قرب عباس (بارگاہِ خداوند)، ڈاکٹر مریم عرفان (دھوبی گھاٹ)، ڈاکٹر شکیل احمد خاں (میلی عورت) اور نوشابہ خاتون (خلا) کی افسانوی دنیا میں آپ خود کو کھوتا ہوا نظر آئیں گے۔صابر رضا رہبر کا ترجمہ دہلیز (نرمل ورما) اور اقبال حسن خان کے ناول (راج سنگھ لاہوریا) کا آخری باب، کتابوں پر تبصرے، ثالث پر تبصرے رسالے کے معیار میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔

آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ ہند پاک سے شائع ہونے والے ادبی معیاری رسالوں میں ثالث ایک خوشگوار اضافہ ہے کیونکہ اس کی باگ دوڑ ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق قلمکار کے ہاتھوں میں ہے۔یہی دعا ہے کہ حال کے ساتھ ساتھ اس کا مستقبل بھی تابناک ہو.....!!

☆☆☆

● ڈاکٹر منصور خوشتر

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان ''ثالث'' کا بیسواں شمارہ موصول ہوا۔رسالہ کے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد نے رسالہ کو سجانے، سنوارنے اور اس کے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔سابق شماروں کی طرح اس شمارہ میں بھی غزلیں، نظمیں، خراج عقیدت، انٹرویو، اعتراف، مضامین، افسانے، ترجمہ، ناول کا آخری باب، تبصرے، ثالث پر تبصرے اور مکتوبات کے تحت بہت سے مواد اس رسالہ میں موجود ہیں۔اپنے اداریہ میں اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں:

''مایوسی کی بات کرنا دل شکستہ ہونا، خود کے ساتھ اوروں کی ہمت بھی توڑنا اچھی علامت نہیں ہے۔حالات خواہ جیسے بھی ہوں انسان کو ہمیشہ زندگی کے روشن پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہئے۔اگر کچھ برا ہو رہا ہے تو یقیناً کچھ اچھا بھی ظہار پذیر ہو رہا ہوگا۔یہی وہ سوچ ہے جو مجھ جیسے لوگوں کو تعمیری کام میں مشغول رکھتی ہے اور اس کی ایک مثال یہ رسالہ ''ثالث'' بھی ہے۔

ضیاء فاروقی کی حمد اور ڈاکٹر ذکی طارق کے نعتیہ کلام کے ساتھ رسالہ کا آغاز ہوا ہے۔اس کے بعد ضیاء فاروقی، ڈاکٹر ذکی طارق، جمال اویسی، اسحاق وردگ، شمسہ نجم، نوشاد احمد کریمی اور اصغر شمیم کی غزلوں نے رسالہ کو خوبصورت بنانے میں نمایاں کام انجام دیا ہے۔افتخار حیدر اور امین کنجاہی کی نظمیں اس شمارہ میں شامل ہیں۔

گوشۂ اعتراف کے تحت مرغوب اثر فاطمی، اسرار گاندھی، شعیب نظام، اقبال حسن آزاد، طارق چھتاری، ڈاکٹر منصور خوشتر اور حقانی القاسمی کی شخصیت اور فن پر مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔

مضامین کے تحت شعیب نظام کا مضمون ''اودھ کی چند معروف خواتین قلم کار'' کے عنوان سے ہے۔اپنے اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ ''داراب بانو وفا نہ صرف بہت اچھی شاعرہ بلکہ بہت عمدہ اور محبت کرنے والی شخصیت کی مالک تھیں۔ان کا تعلق ایک نواب خاندان سے تھا، ہم لوگ انہیں بانو باجی کہتے تھے۔ان کے گھر زعفران کی بریانی ایسی لذیذ بنتی تھی کہ اب تک اس کے ذائقہ کا احساس باقی ہے۔اسی طرح مضمون نگار نے قرۃ العین حیدر، نگار صبیحہ، عصمت آپا، رام لعل وغیرہ کا تذکرہ اپنے مضمون میں کیا ہے۔

''مظہر امام: شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے ڈاکٹر احسان عالم نے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے مظہر امام کی شاعرانہ انفرادیت کو اچھے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔مظہر امام کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''مظہر امام کی شخصیت کئی رنگوں کے امتزاج سے بنی۔لیکن یہ لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں میں ظاہر ہوتی رہی اور ہر بار ان کی قوت کا احساس دلاتی رہی۔کبھی وہ صبر و تحمل کے پیکر نظر آئے اور کبھی متلون مزاج اور سیماب فطرت، کبھی وہ بچوں کی معصومیت اور حیرت کے مظہر ہیں اور کبھی ایک جہاں شناس شخص کی طرح طنز کے تیر برساتے نظر آتے ہیں۔وہ قاری کو لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر دنیا کا سفر کراتے ہیں۔''

ڈاکٹر جگ موہن سنگھ نے ''ادبی مجلّہ 'ثالث' کے اداریے'' پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب ہم اقبال حسن آزاد کی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی اردو رسالہ ''ثالث'' کے اداریوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو سب سے پہلی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ''ثالث'' کے اداریوں میں عصری ادب کی صورت حال اور سماجی و ثقافتی اور ادبی مسائل کو نمایاں کرنے کا رجحان ملتا ہے۔''ثالث'' کا اجراء سن ۲۰۱۳ء میں ہوا اور پہلے شمارہ کے اداریہ سے ہی اندازہ ہوگیا کہ اقبال حسن آزاد شعر و ادب کے حوالے سے اپنی ایک رائے رکھتے ہیں لیکن ''ثالث'' میں مدیر کے اداریہ کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی مہمان مدیر ادیب کا اداریہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔''

''صفدر امام قادری کا سفر نامہ بنگلا دیش: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے شبنم پروین نے اپنی تحریر رقم کی ہے۔وہ لکھتی ہیں کہ ''بنگلا دیش کو میں نے دیکھا'' معروف ادیب صفدر امام قادری کا تازہ سفر نامہ ہے۔

مصنف ۲۰۱۷ء اور ۲۰۲۰ء میں دو بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی غرض سے بنگلا دیش گئے تھے۔بنگلا دیش کے علمی سفر کے دوران انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اسے تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔یہ کتاب ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔جس میں ۳۶ چھوٹے بڑے ابواب ہیں۔اس کتاب کا انتساب شعبۂ اردو ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے نام کیا گیا ہے۔اس سفر نامے کا ذیلی عنوان رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور نظم ''کمار سونار بنگلا'' کو بنایا گیا ہے جسے بنگلا دیش کے قیام کے بعد وہاں کا قومی گیت قرار دیا گیا تھا۔

اردو ادب کی معروف شخصیت پروفیسر قدوس جاوید نے ''دشت وحشت'' کا شاعر: ذوالفقار نقوی'' کے عنوان سے ایک پُر مغز مضمون قلمبند کیا ہے۔ذوالفقار نقوی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ذوالفقار نقوی کہیں غزل کی روایت کی توسیع کرتے ہیں تو کہیں تجدید، لیکن اکثر وہ سب سے الگ ایجاد و اختراع سے بھی کام لیتے ہیں۔اس کی بہترین مثالیں ان کے اس مجموعۂ غزلیات ''دشت وحشت'' میں بھری پڑی ہیں۔غزل وہ صنف سخن ہے جس میں مضمون و معنی آفرینی کی ندرت، تمام تر ہنرمندیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو کر شاعری کے لسانی و شعری، فنی و جمالیاتی اور تعبیراتی امکانات کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی نے شاہ نجم الدین آبرو کی غزل کو اپنے بحث کا موضوع بنایا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ کلام آبرو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایہام گوئی کی زندہ مثال کہا جانے لگا۔اب ایہام گوئی کی کون سی صفت اور کون سے شاعر ایہام گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔یہ الگ بحث ہے۔آبرو کے اشعار عشق و محبت کے جذبات سے لبریز ہیں لیکن زبان کی فنکاری اور الفاظ کی ہنرمندی اور اشعار میں تازگی نمایاں ہے۔اپنے عہد کی زبان اور مزاج سے ہمیں آشنا کرتی ہے۔

کیفی اعظمی کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے وسیم فرحت (علیگ) اس طرح رقمطراز ہیں:

''کیفی کے ابتدائی دور کا شعری آہنگ اور مزاج مرثیہ کے بے حد قریب ہے۔ان کی اولین غزل 'اتنا تو زندگی میں کسی کے خلل پڑے' بجائے خود رثائیت، قنوطیت، یاسیت کی غماز ہے۔یہ ایک خاص طرز تکلم تھا، ایک خاص نماز عشق تھی جس کی امامت یا تو میر انیس فرما رہے تھے یا فانی بدایونی۔لیکن باوجود اس کے کیفی کے ابتدائی دور کی شاعری پسپائیت، سطحیت اور پژمردگی سے یکسر پاک ہے۔''

افسانے کے باب میں شموئل احمد، رینو بہل، شاکر انور، شاہین کاظمی، اقبال حسن آزاد، قرب عباس، شاہین کاظمی، ڈاکٹر مریم عرفان، ڈاکٹر شکیل احمد خاں، نوشابہ خاتون کے افسانے متاثر کرتے ہیں۔

''دیکھ لی دنیا ہم نے'' (مبصر علی رفاد فتیحی)، ''چراغاں سر خواب'' (مبصر سلیم سرفراز)، ''معروف و غیر معروف افسانہ نگار''، ''اردو میں دلت افسانہ''، ''نیا حمام'' اور ''دربھنگہ ٹائمز'' (مبصر اقبال حسن آزاد کے

تبصرے سے کتابوں اور رسالہ کا بھرپور تعارف ملتا ہے۔

ثالث پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے والوں میں مشتاق احمد نوری، سلیم انصاری، ڈاکٹر شاہد جمیل، ڈاکٹر احسان عالم، شاذیہ کمال، اصغر شمیم، ڈاکٹر جگ موہن سنگھ، وسیم احمد فدا، ناہید طاہر اور ڈاکٹر گلاب سنگھ ہیں۔

مکتوبات کے تحت اپنے خطوط کے ذریعہ شموئل احمد، ضیا فاروقی، شعیب نظام، ابرار رحمانی، عشرت ظہیر، ڈاکٹر ذکی طارق، وسیم فرحت (علیگ)، جمال اویسی، احمد علی جوہر، ابو محمد، نہاں، دانش اثری، تسلیمہ پروین رسالہ کے مزین کیا ہے۔

مختصر طور پر یہ عرض کرنا لازمی سمجھتا ہوں کہ اقبال حسن آزاد نے رسالہ کو دستاویزی حیثیت کا حامل بنادیا ہے۔

☆☆☆

● ریحان کوثر

ثالث: اعتراف کی معراج

میں رمضان المبارک کی آمد کا منتظر تھا۔ مجھے سارے زیر التواء کام مکمل کرنے کی دھن سوار تھی۔ کورونا وائرس کی وبا کی متعدد لہروں کے بعد اب لاک ڈاؤن اور مختلف پابندی کو پوری طرح اٹھا لیا گیا تھا۔ زندگی تیز بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ میرا رمضان کا معمول ہے کہ میں مطالعے کے لیے چند ایک کتابوں کا انتخاب پہلے ہی کرلیا کرتا ہوں۔ ان میں زیادہ تر دینی علوم اور تاریخِ اسلام سے متعلق کتابیں ہوا کرتی ہیں۔ اسی تگ ودو میں مصروف تھا کہ پوسٹ مین کتابی سلسلہ ثالث تھما کر چلا گیا۔

ہمارے دوست نعیم یاد کا ڈیزائن کیا ہوا، زعفرانی، زرد اور سبز رنگوں کے دلکش امتزاج کے سبب سرورق تو دیدہ زیب تھا لیکن پشت پر نگاہ ڈالی تو دل اداس اور غمگین ہو گیا۔ حسین الحق صاحب کی تصویر کے نیچے 'آمد' اور 'رفت' کی تاریخوں کے درمیان دل و دماغ 'پینڈولم' بن کر رہ گیا..... حسین الحق صاحب سے وابستہ یادیں آنکھوں میں رقص کر رہی تھیں۔ میرے ناتواں کاندھوں اور کمزور پشت پر ثالث کا پشت کسی وزن کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ وہ وزن جسے رکھنے کی مجھے کہیں بھی مناسب جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے کئی بوجھ انسان اپنی ذات کے ساتھ لیے پھرتا ہے۔ ابھی تو ساہتیہ اکادمی کا میمنٹو بھی مناسب جگہ پر رکھا نہ گیا تھا۔ افسوس نے باطن میں سرگوشی کی۔ ؎

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن ثالث کے مشمولات دل وجاں کے اس بوجھ کو کچھ حد تک کم کرنے میں کامیاب ضرور نظر آئے۔

ثالث کا خصوصی گوشہ خراجِ عقیدت دیکھ کر دل کو سکون حاصل ہوا۔ زخم پر مرہم کی طرح محسوس ہوا۔ اس شمارے میں مرغوب اثر فاطمی نے 'الوداع حسین الحق' کے تحت خوبصورت اور دلپزیر منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

''تم روٹھ گئے ہو تو جاؤ
ہم تمہاری تخلیقات کے سوز وگداز میں
تمہیں ڈھونڈ لیں گے، ڈھونڈ ہی لیں گے
اثر کو یہ یقین کامل ہے
تمہارے کارنامے تمہیں زندہ رکھیں گے
ادب کو تم پر ناز تھا، ہے اور رہے گا
الوداع حسین الحق، الوداع الوداع''

پروفیسر عین تابش نے 'میرے ہمراز جنوں، شام الم کے دمساز' کے ذریعے حسین الحق کے قیام پٹنہ کے زمانے کے عظیم آباد کی علمی اور ادبی شخصیات اور اُس عہد کی ادبی زندگی کا خوبصورت منظر نامہ پیش کیا ہے۔

فیکٹ کو فکشن بنانے والے جادوگر حسین الحق دراصل میرے سیاسی پس منظر پر تحریر کردہ افسانوں کا محرک اور استاد تھے۔ آپ نے سیاسی، سماجی، ثقافتی، مذہبی اور تہذیبی معاملات پر بہترین افسانے اور افسانوی کرداروں کی فوج تخلیق کی ہے۔ ایک مشہور جج کی مرڈر مسٹری کو آپ نے کچھ ہوں افسانہ بنایا ہے کہ ساری حقیقت عیاں کر دی ہے۔ جب بھی میں فیکٹ کو فکشن بنانے کی کوشش کرتا ہوں آپ کے افسانوں کو کسی فارمولے کی طرح استعمال کرتا ہوں۔ آپ نے سیاسی اور سماجی حالات پر تخلیق کیے گئے افسانوں میں قوم وملت کے درد والم کو عمدہ جزیات نگاری کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جی ہاں! آپ نے ملت اسلامیہ کے حالات کو پیش کرنے کے لیے جزیات نگاری کا سہارا لیا ہے جو کہ افسانہ نگاری میں مشکل ترین کام ہے۔ جبکہ بیشتر یہ کام اپنے بیانیے یا کرداروں کے مکالمے سے لیا کرتے ہیں۔ میں نے سیاسی پس منظر پر جب جب لکھا یا لکھنا چاہا تو میں نے آپ کو کئی کئی بار پڑھا ہے اور ان کی تحاریر میں فیکٹ کو فکشن بنانے کی تدابیر کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

نثار احمد صدیقی کا مکالمہ 'حسین الحق سے فکشن پر مکالمہ' فکشن کے ہر طالب علم کو ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیے، ایک سوال کے جواب میں افسانوی تنقید کے حوالے سے حسین الحق فرماتے ہیں:

''تقریظ تو جدید دور کیا کسی دور کے کام آنے والا اظہار ہی نہیں ہے، یہ ایک قسم کا فریب ہے جو تقریظ نگار مصنف کو دیتا ہے اور خود فریبی ہے جو تقریظ لکھوانے والا خود اپنے لئے روا رکھتا ہے۔ رہی بات تاثرات کی۔ تاثر ظاہر کرنے والا اگر باعلم ہے اور 'تحریر متاثہ' کے متن اور منطقے کو اس نے پالیا ہے تو یہ تاثر یقیناً

متن کی تفہیم میں مددگار ہوگا۔اس کے باوجود تاثر بنیادی طور پر ذاتی پسند و ناپسند کا اشاریہ ہے اور علمی گفتگو میں ذاتی پسند و ناپسند کہ 'میں ایسا سمجھتا ہوں' کی کوئی حیثیت علمی اہمیت نہیں ہے۔ ہر فن پارے کو سمجھنے کا ایک 'مقررہ ادبی اور ہمعصر معیار' ہوتا ہے اور ہونا چاہئے اور تاثر ظاہر کرنے والے کو اس معیار سے واقف بھی ہونا چاہئے اور اس معیار پر فائز بھی ہونا چاہئے۔اگر وہ ان نام عصر ادبی معیاروں سے واقف نہیں ہے یا خود اس معیار کا قاری نہیں ہے تو اس کے لئے خموش رہنا افضل ہے۔''

اس کے بعد اقبال حسن آزاد نے اپنے مضمون ''حسین الحق..... کچھ یادیں، کچھ باتیں'' میں آپ کے آخری ایام کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

''وہ فیس بک پر بھی ایکٹیو تھے اور میری تحریروں پر خاص نظر رکھتے تھے۔اکثر میرے کسی افسانے کو پڑھ کر مجھے فون کرتے اور مفید مشوروں سے نوازتے۔گزشتہ سال میں نے ''ثالث ادبی فورم'' کے تحت فیس بک پر ایک افسانوی نشست رکھی تھی اور جس کی صدارت کے لیے میری نظرِ انتخاب، حسین صاحب پر پڑی۔ انہوں نے بخوشی اس ذمہ داری کو قبول کیا اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک موذی مرض کے شکار ہو گئے ہیں۔کورونا قہر کے دوران جب ایک ایک کر کے ادبی شخصیتیں رخصت ہونے لگیں تو ان کے لہجے میں مایوسی در آئی تھی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ بغرض علاج دلی لے جائے گئے ہیں۔جب وہ دلی سے واپس آئے تو میں نے ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا۔ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا اور مایوس کن تھا۔ میں نے مناسب وموزوں الفاظ میں انہیں تسلی دی تو وہ خوش ہو گئے۔لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بہت جلد اپنے چاہنے والوں کو غم کے اتھاہ سمندر میں چھوڑ جائیں۔''

ثالث ادبی فورم کا میں بھی ایک ادنیٰ سا رکن ہوں۔''ثالث افسانوی نشست ۲۰۲۱'' کے خطبہء صدارت جو انہوں ۲۶ جولائی ۲۰۲۱ء کو پیش کیا تھا، اس خطبے کے آخر میں فرماتے ہیں کہ:

''بس دم آخر اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ہر پہلو سے تنوع صائب ہے مگر کوشش کی جانی چاہئے کہ معیار کے محاذ پر سب سپہ سالار ہی رہیں، پیدل کوئی نہ رہے (گو کہ شاید یہ ممکن نہیں ہے، پھر بھی اپنی جانب سے کوشش یہی ہونی چاہئے)''

اس نشست میں میرے افسانے 'ریختہ' پر آپ نے مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا تھا جس کا لفظ لفظ میرے نزدیک سند کا درجہ رکھتا ہے۔اس کے بعد آپ نے مجھے پرسنل پر بھی خوب دعاؤں اور حوصلہ افزا کلمات سے نوازا تھا۔

اس کے بعد محمد الیاس انصاری کا مختصر لیکن جامع مضمون 'جہانِ فکشن کا ایک معتبر نام پروفیسر حسین الحق' بھی قابلِ قدر اور قابلِ مطالعہ مضمون ہے۔موصوف نے نہایت جامع انداز میں آپ کے فکشن کا احاطہ کیا ہے آپ لکھتے ہیں:

''پروفیسر حسین الحق ایک ایسے فن کار تھے جنھوں نے سماج کے ہر طبقے سے کردار کا انتخاب کیا ہے اور زمانے وحالات کی بہتر عکاسی کی ہے۔سچا فن کار وہی ہوتا ہے جس کی کہانیوں میں زمانہ بولتا ہے اور زمانہ کے اعتبار سے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔''

اس طرح ثالث نے حسین الحق صاحب کے گراں قدر خدمات کے اعتراف میں پر اثر اور جذبات واحساسات سے بھرپور حقیقی خراج عقیدت پیش کی ہے۔ یہ صرف ایک یادگار ہی نہیں بلکہ یہ تاریخی دستاویز سے کم نہیں! جبکہ ثالث شمارہ نمبر ۱۴ میں آپ پر ایک یادگار گوشہ بھی شائع کر چکا ہے۔

اقبال حسن آزاد صاحب نے اپنے اداریے میں اسی بے باکی اور دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے جس کے لیے وہ سوشل میڈیا پر مشہور ہیں، آپ نے اپنے سینے کے چھالوں کو کچھ یوں پھوڑا ہے، آپ فرماتے ہیں:

''یونیورسٹیوں میں اساتذہ ریسرچ اسکالرز کو ایسے موضوعات دیتے ہیں جن پر پہلے ہی سے وافر مواد دستیاب ہوتا ہے نتیجہ یہ کہ کاٹو سا ٹو کی ترکیب سے مکھی پر مکھی ماری جاتی ہے۔''

انھوں نے آگے اس کی منطقی مثال بھی دی ہے:

''منٹو کو تو اس قدر تختہ مشق بنایا گیا کہ اس بے چارے کی شکل پہچاننا مشکل ہو گئی ہے۔کم وبیش یہی حال دوسرے قلم کاروں کا بھی ہے اور اس طرح بار بار کے اگلے ہوئے نوالے ہی سامنے آتے ہیں جن سے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔''

میں اس بات کا شاہد ہوں۔سلام بن رزاق صاحب کا معروف واٹس ایپ گروپ 'بزم افسانہ' میں میں نے منٹو کے افسانے 'پھندنے' پر چوبیس پچیس صفحات پر مشتمل تبصرہ اور تجزیہ پیش کیا۔درحقیقت میں بھی اقبال حسن آزاد کے اس قول کا حامی ہوں کہ:

''جب تک فن پارے میں کوئی نیا پہلو نظر نہیں آئے تب تک اس پر کچھ نہیں لکھنا چاہیے۔''

میں نے پھندنے کی کردار نگاری کا مفصل تجزیہ کیا۔وہاں بزم میں خوب پذیرائی بھی ہوئی لیکن میں نے طنز کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسے کوئی شائع نہیں کرے گا۔ یہ پڑھتے ہی اسرار گاندھی صاحب نے فون کیا اور کہا کہ آپ یہ تبصرہ اقبال حسن آزاد صاحب کو بھیج دیجیئے ان شاء اللہ ضرور شائع ہوگا۔ بہرحال اسی دوران بزم میں پروفیسر بیگ احساس صاحب نے اعلان کیا کہ ریحان بے فکر ہو جائیں، پھندنے پر یہ تبصرہ 'سب رس' میں میں شائع کروں گا۔افسوس اعلان کے دو ہفتے بعد ہی بیگ احساس صاحب بھی ہم سے روٹھ کر چلے گئے.....

اقبال حسن آزاد صاحب کو میں نے وہ تبصرہ تو نہیں لیکن اپنا افسانہ 'ریختہ' بھیج دیا۔یہ افسانہ انھوں نے نہ صرف ثالث ادبی فورم پر پیش کیا بلکہ آپ ہر منفی تاثرات پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے۔انھوں نے میری خوب حوصلہ افزائی کی!

بہر کیف! اداریے میں اقبال حسن آزاد صاحب نے ثالث کا اگلا پچھلا سارا نقشہ قاری کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ میں تو حیران اور پریشان ہوں کہ اداریے کی کون کون سی بات کا ذکر کروں!

اس شمارے میں حمد (از: ضیاء فاروقی) ونعت (از: ڈاکٹر ذکی طارق) کے بعد ضیاء فاروقی، ڈاکٹر ذکی طارق، جمال اویسی، اسحاق وردگ، شمسہ نجم، نوشاد احمد کریمی اور اصغر شمیم کی غزلیں اور افتخار حیدر، امین کنجاہی کی نظمیں شاملِ اشاعت ہیں۔ یہ تمام معیاری اور عمدہ ہے۔ اس کے بعد خراج عقیدت کے تحت اول الذکر پانچ مضامین شامل ہیں۔

پروفیسر غضنفر علی صاحب سے انٹرویو ''بات کر کے دیکھتے ہیں'' ادب کے طالب علموں کے لیے کسی سوغات سے کم نہیں! یہ انٹرویو ذہین اور نوجوان ریسرچ اسکالر اور ادیبہ ڈاکٹر ریشا قمر نے لیا ہے۔ مکالمہ دلچسپ، معلوماتی اور پر مغز ہے۔ سوال بھی خوب اور جواب بھی خوبصورت ہے۔

غضنفر سر سے میں نے منٹوں نہیں بلکہ گھنٹوں ٹیلی فونک گفتگو کی ہے۔ کئی آن لائن نشست میں بھی ان کے ساتھ رہا۔ آپ لفظوں کے جادوگر ہیں۔ بات سے بات بنانا اور بات کو انجام تک پہنچانے میں آپ ماہر ہیں۔ لیکن اس دلچسپ انٹرویو میں ایک جواب پر میری فکر ونظر کی سوئی اٹک سی گئی، غضنفر سر مثبت اور تعمیری باتیں کرنے میں 'سردار' اور اثر دار ہیں، اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں آپ کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

''میری رائے اچھی نہیں ہے مجھے اس زبان کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا جبکہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بھی اردو کے قمقمے کثرت سے دکھائی دیتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ قمقمے نہیں جگنو ہیں جو ذرا دیر کے لیے جھلملاتے ہیں اور فضا پر جیوں کے تیوں اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔ وجہ صاف ہے اسکولوں سے اردو کی تعلیم ختم ہوتی جا رہی ہے اردو والوں کے بچے ہی اردو نہیں پڑھتے جو اردو سے جڑے ہوئے ہیں یا جن کے بچے اردو اسکولوں میں پڑھتے ہیں انھیں ترچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے جن کی یہ مادری زبان رہی ہے ان کے گھروں سے بھی اب یہ بے دخل ہو رہی ہے کسی بھی جانب سے اس کی بقا کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے جذباتی رشتہ بھی اب کسی کا اس کے ساتھ نہیں رہ گیا ہے ایسے میں یہ سوچنا کہ اس کا مستقبل تابناک ہوگا ایک خوبصورت خواب کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔''

غضنفر صاحب نے آگے اُردو کی طاقت اور اس کے راستے کے روڑے کا بھی ذکر کیا ہے باوجود اس کے مجھے شک یا گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ جواب نامکمل ہے۔ کہیں نہ کہیں کچھ رہ گیا ہے.....

ہمیشہ کی طرح اس شمارے میں اردو دنیا کا منفرد اور ممتاز کالم 'اعتراف' بھی شامل ہے۔ اس کالم کے تحت ان ادیبوں اور شاعروں پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں جو حیات ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ ان میں معروف وغیر معروف دونوں قسم کے قلم کار شامل ہیں۔

اس شمارے میں مرغوب اثر فاطمی کی غزل گوئی.....ایک مختصر جائزہ (پروفیسر حسین الحق)، جنسی ترجیحات کا تخلیقی بیانیہ: اسرار گاندھی کے افسانے (شافع قدوائی)، شعیب نظام شخص اور شاعر (صغیر افراہیم) خالی فریم بھرنے کی کاوش (مشتاق احمد نوری)، اقبال حسن آزاد کی افسانہ نگاری (پروفیسر اسلم جمشید پوری)، طارق چھتاری کے افسانوں کا فکری وفنی نظام (صدام حسین) ڈاکٹر منصور خوشتر کا ادبی شعور (ڈاکٹر وصیہ عرفانہ)، حقانی القاسمی: ایک تخلیقی نقاد (ڈاکٹر قسیم اختر) اور ڈاکٹر اجے مالوی: شخصیت اور فکر وفن کی روشنی میں (ڈاکٹر صالحہ صدیقی) شامل ہیں۔

ثالث کا مستقل کالم 'اعتراف' صرف ایک کالم نہیں بلکہ نئے اور اچھا لکھنے والوں کے لیے امید کی کرن ہے۔ اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے آئندہ صدیوں میں اس کالم کو یاد کیا جائے گا۔

اس شمارے میں اودھ کی چند معروف خواتین قلم کار (ڈاکٹر صالحہ صدیقی)، مظہر امام شخصیت اور شاعری (ڈاکٹر احسان عالم)، ادبی مجلّہ ''ثالث'' کے اداریے (ڈاکٹر جگ موہن سنگھ)، صفدر امام قادری کا سفرنامہ بنگلا دیش ایک تجزیاتی مطالعہ (شبنم پروین)، دشت وحشت کا شاعر: ذوالفقار نقوی (پروفیسر قدوس جاوید)، شاہ نجم الدین آبرو کی غزل اور اس کی خصوصیت (ڈاکٹر سیفی سرونجی)، مجسم کیف: کیفی اعظمی (وسیم فرحت (علیگ)، آفتاب اقبال شمیم کے کلام میں انسانیت کا پیغام (راتھر سلطان روحی) اور انور سجاد انہدام اور تعمیر نو کا مسافر (عرفان رشید) کل نو تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان تمام میں ایک بات یکساں طور پر نظر آتی ہے کہ تمام مقالات میں شخصیت اور فن پر مختلف زاویوں اور نکتہ نظر سے گفتگو کی گئی ہے اور یہ عصری تقاضوں کے آئینہ دار ہیں۔

افسانوں کی بات کریں تو اس کالم میں 'کٹوا' پہلا افسانہ ہے جو معروف ومقبول افسانہ نگار شموئل احمد کے مشاق قلم کا نتیجہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار روندر تیاگی ایک براہمن ہے جو جنسی امراض سے محفوظ رہنے کے لیے ختنہ کروا بیٹھتا ہے اور ملک کے منافرت سے لبریز اور زہر آلود تالاب میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اس کے جسم پر لپٹی اس کی جنیو بھی کوئی کام نہیں آتی۔ ختنہ کے بعد روندر کے سامنے جو حالات و واقعات رونما ہوتے ہیں بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ تمام واقعات کی شاندار منظر نگاری کی گئی ہے۔ ایک ایک منظر اور ہر منظر کا پس منظر آنکھوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ افسانے میں ختنہ کے عمل سے اکثریت کے جسم میں اقلیت کی روح منتقل کر دی گئی ہے۔ اقلیت کے درد والم کو پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اختتام مثبت اور تعمیری ہے۔ اس افسانے پر تفصیلی گفتگو کی جانی چاہیے۔ جنسی پلاٹ کے باوجود دور حاضر کے کئی مسائل اور اس کے حل کی خاطر افسانے کو تخلیق کیا گیا ہے۔

رینو بہل کا افسانہ 'مجازی خدا' فیس بک اور سوشل میڈیا کا ڈراؤنا خواب اور گھناؤنا کھیل ہے۔ فیس بک کے ذریعے ادھیڑ عمر کے مردوں کو مجازی خدا بنا کر بیوقوف بنانے کی ایک عمدہ کہانی بنائی گئی ہے۔

کردار نگاری اور جزیات نگاری کے ساتھ ساتھ منظر نگاری اور مکالمے بھی مناسب اور متوازن ہے۔

شاکر انور کا افسانہ ''محبت.....ایک عام سا واقعہ'' عمدہ اور 'خاص' سا واقعہ ہے۔ عنوان تا اختتام لاجواب اور شاندار ہے۔ دبئی کی خوبصورت منظر نگاری اور جذبی اور سیما کا بڑا ہی معصوم لیکن حساس کردار پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ پڑھ کر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ افسانے میں پاکستانی ڈرامائی انداز در آیا ہے جو مجھے ذاتی طور پر بے حد پسند ہے۔

شاہین کاظمی کا افسانہ 'چنبے دی بوٹی' پنجابی مٹی سے گوندھا گیا سوندھا سا نہایت خوبصورت افسانہ ہے۔ راوی کا کردار دلچسپ ہے اور منفرد ہے۔ احمد دین اور راوی کی گفتگو دلچسپ اور عمدہ ہے۔ اس پر تو فلم بنائی جانی چاہیے۔ بلکہ یہ کسی ناول کا پلاٹ معلوم ہوتا ہے۔ ایک کمال یہ ہے کہ پنجابی مکالمے کہیں پر بھی بوجھ معلوم نہیں ہوتے اور نہ ہی کہانی میں کسی قسم کا خلل پیدا کرتے ہیں۔ کلاسیکی طرزِ تحریر کی خوشبوؤں سے مہکتا ہوا عمدہ افسانہ ہے۔ اختتام بھی بہت خوبصورت ہے۔ بھرپور افسانوی فضا کے سبب افسانہ مکمل اور متوازن نظر آتا ہے۔ یہ ایک کھرا افسانہ ہے۔

افسانہ 'حکایت در حکایت' افسانہ نگار اقبال حسن آزاد کا ایک کامیاب تجربہ معلوم ہوتا ہے جو ہر اعتبار سے کامیاب اور مکمل ہے۔ بچوں، بیوی اور والدین کے متعلق تین حکایت بڑے ہی دلچسپ انداز میں اس کہانی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ کورونا وائرس کی وبا اور اس کے بعد زندگی کی بدلتی ہوئی صورتحال کو حکایت کے دھاگوں سے پرویا گیا ہے۔ فلسفیانہ اور نفسیاتی طرزِ تحریر نے افسانے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ افسانے میں راوی نے کئی عمدہ اور قابل ذکر مکالمے ادا کیے جو علم نفسیات کے آئینے میں ڈی کوڈ کیا جانا چاہیے۔

بارگاہ خداوند (قرب عباس)، دھوبی گھاٹ (ڈاکٹر مریم عرفان)، میلی عورت (ڈاکٹر شکیل احمد خاں) اور خلا (نوشابہ خاتون) چار مزید افسانے بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

نرمل ورما کی کہانی دہلیز کا ترجمہ صابر رضا رہبر نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس کے بعد ناول کا آخری باب 'راج سنگھ لاہوریا' (اقبال حسن خان) شامل ہے۔

آخری حصے میں، دیکھ لی دنیا ہم نے (مبصر: علی رفاد فتیحی)، چراغاں سر خواب (مبصر سلیم سرفراز)، معروف و غیر معروف افسانہ نگار.....، اردو میں دلت افسانہ..... نیا حمام، در بھنگہ ٹائمز (مبصر اقبال حسن آزاد) منتخب تبصرے اور جائزے شامل کیے گئے ہیں۔

مشتاق احمد نوری، سلیم انصاری، ڈاکٹر شاہد جمیل، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر شاذیہ کمال، اصغر شمیم، ڈاکٹر جگ موہن سنگھ، وسیم احمد فدا، ناہید طاہر، ڈاکٹر گلاب سنگھ، شموئل احمد، ضیاء فاروقی، شعیب نظام، ابرار رحمانی، عشرت ظہیر، ڈاکٹر ذکی طارق، وسیم فرحت (علیگ)، جمال اویسی، ڈاکٹر احمد علی جوہر، ابو محمد، نہاں، دانش اثری اور تسنیمہ پروین وغیرہ مشاہیر ادب کے ثالث پر تبصرے اور مکتوبات آخری کالم میں پیش کیے گئے ہیں۔

سہ ماہی ثالث، شمارہ نمبر 20 کا حاصلِ مطالعہ درج ذیل ہیں۔

- شمارہ میں مضامین اور مقالات کے انتخاب کے دوران طوالت کے بجائے مواد پر زور دیا گیا ہے۔ کاپی پیسٹ اور بار بار دہرائے جانے والے مقالات سے پرہیز صاف نظر آتا ہے۔
- مختصر لیکن جامع مضامین شاملِ اشاعت ہیں۔
- شمارہ عصری تقاضوں پر کھرا اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔
- حالات حاضرہ پر مشتمل مواد کو ترجیح دی گئی ہے۔
- نئے اور اچھا لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہر کالم میں کی گئی ہے۔
- افسانوں اور نظموں کے انتخاب میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔
- شعری و نثری توازن برقرار رکھا گیا ہے۔

بیشک اس عمدہ شمارے کی اشاعت کے لیے ٹیم ثالث بے انتہا داد و تحسین کی مستحق ہے۔

☆☆☆

● روندر جو گلیکر

کسی ادبی جریدے اور رسالے کی اہمیت اس بات سے بہت زیادہ تعلق رکھتی ہے کہ وہ رسالہ یا جریدہ ہم عصر ادب میں راہ بنانے والے نظریات کو، تخلیقی عمل میں ارتقاء کی نئی جہتوں کی دریافت سے نسبت کیے جانے والے تجربات کو، اور تنقیدی رویوں میں ترمیمی اور وضاحتی بدلاؤں کی نمائندگی کرنے والی تحریروں کو اپنے صفحات پر کتنی جگہ دیتا ہے۔ مدیر کسی بھی ادبی یا فنی نظریے کا حامی ہو لیکن اس کا اصلی سروکار اپنے رسالے کے حوالے سے اس نقطے پر فوکس ہوتا ہے کہ بہ حیثیت مدیر وہ ادبی منظر نامے میں ہونے والی تبدیلیوں اور مباحث تک رسائی کس حد تک ممکن کر پاتا ہے، اور اپنے نقطہ نظر کی بنیاد سے اس پر کیا تصورات پیش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو ادب کے مختلف ادوار اور رہم عصر رجحانات کے درمیان کے باہمی تعلق سے کس حد تک اپنی نزدیکی پہنچ کی شناخت کر پاتا ہے۔ مونگیر بہار سے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی ادارت میں نکلنے والا ادبی جریدہ ''ثالث'' ہم عصر ادبی منظر نامے پر اپنا ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ شمارہ در شمارہ ''ثالث'' اپنی فہرست میں اُپر عرض کی گئی باتوں کا بہت صاف عکس پیش کرتا ہے۔ ''ثالث'' شمارہ ۲۰ میں پیش کی گئی فہرست اس زمن میں ایک اچھی مثال ہے۔

اس حوالے سے شمارہ ۲۰ کے جائزے کی شروعات ڈاکٹر جگ موہن سنگھ کے مضمون کے ذکر سے کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں ثالث کے ماضی میں پیش کیے گئے کم و بیش سبھی شماروں میں شائع ہوئے اداریوں کا

احاطہ کیا گیا ہے۔یہ مضمون ''ثالث'' کی روح کے پیغام کی ترجمانی معلوم ہوتا ہے جس میں مدیر اقبال حسن آزاد صاحب کے عزم اور ''ثالث'' کی بنیادی مقاصد کو صاف صاف لفظوں میں پیش کر دیا گیا ہے۔بقول ڈاکٹر جگ موہن سنگھ

''ثالث'' کے اداریوں میں اردو زبان وادب کی عصری صورت حال، مسائل، خامیوں اور خوبیوں کے علاوہ زبان وادب کے فروغ کے لیے منصوبہ بندی کے حوالے سے کسی نہ کسی نقطے کی نشان دہی بھی کی جاتی ہے اور یہ 'ثالث' کے اداریے ادب کے قلم کاروں اور قارئین کو دعوتِ فکر دیتے ہیں'' (ص:۰۴۱)

معروف فکشن نگار حسین الحق کو خراج عقیدت پیس کرتے ہوئے جو مضامین پیش کیے گئے ہیں وہ مرحوم فکشن نگار کی ادبی کاوشوں میں نہ صرف یہ کہ فن کے توصیت سے فنی شعور کی بازیافت لیے ہوئے ہیں بلکہ موصوف کی اپنے فن کے ساتھ گہری وابستگی کے سبب پیدا ہوئے Commitment اور اس سے جڑے واضح نظریے کی تفہیم بھی کرتے ہیں۔اس زمن میں نثار احمد صدیقی اور حسین الحق کے بیچ ہوا مکالمہ دلچسپ کڑی ہے جس میں ایک افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے ناطے حسین الحق نے اپنے فن، ہم عصر فکشن نگاروں کی تخلیقات اور رویئوں پر اپنے نظریات کا اظہار بہت گہرے جا کر کیا ہے۔مثال کے طور پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے جڑے ایک سوال کے جواب میں وہ رجحان اور داخلی تخلیقی عمل کے بیچ فرق کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ؛

''کسی رجحان کے نام پر کچھ نہیں لکھا جاتا ہے، رجحان کے زیرِ اثر لکھا جاتا ہے۔جدیدیت میں اولیت موضوع کی نہیں اسلوب کی ہے، متن کی نہیں بیان کی ہے۔یہاں اس بنیادی بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ادب میں اہمیت لفظ کے استعمال کی ہے۔آج کی تاریخ میں مابعد جدیدیت ہنوز اپنے کو اردو والوں سے مترادف کرنے اور اپنا جواز ثابت کرنے کے مرحلے سے گزر رہی ہے، لہٰذا ایسی غیر یقینی صورت حال میں اس کے بارے میں کیا کہا جائے۔'' (ص:۹۲)

اپنے مضمون میں اقبال حسن آزاد حسین الحق کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ نثر نگاری بھی مرصع سازی ہی ہے۔اور بلا شبہ حسین الحق ایک بہترین مرصع ساز تھے۔صرف مرصع ساز ہی نہیں بلکہ وہ ایک عمدہ مجسمہ ساز بھی۔'' (ص:۸۳)

تبصروں اور تجزیوں کو Secondary تحریر مانا جاتا ہے جو فن پارے کے وجود کی محتاج ہوتی ہے، لیکن تنقید کی ان دو اہم سرگرمیوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔گو تصنیف کے جمالیاتی حسن اور اس میں نظر آنے والے فنی مظاہر نقاد کو کسی نہ کسی طریقے سے متاثر کرتے رہتے ہیں مگر جب تک اس کی ماہیت کا تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا جاتا تب تک حسن کی تعبیر و تفہیم ادھوری رہ جاتی ہے۔بعض حلقوں میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ نقاد تخلیقی عمل سے نا آشنا ہوتا ہے۔لہٰذا تخلیق کا رمز شناس نہیں ہو سکتا لیکن اس شمارے میں پیش کیے گئے تنقیدی مضامین اس سوچ کے

اتھلے پن کو نکارتے ہیں۔اور تخلیق و تجزیہ کے بیچ کے رشتے کو بہ روکار رکھتے ہوئے تحریر میں فن کے متحرک پہلوں اور فنی لوازمات کی نشان دہی خوب کرتے ہیں۔تجزیہ اور تنقید کی بہترین مثال اسرار گاندھی کے افسانوں پر شافع قدوائی کے مضمون اور انور سجاد کے فن پر لکھے گئے عرفان رشید کے مضمون میں سے اخذ ان اقتباسات کو ملاحظہ فرمائیں؛

''علامتی طرز اظہار جدید افسانہ کا طرۂ امتیاز ہے۔تاہم چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر بیشتر جدید افسانہ نگاروں کے علامت کو بطور ایک متحرک تجربہ کی صورت میں پیش کرنے کی بجائے اسے محض پیرایۂ اسلوب کی ایک شق کے طور پر برتا ہے اور اکثر افسانہ علامت کے بجائے التباس علامت کا منظر بن گیا۔'' (ص:۴۶)

''انور سجاد نے اپنے افسانوں کو سماجی تاریخ بننے نہیں دیا بلکہ ان کے یہاں حقیقت اور فینٹسٹی کی وجہ سے کردار علامت کا روپ دھار لیتا ہے۔جس کی وجہ سے ان کی افسانوی کائنات میں معنی کی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔افسانوں میں زبان کا خیال رکھنا اس بات کا عین ثبوت ہے کہ انہیں زبان و بیان پر خاصی دسترس حاصل ہے۔ان کا افسانہ عموماً عام قاری سے گریز کرتا ہے۔اس کی وجہ اسلوب اور بیان کے نت نئے تجربے اور بظاہر وہ عام موضوعات ہیں جو بعد میں بین الاقوامی تناظر کا روپ دھار لیتے ہیں۔'' (ص؛۹۷۱)

اطالوی، مفکر، فلسفی اور نقاد Croce Benedetto کا موقوف ہے کہ فنی شہ پارے کو اس کی باطنی اصلیت میں دیکھا جائے، خود شاعر یا فن کار کے ذہن میں شہ پارے کی تجلی کس طرح ہوئی ہے۔میرے خیال میں شاعر اور اس کی شاعری میں جو رشتہ ہوتا ہے وہ لفظ کے معنی اور شاعر کے نجی احساسات میں اس معنی کی وسعت سے تعبیر ہوتا ہے۔شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس رشتے سے ہی مکالمہ قائم کیا جاتا ہے۔جو شاعری کی تال اور روانی کی پہچان بھی کرتا ہے۔اس شمارے میں پیش کچھ ایسے مضامین کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان مضامین میں جس شاعر کی شاعری کے حوالے سے جو بات کہی گئی ہے اس میں مواد پر اظہار کو ترجیح دی گئی ہے۔اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اظہار اور اس کے بنیادی وسیلہ جیسے اسلوب اور اس مختلف عناصر سے ہی ہدف کی پہچان کی جائے۔اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اسلوب، حسن کاری اور اظہار گویا ایک ہی عمل کے مختلف پہلو ہوں۔چند اقتباس پیش ہیں؛

''غزل وہ صنف سخن ہے جس مضمون و معنی آفرینی کی نُدرت، تمام تر ہنر مندیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو کر شاعری کے لسانی و شعری، فنی و جمالیاتی اور تعبیراتی امکانات کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جاتی ہے۔اور چوں کہ غزل ہر دور میں زبان، ذات، زندگی اور زمانے کی لہروں کو اپنے اندر سمیٹ کر کمال کی مہارتوں کے ساتھ اِن کے اظہار اور بیان کی قوت بھی رکھتی ہے۔چنانچہ اس بنیاد پر ذوالفقار نقوی ہی نہیں بلکہ پوری معاصر اردو شاعری کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ''زبان، ذات، زندگی اور زمانہ'' ہی وہ چار عناصر ہیں جن کی ماہرانہ لسانی، فنی اور جمالیاتی ترتیب و تنظیم سے شاعری وجود میں آتی ہے۔'' (دشت

وحشت کا شاعر: ذوالفقار نقوی، از پروفیسر قدوس جاوید، ص:۷۵۱)

یہ حقیقت ہے کہ کیفی کے شعری گلستاں میں کانٹوں کی چبھن اتنی معصوم ہے کہ جیسے پھول چنتے وقت کوئی کانٹا چبھ جائے۔ غرض کہ کیفی کی خالص اشتراکی منظومات کا نرالا خطیبانہ لہجہ بھی سماعت پر بار نہیں ہوتا۔ کیفی اپنی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں سے اسے 'پروپگنڈا' والی شاعری سے کچھ ماسوا نکال لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔'' ('مجسم کیف: کیفی اعظمی' از وسیم فرحت علیگ، ص:۶۶۱)

اقبال حسن آزاد خود ایک افسانہ نگار ہیں اور اس فن کا ایک لمبا تجربہ رکھتے ہیں چنانچہ افسانوں کی کی فہرست میں ہمیشہ دلچسپی اور تجسس بنا رہتا ہے۔ ان کا انتخاب کچھ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ افسانے کے فن سمیت افسانہ نگاری کے تمام جزئیات، کردار اور بیانیہ، موضوع اور بیان کی کوئی نہ کوئی یاد رہ جانے والی مثال دیکھنے کو ملتی ہے۔ دراصل افسانہ زندگی کے مسلسل سفر میں در آئے وقفے، نظر انداز کر دئے گئے گوشوں کی تحریر میں بازیافت پر تخلیقی گرفت کی گرہ لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔ افسانے میں انسانی زندگی سے ماورا اور شاید ہی کچھ ہو۔ افسانے میں مصنف زندگی کے نشیب و فراز کے تئیں اس کے خیالات اور مشاہدے سے حاصل تصورات خلق کرتا ہے، یہ معجزہ ہائے ہنر اسی بات پر بہت حد تک مبنی کرتا ہے کہ افسانہ نگار کی Range کی وسعت اور گہرائی کتنی ہے۔ افسانے میں کائنات کی تنقید کا ایک سُر نہاں رہتا ہے۔ تخلیقی کارفرمائی کا ایک جہاں آباد نظر آتا ہے۔ افسانہ یوں بھی کسی ایک پل میں ذہنی کیفیت، ایک احساس کی تفسیر ہے اور بطورِ خاص اس لیے اپنے محدود پیرائے میں خارج سے داخل تک کا سفر طے کرنے میں اپنا مقصد بھی تلاش کرتا ہے۔

اس شمارے میں ۱۰ افسانے شامل ہیں جس میں ایک افسانہ ہندی کے افسانہ نگار نرمل ورما کے افسانے 'دہلیز' کا اردو میں ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کو صابر رضا رہبر نے انجام دیا ہے اور اصل متن کے اثر کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس افسانے کی فضا اور موضوع سے، اسی شمارے کے ایک دوسرے افسانے ''محبت ایک عام سا واقعہ از شاکر انور'' کی بہت حد تک مماثلت ہے۔ 'دہلیز' کے شمی بھائی اور 'محبت ایک عام سا واقعہ' کے جذبی بھائی؛ دونوں افسانے میں اُس مرکز پر براجمان ہیں جہاں سے 'دیلیز' کی رونی اور 'محبت ایک عام سا واقعہ' کی سیما اپنے دبے، نظر انداز کر دیے گیے جذبات کی رو میں افسانے کا بیانیہ بنتی چلتی ہیں جو ایک ہی فضا کے دو افسانوں کو مختلف موڑ اور رنگ دیتا چلتا ہے۔

''ہمارے، جذبی بھائی اور آپی کے درمیان ایک طویل سونا فاصلہ ہے، ہم تینوں ان فاصلوں کے آخری موڑ پر کھڑے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتا۔ چھونا چاہتا ہے، لیکن پھر بھی چھو نہیں سکتا۔ ہمارے درمیان ایک گہری کھائی ہے جس میں مجھے گرنے کا خوف بھی ہے اور نہ گرنے کا افسوس

بھی۔'' (محبت ایک عام سا واقعہ، ص:۹۰۲)

جیلی اس کی بڑی بہن ہے۔ اس کے اور جیلی کے درمیان کئی برسوں کا سونا اور لمبا فاصلہ ہے۔ اس فاصلے کے دوسرے سرے پر جیلی ہے شمی بھائی ہیں۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو چھو نہیں سکتی، وہ دونوں اس سے مختلف جیتے ہیں۔'' (دہلیز ص:۲۴۲)

شمی بھائی جو بات کہتے ہیں اس پر یقین کرنا نہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کے سامنے جیسے سب کچھ کھو جاتا ہے.....اور کچھ ایسی چیزیں ہیں جو گویا چپ رہتی ہیں اور جنہیں جب رونی رات کو سونے سے پہلے سوچتی ہے تو لگتا ہے کہیں گہرا دھندلا پن سا گڑھا ہے جس کے اندر وہ پھسلتے پھسلتے بچ جاتی ہے اور نہیں گرتی تو افسوس رہ جاتا ہے نہ گرنے کا۔'' (دہلیز ص:۳۴۲)

شموئل احمد کا افسانہ 'کٹوا' اس شمارے کا بہترین افسانہ ہے یہ افسانہ انسانی فطرت میں جبلت کے زیر اثر ہونے والے عمل اور فرد کی سماجی شناخت کے Stereotype عوامل کی بنا پر برتے جانے والے تعصب کو ایک دلچسپ نظریے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ انسانی جبلت ایک نجی اور اندرونی کیفیت ہے جس کا دائرہ فرد کی اپنی حکمت عملی سے تعلق رکھتا ہے لیکن تنگ نظر معاشرے میں فرد کی شخصیت کی انفرادیت، شناخت کی اجتماعی نشانیوں کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ اس بنیاد پر ہم روندر تیاگی کے کردار کی بند نصیبی سمجھ سکتے ہیں جو بازار حسن میں جنسی مرض سے بچنے کے لیے ختنہ کروالیتا ہے، جہاں سے اس کی ساری شخصیت اب بس بدن کے اسی حصے میں آ کر ٹھہر جاتی ہے۔ وہ سماج میں بڑھتی فرقہ پرستی سے فکر مند بھی ہے اور بے نیازی کے سبب فراری بھی اختیار کر لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کا ختنہ ہی اس کے ذہن کا خوف بنتا چلا گیا یہاں تک کہ اردو اخبار سے بنے پیکٹ بھی تنگ نظری کے چلتے اجتماعی پہچان کا نشان بن جاتا ہے۔ شموئل احمد اس افسانے میں روندر کے کردار میں انسانی نفسیات اور سماجیات کو Juxtapose کرتے ہوئے کردار اور سماج کے بیچ جو absurdity ہے اس کی وضاحت کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

افسانے 'چنے دی بوٹی' اور 'بارگاہ خداوند' زندگی کی ڈھلتی شام کے شور میں کہیں پیچھے رہ گئی ڈھندلی صبح کی خاموشی کے گیت گاتے ہیں۔ 'چنے دی بوٹی' کا احمد دین اور 'بارگاہ خداوند' کا سونا دونوں کردار اپنے ماضی کے شکار ہیں۔ احمد دین محبت کی شدت دل میں لیے بوڑھاپے تک خلش کو نہیں بھولتا وہیں بوڑھاپے میں سونے کا وجود اور شخصیت جائز اور ناجائز کے حصار میں اپنی گمشدہ راہ کو تلاش کرتی نظر آتی ہے۔ احمد دین اور بے بے افسانے کے راوی کے حوالے سے ایک دوسرے کی نجات کا وسیلہ بنتے ہیں پر سونے کو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا یہاں تک کی خدا بھی اس کی نجات کا وسیلہ نہیں بن پاتا۔

ان دونوں افسانوں میں زبان کو اس طرح برتا گیا ہے کہ بیان میں ایک ہی وقت میں رمز اور اس کی وضاحت بیانیہ کا حصہ بن جاتی ہے۔ اپنے کرداروں کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو ابھارنے کی کوشش میں موضوع کا اظہار کچھ اس طرح سے ہوا ہے کہ ان دو افسانوں کے مطالعے کے دوران کرداروں کے کاندھے پر سوار افسانہ متحرک بیانیہ کے باوجود اپنے آخری حصے میں تھکنے لگتا ہے۔

اقبال حسن آزاد کا افسانہ 'حکایت در حکایت' صرف اپنے فارم میں حکایتی اور داستانوی ساخت کے تجربے کی وجہ سے ہی نیا پن لیے معلوم ہوتا ہے۔ اس افسانے میں حیات کی مختلف پیچیدگیوں، اتار چڑھاؤ پر چھوٹے چھوٹے قصوں میں درس دینے کا عنصر غالب ہے۔ اسی طرح کا ایک لیکن کم دلچسپ افسانہ 'خلا' ہے جو ایسے ہی موضوع پر لکھا گیا ہے لیکن سپاٹ بیانی نے قاری کے من میں واقعات کی پیش گوئی کے سارے راستے کھول دئے ہیں۔ 'میلی عورت' کا اختتام اگر چوکانے والا نہیں ہوتا تو یہ اپنے موضوع اور بیان کے لحاظ سے Cliche بن جاتا۔ گو اختتام پر پیش کیے گئے واقعے کی صدا بھی افسانے کے وسط میں ہی سنائی دینے لگتی ہے جس کی ایک وجہ ماروی کے کردار کو وسعت اور گہرائی عطا نہیں کر پانا ہے۔

اس شمارے میں جہاں تک شاعری کے شعبہ کا سوال ہے وہاں غزلیں بہ نسبت نظم کے زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ مثلاً ضیاء فاروقی کی غزلوں میں داخلیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ تجربۂ حیات اور گہرے احساسات کو مرکز میں رکھتے ہوئے غزلوں میں تخیل سے حاصل ڈکشن بہت متاثر کرتا ہے۔

پہلے آنکھوں نے منظر سمیٹے سبھی — پھر جو رنگین تھے ان کو سادہ کیا
موت کی جستجو میں ضیا عمر بھر — زندگی سے بہت استفادہ کیا
کان دھرتا ہوں تو ہوتی ہے سماعت مجروح — اپنی ہی خواہش بے باک سے ڈر لگتا ہے
کوئی سراب زدہ بھی نہیں نہ تشنہ لب — تو پھر یہ کون ہے دریا کی سمت آتا ہوا

جمال اویسی کی غزلوں میں انسان کو ماحول اور فطرت کی سطح سے دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ باطن کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسلوب میں ابہام کی صورت کو دور رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے اشعار آزاد فضا میں سفر کرتے ہوئے ہم تک بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں۔ اشعار میں گفتگو اور مکالمہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مضامین جو غزل میں مشکل سمجھے جاتے ہیں انہیں بہت ہی سہل لفظوں میں ادا کر دیا گیا ہے۔

شکستہ ملگجی گلیوں میں کیا کھویا ہے میرا — دروں کو دیکھتا ہوں بھٹکتا پھر رہا ہوں
ہر ایک مسلک کو عائد کر لیا ہے خود پر میں نے — عجب بے خد ہوں بے مطلب جھلکتا پھر رہا ہوں

ایک نظم جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ ہے امین کنجاہی کی نظم 'میں کیا بھیجوں' اس نظم

میں تشبیہات، مثلاً، وعیدوں کی زنجیر، سانسوں کی تسبیح، خط جو لکھے نہیں گئے کی کڑیوں نے نظم کے اندر کی بے چینی کو سلسلے وار طریقے سے ایک مالا میں گونتھ دیا ہے جس کی وجہ سے نظم میں نہاں سوال میں کیا بھیجوں کے معنی پوری نظم میں پرواز کرنے لگتے ہیں۔

ان سب کے علاوہ اس شمارے میں دیگر کتابوں پر تبصرے بھی موجود ہیں جس میں سے دو تبصرے بہت ہی اہم معلوم ہوتے ہیں جو تنقیدی نقطۂ نظر کی گہری سمجھ رکھتے ہیں۔ غضنفر کی تخلیق ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے علی رفاد فتیحی سوانحی ناول اور ناول کے باہمی رشتوں کا جائزہ اس کتاب کو مرکز میں رکھتے ہوئے لیتے ہیں۔ اس تبصرے کو اس حوالے سے بھی پڑھنا اہم ہے کہ یہ تبصرہ فکشن اور فیکٹ کی آمیزش کے مختلف اثرات پر بھی بات کرتا ہے۔

''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کی خوبی یہ ہے کہ غضنفر نے اپنی زندگی کے حالات، اپنے تجربات و مشاہدات، نفسیاتی و جذباتی پیچیدگیوں کو انتہائی دھیمے انداز میں انکسار و معروضیت کے ساتھ کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ تحریر خود نوشت سے زیادہ دلچسپ اور زندگی سے زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔'' (ص:۶۷۲)

دوسرا اہم تبصرہ سلیم سرفراز کا ہے جو شاعر ارشد عبدالحمید کے شعری مجموعے 'چراغاں سرِ خواب' پر کیا گیا ہے۔ موصوف نے رسمی گفتگو سے ایک دم ہٹ کر فنِ شعر گوئی کی تفسیر پیش کرتے ہوئے شاعری کا احاطہ کیا ہے۔ لفظ، ترکیب، ساخت جیسے لسانی پہلوں سے بھی استفادہ کرتے ہوئے شعری جمالیات کو پیش کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔

''انہوں نے اپنے اشعار میں ایسی نئی اور اچھوتی ترکیبیں اتنی فنی مہارت سے وضع کی ہیں کہ وہ کہیں سے بھی اجنبی اور غیر مانوس نہیں لگتیں۔ ثانیہ بھر کے لئے قاری چونکتا ضرور ہے لیکن پھر اس پر ایسا فسوں طاری ہوتا ہے کہ وہ اشعار کی روانی اور شیریں بیانی میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اس روانی میں اشعار میں برتی گئیں انوکھی ردیفیں بھی اپنا موثر کردار ادا کرتی ہیں۔'' (ص:۲۸۲)

مندرجہ بالا تاثراتی خیالات کی روشنی میں یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ''ثالث'' اپنی روش پر مسلسل قایم ہے۔ جس کی بنیاد ہم عصر ادبی منظر نامے پر فوکس رکھتے ہوئے اسے مرکزیت دینے پر ہے۔ پچھلے شماروں کے متعلق مکتوبات سے یہ شعور بھی ملتا ہے کہ ایماندار اور سنجیدہ قاری کی تربیت میں ایک معیاری رسالہ کیا رول ادا کر سکتا ہے۔ اختلافات اور ستائش کے دوسروں کے بیچ ہی فن و مشق کا وجود متحرک رہتا ہے، اس لیے 'ثالث' ہر طرح کی آوازوں کو اہمیت دیتے ہوئے مسلسل ترقی کی راہ پر چل رہا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

مکتوبات

- ''ثالث'' کا تازہ شمارہ پختہ جلد بنانے بھیجا ہے۔ سہیج کر رکھنے کی چیز ہے۔''

(فاروق ارگلی، نئی دہلی)

- ثالث کا شمارہ نمبر ۲۰ میرے سامنے ہے۔ موصول تو پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن جستہ جستہ اور لطف لے لے کر مطالعہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی کچھ ذاتی نوعیت کی مشغولیت بھی رہی اس لیے ذرا دیر سے کچھ لکھ پا رہا ہوں۔ حسین الحق اچانک اس جہان فانی سے دل رخصت ہو گئے اور ہمیں غمزدہ چھوڑ گئے۔ اس شمارے میں ان پر گوشہ کی صورت میں کافی مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ اقبال حسن آزاد صاحب کی قدر دانی کی داد دینی ہو گی۔ آزاد صاحب نے ان پر پورا ایک نمبر بھی نکالا تھا۔ مزید کام کی گنجائش تو ہے ہی۔ افسانوں کی بات کریں تو آزاد صاحب ان کے انتخاب سے ہر بار چونکاتے ہیں۔ اس بار بھی بہترین لکھاریوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ سب پر الگ الگ بات کرنے کی شاید یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہر قاری کی پسند الگ الگ ہوتی ہے۔ 'اعتراف' کے تحت بشمولِ ناچیز کل ۹ قلم کاروں کو منتخب کیا گیا ہے۔ ناچیز کی غزلیہ شاعری پر لکھا گیا مضمون تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ہی بھیجا گیا تھا، صاحبِ مضمون کی خواہش کے مطابق، لیکن بوجوہ تب شائع نہیں ہو سکا تھا۔ مدیر کی بھی مجبوریاں ہوتی ہیں جس کا مجھے احساس ہے۔ میں آزاد صاحب کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اعتراف نامے میں شامل تقریباً سارے نام اور ان پر مضامین رقم کرنے والے حضرات آسمانِ اردو ادب کی کہکشاں کے جزو ہیں۔ شعیب نظام کے فن اور ان کی شخصیت سے تفصیلی واقفیت ہوئی۔ انہوں نے متاثر کیا۔ سہ ماہی 'امروز' علی گڑھ کے حالیہ شمارے میں بھی ان کی غزلیں اہتمام سے شائع ہوئی ہیں جو بے شک منفرد انداز کی ہیں۔ ناچیز پر لکھے گئے مضمون اور الوداعیہ نظم کی پسندیدگی کے کئی پیغامات موصول ہوئے۔ ناقدوں کی نگاہ کب پڑتی ہے، اللہ جانے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شمارہ مجھے بروقت مل گیا تھا لیکن میرے ملاقاتی کمرے سے غائب ہو گیا۔ کسی کا دل

آ گیا ہو گا۔ اس پرچے کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میری گزارش پر محترم مدیر نے مجھے دوسری کاپی بھیج دی۔ میں ان کا مزید شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مرغوب اثر فاطمی (گیا)

- امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے اور تازہ خصوصی شمارے کی تیاریوں میں مشغول ہوں گے..... آپ کی محنتوں اور انہماک نے ثالث کو اس عہد کا ایک اہم اور یادگار رسالہ بنا دیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے بھیانک ایکسیڈنٹ اور اس کے بعد کی پریشانیوں کی وجہ سے ثالث شمارہ ۲۰ کے تعلق سے اپنے تاثرات اب تک نہیں بھیج سکا۔

اللہ کا بے حساب شکر ہے کہ اب بہتر ہو رہا اور دائیں ہاتھ اور انگلیوں میں ایک حد تک توانائی آنے لگی ہے تو خیال کہ تاخیر سے ہی سہی شمارے کے تئیں اپنے تاثرات کا اظہار کر دوں۔

آپ کے خصوصی شماروں کے درمیان شمارہ ۲۰ بھی یقیناً ایک سنگ میل تصور کیا جائے گا۔ تمام قابل قدر مشمولات کے ساتھ میرے لیے یہ شمارہ جذباتی طور پر بھی اہم ہے کہ اس شمارے میں خراج عقیدت و محبت اور اعتراف کے طور پر برادر بزرگ پروفیسر حسین الحق مرحوم و مغفور کے نام ایک گوشہ مختص کیا اور اس بات کے لیے میں دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں کہ اس گوشے میں آپ نے ناچیز کی تحریر شامل کی۔ آنے والے وقت میں بھیا صاحب کے حوالے سے جو بھی گفتگو آگے بڑھے گی اس میں یہ گوشہ اور اس سے بہت پہلے شائع شدہ ثالث کا ایک خصوصی شمارہ پروفیسر حسین الحق کے نام ضرور شامل ہو گا۔

اس شمارے میں آپ کے اور الیاس انصاری کے مضامین، نثار احمد صدیقی کا انٹرویو اور مرغوب اثر فاطمی کا خراج عقیدت خاصی اہم مشمولات ہیں۔ ان کے درمیان ناچیز کے مضمون کی شمولیت میرے لیے باعث مسرت ہے۔ بہت شکریہ۔ مجموعی طور پر پورا شمارہ بے حد دلکش اور قابل قدر ہے۔ غضنفر بھائی سے ریشا قمر کا انٹرویو، مرغوب اثر فاطمی کی غزل گوئی پر بھیا صاحب حسین الحق کا مضمون، شافع قدوائی، صغیر افراہیم، مشتاق احمد نوری، اسلم جمشید پوری، صدام حسین، وصیہ عرفانہ اور قسیم اختر کے اعترافات اور دیگر مضامین بالخصوص قدوس جاوید بھائی کی تحریر، اکثر افسانے بشمول شموئل احمد اور اقبال حسن آزاد، جمال اویسی و دیگر محترم شعرا کی غزلیں اور نظمیں،

تبصرے اور مکتوبات۔ تمام مشمولات بے حد وقیع ہیں۔ جن کے نام نہیں لیے جا سکے میری جانب سے ان کے لئے بھی مضمون واحد ہی۔ ضیا فاروقی اور ذکی طارق کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ بہت سلام، محبتیں، مبارکباد اور شکریہ عین تابش (گیا)

- آداب عرض ہے، ثالث کا نیا شمارہ ملا، بہت خوبصورت ہے۔ بہت بہت شکریہ جناب عنایت مہربانی۔ غزال ضیغم (لکھنؤ)
- آج ہی ڈاک سے مجھے "ثالث" کا جلد نمبر ۵ اور شمارہ نمبر ۲۰ موصول ہوا ہے۔ پہلے بھی انہوں نے دو ایک مرتبہ اپنا رسالہ ارسال کیا تھا اور میں نے ان کا رسمی شکریہ بھی ادا کر دیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ مجھے ایسا لگا کہ مجھے ان کا قلمی شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے اس سلسلے میں انہیں میں ایک معیاری اور خوب صورت رسالہ نکالنے کے لیے مبارک باد دیتا ہوں۔ رسالہ نکالنا ایک بات ہے اور دوسری بات ہے معیاری رسالہ صحت کے ساتھ نکالنا..... مدیر کے لیے رسالہ نکالنا اور مشکل ہو جاتا ہے اگر وہ خود افسانہ نگار، شاعر یا ناقد ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ اقبال حسن آزاد صاحب یہ دشوار اور مشکل کام کو بہت سبکساری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ شائد کوئی پھول سا ہاتھ ان کے کاندھے پر موجود ہو۔ بہر حال ''ثالث'' کا تازہ شمارہ اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ خوب صورت ہے، معیاری ہے، اس میں اچھے اور قیمتی مواد موجود ہیں، موضوعات کا تنوع ہے۔ فکر و احساس کی خوب صورت آمیزش ہے۔ معتبر فنکاروں کی ایک حسن کہکشاں ہے اور وہ سب کچھ ہے جو ایک رسالے کو معیار اور اعتبار بخشتا ہے۔ فنکاروں اور قلم کاروں کی اتنی بڑی تعداد موجود ہے، جس کا شمار ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قیمت: ۳۵۰ روپے، رسالے کی اشاعت ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس نئی دہلی کے ذریعے عمل میں آئی ہے۔

میرے خیال میں ''ثالث'' کا مطالعہ طالب علموں اور ان فنکاروں کے لیے بھی مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔ جو اپنی زندگی کی کہانی کو ''دھنک رنگ'' بنانا چاہتے ہوں۔ (فخر الدین عارفی، پٹنہ)

- ''ثالث'' میں شائع شدہ مواد پروفیسر موصوف کی محنت شاقہ کا پتہ دیتے ہیں۔ مشمولات کا انتخاب واقعی قابلِ مطالعہ ہوتا ہے۔ ہر ایک گوشے میں مضامین و

تخلیقات کے معیار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک گوشہ پروفیسر حسین الحق کے لیے مخصوص رکھا گیا ہے جس میں ان کے تعلق سے چند تاثراتی و تجزیاتی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ''ثالث'' عصری ادب کی بہترین انداز میں ترجمانی کر رہا ہے۔ نئے پرانے ادباء و شعراء کی حوصلہ افزائی کا سنگم بھی خوب ہے۔ مجموعی طور پر ''ثالث'' کے مدیر اقبال حسن آزاد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے عصری صحافت کی نیو کو مضبوط کرنے کی ٹھان لی ہے۔ لوگوں کا صحیح ردعمل نہ آنے کی وجہ سے حقیقت میں ایک مدیر ہمت ہار دیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور وہی اقبال حسن آزاد صاحب کو حوصلہ بخشتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے آمین۔ غلام نبی کمار (سری نگر)

- ثالث کا شمارہ (اکتوبر تا دسمبر-۲۱) پندرہ بیس روز قبل مل گیا تھا۔ لیکن رمضان کی مصروفیت نے پڑھنے کا موقع کم دیا۔ ادھر تین چار دنوں سے ثالث کا مطالعہ کرنے میں کسی طرح کامیاب رہا..... اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال حسن آزاد ایک بہترین مدیر ہیں۔ ناسازگار ماحول میں بھی انہوں نے اپنے دم پر اس ادبی صحیفہ کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ معیاری ادب بھی پیش کر رہے ہیں۔ اور ایسا کر پانے میں جہاں ان کا ادبی جنون کارفرما ہے وہیں وہ معیار سے کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ اچھی بات یہ ہے کہ وہ بڑے ناموں کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کی تحریروں کو بھی ترجیحاتی بنیاد پر رسالہ میں شامل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثالث کا شمار آج اردو کے اہم رسالوں میں ہونے لگا ہے۔

اس شمارے کے ذریعہ حسین الحق کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے جو قابل تحسین ہے..... غضنفر کا انٹرویو ہو یا اعتراف کے تحت 'خالی فریم بھرنے کی کاوش' یا 'جنسی ترجیحات کا تخلیقی بیانیہ' یا پھر مضامین میں 'اودھ کی چند معروف خواتین قلم کار' یا 'صفدر امام کا سفر نامہ' سب پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور معلوماتی ہیں۔ فکشن میں 'کٹوا' 'مجازی خدا'، 'چننے دی بوٹی'، 'حکایت در حکایت' اور 'بارگاہ خداوندی' نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ڈاکٹر اختر آزاد (جمشید پور)

- بھئی آپ واقعی بڑی سخت جان والے آدمی ہیں جو اس درجہ ادب بیزاری کے دور

میں بھی زبان کی بقا کو اپنا فرض عین گردانتے ہیں۔ وسیم فرحت (امراوتی)

- اقبال حسن آزاد صاحب کی ادارت میں نکلنے والا کتابی سلسلہ ثالث روز افزوں اپنے بلند معیار کی جانب بتدریج گامزن ہے..... نیا شمارہ نمبر ۲۰ بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ مشمولات کی فہرست ہمیشہ کی طرح اقبال صاحب کی مدیرانہ نظر انتخاب کی مظہر ہے۔

چند ماہ قبل ہمارے درمیان سے ملک عدم سدھارنے والے فکشن کے معتبر دستخط مرحوم حسین الحق صاحب پر بھی ایک مختصر گوشہ شامل اشاعت ہے۔ حسین الحق صاحب کے فن پر سنجیدگی سے مکالمہ کی فضا استوار کرنے کی احتیاج ہے۔ مدیر محترم نے اس تعلق سے چند عمدہ مضامین جمع کیے ہیں۔ سردست وصولیابی کی رسید حاضر خدمت ہے۔

اس خوبصورت ادبی تحفے سے نوازنے کے لیے اقبال حسن آزاد صاحب کا بہت شکر گزار ہوں۔! رب کریم ان کو صحت و عافیت سے نوازے۔ وسیم احمد فدا (ہاپوڑ)

- اور اب جب بنارس لوٹ آیا ہوں تو سب سے پہلے پہلی فرصت میں ان کتابوں کو پڑھ لینا ہے۔ ان دنوں زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان ''ثالث'' شمارہ ۲۰-۱۹ زیر مطالعہ ہے۔ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر اقبال حسن نے اس کتابی سلسلہ کو جو معیار عطا کیا ہے یا اس پر آشوب دور میں بھی رسالے کو زندہ و جاری رکھا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ اس کتابی سلسلہ کو زندہ رہنا چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس رسالے کو خرید کر پڑھیں، یا سالانہ خریدار بن کر اسے زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوں ورنہ اپنے خرچ پر کب تک کوئی مدیر کسی رسالے کو زندہ رکھ سکتا ہے۔

جرنلسٹ اقبال (بنارس)

- آپکا افسانہ ''حکایت در حکایت'' پڑھا۔ (ثالث اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء) پرت در پرت اک نکتے کو سمجھانے کی کوشش کی گی ہے۔ اک پردیسی جو وطن لوٹا تو سب کچھ بدلا بدلا دیکھا۔ دوستوں پہ تکیہ کرنیوالے کو باپ نے اپنے واحد دوست سے ٹھٹھرتی رات ملوایا۔ وہیں اک محبت کرنیوالی مثالی بیوی اور پھر عاشق کا اپنی ماں کا سینہ چیر دینے والی حکایت سامنے آئی۔ میں اپنے اک دوست کو قریب سے جانتا ہوں۔ وہ واپس جانا چاہتا ہے، ہمیشہ کے لیے اپنے وطن میں ہی رہنے کی خواہش اسکی ذات

سے دھواں بن بن کر اٹھتی رہتی ہے۔ مگر اسے واپس جا کر اپنوں کے بدلتے رویوں کا اندیشہ رہتا ہے۔ وہ انہیں کھونا نہیں چاہتا اور زمینی فاصلہ شف کرنا چاہتا ہے مگر ممکنہ اندیشوں کا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے۔ اس تخلیق کی خاص بات زندگی کی سختی، ترش مزاج انسانی نفسیات اور لفظوں کا خوبصورت استعمال ہے۔ جو پڑھتا جائے تو بریک نہیں ملتا، اک بہاؤ کے ساتھ اک ہی نکتے پہ مختلف کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ ہم بطور نمونہ اس سے افسانہ کا مرکزی خیال اور بطور تخلیق کار سمجھ سکتے ہیں کہ کیسے اپنے مرکز کو کمزور ہونے سے بچائے رکھنا۔ (مختار بلال، آسٹریلیا)

- سہ ماہی ثالث کا گلدستہ موصول ہوا۔ ثالث کے شمارے پا کر جو مسرت و شادمانی حاصل ہوئی اسے لفظوں میں بیان کرنا محال ہے، میں اس کے لیے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد صاحب کی مشکور و ممنون ہوں۔

ثالث کا ہر شمارہ انفرادی اہمیت کا حامل ہے، ہر شمارے میں اقبال حسن آزاد اور ان کی ٹیم ممبرس کی محنت و کاوشیں نظر آتی ہیں، کور پیج سے لے کر مواد کی ترتیب و تزین قابل دید و فخر ہے، ساتھ ہی کشمیر سے کنیا کماری تک کے مصنف و ناقدین، شعراء و ادباء اور ریسرچ اسکالرس کے مضامین ثالث میں پڑھنے کو ملتے ہیں، جو رسالہ کے لئے بڑی کامیابی و کامرانی کی ضمانت ہے۔ تازہ شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ اس کی عمدہ مثال ہے، جس میں ملک و بیرون ممالک کے شعرء، ادباء، تحقیق و تنقید نگار اور مترجم کی تصنیفات شامل ہیں۔ اس شمارے میں ناچیز کو بھی شامل ہونے کا موقع ملا، اس سے قبل ان کا تاریخی شمارہ ''عالمی خواتین'' نمبر بھی منظر عام پر آیا جس نے پوری دنیا میں داد و تحسین حاصل کی۔ میں یہ کہتے ہوئے بہت فخر محسوس کر رہی ہوں کہ سہ ماہی 'ثالث' عصر حاضر کے رسائل میں شامل ایک ایسا نام بن چکا ہے، جس نے اپنے پہلے شمارے کی اشاعت کے ساتھ ہی اہل علم فن کے درمیان اپنی جگہ مستحکم کر لی۔ ثالث کی اہمیت و افادیت اور معیار کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ یو۔ جی۔ سی کیئر لسٹ میں بھی شامل ہیں۔

شہر مونگیر سے اتنا خوبصورت و معیاری ادبی رسالہ نکالنا وہ بھی آج کے دور میں جہاں ایک طرف رسائل کی بھرمار ہیں تو دوسری طرف ناسازگار حالات..... دو برس سے

پوری دنیا کرونا وائرس کے قہر میں مبتلا رہی، ایسے میں سوشل میڈیا، نیوز چینلس اور اخبارات کی سرخیاں اسی وائرس سے متعلق خبروں سے بھری پڑی رہیں۔ کرونا نے جس طرح پوری دنیا کو اپنی چپیٹ میں لے لیا اور زندگی کی تصویر بدل ڈالی ایسے وقت میں بھی رسالہ نکالنا اور بریک نہ لگنے دینا کسی معجزے سے کم نہیں۔ ساتھ ہی جن مشکلات سے آج اردو ادب دوچار ہے، ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اس محنت و کاوش اور ہمت کے لیے مدیر اعزازی اقبال حسن صاحب واقعی قابل ستائش و قابل مبارکباد ہیں۔ اپنے اداریہ میں اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں:

"مایوسی کی بات کرنا دل شکستہ ہونا، خود کے ساتھ اوروں کی ہمت بھی توڑنا اچھی علامت نہیں ہے۔ حالات خواہ جیسے بھی ہوں انسان کو ہمیشہ زندگی کے روشن پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہئے۔ اگر کچھ برا ہو رہا ہے تو یقیناً کچھ اچھا بھی ظہار پذیر ہو رہا ہوگا۔ یہی وہ سوچ ہے جو مجھ جیسے لوگوں کو تعمیری کام میں مشغول رکھتی ہے اور اس کی ایک مثال یہ رسالہ "ثالث" بھی ہے۔"

مجموعی طور پر ثالث کے تمام شمارے تازگی و توانائی سے پُر.....نہایت ہی قیمتی اور تشفی بخش ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ ثالث ظاہری و معنوی ہر دو اعتبار سے سنجیدہ رسالہ ہے۔ یقیناً اس رسالے سے آنے والے وقت میں بھی تحقیق و تنقید کے نئے باب کھلیں گے اور قارئین اردو ادب کے افکار و احساسات میں ایک نئی تازگی و نئی ترنگ دوڑے گی۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ اس کار خیر میں آپ کے لیے آسانیاں فرمائیں اور کامیابی و کامرانی کے نئے مراحل اسی طرح طے ہوتے رہیں.....آمین

ڈاکٹر صالحہ صدیقی (الہ آباد)

- آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا "ثالث" انسانیت کا نقیب و علم بردار ہے۔ زندگی آموز اور حیات افروز شہ پارے پیش کرتا ہے۔ شمارہ ۱۴ میں ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ اردو فکشن نگار حسین الحق کے فن اور شخصیت پر عمدہ گفتگو ہوئی ہے۔ اداریہ خوب ہے۔ اس جریدے کی میری نگاہ میں بہت قدر ہے۔ اقبال حسن آزاد بھائی آپ اردو زبان کی جس انداز پر خدمت کر رہے ہیں، وہ قابل تعریف ہے۔

احسان تابش (گیا)

- برصغیر کے مشہور ادیب و افسانہ نگار پروفیسر اقبال حسن آزاد کو کون نہیں جانتا لیکن کچھ

ادبی ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے ادبی کارناموں سے منفرد مقام بنا لیتی ہیں انہیں میں اقبال حسن آزاد بھی ہیں۔ آپ ایک مشہور ادبی رسالہ "ثالث" کے مدیر اعزازی ہیں۔ آپ نے "ثالث" میں مشہور ادیبوں افسانہ نگاروں پر مشتمل مقالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے جو اردو محققین کے لئے مشعل راہ بنے گا۔

میرے ہاتھ میں "ثالث" کا شمارہ نمبر ۱۴ ہے جو مشہور افسانہ نگار و ناقد پروفیسر حسین الحق (گیا) پر مشتمل مقالات کا مجموعہ ہے جو محترم مدیر اعزازی نے از راہ شفقت مجھے دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے حسین الحق کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہے۔ پروفیسر حسین الحق میرے استاد بھی رہے ہیں اور ان کے افسانوں کا میں نے مطالعہ بھی کیا ہے۔ ان کے تعلق سے یہ شمارہ ادب کے شائقین کے لئے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

میری گذارش مدیر ثالث سے یہ بھی ہے کہ شعراء پر بھی کبھی یہ سلسلہ نکالا جائے حالانکہ اس دور میں اردو کا رسالہ نکالنا مشکل کام ہے اس لیے اردو والے ہی اردو کتابوں کو خریدنے میں دلچسپی نہیں لیتے بہر حال نامساعد حالات میں بھی ثالث جیسے رسالے کا نکالنا اور مزید براں مشہور ادباء و افسانہ نگاروں پر مشتمل مقالات و تلاش کر اس میں شائع کرنا عظیم ادبی کارنامہ ہے جسے اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی (گیا)

نئی کتابیں

نام کتاب : مونتاژ (افسانے) مصنفہ : فارحہ ارشد سال اشاعت: ۲۰۲۲ء قیمت : ۵۰۰/روپے	نام کتاب: راستے خاموش ہیں (افسانے) مصنف: مکرم نیاز سال اشاعت: ۲۰۲۲ء قیمت: ۳۰۰/روپے